جملہ حقوق محفوظ

...قۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیمۃ وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور ۳:۱۸۵

ہر جان موت کا مزا چکھے گی اور تم لوگ قیامت کے دن اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ پاؤ گے۔ دنیا کی زندگی تو ایک دھوکہ ہے۔

فلسفۂ اسلام

حصہ اوّل

جس میں

(۱) ادیانِ عالم، فلسفۂ یونان و ایران و ہندوستان و مصر اور حالات و معاشرت و تہذیبِ اقوامِ ماضی مثلاً اہلِ بابل، آشوریا، فینیقیا، مصر و جزیرہ قریطہ، چین وغیرہم کو وضاحت سے بیان کر کے ان کا مقابلہ فقہ و فلسفۂ اسلام سے کیا گیا ہے جس سے حقیت و افضلیت اسلام عیاں ہے۔

(۲) ارشاداتِ قرآن و تعلیماتِ ائمہ علیہم السلام کو موزوں مقامات پر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) دہریت کے نظریات و معتقدات کی تردید باحسن دلائل کی گئی ہے (۴) آیاتِ فطرت سے فاطرِ ارض و سموات کی طرف دلالت کی گئی ہے اور اس ضمن میں علم اجرامِ فلکی و علم طبیعیات و تخلیق کائنات و ابتداءِ حیات و گردشِ ثوابت و سیارگان و اثرِ شعاعِ عالمی و تقلیبِ معدنیات و اختلافِ خلقت کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور سائنس کی لاعلمی کو ہر مناسب موقعہ پر عیاں کیا گیا ہے —— !

تالیف

آغا محمد سلطان مرزا

ایم اے، ایل ایل بی۔ ڈسٹرکٹ و سیشن جج ریٹائرڈ جسٹس آف پیس کراچی و نوٹری پبلک کراچی۔ سابق آنریری سیکرٹری پراونشیل سول سروس جوڈیشل برانچ پنجاب سابق ممبر کورٹ اور دہلی یونیورسٹی۔
مؤلفِ البلاغ المبین، نور المشرقین من حیاۃ الصادقین، کتاب التزئین والتحریف فی الاسلام، کتاب سیرۃ فاطمۃ الزہراؑ۔ وغیرہ وغیرہ؛

ناشر

امامیہ کتب خانہ

مغل حویلی
حلقہ ۲/۷ ———— لاہور ۸

۳۹۷۶۸۸
م ۱/۲۴۹ ف
۱۵۴۵۳
۷۰۱ 66156
9/2

بیادگار

و

برائے ایصالِ ثواب

بارواح

والدین و مادر و پدر والدین مصنّف

نوشتہ شد!

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

حمایت اسلام پریس لاہور

Marfat.com

کشاف

الموضوعات الجزء الاوّل کتاب فلسفۂ اسلام

الموضوع	صفحہ	الموضوع	صفحہ
سرورقِ اوّل	۱	**باب اوّل**	۲۹
بیادِ رفتگانِ عزیز	۲	**مغربی تہذیب۔ اس کے چند تصورات و اثرات**	
فہرست مضامین (کشاف)	۳	سیاسی ہتھکنڈے	۳۰
مناجات	۱۵	روس و مغربی یورپ کا فلسفۂ سیاست ایک ہی ہے ۔	۳۱
نذر	۱۶	خودی	۳۲
تعارفِ کتاب ہذا	۱۷	جناب امیر علیہ السلام کا خطبہ	۳۳
مغربی تہذیب کی تقلید کے خطرے	۱۸	تجارت	۳۶
سدِّ باب فتنۂ دہریت، مقصدِ کتابِ ہذا ۔	۲۰	قومیت و وطنیت	۳۹
عصرِ رواں کی خصوصیّت	۲۱	انڈسٹریلزم	۴۰
آہ! آہ! از غفلتِ مردم آہ!	۲۳	جمہوریت	۴۳
نکات برائے غور	۲۵	ابتدائی تعلیم اور اس کی خرابیاں	۴۵
ہستئ خداوند تعالےٰ	″	عصرِ رواں کے اربابِ ثلاثہ	۴۸
توحید	″	عورتوں کی ابتدائی تعلیم	۵۰
حیات بعد ممات	۲۶	رقص و سرود	″
نبوت	۲۶		
امامت	۲۷		
آئمۃ الصدق و اولیاء الحق	″		

الموضوع	صفحہ
قناعت	۵۰
اصلی ترقی کیا ہے	۵۲
باب دوم	
فلسفہ وحکمت ۔ مذہب وعقل و سائنس	۵۳
فلسفۂ یونانی وحکمتِ قرآنی میں فرق۔	۵۳
فلسفۂ یونانی کی خرابیاں۔	۵۵
عقل سلیم وایمان وعقائد اسلامیہ ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔	۵۶
یورپ کے مذاہب اور یورپ کی عقل وسائنس میں اختلاف۔	۵۹
باب سوم	
اسلام سے کونسا مذہب مُراد ہے۔	۶۳
صحیح اسلام کی قیادت کے لئے آئمہ اہلبیت علیہم السلام ہیں۔	۶۵
اس اسلام میں ہر زمانہ کی قیادت و ترقی کی اہمیت ہے اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہیں۔	۶۶
آخری امام اہل بیت کی غیبت تک بنی نوع انسان اپنے سارے ممکن تخیلات ختم کر چکی تھی۔	۶۸

الموضوع	صفحہ
باب چہارم ارکانِ حیاتِ ابدی در محیطِ فلسفۂ اسلام	۶۹
جدول ارکانِ حیاتِ ابدی۔	۷۱
باب پنجم غیر اسلامی فلسفے اور مذاہب (ما سوائے فلسفہ و مذہب یونان)	۷۲
بہت سی تہذیبیں ایسی گزری ہیں جن کے نام ونشان باقی نہیں، لیکن اثرات باقی ہیں۔	۷۲
انسان نے اپنی زندگی کے بڑے بڑے اصول جانوروں سے سیکھے ہیں۔	۷۳
غیر اسلامی فلسفے ومذاہب جن کا ذکر اس باب میں ہوگا۔	۷۴
(۱) مصر قدیم کا مذہب اور فلسفہ۔	۷۴
دُنیا کا پہلا فلسفہ مصر میں شروع ہوا۔	۷۵
مصر قدیم کا مذہب۔	۷۶
مصر کے خدا۔	۷

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
مصر میں دو مذہبوں کی رقابت	۷۹
انبیاء کی تعلیم کا اثر	۸۰
اعتقاد ارواح خبیثہ	۸۳
انسان کو خدا بنانا۔	۸۴
(۲) بابل کا مذہب و فلسفہ	۸۵
جس میں عیلام، عقاد، سمیر اور اشوریوں کے فلسفہ و مذہب کا ذکر ہے۔	۸۵
طبیعت الانلیل۔ ناامیدی۔	۸۶
بائبل کی کتاب ایوب سے اُس کی فریاد کی مشابہت۔	۸۷
عیلام، بابل، عقاد، سمیر اور اشوری اقوام کے حالات۔	۸۸
تمام سامی اقوام کی ابتدا عرب میں ہوئی۔	۸۹
سام کی وجہ تسمیہ	۹۱
تین خروج	۹۲
عیلام۔	۹۳
سوسا کی تہذیب سب سے پورانی	۹۴
سمیریا اور عقاد۔	۹۵
سارغون۔	۹۶
اُر۔ حمورابی اور اُس کا ضابطہ قوانین۔	۹۷

الموضوع	صفحہ
مذہب	۹۸
بابل	۱۰۰
بنو خذ رزار	۱۰۱
حمورابی	〃
سناخرب	۱۰۲
کروشس اعظم کی فتح۔	۱۰۳
مذہب۔	〃
تخلیق کائنات کا عقیدہ۔	۱۰۴
اسیریا۔	۱۰۵
اشوربانی پال۔	۱۰۶
اسیریا کے مظالم۔	۱۰۷
اسیریا کی فتوحات کے بُرے نتائج۔	۱۱۰
(۳) ویدوں کا فلسفہ اور مذہب۔	۱۱۲
اپانیشد اور اُن کی تعلیم۔	〃
ہندو فلسفہ کی باطنی تعلیم۔	۱۱۳
ویدوں کا زمانہ اور مذہب۔	۱۱۶
رگ وید۔ اتھروید۔	〃
براہمنا۔	۱۱۷
ویدوں کے خدا۔	〃
ویدوں کے بموجب تخلیق و تکوین کائنات	۱۱۹

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
تخلیق انسان وحیوان ۔	۱۲۰
مسئلہ تناسخ ۔	۱۲۲
ویدوں کے بعد کا زمانہ ۔	۱۲۲
برہمنوں کے مذہب سے بغاوت ۔	〃
موجودہ ہندو مذہب ۔	۱۲۳
عام ہندوانی اعتقادات ۔	۱۲۶
بھگوت گیتا اور اُس کی تعلیم ۔	۱۲۸
(۴) الف و ب	
زرتشت ۔ اُن کا مذہب و فلسفہ اور اُن کے بعد اُن کی تعلیم کی تنسیخ و تحریف	۱۳۲
زرتشت کا زمانہ ۔	۱۳۲
لفظ مجوسی کی تحقیق ۔	〃
زرتشت کی تعلیم ۔	۱۳۳
زرتشت سے پہلے کی حالت ۔	۱۳۵
زرتشت کی تعلیم اور اُس کا تغیر ۔	۱۳۶
(۵) بودھ مذہب	۱۳۸
برہمنوں کے مذہب سے بغاوت ۔	〃
بدھ مذہب کی تعلیم اور اس کے اصول ۔	۱۳۹
بدھ مذہب پر تنقید ۔	۱۴۰
(۶) جین مت ۔ مہاویر	۱۴۲
جین مت کے عقائد ۔	〃
(۷) فلسفۂ چینی	۱۴۴
کن فیوشی اس	۱۵۰
اس کا فلسفہ	۱۵۱
انسانِ اعلیٰ	۱۵۳
باب ششم	۱۵۶
غیر اسلامی فلسفے ۔ فلسفۂ یونان ۔	
یونان نے اپنا فلسفہ ایشیاء سے لیا ہے ۔	۱۵۶
تعلیم انبیاء ۔	۱۵۷
یونانی تہذیب ۔	۱۵۸
آؤنین فلسفہ ۔	۱۵۹
یونانی فلسفہ کی تقسیم تین حصوں پر ۔	۱۶۰
ملطیہ ۔	۱۶۱
ثالیس فلاسفر ۔	۱۶۲
ثالیس کا فلسفہ ۔	۱۶۳
انگزیمینڈر اور اس کا فلسفہ ۔	۱۶۵
انگزامینین	۱۶۶
فیثاغورث اور اُس کے مقلدین ۔	〃
تناسخ ارواح ۔	۱۶۹
موسیقی اور اسلام ۔	۱۷۰
فیثاغورث کی سیاست ۔	۱۷۱

Marfat.com

الموضوع	صفحہ	الموضوع	صفحہ
ایلیاتی حکماء	۱۷۲	افلاطون۔	۲۱۴
پارمینڈیز اور اُس کا فلسفہ	۱۷۳	افلاطون کا فلسفہ۔	۲۱۵
حقیقت	۱۷۴	حکمرانوں کے تقرر و انتخاب	
پارمینڈیز کے دو جانشین۔	۱۷۵	کا طریقہ۔	۲۱۹
مسئلہ تناسخ۔	۱۷۶	اس پر تنقید۔	۲۲۱
تصوف۔	۱۷۷	افلاطون کے اصولِ حکومت۔	۲۲۴
زینو۔	۱۷۸	ارسطو۔	”
ہیراقلیطس اور اُس کا فلسفہ۔	”	روح اور خدا۔	۲۲۶
ایمپڈوکلیز۔	۱۸۰	ارسطو کے بعد کے یونانی حکماء	۲۲۸
فلاسفہ جوہر فرد۔	”	افلاطونیت جدید	”
ایٹم۔	۱۸۱	جدولِ فلاسفران ماضی و حال۔	۲۳۱
انکزاغورث اور اُس کا فلسفہ	۱۸۲	**باب ہفتم**	
نوس .Nous	۱۸۴		
سوفسطائی حکماء یونان	۱۸۷	**غیر اسلامی فلسفے**	
سوفسطائیوں کا زمانہ	۱۸۸	(مذہب یونان)	
پروطاغورث اور اُس کا فلسفہ۔	۱۹۰	جزیرۂ قریطہ کے باشندوں کا مذہب	۲۳۲
مذہب پروٹسٹنٹ۔	۱۹۳	عذابِ الٰہی اس جزیرہ پر تین	
سقراط اور اُس کا فلسفہ۔	۱۹۵	دفعہ آیا۔	۲۳۳
فلسفۂ کلبیہ۔	۲۰۰	مذہب۔	۲۳۶
لذاتی فلسفہ۔	۲۰۵	یونان کا مذہب۔	۲۳۶
لذاتیہ حکماء۔	۲۰۷	معبودوں کی کثرت، اور عابدوں	
رواقی فلسفہ	۲۰۹	کی اطاعت۔	۲۳۷
رواقی فلسفہ کے اصول	۲۱۱	خداؤں کی سات قسمیں۔	۲۴۲

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
باب ہشتم	
یہودیت اور مسیحیت	۲۴۸
اسلام کی بنا یہودیت و مسیحیت پر نہیں ہے۔	۲۴۸
اکثریت کا اسلام بھی یہودیت و مسیحیت کی طرح متغیر ہوگیا۔	۲۴۹
حضرت عیسٰےؑ کے حوارئین صحیح مسیحیت پر تھے۔	۲۵۱
پادریوں نے کیوں مسیحیت کو متغیر کیا۔	۲۵۱
عہد جدید کی انجیلیں۔	۲۵۲
زمانۂ حال کی تحقیق کے نتائج	〃
مرقس کی انجیل۔	۲۵۳
لوقا 〃 〃	۲۵۳
متی 〃 〃	〃
یوحنا 〃 〃	〃
ان کے مرتب ہونے کے حالات۔	۲۵۴
الحاد کے مذاہب جن سے مسیحیت نے اپنے نظریئے اخذ کئے ہیں۔	۲۵۶
الہیت کا تصور۔	۲۵۷
ثانویت۔	۲۵۹
خدا کو انسان کی شکل دینی۔	۲۶۰

الموضوع	صفحہ
خفیہ مذاہب۔	۲۶۰
اورفزم۔	〃
الیوشن مذہب کے رازہا۔	۲۶۲
اوسیرس۔ مصر کا خدا۔	۲۶۳
دینِ متھرا۔	۲۶۴
موجودہ مسیحیت سابقہ ادیان کفر و الحاد سے مرکب ہے۔	۲۶۶
اسلام و مسیحیت کا فرق۔	〃
موجودہ انجیل و قرآن میں فرق۔	۲۶۷
الفاظ کی طاقت و برکت۔	〃
شیطان کو مہلت دینے کا کیا نتیجہ ہوا۔	۲۶۸
یہودیت۔ (تاریخ)	۲۶۹
عبرانی ناموں کے معنی۔	۲۷۰
ہائک سوس کا زمانہ۔	۲۷۱
فتح کنعان۔	〃
چند تاریخیں۔	۲۷۲
حضرت سلیمانؑ کے انتقال پر سلطنتِ بنی اسرائیل کی تقسیم۔	۲۷۲
برادرانِ یوسفؑ کی عداوت پر عذابِ الٰہی۔	۲۷۳
بادشاہانِ اسرائیل کی بت پرستی۔	۲۷۴
یہودیت۔ مذہب۔	۲۷۵

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
یہودیت بھی مسخ و متغیر ہوگئی۔	۲۷۵
خدا کا تصور۔	۲۷۶
مصر و کنعان کے کفر کا اثر یہودیت پر۔	۲۷۷
اہلِ کنعان کی پیروی دیگر امور میں۔	۲۷۸
موجودہ زبور، تورات غرضکہ جملہ کتب عہد عتیق کس طرح، اور کس نے تصنیف کیں۔	۲۷۸
عاموس۔	۲۸۰
یسعیاہ۔	״
یرمیا۔	״
باب نہم دہریت کے معتقدات اور اُن کی تردید	۲۸۱
معیار بحث۔	۲۸۲
دہریت کے دعویٰ کا بار ثبوت۔	״
معیار بحث۔	״
مادہ اور مادیت۔	۲۸۵
حرکتِ اوّلین۔	۲۹۱
حیات	۲۹۳
سائنس کی لاعلمی۔	۲۹۶
حیات سمندر میں شروع ہوئی۔	״

الموضوع	صفحہ
ارتقاء۔	۲۹۷
رُوسی سائینسدان کا بیان۔	۳۰۲
بنی نوعِ انسان جسمانی اور ذہنی تنزل کر رہی ہے۔	۳۰۲
قرآن شریف کی آیت: "انی جاعلٌ فی الارض الآیۃ۔	۳۰۹
کفارۂ گناہاں، اور پادریوں کے معجزے۔	۳۱۱
مذہب اور عقل کے مقابلہ کا معیار۔	۳۱۲
سائنس کی لاعلمی اور اس کے نظریات کا تغیر و تبدل اور غیر یقینی ہونا۔	۳۱۲
حیات بعدموت کا عقلی امکان۔	۳۱۴
قرآن شریف نے اس وقت ہی کیوں نہ سائنسی اصول بتا دیئے۔	۳۱۵
سائنس دُنیا کے سادے سے سادے واقعہ کی ماہیت نہیں بتا سکتی۔	۳۱۶
اقتباسات مندرجہ سے جو نتائج کھلتے ہیں	۳۱۷
خدا نے آدمؑ کو علمِ اسماء یعنی ماہیتِ موجودات بتائی تھی۔	״
وصیت جو انبیاء میں منتقل ہوتی رہی۔	۳۱۸

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
افلاطون کے ہیاکل۔	۳۱۸
جناب امیرؑ کا فرمانا کہ سلونی قبل ان تفقدونی۔	۳۱۹
کائنات میں اٹل قوانین جاری ہیں۔	"
انسان کے قلیل علم کے متعلق آیات قرآنی۔	"
ابراہیمؑ کی بحث: "فبھت الذی کفر"۔	۳۲۰
دہریت کے کیا معنی ہیں۔	"
لاادریت۔ مذہب تذبذب۔	۳۲۱
دہریوں کی جماعت سے جناب رسول خدا کی بحث۔	۳۲۱ تا ۳۲۴
جناب امام جعفر صادقؑ کا بیان دہریت۔	۳۲۵
جناب امام جعفر صادقؑ کا دہریوں سے جہاد اکبر۔	"
توحید مفضل کتاب اہلیلجیہ۔	۳۲۶
بولشوزم۔	"
سرمایہ داری، اور بولشوزم کا مدعاء و مقصد اور اُن کی بناء ایک ہی ہے۔	۳۲۷
انبیاء و اولیاء و شہداء کی	

الموضوع	صفحہ
قربانیاں اقتصادی نقطۂ نظر سے نہ تھیں۔	۳۲۸
مذہب سے کہیں زیادہ اقتصادی بحران کی وجہ سے دنیا میں کشت وخون۔	"
کمیونزم کا اقتصادی نظام محض دھوکہ ہے۔	"
دہریت کی دیگر وجوہات۔	"
انسان کی مجبوری (موت) اور ظلم عاقبت کا پتہ دیتے ہیں۔	۳۲۹
انسان میں باوجود امراض شدید، اور مصائب دُنیا کے زندگی کی خواہش کیوں ہے۔	"
دنیا میں شر و ظلم و مصائب کی موجودگی خدا کے نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔	"
دنیا کی زندگی محض ایک خیال ہے۔	۳۳۰
سب کا مقصد جزا و سزا ہے۔	"
اس ساری بحث کا ماحصل۔	۳۳۲
جناب امیر علیہ السلام کے چند خطبے۔	۳۳۲

Marfat.com

الموضوع	صفحہ	الموضوع	صفحہ
باب دہم			
آیاتِ فطرت، دلیلِ ہستیٔ فاطر۔	۳۳۹	سُورج کی روشنی و گرمی۔	۳۵۰
خدا کی ہستی کا ثبوت کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے۔	۳۴۰	سُورج کی اندرونی حالت۔	״
ملاءِ اعلیٰ۔	۳۴۱	سُورج کی گرمی اور اس کے حجم و ایندھن کا خرچ۔	۳۵۱
دنیا کی ابتداء کا علم سائنس کو نہ ہی، اور نہ کبھی ہوگا۔	۳۴۲	نہیں معلوم کہ یہ کمی کیوں کر پوری ہوتی ہے۔	۳۵۱
اس کے قیاسات۔	״	زمین کے علاوہ کہیں اور زندگی نہیں۔	۳۵۲
جناب امیرؑ کا خطبہ۔ تخلیقِ کائنات پر اس کی تشریح۔	۳۴۳	تمام کائنات میں ایک ہی قسم کے Materials ہیں۔	״
یہ خطبہ ایک معجزہ ہے۔	۳۴۶	نظامِ شمسی کا چلنا۔ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔	״
ہمارا عالم اُس کی وسعت۔	״	قوتِ کشش پر شبہات۔	۳۵۳
ہمارے عالم کے علاوہ اور بہت سے بے شمار عالم ہیں۔	۳۴۷	دُنیا کی ابتداء سے لے کر اب تک کے واقعات نور کی شعاعوں پر چل رہے ہیں۔	۳۵۴
فضا کی دہشت ناک وسعت۔	״	قیامت کے دن اعمال کا دکھایا جانا۔	۳۵۵
ستاروں کی روشنی کے رنگ سے اُن کی حرارت کا پتہ چلتا ہے۔	۳۴۸	اس ہی مضمون پر چند آیاتِ قرآنی۔	۳۵۶
Nebulae. اور Novae.	״	قرآن کا معجزہ۔	۳۵۷
بہت سے عالموں کے اجتماعات۔	۳۴۹	خداوند تعالےٰ کے چند صنائع جو انسان کو غور کرنے پر مجبور	״

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
کرتی ہیں اور خدا کی ہستی کی طرف دلالت کرتی ہیں۔	۳۵۷
زندگی کس طرح پیدا ہوئی۔ قیاسات۔	۳۵۹
Radio - Activity	۳۶۰
Cosmic - Rays.	۳۶۱
شہد کی مکھی کے حالات۔	″
نظام شمسی اور نظام ایٹم بالکل ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔	۳۶۳
چیونٹیاں اور حضرت سلیمان ؑ کا لشکر۔ چیونٹیوں کی گفتگو۔	۳۶۴
حضرت امیر انسان کے ناجائز غرور و فخر کی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔	۳۶۷
شہد کی مکھیوں کے عجائبات۔	۳۶۸
چیونٹیوں کے عجائبات۔	۳۶۹
چیونٹیوں کا آپس میں گفتگو کرنا۔	۳۷۱
باب یازدہم فلسفہ اسلام اور اس کی خصوصیات	۳۷۲
خصوصیتِ اوّل۔ نجات ایمان و عمل پر منحصر ہے۔	۳۷۳
خصوصیتِ دوم۔ اسلام دین فطرت ہے۔	۳۷۴
(A) اس میں رہبانیت نہیں ہے۔	۳۷۴
(B) اپنے جسم کو تکلیف میں ڈالنے کی ممانعت۔	″
(C) ترک دنیا و لذات دنیا۔	۳۷۵
(D) عدل۔	″
فطرت الٰہی کے معنی۔	۳۷۶
خصوصیت سوم۔ دین اسلام میں ترمیم و تنسیخ ناممکن ہے۔	۳۷۷
خصوصیت چہارم۔ الاعمال بالنیات۔	″
چند احادیث آئمہ علیہم السلام۔	۳۷۸
خصوصیت پنجم۔ حب خدا اور اس کے معنی۔	۳۸۰
خصوصیت ششم۔ اطاعتِ رسول ؐ۔	۳۸۱
خصوصیت ہفتم۔ دین یسر۔	″
خصوصیتِ ہشتم۔ شفاعت اور اس کی نوعیت۔	۳۸۲
خصوصیت نہم۔ شکر۔	۳۸۴

الموضوع	صفحہ
خصوصیت دہم۔ صبر	۳۸۵
جناب امیرؑ کا کلام۔	"
خصوصیت یازدہم۔ اتفاقات۔	۳۸۶
خصوصیت دوازدہم۔ حقیقتِ دُنیا اور مقصدِ حیاتِ انسان۔	"
چند مسائل برائے حل۔	۳۸۸
میزان کی حقیقت۔	۳۹۳
اس اعتراض کا جواب کہ باوجود اسلام میں اور خدا کے نزدیک ظلم کی اس قدر مذمت کے دنیا میں چاروں طرف ظلم کیوں پایا جاتا ہے۔	۳۹۴
مصائب و آلام دنیا کی وجوہات اور ان کا بیان۔	۳۹۵
نبوت کی غرض و غایت۔	۴۰۰
لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ انسان کی زندگی کی حقیقت۔	۴۰۱
مسیحیت کا نظریہ عورت کے متعلق۔	۴۰۲
علائق دنیا۔ مسیحیت کا نظریہ۔	۴۰۳
ان دونوں پر اسلام کا نظریہ۔	۴۰۴
حیاتِ دنیا پر قرآن شریف کی آیات۔	۴۰۶

الموضوع	صفحہ
حکماء اسلام یعنی آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال۔	۴۰۷
دنیا کی حالت۔ حضرت علیؑ کی زبانی۔	"
حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں زمانہ عشرت، زمانہ نکبت۔ ہر زمانہ میں انسان کا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیئے۔	۴۰۸
حضرت علیؑ۔ خیر و شر کی ماہیت۔	"
" " ۔ دنیا کی طرف جُھک جانا۔	"
" " ۔ دنیا کی حالت۔	۴۰۹
" " کا دیگر خطبہ۔	۴۱۰
" " کے اقوال۔	"
" " کے نزدیک دُنیا کی قدر۔	"
" " ۔ انسان کی غفلت	۴۱۱
" " ۔ دنیا کو کون پسند کرتا ہے، اور کون اس سے حذر کرتا ہے	"
" " ۔ دنیا و آخرت۔	"
" " کے دیگر خطبوں کی	۴۱۲

Marfat.com

الموضوع	صفحہ
فہرست ۔ جو اسی ہی مضمون پر ہیں ۔	۴۱۲
حضرتؑ کا خطبہ جس میں آپ نے لوگوں کو دنیا کے انہماک سے ڈرایا ہے ۔	"
اُس کا ترجمہ اردو ۔	۴۱۴
دوسرا خطبہ اس ہی مضمون پر ۔	۴۱۸
اُس کا ترجمہ اردو ۔	۴۱۹
جناب امام حسن علیہ السلام کے نصائح ۔	۴۲۰
اُس کا ترجمہ اردو ۔	۴۲۱
حضرت امام حسن علیہ السلام کا دوسرا خطبہ ۔	۴۲۲
اُس کا ترجمہ ۔	"
حضرت امام حسین علیہ السلام کا خطبہ ۔	۴۲۳
اُس کا ترجمہ اردو ۔	۴۲۴
حضرت امام حسین علیہ السلام کا دوسرا خطبہ ۔	۴۲۵
اُس کا ترجمہ اردو ۔	"
حضرت امام حسین علیہ السلام کا تیسرا خطبہ اور اس کا ترجمہ اردو ۔	۴۲۶

الموضوع	صفحہ
حضرت امام حسین علیہ السلام کا چوتھا خطبہ ۔ معہ ترجمہ اردو ۔	۴۲۷
حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے اشعار عبرت آموز ۔ معہ ترجمہ اردو ۔	۴۲۸
اسلام ترکِ دنیا اور عشق دنیا دونوں سے ممانعت کرتا ہے ۔	۴۲۹
ترکِ دنیا خلاف فطرتِ انسانی اور مشیت یزدانی ہے ۔	۴۳۰
خداوند تعالےٰ نے باوجود دنیا کے آلام و مصائب و تکالیف کے دنیا کو انسان کی نظروں میں خوش آیندہ بنا دیا ہے ۔ یہ حکمتِ الٰہی کا بہترین نمونہ ہے ۔	۴۳۰
دنیا کی زشت روئی میں حسن کی آمیزش ۔ حضرت علی علیہ السلام کی زبانی ۔	۴۳۰
حضرت علی علیہ السلام کے اس مختصر خطبہ سے انسان کی زندگی کا مقصد واضح ہوتا ہے ۔	۴۳۲
حصہ اول ختم، حصہ دوم میں کیا ہوگا ۔	"

Marfat.com

آغا محمد سلطان مرزا دہلوی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ مرحوم

مصنف کتاب ہذا

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات

اے وُہ ذات ہست جو فہم و شعورِ انسانی سے بالا تر ہے جس کی مشیت کو سمجھنا ذہنِ انسانی کا کام نہیں۔ اور جس کی قضا و قدر میں چون و چرا کرنا عقلِ انسانی کی بے عقلی ہے۔ میں نے اپنی حالت اور حاجت کو عرصہ تک تیری درگاہ میں فریاد و فغاں کے ذریعہ سے پہنچایا اور اب خاموشی کو اپنا وکیل کر کے تیرے پاس یہ عرض کرنے کے لیئے بھیجتا ہوں کہ ؎

کای کمینہ بخششت ملک جہاں

من چہ گویم چوں تو میدانی نہاں

میں ہمیشہ زبان سے یہ ہی کہتا رہوں گا اور دل سے اقرار کرتا رہوں گا۔ اس دُنیا میں بھی، اور میدانِ حشر میں میزانِ عدل کے سامنے بھی، کہ تُو نے ہمیشہ میرے اُوپر اپنے افضال و اکرام ہی ارزانی فرمائے۔ اور جو دُنیا والی آنکھوں میں مصائب نظر آئے وُہ بھی میرے بے شمار گناہوں کے کفارہ کی صُورت میں تیری نعمتیں تھیں۔ قصور میرے شکر میں ہُوا، تیرے فضل و کرم میں کبھی کمی نہ ہوئی۔ باوجود میرے گناہوں کی کثرت اور ان پر اصرار کے تُو نے میری حاجتیں پُوری کیں ع

"اے ہمیشہ حاجتِ ما را پناہ"

حالانکہ جب میں نے تیری طرف امداد کے لیئے ہاتھ پھیلایا، تو یہ پہلے کہنا پڑا کہ ع

"بار دیگر ما غلط کردیم راہ"

ایک حاجت میری اتنی شدید ہے کہ باوجود اس یقین کے کہ تو اس کو بغیر میرے کہے جانتا ہے، فقط اپنی تسلی کے لیئے اس کو زبان سے بھی عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وُہ یہ کہ میں اپنے والدین کی خدمت اپنی تمنا کے مطابق نہ کر سکا۔ اور قبل اس کے کہ میں اس کمی کو پُورا کرتا، وُہ اپنا سفر ختم کر کے تجھ تک جا پہنچے تھے۔ اب کیا کروں اور کس سے کہوں کہ میرے اس قصور کی تلافی کرے۔ تجھ سے ہی عرض کرتا ہوں کہ

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

عرض پوری ہوئی، قبول پر نظر ہے

نذر

بحضور حضرت حجۃ اللہ القائم امام العصر والزمان مہدی دوران صلوات اللہ علیہ

کیا ایسے گنہگار کو بارگاہِ عالی میں حاضر ہونے کی اجازت مل سکتی ہے جس کے ہاتھ خالی ہیں، اور دامن گناہوں سے پُر؟ مجھے یقین کامل ہے، کہ آپ میری حالت سے واقف ہیں۔ گناہوں اور غفلتوں کا تو کوئی عذر ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر میری حالت پر نظر کر کے سزا میں کمی ہو جائے، تو یہ بھی بہت ہے۔

مومنین کی دعا ہے کہ آپ جلد ظاہر ہوں تاکہ دنیا جو ظلموں سے بھری ہوئی ہے، عدل سے پُر ہو جائے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حضور والا خداوند تعالیٰ سے دُعا کر کے ہمیں اِس قابل کر دیں، کہ ہم حضور کو قبول کر سکیں اور حمایتِ حق کر سکیں۔ ابھی تک تو ہماری یہ حالت ہے کہ حمایتِ حق تو بڑی چیز ہے، ہمارے صاحبان حل وعقد باطل کی کثرت کو دیکھ کر اپنے تئیں اہلِ حق کہتے ہوئے شرماتے ہیں ڈرتے ہیں۔ اور ہم سب اپنے عمل سے ان کے اس ڈر کو تقویت دیتے ہیں۔ ابھی ہم "عجل اللہ فرجک" کہنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ ہماری مدد فرمائیں کہ اس قابل ہو جائیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ دُعا کرتے کرتے عرصہ ہو گیا، اور ابھی یہ دُعا قبول نہیں ہوئی۔

یہ سطور میں اس مہینہ میں لکھ رہا ہوں کہ جس مہینہ میں دُنیا کو آپ کی پیدائش سے فیض پہنچا تھا۔ مومنین نے سینکڑوں رقعے حضور کی طرف دریا میں ڈال کر بھیجے اور منکرین نے اعتراض کیا کہ کہیں پانی کے رقعے بھی پہنچے ہیں۔ وُہ یہ نہیں جانتے کہ تحریر تو طرزِ عرض ہے اور رقعہ کو پانی کے حوالہ کرنا اظہارِ نیت ویقین۔ اور جب اس عرض کو نیت ویقین کے بال و پر لگ جاتے ہیں، تو اس کو بہت سے خضرِ راہ مل جاتے ہیں جو اُسے حضور تک پہنچا دیتے ہیں۔

Marfat.com

اگرچہ میں گنہگار ہوں لیکن باوجود گناہوں کے آپ کے فیض و کرم کا اُمیدوار بھی ہوں اگر میری اس اُمید و یقین کی سادگی کو گناہوں کی شدت و کثرت کے مقابلہ میں ترازو میں رکھا جائے، تو پھر آپ ہی فیصلہ کر سکیں گے کہ گناہ مستوجب سزا ہے یا یہ سادگی قابل آفریں ہوئی۔ یہ وہ سادگی ہے جس کے ایک ہاتھ میں آپ کے عفو کا دامن ہے، اور دوسرے ہاتھ میں کشکولِ گدائی۔ اور نظر آپ کے چہرے پر ہے کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ کیا ایسے گدا کو آپ اپنے دروازے سے محروم واپس کر دیں گے! نہیں، نہیں، ہرگز نہیں واپس کریں گے۔ آپ کے جدامجد کے دروازے سے تو کبھی کوئی سائل محروم نہیں گیا۔ اور بغیر اُس کے جرموں کی فہرست پر نظر ڈالے ہوئے اُسے اتنا دیا کہ پھر اُسے کسی اور در دروازے پر جانے کی ضرورت نہ رہی۔

اس اُمید کو لے کر آپ کی بارگاہ پر حاضر ہوا ہوں، کہ میرے گناہوں کو نظر انداز کر کے میرا یہ حقیر نذرانہ قبول فرمایا جائے گا۔ نذرانہ بھی کیا ہے؟ چند اوراقِ پریشاں۔ جن میں جہالت کے قلم سے آنسوؤں کی سیاہی کے ساتھ اُس نالۂ دل کو قید کرنے کی کوشش کی ہے جو گناہوں کے بوجھ سے پہلے ہی دبا ہوا تھا۔ شاید اُس کو قید میں دیکھ کر کسی کو رحم آجائے۔ طائرِ نالاں قفس میں بند ہو کر زیادہ قابل توجہ ہو جاتا ہے۔

روزِ محشر کہ جب کوئی تو اپنے گناہوں سے نادم ہوگا، اور کوئی اپنے اعمال پر فخر کرتا ہوا آئے گا۔ میں ہوں گا، تو خالی ہاتھ اور گناہوں سے آلودہ۔ لیکن انشاءاللہ اس طرح آؤں گا کہ ع

من و دست و دامانِ آلِ رسولؐ

ناظرین اس وقت آمین کہہ دیں، تو میرا دل بڑھ جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف کتاب ہذا

الحمد للہ الواحد الفرد الوتر الصمد و لم یکن لہ کفوا احد الذی لم یتخذ صاحبۃ ولا ولدا و لم یکن لہ شریک فی الملک و لم یکن ولی من الذل فکبرہ تکبیرا۔ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وآلہ الطیبین الطاہرین

Marfat.com

زمانۂ حال کی کتابوں کی کثرت و فہم کی قلت ہر مصنف کو مجبور کرتی ہے کہ وُہ بتائے کہ جو کتاب وُہ پیش کر رہا ہے اس کی غرض وغایت کیا ہے، اور وُہ کس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آجکل دُنیا پر مغربی تہذیب نے اپنا مکمل قبضہ کر لیا ہے۔ اور چونکہ اس کی پُشت پر سیاسی طاقت بھی ہے، اور اس نے مادی ترقی بھی کافی کر لی ہے لہٰذا دُنیا کی اکثریت کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس تہذیب میں ضرور احقیت ہے، جب ہی تو یہ ترقی کر رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں چند خصائل ایسے ہیں جو واقعی اچھے ہیں۔ مثلاً (۱) کام کرنے میں (۲) ہمت وطاقت، (۳) علم کی جستجو (۴) آپس کے معاملات میں ایمان داری۔ ان اُمور کو اور ظاہری سیاسی طاقت کو دیکھ کر چند مسلم محققین خصوصاً مصری عالم علی عبدالرزاق اور طٰہٰ حسین کی رائے یہ ہے کہ بغیر مغربی تہذیب کی مکمل اور خالص پیروی کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ بغیر دل میں کوئی شک لائے ہوئے مغربی تہذیب کو الف سے یؔ تک اپنا بنا لیں۔ اس راستہ میں پہلا قدم یہ ہو کہ حکومت کو مذہب سے بالکل علیحدہ کر لیں۔ دیکھو علی عبدالرزاق کی کتاب "الاسلام والاِمارة العربیہ" اور طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافت فی مصر"۔ یہ ایک ایسا انقلابی نظریہ ہے کہ جس کی روک تھام ضروری ہے۔

پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا جس راستہ پر مغربی تہذیب جا رہی ہے وہ ترقی کا راستہ ہے یا اس کے برعکس ہے۔ یہ امر واقعہ بہت بدیہی ہے۔ اس کے لیئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے کہ مغربی تہذیب دُنیا کو ایک مہیب غار آتشین کے کنارے پر لے آئی ہے جس کے اندر وُہ اب گرنے کو ہو رہی ہے۔ مغرب والے سب ہم مذہب ہیں۔ ایک ہی اُن کی تہذیب ہے۔ آپس میں صلح وآشتی سے رہنے کے ہزاروں جتن کر لیے، لیکن جو قدم اُٹھتا ہے وُہ اُن کو مزید عناد و نفاق و جنگ کی طرف لے جاتا ہے۔ خود یورپ کے محققین کی رائے ہی کہ اگر یہ ہی حالت رہی تو دُنیا کی بربادی یقینی ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ عقل انسانی کے سارے حیلے ختم ہو گئے۔ اور اب بنی نوع انسان کے نیست و نابود ہونے کا زمانہ آگیا[1]۔ مغربی تہذیب

ط (1) H.G. Wells : Mind at the end of its Tether

اس کتاب کے متعلق علماء کی یہ رائے ہے:-

"Mr. Wells had not heard of the atomic bomb

Marfat.com

کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ جو کچھ ہے عقل انسانی ہے۔ نہ خدا ہے اور نہ عاقبت۔ یہ کلیہ اُنہوں نے یونان کے فلسفۂ قدیم سے لیا ہے جس کا مقولہ یہ ہے کہ:

Man is the measure of all things।

یعنی صرف انسان ہی تمام اشیاء کائنات کی اصلیت اور حقیقت کا معیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو انسان سچ کہہ دے وُہ سچ، اور جس کو انسان غلط کہہ دے وُہ غلط۔ لیکن اس نظریہ اور اس تہذیب کا نتیجہ بربادی ثابت ہے۔ اور جس کا نتیجہ بُرا ہو وہ نظریہ یا وُہ خیال کبھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ صحیح نتیجہ نکلا کہ مغربی تہذیب غلط ہے۔ اور بربادی پر منتج ہو رہی ہے۔ ایٹم بم یا ہوائی جہاز ترقی کے نشان نہیں ہیں بلکہ بربادی کی علامتیں ہیں۔ مغربی تہذیب کی جو خوبیاں ہم نے اُوپر بتائی ہیں اگر وُہ مغربی تہذیب میں اور محض مغرب ہی میں پائی جائیں اور کسی اور ضابطۂ زندگی میں نہ ملیں، تو پھر مغربی تہذیب کی تقلید جائز ہو سکتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں وہ اُصول بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ تو پھر اس زہریلے درخت کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کسی ثقافت یا تہذیب یا Culture کی ایک یا چند اُمور کی تقلید کریں، اور اُن اُمور کو اس تہذیب یا ثقافت کے اجزاء تصور کر کے تقلید کریں، تو پھر رفتہ رفتہ ساری ہی تہذیب کی تقلید کرنے

بقیہ صفحہ ۱۰:

When he wrote this book. Nevertheless, he makes no secret of his conviction that man soon would arm himself with the means of complete self destruction, This is a prophecy in this book which recent events have brought alarmingly nearer.

اس ہی مصنف کی مندرجہ ذیل کتاب بھی اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہے:

The Outlook for Homo Sapions

ترجمہ: اس کتاب کے مصنف مسٹر ویلز کو ایٹم بم کی اطلاع نہیں تھی جب اس نے یہ کتاب لکھی لیکن پھر بھی وہ اپنے اس یقین کو برملا ظاہر کرتا ہے کہ بہت جلد انسان اپنی ہی بربادی کے ہتھیار خود تیار کرے گا اس کتاب میں جو پیشین گوئی ہے، اس کو زمانۂ حال کے واقعات نہایت خطرناک صورت میں نزدیک تر لے آئے ہیں۔

Marfat.com

کرنے لگتے ہیں لہٰذا ہم کو اُن امور کا تتبع ان کو مغربی تہذیب کے ارکان سمجھ کر نہ کرنا چاہیئے، بلکہ اسلام کے امور د ارکان سمجھ کر اُن کی پیروی کرنی چاہیئے ۔ جناب امیر علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ "جب تم دُنیا کا کام کرو تو اس انہماک سے کرو، کہ گویا تم کبھی نہیں مرو گے ۔ اور جب تم عبادت کرو تو اس خیال کے ساتھ کرو، کہ گویا آنے والے لمحہ ہی میں تم مرجاؤ گے"۔ اس سے زیادہ زور دار الفاظ میں کام اور جستجو کی ہدایت نہیں ہو سکتی ۔ جناب رسولؐ خدا فرماتے ہیں کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین ۔ آپس کے معاملات کے طریقے اور ان کی دیانتداری جو اسلام نے بتائے ہیں، اس سے بہتر کسی فلسفہ یا مذہب میں نہیں ملتے ۔ ان کو تفصیل سے اس کتاب کے دُوسرے حصّہ میں ہم انشاء اللہ بیان کریں گے ۔

اس کتاب کی تحریر کا مقصد اس ہی خطرۂ عظیم کا روکنا ہے ۔ اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ مغربی تہذیب میں جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں، وُہ سب "فلسفۂ اسلام" میں ملیں گی ۔ اور اس کی بُرائیاں جو اس کی اچھائیوں سے کہیں زیادہ ہیں، اسلام کی تہذیب میں نہیں پائی جاتیں ۔ غرضکہ فلسفۂ مغربی کا مقابلہ فلسفۂ اسلام سے کرکے اسلام کی خوبیوں کو ظاہر کیا گیا ہے ۔ مغربی تہذیب کے ابلیسی فلسفہ کے عیوب کو نمایاں کرنا، اور اسلام کے دین کی خوبیاں بیان کرنا اس کتاب کا مقصد ہے ۔

لیکن اس امرِ واقعہ سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بہت عرصہ سے مسلمان اخلاقی اور اقتصادی مذلت میں گرفتار ہیں ۔ اگر نتیجہ سے فلسفہ کی صحت کا پتہ چلتا ہے، تو مخالفین اعتراض کر سکتے ہیں کہ فلسفۂ اسلام بھی صحیح نہ ہوُا ۔ ان کی یہ بحث صحیح ہوتی، اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ مسلمان صحیح فلسفۂ اسلام پر عمل کر رہے ہیں ۔ ہمارا دعوٰی ہے کہ بہت عرصہ سے مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد کا مذہب اسلام نہیں رہا ۔ یا یُوں کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اصولِ اسلام پر عمل کرنا ترک کر دیا ہے ۔

مغربی تہذیب کی تقلید کی حماقت اس کے آخری درجہ پر پہنچ چکی ہے ۔ مثلاً عورتوں میں بے پردگی معیارِ ترقی سمجھا گیا ہے، اور اس میں درجے ہیں ۔ سب سے نیچا درجہ یہ ہے کہ عورت مردوں کے مجمع میں بے حجابانہ داخل ہو، اور خاوند سے دُور غیر مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں حصّہ لے، اور خاوند اس کو دیکھ کر دل ہی دل میں دُور بیٹھا ہوُا خوش ہوتا رہے ۔ اس سے اُوپر کا درجہ یہ ہے کہ عورت مردوں کو اپنا گانا سُنائے ۔ اور

Marfat.com

سب سے زیادہ Advanced وُہ ہے جو غیر مردوں کے ساتھ ناچے۔ اسی طرح مردوں کے بھی ترقی کے درجات ہیں۔ سب سے نیچا درجہ تو یہ ہے کہ گلے میں ایک دھجی، صلیب کے طرز پر باندھ لی، اور وُہ ہوا میں اُڑتی ہے۔ دُوسرا درجہ یہ ہے کہ جس طریقے سے انگریزوں کو سگرٹ پیتے دیکھا تھا اور باتیں کرتے سُنا تھا، اسی طرح سے یہ بھی کریں۔ شراب پینا تیسرا درجہ ہُوا۔ مردوں میں بہت زیادہ درجے ہیں، اور سب حماقت پر مبنی۔ یہاں تک بھی خیریت ہوتی، لیکن وُہ ہی اصول کارفرما ہُوا کہ اگر چند باتوں میں تقلید کرو گے، تو پھر ساری تہذیب ہی کی تقلید کرنے لگو گے۔ مغربی تہذیب کا رُکنِ اعظم دہریت ہے اور اب مسلمان اس کو محض فیشن سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت محسُوس ہوئی کہ ان کی توجہ دہریت کی حماقت کی طرف منعطف کرائی جائے۔ اور یہ کتاب زیادہ تر اُن ہی لوگوں کے لیئے لکھی گئی ہے۔ مومن کے لیئے کسی چون و چرا کی ضرورت نہیں۔ اور اس کے لیئے حقائقِ اسلام محتاجِ ابحاث و اثبات نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے، کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مومن کا ایمان راسخ تر ہو جائے گا، اور اس کو قرآن شریف کے مطالعہ میں خاص لطف آنے لگے گا۔ اس کتاب کا بہت بڑا جزو تعلیم آئمہ علیہم السلام پر مشتمل ہے۔

یہ سوال بھی دلچسپ ہے کہ آیا انسان نے بذریعہ ارتقاء مچھلی یا بندر سے گزرتے ہوئے یہ شکل پائی ہے، یا شروع ہی سے اس ہی شکل میں زمین پر ڈالا گیا تھا۔ مذہب پر بھی کیا اصولِ ارتقاء حاوی ہیں؟ اور دماغِ انسانی بتدریج بُت پرستی اور جانور پرستی سے گذر کر توحید پر پہنچا ہے۔ یا اس کو یہ تعلیم شروع ہی سے دی گئی ہے؟ ان سوالات پر بھی اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

دُنیا میں ہر ایک عصر کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ اور عصرِ رواں کی خصوصیت لادینی، اور خداوند تعالےٰ سے اعراض ہے۔ لوگوں نے خداوند تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو فراموش کر دیا ہے، اور اپنے رسُولؐ اور ان کے خاندان کے آئمہ علیہم السلام سے روگردانی اختیار کر لی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان بھُولے ہوئے سبقوں کو پھر یاد دلایا جائے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نوائے بے ہنگام ہے۔ وُہ وقت نہیں رہا۔ وُہ لوگ نہیں رہے کہ جب اس طرف لوگوں کی توجہ تھی۔ اور ان باتوں کو کان لگا کر سُنتے تھے

Marfat.com

وُہ گُل نہ رہا۔ گلستان نہ رہا۔ بُلبل کے نغمے نہ رہے، سُننے والے نہ رہے ؎

چونکہ گل رفت و گلستاں در گزشت
نشنوی زیں پس ز بُلبل سرگزشت

بہرصورت بے وقت کی راگنی تو یہ ہے، لیکن ضروری تھی۔ اپنی طرف سے تو میں نے بڑی کوشش کی ہے، اور شاعرانہ مبالغہ کے لہجہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ؎

شمعِ محفل خفتہ بود و شوقِ صحبت رفتہ بود
آتش انگندم بمجلس بال بر مجمر زدم

ہم نے اس کتاب میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحیں بعض بعض جگہ انگریزی ہی میں لکھ دیئے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ ان الفاظ کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اردُو میں انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہو سکتا، اور وُہ الفاظ آجکل کے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے، کہ اس میں فلسفہ اور تصوّف کی اُن اصطلاحات سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی خار دار جھاڑیوں میں ذہنِ انسانی اُلجھ کر آگے بڑھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ عام فہم اُردو میں اُن کو سمجھایا گیا ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر اُن لوگوں کے لیئے بھی لکھی گئی ہے، جو اپنے دیگر مشاغل کے باعث فلسفہ اور تصوّف کو اپنا خاص مضمون نہیں بنا سکے۔ لیکن اُن کی طبیعت اور ذہن کی فطری رغبت اور رفعت اس امر کی مقتضی ہے کہ وُہ اپنے ماحول کو سمجھیں، اور غور کریں کہ ہم کیوں پیدا کیئے گئے ہیں، اور ہمارا آخری انجام کیا ہوگا! ــــ

اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ "اس کتاب کا مقصد ایک تو دہریت کے اثر کو محو کرنا ہے، اور دُوسرے تعلیمِ آئمہ علیہم السّلام کی نشر و اشاعت۔

اگر اس کتاب کے مطالعہ سے قوم کے چند افراد میں ہی صحیح غور و فکر کی عادت و اہلیت پیدا ہو گئی، تو میں سمجھوں گا کہ اس کتاب کا مقصدِ تحریر پُورا ہو گیا!

وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم

سرتاج حسین

66154

آہ! آہ! از غفلتِ مردم آہ!

اس غفلت کا کچھ ٹھکانہ ہے۔ انسان اس چیز کو بھولا ہوا ہے، جو اس کو خاک میں ملا کر کیڑوں کی خوراک بنا دے گی۔ اور اس کے حصول کے پیچھے اپنی عمرِ عزیز کو کھو رہا ہے جس نے کبھی کسی سے وفا نہ کی۔ اوّل تو اس کا ملنا ہی دُشوار ہے، اگر مل بھی گئی تو کے دن کے لیے؟ کیا موت بھلا دینے والی شے ہے جس کا آنا یقیناً معلوم ہے۔ لیکن جس کے آنے کا وقت نامعلوم۔ دُنیا کی زینت جو پھرتی چھاؤں ہے، اس قابل نہیں کہ اس کے لیے انسان اپنی عاقبت سے بے خبر ہو جائے۔ کیا یہ کل کی بات نہیں کہ ہمارے والدین جو ہم پر جان چھڑکتے تھے۔ اگر ہمارے بدن پر مکھی بیٹھ جاتی تھی تو بے تاب ہو جاتے تھے۔ آج ہماری آنکھیں اُن کو ڈھونڈتی ہیں، اور وُہ چہرے نظر نہیں آتے جن سے محبت ٹپکتی تھی۔ ہمیں برچھیاں لگ رہی ہیں، اور کوئی ہمارا دردِ دل سننے والا نہیں۔ ہمارے دوست و اقارب جو کل تک ہم سے باتیں کر رہے تھے آج ہماری نظروں میں پھرتے ہیں؎ لیکن ہماری آنکھوں سے غائب ہیں۔ جو گیا، دل میں حسرت ہی لے کر گیا۔ ذرا تاریخ کی ورق گردانی تو کرو، کتنے بڑے بڑے عظیم الشان بادشاہ ہوئے ہیں۔ کیا کیا طوفان اُٹھائے ہیں۔ دُنیا کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ لیکن انجام یہ کہ خاک!۔۔۔ وُہ شان و شوکت کیا ہوئی۔ رُعبِ شاہی کہاں گیا۔ اب تو اُن کی لاش پر زمین کے کیڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں پہلے کھاؤں، دُوسرا کہتا ہے کہ میں پہلے کھاؤں۔ شاعر نے سچ کہا ہے ؎

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

دُوسرا کہتا ہے ؎

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند نے نادری

ایسے ہی کہنے والے بہت کہہ گئے۔ لیکن شیطان نے کچھ ایسا سحر انسان کے کانوں میں پھونکا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتا ہے، اور پھر کچھ نہیں دیکھتا۔ کبھی قبرستان میں جا کر تو دیکھو

Marfat.com

سب سے بڑا مدرسۂ عبرت تو وُہ ہی ہے۔ اُجڑی ہوئی بستیوں پر نظر ڈالو۔ بابل، نینوا، قرطبہ کا تھیج وغیرہ۔ ان شہروں کی گذشتہ رونق اور موجودہ بربادی پر خیال دوڑاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں پہلے کوئی آبادی نہ تھا۔ کان لم یغنوا فیھا۔ یہ وُہ ہی انسان تو ہے جس کو خلیفۂ خدا کہا گیا ہے۔ ایسی غفلت اور ایسی جہالت ایسی عظیم الشان ہستی کے شایان نہیں۔ سوچنا چاہیئے کہ ہمارا مقصدِ حیات کیا ہے!۔ وُہ مقصدِ حیات اس دُنیا کا عروج تو ہو نہیں سکتا۔ بقولِ شیخ سعدیؒ ع

آنچہ پایندگی ندارد دل بستگی را نشاید

صحیح مقصدِ حیات نہ تو فلسفہ میں مل سکتا ہے، اور نہ دھریت میں۔ کیونکہ وُہ دونوں اس دُنیا میں محدُود ہیں۔ اور مقصدِ حیاتِ انسانی دُنیا کی آلائش سے بالاتر ہے۔ وُہ مقصد تو مذہب ہی میں مل سکتا ہے۔ ہم نے تمام دُنیا کے فلسفے اور تمام دُنیا کے مذاہب آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ ان میں سے جس کی طرف آپ کی عقلِ سلیم دلالت کرے، اُدھر چلے جاؤ۔ ہمیں یقین ہے کہ انسان کی عقلِ سلیم سوائے اسلام کے اور کسی طرف دلالت نہیں کر سکتی۔ اسلام میں بھی بہت سے فرقے ہیں، اور ہر ایک میں آئمہ اور رہبر بیان کیئے جاتے ہیں۔ پھر عقلِ سلیم کو کام میں لاؤ، اہل بیتِ رسولؐ سے بہتر اور حقیقی آئمہ کہیں نہ پاؤ گے۔ آئمۂ حق اور آئمۂ ناحق کی شناخت بھی قرآن نے بتادی ہے، اور صبر کو معیار قرار دیا ہے۔ اس معیار پر سوائے آئمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کے اور کوئی پُورا نہ اُترے گا۔ سب سے زیادہ مصائب ان پر پڑے سب سے زیادہ ثابت قدم یہ ہی رہے۔ ان کے سوا کسی اور کی تعلیم راہِ ھدایت نہیں دکھا سکتی۔ لیس للانسان الا ما سعی۔ ہدایت تلاش کرنے کی سعی کرو۔ خدا بھی اس کی ہی ہدایت کرتا ہے جو ہدایت کا متلاشی ہوتا ہے۔ جس کو ہدایت کی پرواہ ہی نہیں بلکہ اُس کی مخالفت ہے، وُہ تو صم بکم عمی فھم لا یعقلون کے ذمرہ میں آتا ہے۔ اور اس کی ہدایت خدا نہیں کرتا۔ اگر ورثہ میں پائے ہوئے تخیلات کو نظر انداز کر کے دیکھو گے، تو خاندانِ رسولؐ کے علاوہ اور کہیں ہدایت نہ پاؤ گے۔ ہم نے اس کتاب میں اُن کی تعلیم پر اپنے بیان کو مبنی کیا ھے۔ دیکھو! زندگی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اگر ہزاروں نعمتیں بھی تم کو حاصل ہیں تو نتیجہ یہ ہی ہو گا کہ ایک دن یا وُہ نعمتیں نہیں رہیں گی، یا تم نہیں رہو گے۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ بسترِ مرگ پر پشیمانی ہو۔ وُہ پشیمانی بعد از وقت کی کچھ کام نہیں آئے گی۔

نکات برائے غور

شوخیٔ باطل نگر! اندر کمین حق نشست
شپر از کوریٔ شبیخونے زند بر آفتاب

فلسفہ کا دار و مدار خود اپنے غور و فکر پر ہے۔ اور غور و فکر کا دار و مدار عقلِ سلیم پر ہے۔ اور عقلِ سلیم ہر انسان کے اندر ہے، اگر اس پر خود غرضی و عصبیت کا غلاف نہ چڑھ جائے۔ سقراط کا طریقۂ تعلیم اسی اصول پر مبنی تھا۔ متواتر سوال و جواب سے مخاطب کو خود غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور پھر آخرکار اس کے منہ سے وہ ہی بات نکلوا لیتا تھا، جو وہ تعلیم کرنا چاہتا تھا۔ ہم اپنے ناظرین کے غور و فکر کے لیئے مندرجہ ذیل نکات پیش کرتے ہیں اگر ان پر عقلِ سلیم کے ساتھ غور کیا، تو خود بخود راہِ مستقیم نظر آنے لگے گی اس کے بعد اس کتاب کا مطالعہ ان کے لیئے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

۱۔ ہستیٔ خداوند تعالےٰ۔

اپنے چاروں طرف نظر ڈالیئے۔ نظامِ عالم پر غور کرنے سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس نظام کا کوئی مدبر ہے یا نہیں؟

جس نظام کا کوئی مدبر نہ ہو وہ کبھی ایک راستہ پر نہیں چلے گا۔ لیکن اس نظام کے متعلق تو یہ ہے کہ لن تجد لسنة الله تبديلا۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو اس نظام کی کوئی کل تو بدل کر دکھاؤ؛ سورج مشرق سے نکلتا ہے کبھی اس کو مغرب کی طرف سے بھی نکلتا ہوا دیکھا ہے؟

۲۔ توحید۔

توحیدِ مطلق کے یہ معنی ہیں کہ صفات میں بھی خداوند تعالےٰ کا شریک کسی کو نہ سمجھے۔ انسان کو بھی غصہ آتا ہے، خوش ہوتا ہے، ناخوش ہوتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، کسی کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔ اس نے جو اپنی زبان اور اس کے حروف و جملے بنائے ہیں محض اپنی ضرورت

کے لیئے۔ جب خداوند تعالیٰ کے لیئے خوشی، ناراضی، محبت، عداوت وغیرہ کی شانوں کو بیان کرتا ہے، تو اس کو یہ ہی الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ انسان کی زبان محدود ہے، خداوند تعالےٰ کی شان وصفت لامحدود ہے۔ قرآن شریف انسان کی زبان میں ہے۔ ہم خداوند تعالیٰ کی صفات میں شریک نہیں ہیں۔ لہٰذا اُس کی صفات ہماری محدود زبان ادا نہیں کر سکتی۔ ہمارے رنج، خوشی نفرت ومحبت کا Physical Basis ہے۔ یعنی ان کا ہمارے دماغ سے تعلق ہے جو جسمانی ہے۔ خداوند تعالیٰ کا کوئی جسم نہیں ہے۔ لہٰذا یہ صفات اس میں اس طرح کے نہیں ہو سکتے جس طرح ہماری صفات ہیں۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہر ایک فلاسفر نے جب خدا کا تخیل کیا، تو جسم کے ساتھ کیا۔ موجودہ بائیبل لکھنے والے بھی اس نکتہ کو نہ پا سکے۔ انہوں نے بھی خدا کا تخیل جسم کے ساتھ کیا۔ اور وہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ، پاؤں، جسم ہے، قیامت میں خدا نظر آئے گا۔ جہنم کی آگ اس وقت ہی فرو ہوگی جب وُہ اپنی ساق اس میں ڈال دے گا، وہ بھی اِس نکتہ کو نہیں سمجھے۔ اور قرآن شریف میں جو یہ صفات بوجہ محدودیت زبان ان ہی الفاظ سے ظاہر کی گئی ہیں، ان کی وجہ سے ان کو یہ دھوکہ ہو گیا۔

۳۔ حیات بعد مماۃ۔ عاقبت۔

(الف) کیا انسان کی اس دنیا کی زندگی کامل ہے؟ کامل اُس وقت کہی جائے گی کہ جب انسان کی ساری قوتیں اور جائز خواہشات اس کی زندگی میں بار آور ہو سکیں۔

(ب) دُنیا میں موت اور ظلم کی موجودگی کیا ظاہر کرتی ہے؟ مُوت اور ظلم سے جو انسان کو رنج پہنچتا ہے، کیا اس کا مداوا اور اس کا بدلہ انسان کو اس دُنیا کی زندگی میں مل جاتا ہے؟ یا مل سکتا ہے؟

۴۔ نبوت۔

اگر خدا ہے اور عاقبت معہ اپنی سزا و جزا، حساب وکتاب کے ہے تو عدل ضروری ہے اور اگر عدل ہے، تو دُنیا کے طوفان و تلاطم انگیز امواج کو جن کو جوبانی ہوا اُٹھا رہی ہے، اور انسان کی کمزوری کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس کو خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا اور علم کافی دیا ہوا انسان اس کی ہدایت کے لیئے نہ آئے، تو پھر حیاۃ بعد مماۃ اور عاقبت و سزا و جزا و حساب و میزان سب بے معنی اور غیر ضروری ہیں۔ اور اگر نہیں تو

Marfat.com

منافی عدل ہیں۔ ایسا شخص جو خدا کا پیغام لے کر آئے گا، وہی پیغمبر اور نبی ہے۔ اگر دُنیا میں محض فلسفہ ہوتا اور نبوت نہ ہوتی، تو چاروں طرف فتنہ و فساد ہی ہوتا۔ اوّل تو عوام الناس فلسفی عقل نہیں رکھتے اور جن معدودے چند افراد کے پاس یہ ہے بھی، تو آج تک تو وُہ سب کسی ایک نظریہ پر متفق نہیں ہوئے اور محض عقل انسان کے تمام افعال کی محرک نہیں ہوتی۔ ان کی عقل تو یہاں تک پہنچی ہے کہ

Good and Evil are nothing but pleasure and pain, or that which occasion or procure pleasure or pain to us. Locke : Essay, Book II, Chap. XXVIII. See also Rashdall : The Theory of Good and Evil, Vol. I, Chap. ii

ترجمہ:- خیر و شر کچھ نہیں سوائے راحت و رنج کے یا اُن اسباب کے جن سے راحت و تکلیف پہنچتے ہیں۔

معاملہ ختم ہوا۔ خود غرضی کو عام اجازت مل گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حکماء کی ایک جماعت نے اس نظریہ کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس نظریہ کے رکھنے والے بھی Locke Hobbes اور Bentham جیسے جلیل القدر حکماء ہیں۔ اس اختلاف سے بھی ہمارا مدعا ثابت ہوگیا یہ اختلاف ہی عوام الناس کے فتنہ و فساد کا باعث اور دلیلِ راہ بن جائے گا۔

۵۔ امامت۔

جب دُنیا کو ہر پہلو سے اور اس کی ہر تہذیب کے زمانے میں ڈرایا جاچکا تو نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن ہدایت بذریعہ عمل کا سبق ان نظریات کے مطابق جو دُنیا قائم کرتی گئی ضروری تھا۔ اندریں صورت امامت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۶۔ آئمۃ الصدق و اولیاء الحق۔

دُنیا کچھ اس نہج پر بنائی گئی ہے، کہ یہاں صدق و کذب ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آدمؑ کے ساتھ شیطان، ہابیل کے ساتھ قابیل، موسٰیؑ کے ساتھ فرعون، محمدؐ کے ساتھ ابوسفیان اور حسینؑ کے ساتھ یزید۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ ان دونوں کو

Marfat.com

علیحدہ کر کے رکھے۔ ایک کی پیروی اور دوسرے سے بیزاری اس کا فرض اولین ہے ان دونوں کی شناخت کے لیے خداوند تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم سے مسلح کر دیا۔ اور پھر فرمایا کہ تواصوابالحق وتواصوبالصبر اور فرمایا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ مندرجہ ذیل آیات میں خداوند تعالیٰ نے آئمہ حق و آئمہ تلبیس کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی ہے:۔

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِۙ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍۚ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِؕ وَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۝ اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَاؕ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۝ (الرعد ۱۳- ۲۲ تا ۲۶)

ترجمہ:۔ اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبر کیا اور نماز پڑھی اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا تھا اُس میں سے چھپا کر اور ظاہر طور پر راہ خدا میں خرچ کیا اور بدی کا بدلہ نیکی سے کرتے رہے۔ عاقبت کا گھر اُن کے لیے ہے (یعنی) ہمیشہ کے باغات جن میں خود وہ بھی ہمیشہ رہیں گے اور ان کے آباؤ اجداد میں سے، اور ازواج میں سے، اور اُن کی اولاد میں سے بھی جو جو اس قابل ہوں گے۔ اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان کے پاس آیا کریں گے (اور یہ کہا کریں گے کہ) یہ عوض ہے تمہارے صبر کرنے کا۔ تم پر سلامتی ہو دیکھو (تمہارا) انجام کیسا اچھا ہوا۔ اور جو عہد خدا کو بعد اس کے پختہ ہو جانے کے توڑ ڈالتے ہیں اور جن (تعلقات باہمی) کے قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا، انہیں قطع کرتے ہیں، اور روئے زمین پر فساد پھیلاتے پھرتے ہیں، ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیئے لعنت ہے اور ایسے ہی لوگوں کے واسطے برا گھر (جہنم) ہے۔ اور خدا ہی جس کے لیئے چاہتا ہے روزی کو بڑھا دیتا ہے اور (جس کے لیئے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ اور یہ لوگ دُنیا کی (چند روزہ) زندگی پر بہت نہال ہیں۔ حالانکہ دُنیاوی زندگی (نعیم) آخرت کے مقابلہ

Marfat.com

میں بالکل بے حقیقت چیز ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اب ناظرین خود غور و خوض کرکے معلوم کرلیں گے کہ آئمہ حق کون ہو سکتے ہیں، اور اولیأ الشیطان کون ہیں۔ صبر ہی بہت بڑا معیارِ حقیقت ہے۔ صبر سختی و بلا میں ہوتا ہے۔ مسندِ حکومت پر بیٹھ کر اپنے دشمنوں کو قتل کرکے خوشی حاصل کرنی اور بات ہے، اور تلوار کے نیچے قید خانہ کی تاریکی، اور طوق و رسن کی کشائش میں جانشینِ رسول کے فرائض ادا کرنا اور شئے ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا ہے ؎

رہ و رسم فرماں روایان شناسم

خراں بر سرِ بام و یوسفؑ بچاہے

جناب رسولِ خدا فرمایا کرتے تھے کہ "اشد الناس بلاءً الانبیاء" یعنی تمام انسانوں میں سب سے زیادہ شدت و مصائب و آلام سے انبیاء کا امتحان کیا جاتا ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد حنبل، سنن ابن ماجہ، ترمذی، مسند طیالسی، طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ نتیجہ صاف ہے۔ انبیاء کے جانشین اوصیاً پر بھی انبیاء کے بعد سب سے زیادہ سختیاں اور مصائب نازل ہوں گے، اور وہ صبر کریں گے یہی اُن کی شناخت ہے۔

باب اوّل

مغربی تہذیب، اس کے چند تصوّرات و اثرات

زمانۂ حال کی مغربی تہذیب و تعلیم جو مذہبیت اور رُوحانیت سے بالکل معرا ہے، تمام دُنیا پر چھا گئی ہے۔ اور ایشیا و افریقہ کی تمام کمزور قومیں اس کی محتاج ہیں۔ اور کسی نہ کسی طرز میں مغربی طاقتور اقوام کے سامنے دستِ سوال دراز کیے ہوئے ہیں۔ اور روس و یورپ کی رقابت کی وجہ سے یہ سوال احتیاج کچھ نہ کچھ مقرون باجابت بھی ہو رہا ہے۔ دراصل مغربی تہذیب کی ہمہ گیری کی وجہ اس کے تصوّرات و نظریات

Marfat.com

کی صداقت و حقانیت نہیں ہے۔ بلکہ ایشیا اور افریقہ کی یہ مرعوبیت اور احتیاج اس کی تہہ میں ہے۔ بظاہر دنیا دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو روس اور اُس کی چھوٹی چھوٹی مددگار قومیں، اور دُوسری طرف مغرب کی چار بڑی قومیں۔ جن میں سے ایک امریکہ ہے، اور اُن کے معاونین۔ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ ہماری Ideology میں فرق ہے۔ اپنے اصلی مقصد کو چھپانے کے لیئے یہ ایک جدید لفظ تراشا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم آزادی کے شیدا ہیں، اور جو حصّہ دنیا ہمارے قبضہ میں ہے وُہ آزاد دُنیا کہے جانے کے قابل ہے اور ہمارے مخالفین استبدادیت پسند ڈکٹیٹر ہیں۔ یہ سب سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ ورنہ کل کی بات ہے کہ یہ سب شیر وشکر تھے۔ اُس وقت تو محض ہٹلر ڈکٹیٹر تھا۔ اور باقی سب آزاد دُنیا تھی۔ اب دوسرا پاسا پلٹ گیا۔ لیکن دراصل یہ دونوں بلاک ماہیئت میں ایک ہی ہیں، اور ایک بنیاد یعنی اقتصادیت پر قائم ہیں۔ روس کا کمیونزم بھی یورپ ہی کے اقتصادیت کی ایک شاخ ہے۔ اور اُس کی جڑ یورپ ہی میں ہے۔ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی دُنیا پر قبضہ کرنا۔ یورپ نے اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ عام دُنیا کی دولت سمیٹ کر اپنے گھر میں لے آئے اور پھر ایک طرزِ حکومت ایجاد کیا جو دراصل امراء کی حکومت ہی۔ یعنی Aristocracy بغیر لوگوں کے تو حکومت نہیں ہوسکتی لہٰذا لوگوں کو اپنی طرف کرنے کے لیئے اُنہوں نے اس کا نام جمہوریت یعنی Democracy رکھ لیا۔ اور کہا کہ یہ عوام الناس کی حکومت ہے۔ اور اصُول مساوات پر قائم ہے۔ روس نے بھی ماضی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حکومت بغیر عوام الناس کی مرضی کے محض تلوار سے قائم نہیں رہ سکتی۔ اور عوام الناس کو بغیر مساوات کے جال کے اور کسی طرح نہیں پکڑا جاسکتا۔ اُن کو یہ جال اقتصادیت میں ملا۔ اُنہوں نے سوچا کہ یہ مساوات ہم پیٹ کی طرف سے شروع کریں جس کے سب محتاج ہیں۔ مغرب نے حکومتی مساوات کا جال بچھایا۔ اور کہا کہ حکومت میں سب مساوی ہیں۔ سب کو حصّہ ملنا چاہیئے۔ حکومت تو ہم ہی چند آدمی کریں گے، لیکن تم ہم کو اپنا نمائندہ بنا دو یا تصوّر کر لو۔ بس حکومت تمہاری ہو گئی۔ روس نے یہ نظریہ مشتہر کیا کہ سب لوگ حصولِ رزق و راحت میں مساوی ہیں۔ بظاہر یہ طریقہ زیادہ مؤثر تھا۔ اور ہم یہ کہتے ہیں

کہ مساوات نہ حکومت میں ہوئی اور نہ دولت میں۔ حکومت وہی کریں گے جو کر رہے ہیں اور عیش و راحت وہی کریں گے جن کے پاس دولت ہے۔ افلاس اور دولت میں ابتدائی عالم سے کش مکش چلی آرہی ہے۔ لاکھوں تدبیریں سوچیں۔ ہزاروں جتن کیئے۔ حکومت و راحت ہمیشہ دولت ہی کے پاس رہی ہے' اور رہے گی۔ عوام الناس کو جس طرح جی چاہے احمق بنالو۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

روس باہر سے دولت نہیں سمیٹ سکتا تھا کیونکہ ان راستوں پر پہلے ہی سے یورپ و امریکہ نے تجارت اور نو آبادیات کے ذریعہ سے قبضہ کر لیا تھا۔ جس وقت یورپ اس طرف مشغول تھا' روس کی شہنشاہیت اپنی وسعت ارض کی وجہ سے اپنے تئیں ان باتوں سے مستغنی سمجھتی تھی۔ لہٰذا مشرقی اصول کو زیر نظر رکھ کر کہ بنیا حاکم قہر خدا۔ اُس نے اُدھر سے چشم پوشی کرنا ہی اپنے لیئے آسان اور مفید سمجھا۔ لیکن روس میں چند لوگ ایسے تھے جو دولت و حکومت کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے پہلے تو شہنشاہیت کو نوچ کھسوٹ کے الگ کیا۔ نپولین سبق پڑھا چکا تھا کہ کوئی شے ناممکن نہیں۔ لہٰذا اُنھوں نے دولت اپنے ہی اندر سے نکالنی شروع کی۔ اور حکمرانوں کی جماعت علیحدہ کرکے' اُن کی طرف ایک آہنی پردہ ڈال دیا۔ اور اپنی رعایا کو جو زیادہ تر مشرقی تھی' اُدھر نہ دیکھنے دیا کیونکہ ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند گدائی گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اُن کی آنکھیں اور اُن کا مُنہ اس طرح بند کیا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اُن کے لیئے Employment یعنی کام کی مشغولیت پیدا کر دی۔ اور اپنا دست نگر اتنا بنا لیا کہ بغیر حکومت کے نظام کے وُہ اس قسم کی Employments ہی نہیں حاصل کر سکتے جو سب کو مشغول رکھیں۔ یہی بات یورپ و امریکہ نے رعایا کو باہر غیر ممالک میں نو آبادیات قائم کرکے حاصل کی تھی۔ اور اب الیکشن کی تیز روشنی سے اُن کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔ غرض روس و امریکہ و یورپ گویا تمام دنیا نے مل کر ایک اصول قائم کر لیا کہ اپنی رعایا کو اپنی حکومت پر نکتہ چینی کا موقعہ نہ دیں۔ اور اپنی تہذیب کو اقوامِ مشرق میں بھی ایسے ہی مساوات کے باغ دکھا کر پھیلایا۔ اتنا پھیلایا' کہ شاعر مشرق بھی مغرب کی آواز کو اس لَے میں دُہرانے لگا کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیجئے دُنیا کو تو اپنے قبضہ میں کیا تھا آسمان پر بھی ایک جمہوریت قائم ہو گئی اور شہنشاہِ کائنات کو اُس کے عرش پر سے اُٹھا کر امریکہ کی مسندِ جمہوریت کا صدر بنا دیا۔ اور وُہ ہی رعایا کی ظاہری رضامندی کا اصول قائم رکھا۔ یہ مغربی تہذیب کا اثر نہیں تو کیا ہے! حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ تو کہیں کہ ؎

می نہ گنجد بوعلیؒ ہرگز خدا اندر خودی
تو ہمی خواہی بری درکعبہ بازاصنام را

لیکن حکیم اُمت نے خودی کو خدا کے مقابل میں لاکر کھڑا کر دیا۔ یہ صنم الاصنام یعنی خودیٔ مغرب کا بچہ ان کے اسلام کا خدا بن گیا۔ اور بھولے بھالے مسلمان اس کو حکمتِ اسلام سمجھنے لگے۔ مغرب کے غلط فلسفہ کو سامنے رکھ کر حکمتِ اسلام سے موجودہ تاریکی کو دُور کرنا اس کتاب کی وجہ ہست و بود ہے' جس کا نام حضرت اقبال نے خودی رکھا ہے اُس کو فلسفۂ یونان و یورپ نے عقل انسانی کہا ہے۔ دونوں نے انسان کو خدائی کا درجہ دے دیا۔ اور بے جا غرور اس کا باعث ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل اتنی بلند ہے کہ ہم سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ ہمارے فلسفہ میں خدا کی ضرورت نہیں۔ ہماری خودی اتنی مجموعۂ اسرار ہے' کہ اس کو Develop کرکے ہم خدا کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور خدا کی تقدیریں کو اپنے احکام سے مرتب کر سکتے ہیں۔ چونکہ اپنے تئیں مسلمان کھلوانا ضروری تھا لہٰذا خدا کا نام بھی آگیا۔ ورنہ مطلب اس کا بھی یہ ہی ہے کہ ہمیں خدا کی ضرورت نہیں۔ اور اگر خدا ہے تو ہمارا ماتحت ہے۔ دیکھئے یہ وُہ ہی ابلیسی تکبر ہے جس نے عزازیل کو خوار کیا تھا' اور اب وُہ ہی ابلیس اپنی پورانی خودی پر اڑا ہوا ہے جس نے کہا تھا کہ: قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ ۱۵: ۳۹' ۴۰' ۴۱' ۴۲۔

ترجمہ: کہا اے میرے پروردگار چونکہ تُو نے مجھے راستہ سے الگ کیا' میں بھی ان کے لئے دنیا میں ساز و سامان کو ان کی آنکھوں میں زینت دوں گا' اور ان سب کو بہکاؤں گا'

Marfat.com

مگر اُن میں سے تیرے خالص بندے (کہ وہ میرے بہکانے میں نہیں آئیں گے)
خدا نے فرمایا کہ یہی راہ سیدھی ہے کہ مجھ تک (پہنچتی) ہے۔ جو میرے
بندے ہیں، اُن پر تجھے کسی طرح کی حکومت نہ ہوگی۔ مگر ہاں گمراہوں میں سے
جو تیری پیروی کرے (اس پر تیرا زور چل جائے گا)۔

ان آیات سے یہ امور ظاہر ہوئے:۔

(۱) کبر خصلتِ ابلیسی ہے۔

(۲) دُنیا کی زینت میں پھنس جانا شیطان کی پیروی کا نتیجہ ہے۔

(۳) ان آیات سے فقۂ اسلام کا ایک مسئلہ حل ہوتا ہے کہ شیطان خود اپنی مرضی سے ہر ایک فعل کا مرتکب ہوا۔ سجدۂ آدم نہ کرنا اُس کا اپنا فعل تھا۔ آدم و حوّا کو ورغلا کر جنت سے نکلنے کا باعث بننا اُس کی آزاد خودی کا عمل تھا۔ پھر کہتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے صراطِ مستقیم سے علیحدہ کر دیا۔ اپنے فعل کو خدا کے سر تھوپتا ہے۔ اس ہی شیطان کی تاسّی میں ایک فرقہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو کہتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جو وہ کرتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے بلکہ خدا ہی کرتا ہے۔ جماعتِ جبریہ کا فلسفہ ابلیس کی تقلید میں مرتب ہوا ہے۔

اس کتاب میں اُن ہی خدا کے مخلص بندوں کی تاویل قرآن و تشریح فقہ اسلام کا ذکر ہے جو دنیا کی زینتوں کی طرف نہیں گئے اور اس طرح شیطان کے دام میں نہیں آئے۔

جناب امیر علیہ السّلام اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں

اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ مَنِ اسْتَنْصَحَ اللّٰهَ وُفِّقَ وَمَنِ اتَّخَذَ قَوْلَهٗ دَلِیْلًا هُدِیَ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ فَاِنَّ جَارَ اللّٰهِ اٰمِنٌ، وَعَدُوَّ اللّٰهِ خَائِفٌ، وَاِنَّهٗ لَا یَنْبَغِیْ لِمَنْ عَرَفَ عَظَمَةَ اللّٰهِ اَنْ یَّتَعَظَّمَ فَاِنَّ رِفْعَةَ الَّذِیْنَ یَعْرِفُوْنَ مَا عَظَمَتُهٗ اَنْ یَّتَوَاضَعُوْا لَهٗ، وَسَلَامَةَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا قُدْرَتُهٗ اَنْ یَّسْتَسْلِمُوْا لَهٗ فَلَا تَنْفِرُوْا مِنَ الْحَقِّ نِفَارَ الصَّحِیْحِ مِنَ الْاَجْرَبِ، وَالْبَارِیْ مِنْ ذِی السَّقَمِ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ تَرَكَهٗ، وَلَنْ تَاْخُذُوْا بِمِیْثَاقِ الْكِتٰبِ

حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ نَقَضَهٗ، وَلَنْ تَمَسَّكُوْا بِهٖ حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ نَبَذَهٗ فَالْتَمِسُوْا ذٰلِكَ مِنْ عِنْدِ اَهْلِهٖ فَاِنَّهُمْ عَیْشُ الْعِلْمِ، وَمَوْتُ الْجَهْلِ. هُمُ الَّذِیْنَ یُخْبِرُكُمْ حُكْمُهُمْ عَنْ عِلْمِهِمْ، وَصَمْتُهُمْ عَنْ مَنْطِقِهِمْ وَظَاهِرُهُمْ عَنْ بَاطِنِهِمْ. لَا یُخَالِفُوْنَ الدِّیْنَ، وَلَا یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ، فَهُوَ بَیْنَهُمْ شَاهِدٌ صَادِقٌ وَصَامِتٌ نَاطِقٌ۔ (نہج البلاغۃ الجزء الثانی صـ ۴۲، ۴۳)

ترجمہ: اے لوگو! جس نے خداوند تعالیٰ سے نصیحت چاہی، اُسے نصیحت دی گئی جس نے کلامِ الٰہی کو اپنا رہنما بنایا اس کی استوار ترین راستہ کی طرف ہدایت کی گئی۔ کیونکہ جو خدا سے آشنا ہو وُہ ایمن و آسودہ رہتا ہے اور اُس کا دشمن ہراساں اور ترساں رہتا ہے۔ جو خدا کی عظمت کا شناسا ہے اس کے لیئے تکبّر و پندار زیبا نہیں۔ اُن لوگوں کی رفعت جو خدا کی عظمت سے واقف ہیں یہ ہے کہ وُہ اس کے آگے خضوع و خشوع کریں۔ اور اُن لوگوں کی سلامتی جو خدا کی قدرت سے آشنا ہیں اس میں ہے کہ اُس کی اطاعت کریں۔ پس حق سے راہِ فرار اختیار نہ کرو جس طرح خارش زدہ اُونٹنی سے تندرست اور مریض سے مردِ صحیح و سالم بھاگتا ہے۔ تم ہدایت سے آشنا نہیں ہو سکتے جب تک اسے نہ پہچان لو جس نے راہِ ہدایت کو چھوڑ دیا ہے اور کتابِ الٰہی کے عہد پر استوار نہیں رہ سکتے جب تک اُسے نہ پہچان لو جس نے اس کو توڑ دیا ہے اور اس (کتابِ الٰہی) سے تمسک نہیں کر سکتے جب تک اُس کو نہ معلوم کر لو کہ جس نے اُس کو چھوڑ دیا ہے۔ تم یہ باتیں اُن سے ہی حاصل کر سکتے ہو جن سے علم زندہ ہے اور جو جہل کی موت ہیں۔ یہ وُہ لوگ ہیں، جن کے احکام تم کو ان کے علم و دانش سے آگاہ کرتے ہیں اُن کی خاموشی اُن کی نیکوی گفتار سے، اور اُن کا ظاہر اُن کے باطن سے آگاہ کرتا ہے۔ وُہ مخالفِ دین نہیں ہیں، اور اُن کے احکامِ دین میں ایک دوسرے سے اختلاف نہیں ہے۔ پس دین اُن کے درمیان ایک دوسرے کا گواہ اور خاموش گویا ہے۔" (ترجمہ ختم ہوا)

جنابِ امیر علیہ السّلام کے خطبہ کا یہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ اس میں جنابِ امیرؑ نے نہایت اہم مسائل کو بہت عمدگی سے سمجھایا ہے۔ فلسفہ کا یہ نہایت اہم مسئلہ ہے کہ دنیا میں بدی کیوں ہے۔ آپؑ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ طبیعتِ انسانی کی اُفتاد کے مطابق شر کی موجودگی خیر کی معرفت کے لیئے ضروری ہے۔

ہدایت کا دینے والا تو خدا ہے، لیکن ہدایت اُس کو ملتی ہے جو ہدایت کا متمنّی

ہوتا ہے اور اس کے لیئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

اس بات کی پہچان کہ کون شخص خداوند تعالیٰ کی عظمت و قدرت کی معرفت رکھتا ہے، یہ ہے کہ "وہ خدا کے آگے فروتنی اور خضوع و خشوع کرے، اور اُس کے احکام کی اطاعت کرے"۔

حق سے کبھی گریز نہ کرنا چاہیئے۔

تم کو رشد و ہدایت اُس وقت ہی اچھی حاصل ہو سکتی ہے، جب تم آئمہ تلبیس کو آئمہ حق سے شناخت کر سکو۔ بُرے حکام اور بُرے آئمہ کے تجربہ سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آئمہ حق کون ہیں۔ آئمہ حق کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں اور ارشاد فرمایا ہے کہ علم و ہدایت ہمیشہ آئمہ حق سے تلاش کیا کرو۔

آئمہ حق کی خاموشی اور گفتار اور اُن کے کردار و احکام ہی سے تم شناخت کرلو گے کہ وہ آئمہ حق ہیں اور صاحبانِ علم و ہدایت ہیں۔

ہم مغربی تہذیب کا ذکر کر رہے تھے۔ اس مغربی تہذیب نے اپنے لیئے خدا مقرر کر لیے ہیں۔ کچھ تو زبان سے، اور کچھ اپنے عمل سے۔ جو قول سے زیادہ واضح ہے۔ یہ لوگ اچھی طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ اُن کا اعتقاد نہ تو خدا پر ہے، اور نہ عاقبت کی زندگی پر۔ نشر و حشر و میزانِ عدل اُن لوگوں کے نزدیک موہوم تخیلات ہیں جو محض دل بہلانے کے لیئے اختراع کیئے گئے ہیں۔ مغربی تہذیب کا یہ اثر مسلمانوں پر بہت ہے بلکہ آج کل کے مسلمان انکار بالعمل والی جماعت کے نہایت با اثر اور ممتاز ممبر ہیں۔ اسلام کو قومیت کے ڈھانچہ میں ڈھال کر اُس سے وہ ہی کام لے رہے ہیں جو دُوسرے ملک و مذہب والے اپنے تئیں ایک ممیز قوم قرار دے کر قوم کے نام پر اپنی سیاست کو رواں کر رہے ہیں۔ دنیاوی ثروت و وجاہت نے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنی طرف راغب و مشغول رکھا ہے۔ اور اب تو مغربی سند بھی حاصل ہو گئی ہے مذہب سے انکار مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور مسلمانوں نے اس کو ترقی کی علامت سمجھ کر اس کو اپنا فیشن بنا لیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جب سے انسان نے دُنیا میں ہوش سنبھالا ہے، اُس وقت سے دنیا کی اکثریت پر دولت کی حکومت رہی ہے۔ اور بعض وقت وہ حکومت خدائی کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے

ایسے زمانے دنیا پر گذرتے رہتے ہیں۔ اُن سب میں موجودہ زمانہ دولت کی خدائی کا ہے، اور بہت سخت ہے۔ کیونکہ ازمنہ ماضیہ کے تجربوں سے دولت کے بندے بھی فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ اور اب دنیا کے لوگوں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام نکالنے میں بہت زیادہ تجربہ کار ہو گئے ہیں۔

مغربی تہذیب کے پانچ ارکان ہیں۔ اور وُہ ہی اپنے اثرات کے ساتھ دُنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ مغرب میں یہ ارکان اپنا عمل پندرھویں صدی عیسوی سے کر رہے ہیں۔ اور یہ وُہ ہیں جنہوں نے انسان کے اخلاق و عادات کو اِتنا گرا دیا ہے کہ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے انسان میں اور جنگل کے وحشی جانور میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ اگر فرق ہے، تو ریاکاری اور کذب کا ہے۔ جانور اپنے عمل میں سادگی کے ساتھ سچے ہوتے ہیں۔ انساں کا بھی عمل وُہ ہی ہے، لیکن کذب کے ملمع کے نیچے صرف ایک خود غرضی کو لو۔ کیا آج کل کا انسان خود غرضی میں کسی وحشی جانور سے کم ہے۔ خال خال مستثنیات کا ذکر نہیں۔ چونکہ مستثنیات ہیں، لہٰذا قاعدۂ کلیہ کو اچھی طرح ثابت کرتی ہیں۔ مغربی تہذیب کے وُہ ارکان جنہوں نے یہ صورت و حالت پیدا کر دی ہے پانچ ہیں:۔ (۱) تجارت کی رقابت اور نو آبادیات کے لیئے دَوڑ دھوپ۔ (۲) قومیت و وطنیت، (۳) انڈسٹریلزم، (۴) جمہوریت، اور (۵) ابتدائی تعلیم جس نے اُن چاروں کے مددگار پیدا کر دیئے ہیں۔ اب ہم ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ تجارت } اگر تجارت صحیح اصول پر کی جائے جس میں کچھ اپنا فائدہ بھی ہو اور خلق خدا کا بھی فائدہ مدِّنظر ہو، تو وُہ بڑی اچھی چیز ہے۔ فضل الٰہی ہے۔ انسان کی ضروریاتِ زندگی مہیّا ہوتی ہیں تہذیب اور حسن اخلاق کے خیالات اور طریقے تجارت کے قافلوں کے ساتھ چلتے ہیں اور وحشی اقوام کو بلند سطح پر لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن زمانۂ حال کی تجارت جو محض عذابِ الٰہی ہے خلقِ خدا کے لیئے؛ معصیت کے راستوں پر چلنے کے ذرائع اور سہولتیں پیدا کرتی ہے۔ جس طرح اچھے زمانوں میں حکمت اور خیر تجارتی قافلوں کے ہمراہ ایک مُلک سے دُوسرے مُلک میں سفر کرتی تھیں اسی

بدیاں پھیلتی ہیں۔ موجودہ زمانے کی تجارت بعینہٖ اُن اصول کے مطابق اور اُن اغراض کے ماتحت ہو رہی ہے جن طریقوں سے اور جن مقاصد کے لیئے دنیا کی تجارت کے بانی اہل فینقیا تجارت کرتے تھے۔ یہ وہ ہی سبق ہے جو زمانۂ حال کے تجار دُھرا رہے ہیں۔ وہ تجارت کیسی تھی؟ ایک یورپین کی زبانی سُنیئے :-

Like all early voyagers and some old languages, they (Phoenicians) made scant distinction between trade and treachery, commerce and robbery, they stole from the weak, cheated the stupid, and were honest with the rest ۵۲

ترجمہ :- مثل ازمنہ ماضیہ کے دیگر جہاز رانوں (تاجروں) کے اور چند پرانی زبانوں کی لغت کے اہل فینقیا نے تجارت اور دھوکہ دہی اور تجارت اور ڈاکہ زنی میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ وہ کمزور سے مال چرا لیتے تھے، اور احمق کو دھوکہ دے کر مال لیتے تھے۔ اور باقیوں سے ایماندار تھے۔

یہ زمانہ حال کا ترقی یافتہ مؤرخ نہ ہوتا اگر اپنی قوم کے بھی عیوب اسی طرح ظاہر کر دیتا وہ کہہ سکتا تھا اگر چاہتا کہ زمانہ حال کے یوروپین تجارت باز بھی ایسے ہی ہیں۔ اگرچہ اُس نے نہیں کہا۔ لیکن جو شخص زمانہ حال کی تجارت سے ذرا سا بھی واقف ہے وہ آج کل کے تاجروں کو اہل فینقیا کا خلف رشید سمجھے گا۔ بالکل اس ہی نمونہ پر تجارت چل رہی ہے اور اگر ان کی نوآبادیات کے حصول کی تاریخ کو غور سے پڑھا جائے تو یہ اپنے آباء و اجداد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اس کتاب میں تحریر ہے جو یورپ کی مشرقی وراثت کو بیان کر رہی ہے۔ یہ تجارت بھی انہوں نے اس ہی ورثہ میں پائی ہے۔ آگے چل کر مؤرخ کہتا ہے کہ یہ ہی حال اس زمانہ کے ہر قوم کے تاجروں کا تھا۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو پہلے زمانہ میں ہو چکا ہے وہ ہی اب بھی ہو رہا ہے۔ وہ ہی انسان ہے اور وہ ہی اس کی فطرت، اور وہ ہی اُس کے واقعات۔ آج کل

---

۵۲ Will Durant : Our Oriental Heritage, p. 293

Marfat.com

صرف اُن پر ایک ملمع چڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے انسانوں ہی کے جذبات، احساسات، خواہشات موجودہ زمانہ کے انسانوں میں جاری وساری ہیں۔

جب تجارت کے یہ اصُول اور اُن کے ناجائز فوائد عام ہو گئے، تو معاشرت اور معیشت کے اصول و قواعد بھی اُس ہی نمونہ پر ڈھال دیئے گئے۔ اور ہر چیز، ہر صفت، ہر خصلت کی قدر و قیمت روپیہ کی صورت میں تبدیل کر دی گئی مثال کے طور پر دیکھئے پہلے زمانہ میں جب یہ تجارتی اصول عام نہیں تھے تو وکالت طبابت اور تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ تعلیم کی فیس سب سے پہلے سوفسطائی فلاسفروں نے لینی شروع کی۔ لیکن لوگ اُن کے اس فعل کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ ہی نہیں کہ تعلیم کی فیس نہیں لیتے تھے، بلکہ غریب طلباء کو گرُو یا اُستاد اپنے گھر میں رکھ کر اُس کی خوراک و پوشاک مہیّا کرتے تھے۔ لیکن جب بنی نوع انسان نے "ترقی" کی، تو اب اس ترقی یافتہ زمانہ میں ان تینوں پیشوں میں بلیک مارکٹ ہو رہی ہے دُوسرے الفاظ میں ہر قسم کے دھوکے اور چالاکی کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ لیا جاتا ہے۔ ان میں نہ اب اخلاق کا اثر ہے اور نہ مذہب کا۔ صرف تجارتی اصول پر مدرسے اور مطب چلائے جا رہے ہیں، اور وکالت کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔ عدالتیں وکیلوں کے بغیر تو بات نہیں سُنتیں۔ اور وکیل اگر فیس ہی زیادہ لے لیں تو غنیمت ہے۔ نہیں؟ موکل سے ہر بہانہ سے روپیہ نوچا جاتا ہے۔ اور پھر اتنا عالمانہ مشورہ دیا جاتا ہے اور قانونی تدابیر بتائی جاتی ہیں، کہ جو شخص ایک دفعہ اس قانونی بھنور میں پڑ گیا پھر تو جب تک ساری جائداد اور اساسہ فروخت نہ ہو جائے، اُس کا چھٹکارا مشکل ہے۔ تعلیم اتنی مہنگی ہو گئی کہ عام ایمان دار آدمی کے بس کی نہیں رہی۔ لیکن بچوّں کو تعلیم دینا ضروری ہے، لہذا والدین بھی ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے روپیہ گھسیٹنا اپنی زندگی کا جزوِ اعظم سمجھتے ہیں۔ سکولوں کے کتب درسی اور اُن کے نصاب میں جس سُرعت کے ساتھ تبدیلی ہوتی ہے اُس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ کوئی نیا اصولِ تعلیم ایجاد ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نصاب اور کتابوں کی تبدیلی کی ضرورت ہوئی۔ بلکہ دیگر اغراض اس میں شامل ہوتی ہیں۔ پبلشرز کو بھی فائدہ پہنچانا ضروری ہے، مؤلفین بھی بے چین ہیں، نئے آدمیوں کو

Marfat.com

دریائے منافع میں غوطہ لگانے کے لیئے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اور اُن سے بہت سے رہنمایانِ قوم کا فائدہ ہوتا ہے۔ پھر کبھی اگر موڈرن اصول کے مطابق دستورِ اسلامی مانگنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو یہ گروہِ استادان ہاتھوں میں جھنڈیاں اپنے طلبہ کو پیچھے لیئے ہوئے کوچہ و بازار میں یہ کہتے ہوئے گردش کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم دستور اسلامی لیئے بغیر نہیں مانیں گے۔ ورنہ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ وُہ دستور اسلامی کیسا ہوگا، جس کے چاہنے والے ایسے ہیں۔ ڈاکٹروں کی حالت تحریر کرنے کے لیئے تو اکبر الہ آبادی یا نظیر اکبر آبادی کا قلم چاہیئے۔ غرض قصہ مختصر ہر ایک تحریک تجارت کے بلیک مارکٹ کے اصول پر چل رہی ہے اور انسان کی زندگی کا واحد مقصد روپیہ جمع کرنا ہوگیا ہے۔ دراصل تجارت نے روپیہ کو خدائی مسند پر بٹھا دیا ہے۔

قومیّت اور وطنیّت

یہ بھی اہل یورپ کا تحفہ ہے اور مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز۔ لیکن خود اُن کے مذہب مسیحیت کے خلاف ہے۔ دُنیا کے امن و چین کے منافی ہے۔ اور دُنیا کی عالمگیر جنگوں کا باعث ہے۔ یہ یاد رکھیئے کہ دنیا میں جتنی خرابیاں، بدنظمیاں اور ظلم پھیلے ہوئے ہیں اُن کا سبب اوّلین حکومت ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ حکومت کی خود غرضی اِن کا سبب ہے۔ اور اس میں کچھ مذہب کے رئیس یعنی پوپ کی بھی غلطی ہے۔ اُس نے تمام ممالک یورپ میں اپنے مذہب کی بنا پر اتنا تسلط و غلبہ حاصل کرلیا، کہ بادشاہوں کو تخت سے اُتارنا، تخت پر بٹھانا، ان کی رعایا کو اُن کے خلاف کرنا، جس بادشاہ سے ناراض ہو اُس کا ناک میں دم کرنا، اُس کے فرائضِ روزانہ میں داخل ہو گیا۔ فطرتاً بادشاہوں کو بُرا لگنے لگا۔ انہوں نے وطنیت اور قومیّت کے جذبات کو جو پہلے ہی موجود تھے اِتنا بھڑکایا، کہ بجائے ایک عیسائی قوم ہونے کے ملکی حدود سے قومیں بن گئیں۔ اور حُبِّ وطن کا جذبہ حُبِّ مذہب پر غالب آگیا۔ پھر تجارت کی رقابت نے اس جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈالا۔ اس درمیان ہی میں وہ مذہبی اصلاح شروع ہوگئی جس کا نام Reformation ہے۔ یہ تحریک شروع تو نہایت اچھے جذبہ سے ہوئی تھی۔ عیسائی

Marfat.com

چھ چیں تو بہت عرصہ سے بتوں کی پناہ گاہ بن چکی تھیں۔ اور ان میں پرستش ہوتی تھی۔ مقابلہ سے برائی بہت جلدی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے صلیبی لڑائیوں میں جب ان عیسائیوں کو اسلام اور اسلام کے اصول سے واقفیت ہوئی، تو اپنی بُت پرستی پر بہت شرمائے اور اپنے سے خدائی کے اصولوں سے کترانے لگے۔ یہ تھی اس اصلاحِ مذہبی کی بنا۔ لیکن بہت جلد اس نے مسیحی دنیا میں قومیت و وطنیت کے ساتھ مل کر ایک تقسیم و تفریقِ عظیم پیدا کر دی۔ نپولین نے جب بادشاہوں کو شکستوں پر شکستیں دینی شروع کیں تو پھر ان بادشاہوں کو اس ہی حبِّ وطن و قوم سے مدد لینی پڑی۔ اب یہ حد ہو گئی ہے کہ اگرچہ سب عیسائی ہیں لیکن قومیں آپس میں ایک دوسرے کی جانی دُشمن بن گئی ہیں۔ غلام قوموں کو تو آقا کی ہر ایک چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور تمام دُنیا آج کل مغربی تہذیب کی غلام ہے۔ لہٰذا اَور تو اَور مسلمانوں نے بھی اس قومیت کے بُت کو اپنا بنا لیا۔ اور اب اسلام جیسے عالمگیر مذہب کو ایک قوم تصور کر کے اُس پر تمام وُہ اصول حاوی کر دیئے جو قوموں میں رائج ہوتے ہیں۔ جس کے نتائج کو حالیؔ مرحوم ان اشعار میں بیان کرتے ہیں ؎

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجائے اقوام کے تفرقوں کے مٹانے کے دنیادی وجاہت و ثروت و دولت کے زیرِ اثر آن کر ان لوگوں نے جو اپنے تئیں کارکنانِ اسلام کہتے ہیں، اسلام کو مذہب کی مسند سے اُٹھا کر قومیت کی کُرسی پر بٹھا دیا ہے۔

قصّۂ مختصر یہ کہ مغربی تہذیب میں قومیت اور وطنیت سے مل کر تجارت کا مقصد اور مضبوط ہو گیا۔ وُہ مقصد کیا تھا؟ دولت و ثروت پیدا کرنا۔

مغربی تہذیب کا نظامِ اقتصادیات: انڈسٹریلزم

لیکن ابھی دولت کو خدائی مسند پر

Marfat.com

پہنچنے کے لیے مزید مدد کی ضرورت تھی، وہ انڈسٹریلزم اور جمہوریت کی طرف سے ملی۔ سب سے پہلے انڈسٹریلزم انگلستان میں رو نما ہوا۔ وہ ملک اُس کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں کے شاعر گولڈ سمتھ Goldsmith(1728-1774) کے زمانہ میں اس کے بُرے اثرات بہت اچھی طرح ظاہر ہوئے۔ اگرچہ اس وقت ابتداء تھی۔ چنانچہ اُس شاعر نے اپنی مثنوی قریۂ مصیبت رسیدہ (Deserted Village) میں گاؤں اور زراعت کی تباہی اور اخلاقیات کے تنزل کا ذکر نہایت وضاحت سے کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ سب کچھ Industrialism کا نتیجہ ہے جس نے انگلستان کی پُر امن و پُر سکون زندگی کو تلاطم انگیز ہوا و ہوس سے بدلنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن براعظم یورپ میں اس کے بُرے اثرات ۱۸۷۵ء سے بہت زیادہ نمایاں ہونے لگے۔ انسانیت اور اخلاقیات کو دولت پر قربان کرنا انڈسٹریلزم کا پہلا گُر ہے۔ اس کے نزدیک انسان بھی ایک ایسی ہی مشین ہو گیا، جیسی مشینوں سے انڈسٹریلزم نے دولت جمع کرنی شروع کر دی تھی۔ جمہوریت کے ساتھ مل کر انڈسٹریلزم نے وہ غرور پندار سے بھری ہوئی Individualism پیدا کی جس نے اپنے قیاس کے ذریعہ سے جس کو اُس نے مقیاس الحق تصور کر لیا مذہب کو انسانی زندگی سے خارج کر کے دولت و ثروت کو اُس کی جگہ بٹھا دیا۔ اس کو مدد اُس Nationalistic Patriotiam سے ملی جس کو مغربی تہذیب میں ایک تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ کیونکہ بغیر اس تخیل کے حکمرانوں کو اپنی استبدادیت میں تقویت نہ حاصل ہوتی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کمیونزم محض یورپ کے نظام اقتصادیات کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اب رُوس نے اس کو خاص اپنا بنا لیا ہے۔ کمیونزم آخری منطقی نتیجہ ہے یورپ کی اقتصادیات کے ان ہی نظریات کا جو مغربی تہذیب میں کار فرما ہیں اور یہ ہی وجہ ہے کہ بھارت اور پاکستان میں کمیونزم اتنی سرعت اور طاقت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ مغربی تہذیب نے اپنے نظریات کی اشاعت سے ان دونوں ممالک میں، بلکہ جہاں جہاں مغربی تہذیب کی پیروی

Marfat.com

ہوئی کمیونزم کے لیئے زمین صاف کر دی۔ ان کے نظریاتِ جمہوریت نے بے جا انڈسٹریلزم پیدا کیا اور انڈسٹریلزم نے غربا کو امراء کا اس قدر دست نگر بنا دیا کہ امراء کے جذباتِ خود غرضی و نفسانیت اور پندار بہت نمایاں ہو گئے۔ غرباء کی زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اور غربا اور امراء کے درمیان ایک ایسی حد فاصل قائم ہو گئی، جس نے دونوں کا باھمی اتحاد ناممکن بنا دیا۔ اس ہی کشمکش کا ردِ عمل کمیونزم ہے۔ یورپ اور انگلستان کے سیاسی اور اقتصادی ماہرین نے یہ نہ خیال کیا کہ ان کے نظریات کا آخری نتیجہ کمیونزم ہو سکتا ہے۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ کمیونزم نے تو اپنے ممالک میں سے مذہب کے خدا کو ہٹا کر خدا کی جگہ خود لے لی ہے اور اپنی پرستش کرانی شروع کر دی ہے اور اپنے پرستاروں کی ایک علیحدہ جماعت بنا کر جس کو آج کل سیاسی زبان میں بلاک (BLOC) کہتے ہیں، ہمارے اقتدار پر ساری دنیا میں حملہ شروع کر دیا ہے، تو گھبرا کر اسے ایک فتنہ کہنے لگے۔ لیکن یہاں ایک عجیب مخمصہ میں پھنس گئے۔ کس کو خدا بنا کر اس کی آڑ میں اس فتنہ کا مقابلہ کریں کیونکہ بغیر ایک خدا مقرر کیئے ہوئے جماعت نہیں بن سکتی۔ آج کل کی سیاسی زبان میں اس فقرہ کو یُوں ادا کر سکتے ہیں کہ کون سی نئی Ideology قائم کر کے کمیونزم کا مقابلہ کریں۔ قومیت اور وطنیت تو ہمارے اور اہلِ روس کے مشترک خدا ہیں۔ مذہب کو پہلے ہی سے بالائے طاق رکھ دیا ہے، بلکہ اب تو اپنے تئیں اہلِ مذہب کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جب کوئی نیا خدا نہ ملا، یا نئی Ideology نہیں ملی تو کہنے لگے کہ ہم آزاد ہیں اور اہلِ روس غلام ہیں۔ اب اُنہوں نے ایک تخصیص پیدا کر لی۔ دُنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنی دنیا کا نام Free world یعنی آزاد دُنیا رکھا، اور رُوس والی دنیا کا نام اس کے برعکس غیر آزاد دُنیا رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں جمہوریت ہے لہذا ہم آزاد ہیں۔ اور روس میں ڈکٹیٹر شپ ہے لہذا وُہ آزاد نہیں ہے، غلام ہے۔ لیکن گھبراہٹ میں یہ یاد رکھنا مناسب نہ سمجھا کہ کل کی بات ہے جب ہٹلر کے ساتھ موت اور زندگی کی لڑائی ہو رہی تھی تو اس روس کو اس ہی کمیونزم کے ملجا و ماوا کو آزاد ڈیمو کریٹک ملک

Marfat.com

کہہ رہے تھے۔ اور یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب سٹالن جیسا ڈکٹیٹر اُس ملک کا حکمران تھا۔ اور جب اُس کی مدد سے لڑائی فتح ہو گئی تو وہ ہی رُوس اور وُہ ہی سٹالن ڈکٹیٹر شپ کی وجہ سے موجبِ نفرت قرار دیئے جانے لگے اس کا جواب روس و سٹالن کے پاس صاف تھا۔ ہم بھی جمہوریت پسند ہیں اور ہمارا مُلک بھی جمہوریت کے اصول کا پابند ہے۔ صرف قسم یا طرز جمہوریت میں فرق ہے۔ اب گویا دونوں دُنیاؤں کا خدا ایک ہو گیا۔ یعنی جمہوریت۔ لیکن یہ چھوٹا خدا رہا۔ بڑا خدا تو وہ ہی دولت ہے۔ اب ہم ذرا اس نائب خدائی مغرب یعنی "جمہوریت" پر نظر ڈالتے ہیں:

جمہوریت مغربی تہذیب نے جس کو جمہوریت کا جامہ پہنا کر خدائی کی مسند پر بٹھا رکھا ہے اور ساری دُنیا اُس کی پرستش میں مشغول ہے وُہ نہ تو اصلی جمہوریت ہے اور نہ ہی اُس کی نقل ہے ایک نمایاں دھوکہ ہے جس کو جمہوریت کا تاج پہنایا گیا ہے۔ عوام الناس کی حکومت عوام الناس کے مفاد کے لیئے اور عوام الناس کے ذریعہ سے اگر ہو تو وُہ جمہوریت ہی۔ مؤرخین اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ صحیح اور اصلی جمہوریت تو صرف ایتھنز میں نہایت قدیم ایام میں بہت تھوڑے عرصہ کے لیئے ہوئی ہے۔ اور پھر بالکل دنیا سے معدوم ہو گئی۔ اُن کے بعد دنیا میں نہ کبھی جمہوریت ہوئی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ وہ حکومتیں جو آج کل جمہوریت کے نام پر چل رہی ہیں وہ یا تو پارٹی حکومت ہیں یا حکومت نمائندگی بذریعہ آرا شماری ہیں۔ یہ جمہوریت نہیں ہے بلکہ ایک دھوکہ بازی ہے جس کے ذریعہ سے چند آدمی حکومت کو سنبھال لیتے ہیں، اور جمہور کو تو اُسی طرح Hewers of wood and drawers of water کے درجہ پر رکھتے ہیں۔ دیکھو:-

1. Encyclopedia Britannica, Art Democracy.
2. Herbert Spencer : That Man Versus the State Chap. "The Political Superstition".
3. Clark : Democracy in the Dock. p. 10

اُس زمانہ کے اتھنز کی حکومت مکمل جمہوریت اس وجہ سے تھی کہ اُس شہر کے تمام شہری خود بیٹھ کر قانون بناتے تھے اور قانون بناتے وقت سارا شہر موجود ہوتا تھا۔ حق نمائندگی کسی کو نہ تھا۔ ان تمام موجودہ شہریوں میں سے جو حکومت کے لیئے چُن لیئے جاتے تھے، وُہ ہر سال تبدیل ہوتے تھے۔ اس طرح ہر شہری کو باری باری سے حکومت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دولت وجائیداد اور ٹیکس کی مالیت کی قید نہ تھی۔ اس حکومت کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ جمہوریت لوگوں کی حکومت لوگوں کے مفاد کے لیئے تھی اور خود لوگ ہی حکمرانی کرتے تھے۔ اُس میں نہ تو اصُول نمائندگی اور نہ غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ پارٹی کی حکومت تھی۔ یہ حالت اُس کے بعد کبھی نہیں ہوئی جس کو زمانہ حال میں جمہوریت کہا جاتا ہے یہ تو در اصل اُمراء کی حکومت ہے۔ دیکھو:

C.E.M. Joad : Guide to the Philosophy of Morals and Politics, p. 90, Ed. 1948.

اُن ممالک میں کہ جہاں یہ جمہوریت دُوسری دُنیا سے آئی ہے، اب تو اس جدید تحفہ کا تجربہ بہت اچھی طرح ہوگیا ہوگا۔ کس طرح انتخاب کی دشمنیاں اولاد در اولاد میں جاکر پشتینی بن جاتی ہیں، کیسے کیسے لوگ منتخب ہوتے ہیں، کس طرح ووٹ حاصل کیئے جاتے ہیں، کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کیسی کیسی جماعتیں بنتی ہیں اور اسمبلی میں کیا کیا گل افشانیاں ہوتی ہیں۔ کس کس طرح الیکشن میں خرچ کیا ہوا روپیہ معہ سُود کے واپس حاصل کیا جاتا ہے۔ اور اب بھی اگر دُنیا کے لوگ موجودہ جمہوریت کی اصلیت و ماہیئت کو نہ سمجھیں، تو پھر اُن پر جناب امیر علیہ السلام کا قول صادق آئے گا کہ "حوادثِ زمانہ بہترین واعظ ہیں اور جس کو حوادثِ زمانہ نے عاقل نہ بنایا، اُسے کوئی وعظ فائدہ نہ دے گا۔

جو قومیت پوپ اور بادشاہوں کی کشمکش اور ریفارمیشن سے یورپ میں پیدا ہوئی وہ ایسی شدید نہ تھی۔ اُس میں ابھی انسانی ہمدردی باقی تھی۔ یہ انسانی ہمدردی نتیجہ تھی مذہب کی حکومت اور خدا کے خوف کی جس نے قومیت کے تخیل کو منطقی حدود کی آخری حد تک جانے سے روک رکھا ڈیموکریسی ام الفتن ہے، اور انڈسٹریلزم ابوالفتن ہے۔ ان دونوں کے

Marfat.com

ملنے سے الحاد پیدا ہوا جو راس الفتن ہے۔ اب جو وطنیت اور قومیت کے تخیلات پیدا ہوئے' ان میں خالص شیطانی جوش اور زور تھا۔ ان سب نے مل کر وہ دُنیاوی عقل و دانش پیدا کی جس نے جاہ و ثروت کو انسانی زندگی کا مقصدِ واحد قرار دیا۔ اگر یونان کے علم الاصنام کی زبان میں اس حالت کو بیان کریں تو کہیں گے کہ یونان کے خداؤں کے باپ Zeus کی جگہ تو انڈسٹریلزم نے لی۔ اور اس کو بیوی ہیرا (Hera) کی جگہ ڈیموکریسی نے لی اور یونان کی Hierarchy of Deities کی طرح اب اس جوڑے سے ان جیسے ہی خداؤں کی ایک جماعت نکلی۔ اس دوسری نسل کے خداؤں میں سب سے بڑا خدا حُبِ جاہ و مال ہے۔ اُس کا جوڑا انفرادی قیاس Individualism سے لگا جو خود ڈیموکریسی کا بچہ ہے۔ اب اس جوڑے میں سے بھی بڑا خدا الحاد پیدا ہوا۔ جو اپنے ماں باپ سے بھی بڑا خدا بن گیا۔ ان سب نے مل کر اپنے مددگار خدائے گان قومیت اور وطنیت سے مل کر ساری دُنیا پر قبضہ کرلیا یہ ہیں زمانۂ حال کے خدا۔

ابتدائی تعلیم ڈیموکریسی نے اپنے اصول کے مطابق کوشش کی کہ ہر فرد بشر کو ابتدائی تعلیم دی جائے۔ یہ پروگرام بس ابتدائی تعلیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو یہ تجویز بڑی خوش نما معلوم ہوتی ہے' لیکن ذرا اس کے نتائج پر بھی غور تو کرو۔

اس ابتدائی تعلیم سے مطلب تو محض ابتدائی درجہ کا لکھنا پڑھنا ہے' یہ کیا تعلیم ہوئی۔ ایسی تعلیم کے خطرات بہت ہیں' اور فائدہ کچھ بھی نہیں۔ دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زمینداروں' مزدوروں' اور چھوٹے دوکانداروں کے بچے ذرا سا لکھ پڑھ کر اپنے تئیں عالم سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے والدین کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ آبائی پیشہ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اتنی سی تعلیم سے دنیا میں تو کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ محض حروف شناسی ہے' اصلی تعلیم اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ حروف شناسی سے تعلیم کا مدعا تو پورا نہیں ہوتا' روٹی کا سوال اور مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا بچہ نہ خاندان کے کام کا' نہ اپنے کام کا' نہ قوم کے کام کا۔ نام ہو گیا کہ پڑھنا آتا ہے۔ یہ بچہ اپنے خاندان کے لیئے خطرہ ہوتا ہے۔ ماں باپ ایسی

Marfat.com

تعلیم سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور بچوں کو سکول بھیجنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جو سزا اُن کو ملتی ہے اس کو اپنی قسمت کا جزو سمجھ کر برداشت کرتے ہیں۔

قوم کے لیے ایسا بچہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر سرکاری ملازم ہو گیا تو چونکہ اصلی تعلیم تو ہوتی نہیں، غور و فکر صحیح کی عادت نہیں، دماغ میں غرور و پندار پیدا ہو جاتا ہے اور عوام الناس کی مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ملازمت نہ ملی اور بسا اوقات نہیں ملتی تو اس کا یہ کام ہو جاتا ہے، کہ ہر ایک پارٹی، ہر ایک لیڈر اس سے اپنے پروپاگنڈا کا کام لیتا ہے۔ لیڈر بننے کے لیئے اس کو ووٹوں کے لیئے استعمال کرتے ہیں۔ اور چند روپیوں کی اس کی قیمت ہو جاتی ہے۔ وُہ بھی ایک خاص موسم میں۔ یہ روز مرّہ کا ہر جگہ کا مشاہدہ ہے۔ جہاں طلباء نہیں ملتے وہاں اُجرت کے بچوں اور بے کار "تعلیم یافتہ" بالغوں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اکثر ایسی ضرورت کے موقعوں پر بہت سی ٹولیاں ایسے انسانوں کی بانسوں پر جھنڈے لگائے ہوئے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فلاں زندہ باد، فلاں مُردہ باد۔ درمیان سے ایک آدمی جو اکثر مسجد کا مُلّا یا مکتب کا مدرس ہوتا ہے آواز لگاتا ہے "نعرۂ تکبیر"۔ بہت سی آوازیں آتی ہیں "اللہ اکبر"۔ پھر جس آدمی کی زیادہ "زندہ باد" ہوئی، وُہ ہی لیڈری اور آگے کی ترقی کے خواب دیکھتا ہے۔ جو مُردہ باد ہے وُہ بھی تو مُردہ نہیں ہو جاتا۔ کسی دوسری لائن یا دُوسرے وارڈ میں جاکر وُہ ہی زندہ باد ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں جمہوریت کے کرشمے۔ ہمارے علماء کہتے ہیں، سچ ہی کہتے ہوں گے کہ "جمہوریت قرآن سے ثابت ہے" جس طرح کسی زمانہ میں بادشاہ کا حقِ حکمرانی قرآن سے ثابت ہوتا تھا۔ ہمیں ان علماء کا کوئی قرآن نہیں ملا۔ ورنہ ہم دیکھتے کہ وُہ قرآن کہاں، کب، اور کس پر نازل ہوُا تھا۔ یہ سب اس تعلیمِ عام کے کرشمے ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کسی خاص ملک کی حالت کا نقشہ ہے۔ روٹی کا سوال تو شروع ہی سے ہی اور ہر جگہ ہے۔ یہ ہی حالت یورپ کے ممالک کی ہے، اور یہ ہی حالت روم و یونان کی Vespasian کے زمانہ میں تھی۔ جب وہاں تعلیم عام ہو گئی

تھی۔ دیکھو:۔

Hume : Of National Characters.

Juneval Satires No. XVII, 110-12

مصر کی یونیورسٹی کے طلباء گورنمنٹ کے لیئے دردِ سر بن جاتے ہیں اور پھر طلباء میں بھی پارٹیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کمیونسٹ، وفدسٹ، مسلم برادرز وغیرہ وغیرہ۔

جس پارٹی نے جس جماعت طلباء سے اپنا کام لیا وہ جماعت طلبہ اُس کے ساتھ منسوب ہوگئی۔ دیکھو انگریزی کا پرچہ "ڈان" مؤرخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

اس تعلیم نما جہالت سے اشاعتِ کذب بھی بہت ہوتی ہے۔ جو پروپاغنڈہ بذریعہ پریس ہوتا ہے وہ اس ہی کا نتیجہ ہے۔ یہ پروپاغنڈا کیا ہوتا ہے؟ کذبِ محض۔ پھر اس کا جواب بھی پریس ہی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے، وُہ بھی کذبِ محض۔ یہ دونوں مل کر کذبِ مرکب بن گئے۔ لطف یہ ہے کہ ایک ہی اخبار میں دونوں نکلتے ہیں اور وہ اخبار فخر کرتا ہے کہ ہمارے صفحات سب کے لیئے کھُلے ہوئے ہیں۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے جو چاہے لکھوا دے۔ دونوں ہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ورنہ ایک تو ضرور ہی جھُوٹا ہوتا ہے۔ جمہوریت کی آڑ میں اشاعتِ کذب پر فخر کیا جا رہا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دونوں طرف سے کچھ نذرانہ مل گیا ہوگا۔ راست و دروغ بر گردن راوی۔ اگر نذرانہ بھی لے لیا تو کیا ہُوا۔ روپیہ آج کل کی تجارت میں ہر طرح سے ایک مقدّس شئے ہے۔ جس طرح بھی جمع ہو سکے۔ ایسے پروپاغنڈا کی خرابیاں جنگِ عالمِ اوّل اور جنگِ عالمِ ثانی کے واقعات سے اچھی طرح عیاں ہیں۔ انڈسٹریلزم نے تو سرمایہ دار پیدا ہی کیئے تھے، ڈیموکریسی نے بھی پریس لکھ پتی پیدا کر دیئے جن کا مفاد اس میں تھا کہ لڑائی خوب پھیلے، پارٹیاں بنیں، پارٹی بازی ہو۔ اُن کا پروپاغنڈا ہو اور ہم روپیہ کمائیں۔ دیکھئے تجارت کی بلیک مارکٹ کہاں تک پہنچی۔ مالکانِ اخبارات کے جو فتنے ان دونوں بڑی لڑائیوں کے

Marfat.com

زمانہ میں ہوئے وہ سب پر عیاں ہیں۔ اور سیاسی مظاہروں کے جو بُرے نتائج ہو رہے ہیں، وہ کراچی کے انگریزی ڈاآن کے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کے پرچہ میں ملاحظہ ہوں۔

ان امور کا زیادہ تر باعث وُہ ہی ابتدائی عام تعلیم ہے۔ اگر ابتدائی تعلیم عام نہ ہوتی، تو اخباروں سے اثر لینے والے خواندہ جاہل نہ ہوتے۔ اتنے مظاہرے نہ ہوتے۔ ہر ایک شخص اپنے تئیں خواندہ سمجھ کر ان میں حصّہ نہ لیتا۔ وُہ اعلےٰ تعلیم جس سے قوم و مُلک کو فائدہ ہو نہ پہلے عام تھی، نہ اب عام ہے اور نہ آئندہ عام ہو سکتی ہے۔ جب اعلےٰ اصلی تعلیم عام نہیں ہو سکتی، تو پھر اس ابتدائی تعلیم کو عام اور جبری کرنے سے کیا فائدہ۔ اس ابتدائی تعلیم کو عام کرنے سے ہم عجیب خطرناک انسان پیدا کر رہے ہیں ایک بچہ پڑھنے کے شوق میں ہر قسم کا لٹریچر پڑھتا ہے، لیکن غور کرتا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغ چوں چوں کا مربّہ بن جاتا ہے۔ اور آخرکار ہر ایک پروپانںڈا کا شکار ہو جاتا ہے، اور ہر ایک پارٹی یا جماعت کے لیئے بہت عمدہ آلۂ کار بن جاتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے ان کے مقصدوں کو مدد دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی مقصد کی غلطی یا صحت پر سوچنے کا نہ تو اس کو موقع ملتا ہے، اور نہ اتنی لیاقت کہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ جو زیادہ قیمت دے کر اُسے خریدنا چاہے، خرید لیتا ہے۔

اس میں ایک اور بھی نقص ہے۔ اخباران میں تو ہر قسم کی خبریں ہوتی ہیں:۔ کوئی کسی کی لڑکی کو بھگا لے گیا، کسی نے کسی کی عورت پر ہاتھ ڈالا، قتل کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ جاہل اس کو پڑھتے ہیں، اور ان کے دل میں ایسے ہی خیالات نشوونما پاتے ہیں۔ بُرائی کے رواج کی خبر بھی تو بُری ہوتی ہے۔

غرضکہ عصرِ رواں کے ارباب ثلاثہ یہ ہیں:۔ (۱) جمہوریت ناقص یعنی Democracy (۲) یورپ کا نظام اقتصادیات جس کو زمانۂ حال کی زبان میں Industrialism کہتے ہیں اور (۳) حبِّ مال و جاہ اس حد تک

جس نے انسان کے دل سے مذہب اور اخلاقیات کو نکال دیا ہے۔ یہ تیسرا عنصر پہلے ہی دو عناصر کا نتیجہ ہے۔ ان سے جو خصائل پیدا ہوئے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں:

(۱) یورپ کی تقلید میں خداوند تعالےٰ کو اپنے معاملات میں سے نکال دینا۔ (۲) ظلم۔ (۳) خود غرضی۔ (۴) دولت و ثروت کے حصول میں انہماک۔ (۵) تصوّر اطاعت کا معدوم ہونا۔ (۶) خود اپنے تئیں حق کا معیار تصوّر کرنا۔ (۷) محبّت، ہمدردی، ایثارِ نفس اور صبر کا درمیان سے اٹھ جانا۔ (۸) دنیا کی اس ہی زندگی کو معراجِ حقیقت سمجھ کر بالکل اس میں محو ہو جانا۔ (۹) حشر و نشر و قیامت، سزا جزا کے اعتقادات کا معدوم ہونا۔ (۱۰) روحانیت سے مکمل انقطاع بلکہ اُس کا انکار۔

یہ ہیں روح عصرِ رواں کے بڑے بڑے خصائل جو آج کل کی جملہ سیاسی و معاشرتی اور معیشتی خرابیوں اور پریشانیوں کے ذمہ دار ہیں۔ اور اگر ان سب کو مزید اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی ہستی سے انکار، اُس کے احکام سے اعراض، اور اُس کی سزا و جزا کی تضحیک۔ قصّہ مختصر یہ کہ انسان نے خدا کو ہٹا کر خود اُس کی جگہ لے لی ہے۔ سوفسطائی حکمار کا یہ نظریہ کہ Man is the measure of all things (انسان ہی حق و ناحق کا معیار ہے) اب تک اُس جماعت کے بادر تک عمل تھا۔ Democracy اور Individualism نے مل کر ایسی صورت حالت پیدا کر دی ہے کہ محض یہ ہی نظریہ تمام دنیا کا محرکِ عمل بن گیا ہے۔

یہ تو وُہ بڑے بڑے امور ہیں جن کے عیوب و نقائص ایسے عیاں ہو گئے ہیں کہ اہلِ مغرب بھی اُن سے واقف ہو گئے ہیں اور اپنی کتابوں میں ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور ایسی باتیں ہیں جو براہِ راست اسلامی تمدّن سے تصادم کرتی ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ پر بُری طرح اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مثلاً عورتوں کی بے پردگی اور اُن کی تعلیم جس سے مطلب ابتدائی تعلیم ہی ہو سکتا ہے۔ معیارِ رہائش کی بلندی، اور رقص و سرود۔ ان

Marfat.com

امور پر تفصیل سے تو ہم اس کتاب کے حصّہ دوم میں بحث کریں گے
یہاں چلتے چلتے عقلِ سلیم سے اپیل کرتے ہیں۔

عورتوں کی ابتدائی تعلیم } ابتدائی تعلیم کی خرابیاں ہم بیان کر چکے ہیں عورتوں پر وُہ بدرجۂ اولیٰ حاوی ہیں۔ عورتوں کے لیے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت کم مواقع ہیں۔ وہ تو بسا اوقات اس ابتدائی تعلیم ہی میں محصور رہیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ عورتیں اپنے تئیں تعلیم یافتہ خیال کر کے بچّوں کی پرورش اور گھر کے انتظام سے تو اعلےٰ و ارفع ہو گئیں۔ وُہ خواہ خاوند خود کرے، یا نوکر سے کرائے۔ اُن کا کام تو ناول خوانی رہ گیا کیوں کہ اس سے زیادہ لیاقت ہی نہیں۔ اس کی خرابیاں مخصوصاً عورتوں میں ظاہر ہیں۔

رقص و سرود } اسلامی ممالک میں بھی جہاں اسلامی دستور کی دھوم دھام ہی رقص و سرود مدرسہ اور کالج کے نصاب میں داخل ہونے لگا ہے۔ کم سے کم گورنمنٹ کی طرف سے اس کی ہمت افزائی تو مسلّم ہے۔ مغربی تہذیب میں ان کو FINE ARTS تو ضرور کہا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک ہم کو ان کی خوبیوں سے لاعلمی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا مل کر ایک کالج میں پڑھنا اور وہاں رقص و سرود کی فضا میں جذبات کا مشتعل ہونا ایک قیامت خیز فتنہ پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ مغربی تہذیب کا یہ ایک عنصر ہے لہٰذا ترقی کے لیے ناگزیر ہوُا۔ عقلِ سلیم انگشت بدنداں ہے کہ ع

آنچہ من بینم، بہ بیداریست یارب! یا بخواب

قناعت - اب تک تو کتبِ مذہب اور اخلاقیات میں۔ قناعت کو ایک قابلِ تعریف خصلت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ۱۴ مئی ۱۹۵۶ء کے اخبار ڈان سے معلوم ہوُا کہ ۱۳ مئی ۱۹۵۶ء کو لاہور میں امریکہ کے ماہر اقتصادیات Dr. Woytinsky نے روٹری کلب کی میٹنگ میں ایک جدید انکشاف کا اظہار کیا کہ اگر کسی ملک کے غریب آدمی اپنی کم مائیگی پر قانع ہو جاتے ہیں تو وہ قوم اقتصادی ترقی نہیں کر سکتی۔ اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

Marfat.com

So long as people are content with their poverty and do not take a proper share in the economic activity of their country, there is little hope or possibility of any sound economic growth of the nation.

ترجمہ:۔ جب تک لوگ اپنی موجودہ حالت غربی سے قانع ہیں اور ملک کی اقتصادی تحریکات میں حصہ نہیں لیتے، اُس وقت تک قوم کی اقتصادی ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس سے یہ اصول قائم ہوا کہ انسان کو اپنی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہونا چاہیئے۔ اس اصول کو فقط اقتصادیات ہی میں تو منحصر نہیں کر سکتے۔ دنیاوی حالت میں بھی، خانگی زندگی کے لیئے بھی، تعلقات باہمی کے لیئے بھی یہ اصول قائم ہو گیا کہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیئے۔ گویا Discontented رہنا ہی باعثِ ترقی ہو سکتا ہے۔ دنیا میں پہلے ہی Hurry ہے اور اب اس اصول نے تو اس کا درجہ بڑھا کر Hurricane میں تبدیل کر دیا۔ اطمینان قلب (Peace of Mind) تو رخصت ہوا۔ یہ Industrialism کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ جو انسان کی خوشی، راحت اور اطمینان قلب کے لیئے ایسا ہی ہے جیسے کپڑوں میں کیڑا، یا انسان کے جسم میں سرطان۔ گولڈ سمتھ نے کیا اچھا کہا ہے:

Ill fares the land, to hastening ills a prey, where wealth accumulates and men decay.

ترجمہ: وُہ ملک سُرعت سے آنے والے مصائب کا شکار ہو جاتا ہے جہاں دولت تو جمع ہوتی رہتی ہے، لیکن انسانیت مریض ہو جاتی ہے۔

غریب لیکن قانع کسان کی حالت اس طرح بیان کرتا ہے:۔

His best companions, Innocence and Health And his best riches, ignorance of wealth

ترجمہ:۔ اُس کے بہترین ساتھی معصومیت اور صحت تھے۔ اور اُس کی سب سے بڑی دولت یہ تھی کہ وُہ دولت سے بے خبر تھا۔

Marfat.com

یہ انگلستان میں Industrialism کے آنے سے پہلے کی حالت تھی۔

جو اصول مغربی تہذیب نے جس کے نمائندہ Dr. Woytinsky ہیں قائم کیا ہے، وہ تو سوسائٹی کے سارے درجوں کو برابر کرکے ملک میں بدامنی، بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جب ہر ایک آدمی ایک دوسرے سے بڑھ کر دولت جمع کرنے کو اپنا مقصد حیات سمجھے گا، تو ملک سے اطمینان قلب اور سکون رخصت ہو جائیں گی اور اُس Discontentment کی حکومت ہو جائے گی جس کو یہ ڈاکٹر صاحب اچھا سمجھتے ہیں۔

یہ ترقی نہیں ہے جس کو یہ لوگ ترقی سمجھتے ہیں۔ ایٹم بم اور ہوائی جہاز ترقی کے معیار نہیں ہیں۔ بلکہ ترقی کا ایک ہی معیار ہے اور وہ انسان کی راحت اور خوشی ہے۔ آج کل کی زندگی میں سرعت بے جا ہے۔ اور یہ اطمینان قلب کے منافی ہے۔ در اصل انسان کو فرصت کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے، جیسی کام کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دُنیا میں ترقی ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے ہوئی ہے جن کو فرصت تھی۔ سائنس کی ایجادات، فلسفہ کی نکتہ سنجیاں، علم ادب کی پرواز شاعری کی دل آویزیاں وغیرہ یہ سب اُن لوگوں کی مرہونِ منت ہیں جن کو فرصت تھی۔ ہاں فرصت کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔ اور یہ صحیح استعمال بغیر صحیح علم کے ناممکن ہے۔ علم کس چیز کا ہونا چاہیئے؟ آج کل کے فلاسفران تین امور بتاتے ہیں جن کا علم ہونا چاہیئے: یعنی (۱) حق، (۲) حُسن، اور (۳) نیکی۔ یہاں حُسن سے مطلب ہے ہر شئے کا اپنے موزوں مقام پر قائم ہونا۔ لیکن ان کے لئے بھی ایک معیار ہونا چاہیئے۔ اگر معیار میں اختلاف ہوا، تو شبہ پیدا ہو جائے گا۔ اور جہاں شبہ پیدا ہوا، وہاں مقصد کی یکسوئی نہ رہی۔ اور جہاں مقصد میں یکسوئی نہ رہی، وہاں امن و اطمینان نہیں۔ اور جہاں امن و اطمینان نہیں وہاں خوشی نہیں۔ انسانی غور و فکر کی ابتداء سے آج تک اس ایک معیار ہی کی تلاش رہی ہے چونکہ انسان میں خود غرضی کا جذبہ سب پر فائق ہے۔ لہذا انسان حق و حسن و نیکی کا ایک معیار نہیں قائم کر سکتا۔ جس میں اُس کی غرض وابستہ ہوگی اُس کو ہی حق سمجھے گا۔ اور جس کو وہ خود اچھا سمجھے گا، اُس کو ہی حُسن اور نیکی خیال کرے گا

اسلام کہتا ہے کہ اس معیار کا قائم کرنے والا وُہ ہے جس نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے یعنی خدا۔ اس معیار کو واضح کرنا ہی فلسفۂ اسلام ہے۔

اتنی بحث کے بعد ترقی اور ترقی کے زمانہ کی یہ تعریف معلوم ہوئی:

ترقی اس کو کہتے ہیں کہ انسان کو حق حُسن اور نیکی کا معیار معلوم ہو۔ اور اُن کے حصول کو اپنا مقصدِ اوّلین قرار دے۔ ترقی کا زمانہ وُہ ہوگا جو انسان کے اس مقصد کے حصول میں مدد دے۔

ظاہر ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب وہ نہیں ہے۔ اور نہ موجودہ زمانہ ترقی کا زمانہ ہے۔ کیونکہ یہاں تو بے چینی اور اضطراب ساری دنیا میں پھیلا ہؤا ہے۔ اس میں نہ خوشی ہے اور نہ یہ ترقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خدا اور خدا کے قانون کی طرف سے اعراض کرکے انسان نے دولت و ثروت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

باب دوم

فلسفہ اور حکمت۔ مذہب اور عقل و سائنس

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ج وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (البقرہ ۲:۲۶۹)

ترجمہ: خدا جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے۔ اور جس کو (خدا کی طرف سے) حکمت عطا کی گئی، تو اس میں شک ہی نہیں کہ اُسے خوبیوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی۔

عام طور سے فلسفہ کا ترجمہ حکمت کیا جاتا ہے۔ لیکن جنہوں نے اس مضمون کا مطالعہ کیا ہے وُہ جانتے ہیں کہ فلسفۂ یونانی میں اور حکمتِ قرآنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جس دعوٰی سے فلسفہ نے اپنی زندگی شروع کی، وُہ حکمت ہی کا پیراہن تھا۔ لفظ Philosophy جس کو اُردو میں فلسفہ کہتے ہیں یونانی زبان کے دو اجزاء سے مرکب ہے Philo جس کے معنی محبت کرنے والے کے ہیں اور sopher جس کے معنی عقل کے ہیں Philosopher کے معنی عقل سے محبت کرنے

والے کے ہوئے۔ اور Philosophy کے معنی ہوئے عقل سے محبت کرنے کا ہنر یا علم، یہ بہت اچھی شئے ہوئے۔ حکمت بھی عقلِ سلیم ہی پر مبنی ہے اور وہ حکمت اسلام کی روح ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر فلسفہ عقل سلیم و صحیح پر مبنی ہے، تو وہ حکمت ہے، اصلی فلسفہ ہے۔ قرآن شریف کا فلسفہ عقل سلیم پر مبنی ہے لہذا صحیح و اصلی فلسفہ ہے۔ حکمت ہے۔

فلسفۂ یونان بھی بہت دور تک عقل و حکمت کے ساتھ چلتا رہا۔ اور دنیا کو اُس نے بہت فائدہ پہنچایا۔ سب سے پہلے یونان کے بتوں کو اس نے ہی توڑا تھا۔ اس فلسفہ کی ابتداء میں اُس زمانہ کے تمام علوم اُس میں شامل تھے۔ آخرکار اُن میں وہ تمام علوم داخل ہو گئے جن کا تعلق عقل سے تھا۔ یعنی طب، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبعیات، ہیئت وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ لفظ فلسفہ کا اطلاق مظاہر قدرت، فطرت کے اسباب، اُن کی فعالیت اور قوانین پر ہونے لگا۔ قرآن شریف نے بھی ان مظاہرِ قدرت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ہے کہ افلا تعقلون۔ یعنی غور و فکر کرو تو یہ ہی مظاہرِ قدرت کائنات کے خالق کی طرف دلالت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اتنی دُور تک ساتھ ساتھ چلنے کے بعد جب عقل انسانی کی انتہا پر پہنچ گئے تو اب راہیں کٹ گئیں۔ حکمتِ قرآنی نے کہا کہ لا علم لنا الّا ما علمتنا۔ اور آگے چلنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ؎

اگر یک سر موئی برتر پرم ؎ فروغِ تجلی بسوزد پرم

فلسفۂ یونان نے عقلِ انسانی کے لیئے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اور گمان کیا کہ انسان کائنات کی حقیقتِ اوّل معلوم کر سکتا ہے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تو حکمتِ قرآنی تو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیئے اُس سے علیحدہ ہو گئی کہ لکم دینکم ولی دین لیکن دہریت اُس کے ساتھ ہو لی۔ بلکہ اُس کی رہبر بن گئی۔ فلسفۂ یونان کو حقیقتِ اوّل تو کیا ملتی، خدا کو بالکل ہی کھو بیٹھا۔ عقل سلیم نے خدا کی طرف دلالت کی، اور عقلِ ناقص نے خدا سے دوری اختیار کرلی۔ یہ ہے فرق حکمتِ قرآنی اور فلسفۂ یونانی میں۔ قرآن شریف نے حکمتِ قرآنی کی تعریف ان الفاظ میں کی یہاں تک کہ اُس کا درجہ نبوت سے ملا دیا:-

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا: ۴ : ۵۴

Marfat.com

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۔ ۵ : ۱۱۰

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۔ ۶ : ۸۹

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۔ ۱۹ : ۱۲

جناب امام جعفر صادق ؑ سے کسی نے سوال کیا کہ عقل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ عقل وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے، اور جنت حاصل ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ دین اُس ہی کے لیئے ہے جو عاقل ہے۔ اور جس کے پاس دین ہے وہی جنت میں داخل ہوگا۔ انسان کو اُس کے اعمال و عبادات کا ثواب اُس کی عقل کے مطابق ملتا ہے۔ (کافی۔ کتاب العقل)

فلسفۂ یونان کی صورت عقل سلیم کی حدود سے تجاوز کر کے کیسی ہو گئی۔ خود اہلِ فلسفہ کی زبانی سُنئے۔

1. This is the tragedy of almost every civilisation that its soul is in its faith, and seldom survives Philosophy. (3)

2. A nation is born stoic and dies epicurean. At its cradle religion stands, and philosophy accompanies it to the grave. (4).

(3) Wherever philosophy arises, the moral health of the nation decays. (5)

(4) It was even a saying among the philosophers themselves that since learned men had appeared, honest men were nowhere to be found (6)

(حاشیہ ۳، ۴، ۵، ۶ صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ ہو)

ترجمہ: (۱) تقریباً ہر قوم کی تہذیب کے ساتھ یہ المیہ ہوا ہے کہ اُس کی رُوح تو یقین محکم میں ہوتی ہے۔ اور فلسفہ اُس کو برباد کر دیتا ہے۔

Marfat.com

(۲) قوم جب اُبھرتی ہے تو اوّل اوّل وُہ لذات دنیاوی سے نفرت کرتی ہے۔ لیکن آخرکار عیش پرست ہو کر وہ مرجاتی ہے۔ (اقبال نے اس ہی کلیہ کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

آ ہم تجھے بتلائیں تقدیرِ اُمم کیا ہے
تلوار و سناں اوّل اور چنگ و رباب آخر

اُس کے مہد کے پاس تو مذہب اُس کی نگرانی کرتا ہے۔ لیکن پھر فلسفہ آجاتا ہے اور وُہ اُس کو لحد تک پہنچا دیتا ہے۔

(۳) جب کبھی کسی قوم میں فلسفہ پیدا ہوتا ہے تو قوم کے اخلاق گر جاتے ہیں۔

(۴) خود فلاسفران میں یہ مقولہ رائج تھا کہ جب سے یہ عقل والے لوگ آئے ہیں تب سے ایمان دار آدمی کہیں نہیں ملتے۔

فلسفہ کے متعلق انگلستان کے فلاسفر Mr. Bacon کا مقولہ بھی سُننے کے قابل ہے۔ وُہ کہتے ہیں:-

A little philosophy inclineth a man's mind to atheism, but depth in philosophy bringeth men's minds about to religion (7)

ترجمہ: تھوڑا سا فلسفہ کا علم انسان کے دماغ کو دہریت کی طرف راغب کرتا ہے۔ لیکن اس کا گہرا مطالعہ انسان کے دماغ کو پھر مذہب کی طرف راجع کر دیتا ہے۔

حدیث صحیح میں وارد ہُوا ہے کہ جب خداوند تعالےٰ نے عقل کو خلق کیا، تو اُس سے مخاطب ہو کر فرمایا:- ما خلقت خلقا احبّ الیّ منك ولا

(3) Will Durant : Our Oriental Heritage, Chap. viii, p. 193.

(4) Ibid. Chap. ix. p. 259

(5) Will Durant : The Story of Philosophy, p. 232.

(6) Rousseau : A Prize Essay for the Academy of Dijon.

(7) Forty Thousand Quotations, compiled by Charles Noel Douglas, p. 1303

Marfat.com

اکملتك الا نی من احب ۔ یعنی میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جس سے مجھے تجھ سے زیادہ محبت ہو ۔ اور تجھ کو میں نے صرف اُن لوگوں میں کامل کیا ہے جن سے میں محبت کرتا ہوں ۔

کتنے کم سمجھ ہیں وُہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول و قواعد عقل کے خلاف ہیں ۔ در اصل تو فلسفہ اور مذہب میں کچھ اختلاف نہ ہونا چاہیئے ۔ کیوں کہ دونوں کا تعلق انسان اور اُس کے ماحول سے ہے اور دونوں حق کے متلاشی ہیں لیکن مغربی تہذیب کے زیرِ اثر پرورش یافتہ، علماء، فلاسفہ اور مصنفین یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ فلسفہ و مذہب میں اختلاف ہے ۔ اُن کا یہ کہنا ٹھیک ہے کیونکہ اُن کے زیرِ نظر تو وُہ ہی اُن کا نقلی فلسفہ ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں ۔ اور اُن کا وہ مذہب ہے جو اس ہی قسم کے فلسفوں سے اثر لیتا ہوا مسخ ہو کر اُن تک پہنچا ہے ۔ اِن اثرات سے مل کر مذہب ایک مرکب شئے بن گئی ہے ۔ نہ تو دہریت کا فلسفہ رہا اور نہ خدائی حکمت ۔ لہٰذا اختلاف ضروری تھا ۔ اور یُوں بھی وجہ اختلاف عیاں ہے ۔ یہ فلسفہ چونکہ عقلِ انسانی پر مبنی ہے اور عقل انسانی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، لہٰذا فلسفہ میں یقین مطلق نہیں ہے ۔ اُس کو خود بھی شک رہتا ہے، دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا رہتا ہے ۔ اُس کے نظریئے آئے دن بدلتے رہتے ہیں ۔ لہٰذا یہ فلسفہ یقین کے لیئے زہرِ قاتل ہے اور اُس کے طلبہ کی ذہنیت یقین کے بر خلاف ہو جاتی ہے ۔ اور مذہب مبنی ہی محض یقین پر ہے ۔ انسان کی وہ زندگی جس میں FAITH یعنی یقین نہ ہو انسانی زندگی کہلائے جانے کے قابل نہیں ۔ دوسری وجہ اختلاف یہ ہے کہ فلسفہ محض تخئیل ہے ۔ خیال ہے ۔ خیالی تصور ہے ۔ وہ کبھی نہیں سوچتا کہ میں جو اپنی عقل اور منطق سے نظریئے قائم کر رہا ہوں وُہ قابلِ عمل بھی ہیں ۔ افلاطون نے ان دونوں کی مدد سے ایک خیالی ریپبلک قائم کر دی ۔ خیال تو اچھا تھا کہ جب تک حکمران عدلِ مطلق نہ کریں گے ظلم رہے گا ۔ لیکن وُہ خیالی نظام ایسا ناقابلِ عمل تھا کہ کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں وُہ خیالی ریپبلک قائم نہ ہو سکی ۔ ذہن اور قوت متخیلہ کو ایک خاص قسم کی تشکیل کرنے اور تربیت دینے کے علاوہ یہ فلسفہ انسان کی عملی زندگی میں مفید اور کارگر ثابت نہ ہُوا ۔ مذہب کا مقصد اور

Marfat.com

منتہی ہی عمل ہے ۔ اگر عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔ لہٰذا خدائی حکمت میں بار بار عمل پر زور دیا گیا ہے ۔ اور قرآن شریف میں جہاں جہاں نجات، جنّت کا وعدہ کیا گیا ہے، وہاں صراحتاً ایمان و عمل دونوں کی شرط رکھی گئی ہے ۔ افلاطون جیسی خیالی ریپبلک کے متعلق Livius کہتا ہے :-

A republic of Philosophers, such as speculative men are fond of forming in imagination, but which was never known.

ترجمہ:- وہ جمہوریت جس کے حکمران فلاسفران ہوں جیسی کہ خیالی آدمی اپنے تصور میں بنانے کے شائق ہیں لیکن جو کبھی معرض وجود میں نہیں آئی"۔

ایسی روز مرہ کی باتیں کہ انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے یا ہونا چاہیئے، نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے، نیکی کیوں اچھی ہے، بدی کیوں بُری ہے ۔ ان امور کو فلسفہ قطعی طور سے نہ فیصلہ کر سکا۔ بہت بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں، بحثیں ہوئیں، لیکن نتیجہ نہ کچھ نکلا سوائے اس کے کہ بہت سے فرقے بن گئے جن میں آپس میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ یہ کیوں ایسا ہوُا ۔ اس وجہ سے کہ فلسفہ کے پاس کوئی اٹل اور مستقل معیار نہیں ہے ۔ فلسفہ کو ہر ایک شخص کے قیاس و خیال کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے ۔ وہاں معیار مقرر ہے ۔ اور معیار بھی ایسا مستقل، کہ خدائے لایزال کا قائم کیا ہوُا ۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب دیا جائے کہ اسلام میں بھی تو فرقے پیدا ہو گئے ۔ ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں فرقے نہیں ہوئے، بلکہ مسلمان متفرق ہو گئے ۔ اسلام تو وُہ ہی ہے جو جناب رسول خدا لائے تھے، لیکن فلسفہ وُہ نہیں ہے جو پہلے فلاسفہ مثلاً ثالیس امپڈوکلیز یا افلاطون اور ارسطو نے ایجاد کیا تھا ۔ ہر ایک فلاسفی کا علیحدہ فلسفہ ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں بھی فرقے اُس وقت پیدا ہوئے جب اُنہوں نے فلسفہ کی تقلید میں اپنے قیاس کو امورِ اسلام میں دخل دیا ۔

ان کے علاوہ اور بہت سے اہم مسائل ہیں جو مذہب اور فلسفہ کے سامنے برائے حل پیش ہوتے ہیں ۔ جب انسان کی آنکھ اس دُنیا میں کھُلی، تو اُس نے اپنے ماحول پر غور و فکر کرنا شروع کیا ۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں،

میرے ہونے کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا میں بھی جانوروں کی طرح کچھ دنوں میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاؤں گا۔ یہ دُنیا کیا ہے۔ کیوں کر معرض وجود میں آئی۔ اس کا بنانے والا اور اس ساری کائنات پر حکومت کرنے والا، اور اُن کا انتظام کرنے والا کوئی تو ضرور ہونا چاہیئے۔ وُہ کون ہے۔ مجھے اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ اپنے خاندان والوں، رشتہ داروں اور غیروں سے کیسے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ دُنیا میں مجھ سے زیادہ زبردست کون کون سی طاقتیں ہیں۔ ان کے ساتھ میرا برتاؤ کیسا ہونا چاہیئے۔ اپنی جان، اپنے مال اور اپنی اولاد کو کس طرح محفوظ رکھنا چاہیئے۔ آفتاب، ماہتاب، ستارے سیارے یہ کیا ہیں۔ کیوں ہیں اور ان کا تعلق ہماری زمین سے کیا ہے۔ معاشرت معیشت، اخلاقیات، حکومت وغیرہ سب ان سوالات کے صحیح جوابات پر مبنی ہیں۔ اگر ان جوابات کو حکمتِ خداوندی و قرآنی کی روشنی میں مرتب کیا جاتا، تو دنیا میں افراتفری، فتنہ و فساد، نفرت و عداوت، ظلم وجور نہ ہوتے۔ اسلام نے ان جوابات کو پیش کیا لیکن انسان کی عقل نے بغاوت کی، اور ان پر عمل نہ کیا۔ نتیجہ وہ ہوا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

مغربی تہذیب نے یہ مسلمہ قائم کیا ہے کہ فلسفہ و سائنس و مذہب کا آپس میں اتحاد نہیں ہو سکتا۔ جہاں فلسفہ و سائنس ہوں گے، وہاں سے مذہب گریز کر جائے گا۔ جہاں تک اس مغربی تہذیب کے وطنی مذہب کا تعلق ہے۔ تو یہ کلیہ درست ہی یورپ میں جو مذہب رائج ہوتا رہا ہے وہ ایسا ہی تھا کہ عقل و حکمت سے گریز کر جائے۔ سب سے پہلے یونان کی داستانیں تھیں جن کا نام مذہب رکھ لیا تھا۔ بعیداز عقل، خلاف ازقیاس ایک سیر کہسار قائم کرلی تھی۔ کوہ المپس اور اس کے خدا۔ یہ بھی کوئی خدا تھے۔ انسان نے اپنی ہی خواہشات و نفسانیات برطے پیمانہ پر ان خیالی آبادیوں کو دے دی تھیں۔ یونان کے تمام فلاسفران ہمیشہ اُن کے خلاف رہے اور اس مذہب کا مضحکہ اڑاتے رہے، کمزوری اور شکست کے جھونجل میں اُنھوں نے سقراط کو ہلاک کر دیا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو ہمارے مُلک کے خداؤں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ وُہ مذہب تو یُوں گیا، سقراط گیا، لیکن اُس کی عقل کی باتیں تو نہیں مریں۔

اس کے بعد یہ سلسلہ یورپ میں مسیحیت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مسیحیت

کے کارکنان اول مثلاً پیٹر اور پال، کے لئے ہمارے پاس سوائے تعریف کے اور الفاظ نہیں ہیں۔ انہوں نے دُور دراز ممالک میں سفر کرکے نہایت جرأت و خلوص کے ساتھ صحیح وحدانیت کے اعتقادات دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ حضرت عیلےٰ کو ایک نبی برگزیدہ سمجھتے تھے۔ ابھی تک عیلےٰ کی ابنیت و امتزاج فطرتِ بشریہ و الٰہیہ کے اعتقادات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ اعتقادات تو بعد کی پیداوار ہیں۔ جب کارکنان مسیحیت کا مقابلہ نہایت سختی سے مُلک کے مروجہ مذہب متھرا ازم سے ہوا۔ وُہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگر وُہ متھرا ازم کے بڑے بڑے اعتقادات اپنے مذہب میں نہ لیں گے، تو مسیحیت کو شکست ہو جائے گی۔ لہٰذا اُنہوں نے یہ دونوں اعتقادات اور بہت سے رسومات متھرا ازم سے لے کر اپنے مذہب میں داخل کرلیں۔ اور بائیبل کو ان اعتقادات کے مطابق کرنے کی غرض سے بہت جلد اُسے تبدیل کردیا۔ زبان بھی دوسری دے دی، اور مضمون بھی دوسرا دے دیا۔ حضرت عیلےٰ اور اُن کے اصلی حوارین کی زبان ارمی تھی۔ اُس میں ہی بائیبل تھی۔ اُس کو گریک یعنی یونانی زبان سے بدل دیا۔ اور پھر لاطینی زبان میں آگئی۔ تفصیلات کے لیئے دیکھو ہماری کتاب: "البلاغ المبین"۔ حصہ دوم۔ طبع ثانی۔ صفحات ۳۷۹ تا ۳۹۵

اس ہی اصول و آشتی مابین حق و ناحق کو اپنے زیرِ نظر رکھ کر اس مذہب کے پادری آگے بڑھے اور بجائے اس کے کہ اپنے زمانہ و اپنے مذہب کے مطابق کرتے، اُنہوں نے اپنے مذہب کو اپنے زمانوں کے مطابق کرلیا۔ انہوں نے غلط تاویل و غلط قیاس کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو ایسا بنا لیا تھا، کہ وُہ ذرا بھی عقل کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس مذہب کے چند اصول جو عقل سلیم و صحیح لہٰذا فلسفہ اور سائنس کے خلاف ہیں یہ ہیں:- (۱) اعتقاد کہ بیماریوں، وباؤں، طوفان اور دیگر آفتوں کے پیدا کرنے والے جادو اور جادوگرنیاں تھیں۔

(۲) معجزات کی بھرمار۔ یہاں تک کہ ہر پادری کے جوتوں اور چادروں سے معجزے ظاہر ہونے لگے۔

(۳) کلیساؤں میں بُت پرستی۔ اور یہ اعتقاد کہ بُتوں اور اُن کی تصاویر سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔

Marfat.com

(۴) عورتوں کے متعلق اعتقاد کہ یہ ہی معصیت کا اصلی سبب ہیں۔ شیطان کے ایجنٹ ہیں، ان سے چھو جانا گناہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تو محض دوزخ میں جلنے کے لیئے ہیں، ان کی نجات کبھی نہ ہوگی۔

(۵) Atonement یعنی اعتقاد کہ جب شیطان نے حوّا کو اور اُس کے ذریعہ سے آدم کو ورغلایا، تو خدا کو بہت غصہ آیا اور اُس نے اپنے بیٹے حضرت عیسٰیؑ کو صلیب کے لیئے پیش کیا۔ تاکہ وُہ آدمیوں کے گناہوں کا عوض ہو جائے اور آدمی کی روح پاک ہو جائے۔

(۶) خدا کی ویسی ہی شکل ہے جیسی کہ انسان کی۔ اور خدا اپنے انبیاء یا Patriarchs کے سامنے اپنی شکل یعنی انسانی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔

(۷) Papal Dispensations یعنی گناہوں کی پاداش سے بریت کی دستاویزات پوپ اپنی فیس لے کر جو گناہ کی عظمت کے تناسب سے ہوا کرتی تھی یہ پروانہ دیتا تھا۔ یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اُس سے اُس گناہ گار کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور حرام نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ اور پھر وُہ سیدھا مزید باز پُرس کے بغیر جنت میں چلا جاتا ہے۔ حرام نکاح کی جواریت کی اُس زمانہ میں بڑی ضرورت تھی۔ ورثہ کی تقسیم کا دارومدار اس پر تھا۔

ایسے ہی اور بہت سے اعتقادات تھے جو عقلِ سلیم کے خلاف تھے فلسفہ اور سائنس نے مل کر خوب ان کا مذاق اُڑایا۔ اور بتایا کہ بیماریوں، طوفان، اور دیگر مصائب کے لیئے تو قوانین قدرت وصحت ہیں جن پر اُن بے چاری جادوگرنیوں کا کچھ اختیار نہ تھا جو نہایت ظلم و بے دردی کے ساتھ پادریوں کے حکم اور اُن کے اہتمام سے قتل کی گئیں۔ اب یہ خیال عام لوگوں کے دل میں بھی جاگزیں ہوگیا کہ اس مذہب کو عقل سے کچھ تعلق نہیں۔ اور پھر آیندہ چل کر یہ خیال عام ہوگیا، اور ہر ایک مذہب کو خلافِ عقل سمجھا جانے لگا۔

ہر ایک صاحب غوروفکر پر واضح ہے، اور ہم اس کتاب میں انشاءاللہ اس کو ثابت کریں گے کہ اسلام اس بے عقلی کے دائرہ سے باہر ہے۔ نہ اسلام مسخ ہوا اور نہ اسلام کی کتاب (قرآن شریف) لفظاً محرّف ہوئی۔ ہاں یہ نہ تسلیم کرنا خلاف انصاف

و دیانتداری ہوگا کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کا مذہب یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فلسفوں کے زیرِ اثر آن کر اُسی طرح مسخ ہوگیا کہ جس طرح یہودیت اور مسیحیت مسخ ہوئی تھیں۔ یہ مسلمات تاریخیہ میں سے ہے اور ہم نے اُس کو اپنی کتاب نورالمشرقین من حیاۃ الصادقین میں بیان کیا ہے۔ ہر ایک شخص نے اپنے لیئے ایک علیحدہ "اسلام" اپنے قیاس کے مطابق بنا لیا ہے۔ مغربی تہذیب کے لادینی اصول اپنی رہنمائی کے لیے منتخب کرلیئے ہیں، اور اپنے تیار کردہ اسلام کو ان اصولوں کے ڈھانچہ میں ڈھال لیا ہے۔ مثلاً

(۱) مسلمان مولوی تو تنگ دل اور تنگ نظر ہیں۔ دراصل سب مذاہب سچے ہیں۔

(۲) ہر وقت مذہب کو اپنے ساتھ نہیں لیئے پھرنا چاہیئے۔ مسجد اور گرجا کے باہر کوئی مذہب نہیں ہے۔

(۳) مذہب کو حکومت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مذہب کے اصولوں کو حکومت کی سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

(۴) دوزخ، جنّت، حور، غلمان کچھ نہیں۔ یہ تو محض لوگوں میں کردار نیک پیدا کرنے کے لیئے وعدہ وعید کیئے گئے ہیں۔ ان کو فقط استعارات سمجھنا چاہیئے۔

(۵) دنیاوی ترقی کا نام اسلام ہے۔ دنیاوی تنزل کا نام کفر ہے۔ انگریز، جرمن روسی اور امریکن سچے مسلمان ہیں۔ عرب و ایران و شام کے مسلمانان اصلی کافر۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے، تو علامہ عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ ملاحظہ کرے۔

(۶) انسان کی زندگی کئی حصّوں میں منقسم ہے۔ مثلاً خانگی زندگی، سیاسی زندگی، پبلک زندگی، دفتری زندگی، پرائیویٹ زندگی، مذہبی زندگی وغیرہ وغیرہ۔ سوائے مذہبی زندگی کے اور وُہ بھی مسجدوں کے اندر، اور کسی زندگی پر مذہبی رنگ نہ ہونا چاہیئے۔

اگر ان سے کہو کہ علماء دین جو ازمنہ ماضیہ میں گذرے ہیں، وہ تمہارے ان خیالات کی تائید نہیں کرتے اور احادیثِ رسولؐ تمہارے خلاف ہیں، تو جواب ملتا ہی کہ "اسلام" میں جو کچھ خرابیاں اور فرقہ پردازیاں ہیں، وُہ ان ملّاؤں ہی کی تو پیدا کردہ ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو خراب کر دیا ہے۔ احادیثِ رسولؐ سب غلط ہیں۔ قابلِ اعتنا

نہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی وغیرہ سب غلط حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔ سب تفاسیر قرآن غلط۔ تیرہ صدیوں تک کسی نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔ اب ہم کو خدا نے خاص طور سے قرآن کے صحیح معانی سمجھنے اور اُن کی تبلیغ کرنے کے لیئے پیدا کیا ہے۔ اس جدید اسلام کا خالق کراچی کے اُفق سے طلوع ہو رہا ہے۔

مذہب اسلام کی تاریخ میں یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے بہتر سے زیادہ فرقے۔ عقائد میں ایک دوسرے کے بالکل برعکس و متضاد۔ لیکن ہر ایک فرقہ کہتا ہے کہ صحیح اسلام فقط ہمارے ہی پاس ہے، اور کسی کے پاس نہیں۔ اس کی تشریح آگے آتی ہے۔

باب سوم

اسلام سے کونسا مذہب مُراد ہے

اس باب کا عنوان لوگوں کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ مسلمان مؤرخین و مصنفین نے اپنے موروثی عقائد سے مجبور ہوکر اور یوروپین مؤرخین نے بغیر سوچے سمجھے اُن کی تقلید میں یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے کہ اسلام سے وُہ مذہب مراد لیتے ہیں جو آنحضرت کے بعد کے آنے والے خلفا، وسلاطین کے اقوال و افعال و عقائد نظام اور طرزِ عمل سے مستنبط ہوتا ہے۔ یہ بات اُن کے روز مرہ کے تقاریر اور اُن کتابوں سے ظاہر ہے جن کے عنوان ایسے ہوتے ہیں: اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا طرزِ حکومت، اسلام کے عقائد وغیرہ وغیرہ۔ اِن کتابوں میں رسولِ خدا کے طرزِ عمل و دستورِ حکومت کا تو ذکر تک نہیں ہوتا، لیکن آنحضرت کے بعد کے آنے والے خلفاء وسلاطین کے طرزِ حکومت، سیاست، اصُولِ جہاں بانی، اقوال و افعال اور عقائد کا ذکر ہوتا ہے صریحاً یہ غلط ہے۔ دراصل اسلام تو وُہ ہے جو آنحضرت نے سکھایا، اور خود عمل کر کے دکھایا۔ اُن کے بعد کے خلفاء اور سلاطین کو آنحضرت کے مقرر کردہ اسلام کی ترمیم و تنسیخ کا اختیار نہ تھا۔ اُن کا طرزِ عمل، اُن کا مجموعۂ عقائد، اُن کی سیاست اور طرزِ حکومت

تو اس کشمکش کا نتیجہ ہیں جو ان کو اپنا اقتدار و تسلط قائم کرنے اور اُس کو مستقل و مستحکم کرنے میں پیش آئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ان امور کے لیئے جن عقائد و اصول و طرزِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے' اُن کا تعلق صحیح مذہب سے نہیں ہوتا۔ جن بزرگوں کو تفصیل کی ضرورت ہے۔ اور وہ اس پر ذرا مفصل بحث چاہتے ہیں اُن کو چاہیئے' کہ ہماری تین کتابیں ضرور پڑھیں یعنی البلاغ المبین حصہ اوّل و دوم اور کتاب التفریق و التحریف فی الاسلام۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے فرقوں اور معتقدات کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیونکر کیا جاوے کہ صحیح اسلام کس کے پاس تھا' اور اب کس فرقہ میں تلاش کریں؟ ایسے تنازعات کا فیصلہ کرنے کا اصول بھی قرآن شریف نے بتا دیا ہے۔ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ۔ ۳: ۶۴۔ تنازعہ زیرِ بحث یہ ہے کہ آیا جناب رسولِ خدا نے اسلام کی ہدایت و قیادت و جمعیت کے لیئے کوئی مرکز مقرر کیا یا نہیں' اور اگر کیا تو وہ کون سا مرکز تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مشترک اور مسلمہ کلمہ اس تنازعہ میں کونسا ہو سکتا ہے جس کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ یونان و ایران کے فلاسفران بھی اس کی تحکیم کو اسی طرح قبول کرتے ہیں جس طرح ہندوستان و انگلستان کے حکماء و مدبران ماضی و حال مانتے ہیں۔ جو انسان اور حیوان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ جس کی حکومت تمام انبیاء کے ساتھ رہی ہے اور تا قیامِ قیامت جاری رہے گی۔ جس کی طرف خدا نے انسان کی توجہ دلائی اور جس کو قرآن نے ایمان و کفر کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا وہ کیا ہے۔ وہ انسان کی عقلِ سلیم ہے یعنی وہ عقل جو حکم بننے کے درجہ تک ترقی کر چکی ہے اور جو کسی عصبیت یا جدی و ناجائز میلان سے مؤثر نہ ہو۔

اب وہ سوالات مقرر کریں جو ہمارے اس تنازعہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر دیکھیں کہ یہ صحیح عقلِ انسانی اُس کا کیا جواب دیتی ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں:-

(۱) قرآن شریف نے حکم دیا ہے کہ ایک حبل اللہ ہے اُس کو تم مستحکم پکڑے رہو۔ اور امم سابقہ کی طرح متفرق نہ ہو جاؤ۔ فطرتِ انسانی میں متفرق ہو جانا ہے

Marfat.com

چنانچہ قرآن نے خود بتایا کہ پچھلے لوگوں نے متفرق ہوکر اپنے مذہب اور اپنی حکومت کو خود ضایع کر دیا۔ اس تفرقہ سے بچانے کے لیئے کسی مرکز کی ضرورت تھی یا نہیں۔

(۲) جناب رسولؐ خدا اس ضرورت اور اس حکم خداوندی سے واقف تھے یا نہیں۔

(۳) جناب رسولؐ خدا کو ضرور علم ہونا چاہیئے تھا' اور تھا۔ تو پھر آپ نے کوئی مرکز مقرر کیا یا نہیں۔

(۴) ضرورت بھی تھی۔ آنحضرتؐ کو اس ضرورت کا علم بھی تھا۔ تو آنحضرتؐ نے کونسا مرکز مقرر کیا۔

(۵) یہ بھی ضروری تھا کہ جس کو صاحب مرکز بنانا تھا' اُس کو ابتداء ہی سے جناب رسولؐ خدا اپنے زیر تعلیم رکھتے۔ اور اُس وقت سے رکھتے کہ ابھی مخالف نظریہ یعنی کُفر کا شائبہ بھی اُس پر نہیں پڑا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ مہد کے اثرات لحد تک ساتھ رہتے ہیں۔

(۶) یہ بھی ضروری تھا یا نہیں کہ اس مرکز کا اعلان آپ وقتاً فوقتاً اُمت کے سامنے کرتے رہتے' اور اپنی رحلت کے زمانے کے نزدیک بھی کرتے۔

(۷) اُمتِ اسلامیہ کے اُس وقت دوؔ طبقے تھے۔ اصحاب رسولؐ اور آلِ رسولؐ وُہ مرکز ان دونوں میں سے کس میں ہونا چاہیئے تھا۔ مولوی شبلی کا تو یہ قول ہے اور صحیح ہے کہ "باہر والوں کی نسبت گھر والے حالات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں"(8) اور اصحاب رسولؐ میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا بچپن اور شباب عبادت اوثان اور رجس اصنام میں نہ گزرا ہو۔ یعنی اسلام کے مخالف نظریہ کے زیر اثر نہ رہا ہو۔

(۸) کیا یہ ضروری نہیں کہ جو مرکز مقرر کیا جائے اُس کے افراد کی سوانح حیات اور اسلام پر اُس کے احسانات ایسے ہوں کہ انصافاً اور عقلاً یہ ہی سب کو ماننا پڑے کہ واقعی وُہ ہی اس مرکز کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور اس میں یہ بھی

---

(8) شبلی: سیرۃ النعمان صفحات ۳۵-۳۶ ۔ پوری متعلقہ عبارت یہ ہے: "امام ابوحنیفہ کتنے ہی بڑے محدث ہوں اور فقیہہ۔ لیکن فضل وکمال میں ان کو حضرت جعفر صادق سے کیا نسبت؟ حدیث وفقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت کے گھر سے نکلے۔ وصاحب البیت ادری بما فیہا۔

خوبی ہو کہ وُہ آل میں بھی نزدیک ترین ہو، اور اصحاب میں بھی قریب ترین۔

جو جوابات اِن سوالات کے عقل سلیم دیتی ہے اُن کا تذکرہ ہم نے تفصیل سے اپنی کتاب البلاغ المبین حصہ اوّل و دوم میں کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ مرکز آنحضرتؐ نے اپنے اہل بیت میں مقرر کیا جس کے راس و رئیس حضرت علیؑ تھے۔ یہ تقرر رشتہ داری کی بناء پر نہ تھا، بلکہ حضرت علیؑ کی افضلیت اس کی ہی متقاضی تھی۔

اس بحث کا جواب تو کیا ہو سکتا تھا۔ مولوی شبلی علیہ الرحمۃ نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر یہ بات پیدا کی کہ "جناب رسولؐ خدا کے لائے ہوئے اسلام میں ہر زمانہ کے ساتھ چلنے اور اُس کی ضروریات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ وُہ دوش بدوش نہیں چل سکتا تھا۔ اس کمی کو حضرت عمر نے اس اسلام کی ترمیم و تنسیخ کر کے پُورا کیا"۔ اس رائے کی تردید ہم نے مفصّل بحث کے ساتھ اپنی کتاب التفریق والتحریف فی الاسلام میں کی ہے۔ جناب رسولؐ خدا کا اسلام دُنیا کے ہر زمانہ اور ہر حالت کے لیے کافی تھا، اور کافی رہے گا۔ کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ قرآن شریف کی تشریح و تاویل کی ضرورت تھی۔ اس تشریح و تاویل کی ضرورت کو اسلام کے دونوں بڑے فرقے مانتے ہیں۔ سوادِ اعظم کی رائے میں یہ تاویل کا زمانہ حضرت عمرؓ کی وفات تک ختم ہو گیا۔ اس کے بعد صرف اُس کی پیروی کی ضرورت رہ گئی۔ مجلس شوریٰ میں خلیفہ کے لیئے عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف سے پیروی سُنّتِ شیخین کی شرط کو لازمی قرار دینے کی حمایت اس ہی رائے کے مطابق ہو سکتی ہے۔ ورنہ یہ اعتراض عائد ہو گا کہ سُنّتِ رسولؐ کی پیروی کی شرط کیوں نہ لگائی۔ وُہ معقول بھی ہوتی، اور مفید بھی۔ لیکن شیعیان علیؑ کہتے ہیں کہ یہ تاویل کا زمانہ ۲۶۰ھ میں ختم ہوا جب اُن کا بارھواں اور آخری امام غیبت میں چلا گیا۔ اُس وقت تک دُنیا الحاد، بے دینی اور کُفر کی ہر وُہ حالت جو وُہ اختیار کر سکتی تھی، کر چکی تھی۔ اب قیامت تک کوئی نئی صورت اور حالت پیدا نہ ہو گی۔ اور اُس وقت تک جو صورت دُنیا اختیار کرتی تھی اُس کے لیے امام موجود ہوتا تھا۔ اور اپنے قول و فعل سے اُمت کو بتاتا تھا کہ اس خاص صورت و حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ اور یہ سب کچھ قرآن ہی سے بذریعہ تشریح و تاویل نکال لیتا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کوئی ایسی صورت و حالت پیدا نہ ہو گی جو ان بارہ اماموں میں سے کسی امام کے زمانہ میں نہ رہی ہو۔ تمدنی، معاشرتی انقلاب بھی جو ہونے تھے،

ہو چکے تھے۔ آج کل جو تمدنی و اقتصادی و سیاسی نظریئے قائم ہو رہے ہیں' وہ نئے نہیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں رُوس کا کمیونزم دُنیا کے سامنے ہے۔ جس میں مزدور اور مالک کی باہمی کشمکش بہت نمایاں ہے۔ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ عرصہ ہوا دنیا اس سے آشنا ہو چکی ہے۔ اپنی ابتدائی حالت میں مصری' بابلی' اشوری' ہندی اور ایرانی تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔ مندروں کے ساتھ شرفا کی نوجوان کنواری لڑکیوں کا انسلاک جن کو خداؤں کے نام پر وہاں رکھا جاتا تھا' لیکن ہر شہری کو اُن کے استعمال کا حق حاصل تھا اور واقعاً ہر شخص استعمال کرتا تھا صریحاً بغیر کسی شبہ کے نسوانی کمیونزم تھا بنو اسرائیل کے انبیاء نے اس کے خلاف بہت جدوجہد کی یہ نسوانی کمیونزم اُس وقت بھی تھا جب عرب میں اسلام نمودار ہوا۔ Vestal Virgins کا ادارہ بھی موجود تھا۔ اگرچہ چرچ نے اُس کو دُوسری شکل دے دی تھی۔ یہ کہنا خلافِ انصاف ہوگا کہ ہر ایک Nun اور Monk ایسے ہی تھے کہ جیسی Gibbon نے اُن Monasteries کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعض اُن میں سے بہت نیک اور مخلص تھے۔ لیکن ایسے بھی بہت سے تھے کہ جن سے مسیحیت بھی شرمانے لگی۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں اس حالت کی جوانی تھی۔ عرب میں نسوانی کمیونزم اسلام تک رہا۔ قیافہ شناسوں کی جماعت جو عرب میں پیدا ہو گئی تھی' وُہ اس کا ہی نتیجہ تھا۔ پانچ بھائی اور ایک دروپدی کا قصہ تو سُنا ہوگا۔ یہ بھی کمیونزم ہی کی شکل تھی۔ ہندوستان میں تو یہ رسم بہت عرصہ تک رہی۔ اقتصادی کمیونزم بھی تقریباً اُس شکل میں کہ جیسا اب یہ رُوس میں قائم ہے' مزدک اور مانی کے مکتب سے نکلا ہے۔ بلکہ رُوس نے ان سے ہی سیکھا ہے۔ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا' کہ یورپ نے اس کے گُر مزدک اور مانی سے لیئے اور روس نے اس کو یورپ سے لیا۔ سیاست میں زمانۂ حال کی دُنیا صریحاً Machiavelli کی پیروی کر رہی ہے۔ اور Machiavelli نے اپنے Prince کو قدماء کے مروّجہ اُصولوں پر مُرتب کیا تھا۔ تجارت کی رقابت موجودہ زمانہ میں بہت نمایاں ہے۔ در اصل دونوں عالمی جنگوں کی تہہ میں یہ ہی رقابت تھی۔ یہ وُہ ہی تجارت کی رقابت ہے جو ایرانِ پارینہ اور یونانِ قدیمہ کی لڑائیوں اور رُومیوں اور اہل فینیقیا کی لڑائیوں کا باعث تھی۔ مزدُوروں اور مالکوں کی کشمکش آج کل بہت گرم ہے۔ لیکن رومائی میں اُمراء اور

Marfat.com

عوام الناس Patrician Plebeians میں کیا کچھ کم کشمکش رہی ہے۔ اخلاقیات معاشیات، معاشرت اور سیاست یہ سب اُس ہی فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں جو ہمیشہ ایک سی رہی ہے اور رہے گی۔ اس موجودہ دُنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہے جو پہلے نہ تھی۔ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے جو پہلے نہ تھا۔ ان ہی معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اپنے تئیں دُھراتی ہے۔ ان تمام اُمور پر حضرات آئمہ علیہم السلام کے خطبات، ہدایات اور تنبیہات موجود ہیں۔

غرضکہ سنہ ۲۶۰ہجری (۸۷۴ء) کے بعد دُنیا میں کوئی ایسی نئی Ideology یا Theory ظاہر نہیں ہوئی جو پہلے نہ رائج رہ چکی ہو۔ دہریت، بت پرستی، نیچر پرستی، عقیدہ آحد دالہ، فلسفیانہ انکار خدا، مسئلہ خیر و شر، جبر و اختیار یہ سب قضئیے زیرِ بحث آچکے تھے۔ اہرمن و یزدان کی دو خدائی، عیسائیوں کی سہ خدائی وغیرہ وغیرہ یہ سب عقائد مذہبی صورت اختیار کر چکے تھے۔ آقا و غلام کا تعلق، بادشاہ و رعایا کے آپس کے حقوق و فرائض، ناجائز رسُوخ و اثر، امرا و غربا کی کشمکش، حکام کا تقرب اور اس کے ناجائز اثرات، حکومت کا ظلم، رعایا کی چیرہ دستی، بادشاہت، جمہوریت، انتخاب وغیرہ وغیرہ کوئی عقیدہ یا مسئلہ ایسا نہ تھا جو اس عرصہ میں مسلمانوں کے سامنے نہ آیا ہو، اور آئمہ علیہم السلام کے زمانہ میں اس پر بحث نہ ہوئی ہو، اور اس کے متعلق اُن کی تعلیم نہ ہو۔ ان حضرات کی تعلیم عملی بھی تھی۔ شاہانِ جور و استبداد کی حکومت میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ قید میں رہ کر، تلوار کے نیچے، زبان بندی کی حالت میں، دست بندی کی صورت میں ہر طرح سے عملاً حق کی تبلیغ کر کے دکھا دیا۔ جب تعلیم کا ہر درس ختم ہو گیا اور کوئی مضمون باقی نہ رہا، تو امام علیہ السلام غیبت میں چلے گئے۔ تاویل و تشریح کا زمانہ ختم ہوا۔ تقلید کا زمانہ شروع ہوا۔ یہ اب تک ہے، اور اُس وقت تک رہے گا کہ جب تک امام علیہ السلام ... پھر نہ ظاہر ہوں۔

لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام سے مُراد وُہ اسلام ہے جس کی تعلیم و تشریح و تفصیل جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اُن کے مقرر کردہ معلمان و شارحینِ اسلام اور مفسرینِ قرآن یعنی آلِ محمدؐ کے اقوال سے ہوتی ہے اور اس کتاب میں اُس ہی اسلام سے مراد ہے۔ عقلِ سلیم بھی یہی کہتی ہے۔ جناب

محمدؐ مصطفےٰ بانیٔ اسلام اور معلم اسلام تھے۔ اصلی اسلام تو وُہ ہی ہے جس کی تعلیم اُنہوں نے کی۔ بعد کے خلفاء و سلاطین کو کوئی حق نہ تھا کہ اُس اسلام میں ترمیم یا تنسیخ کریں۔

کسی شے کی قدر و قیمت اور اُس کی ماہیت مقابلہ ہی سے اچھی طرح عیاں ہو سکتی ہے۔ اسلام کا بنیادی کلمہ لَآاِلٰہَ سے شروع ہوتا ہے۔ اور جھوٹے خداؤں کی نفی نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ وُہ جھوٹے خدا کون اور کیسے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں اُن کی تشریح و تفصیل اچھی طرح کی گئی ہے۔ فلسفہ اور مذہب اسلام دونوں میں مضمون زیر بحث ایک ہی ہے۔ یعنی انسان اور اُس کا ماحول۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک ہی مضمون یا مقصد کے لیئے جو دو مختلف راستوں سے مسافت طے کی گئی ہے اور اُس کے متعلق نتائج اخذ کیئے گئے ہیں وُہ کیا کیا ہیں۔ ان کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ کس نے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں اور کس نے غلطی کی ہے۔ اور غلطی کی ہے تو کہاں؟

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہم نے آلِ محمدؐ کے فلسفہ کا علیحدہ عنوان قائم نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ آل محمدؐ کا اپنا کوئی علیحدہ فلسفہ نہ تھا۔ آل محمدؐ کا وُہ ہی فلسفہ تھا جو محمدؐ مصطفےٰ کا تھا اور محمدؐ کا وہ ہی فلسفہ تھا جو اسلام کا یعنی قرآن کا فلسفہ ہے۔

باب چہارم!

ارکانِ حیاتِ ابدی

در محیط

فلسفۂ اسلام!

نقشۂ منسلکہ ھذا سے وہ ارکانِ اسلام واضح ہوتے ہیں جن پر مسلمان کی حیاتِ ابدی کا انحصار ہے۔ کتاب ہذا میں بہ تحت فلسفہ اسلام ان کا ہی ذکر

کیا جائے گا۔ ارشادِ خداوندی کے مطابق مسلمان کی نجات کے لیئے حسنِ اعتقاد وایمان اور صلاحیت عمل کی ضرورت ہے۔ اعتقاد میں ہستیٔ خدا، صفاتِ خدا اور عدلِ خدا ضروری ہیں۔ صفات میں وحدانیت، قدرت اور علم آتے ہیں۔ ہم نے عدلِ خداوندی کے تحت میں نبوت، امامت، ملائکہ، حشر و نشر، حساب، میزان جزا و سزا اور صحفِ اولی کو رکھا ہے۔ کیونکہ یہ سب عدلِ خداوندی کی شاخیں ہیں۔ نبوت، امامت اس وجہ سے قائم ہوئی کہ انسان کو جس کے پاس پہلے کوئی علم نہ تھا، اور جس کی فطرت میں بُرائی کی طرف میلان تھا اس طرح بے مہار اور بے ہدایت کے نہ چھوڑ دیا جائے۔ انبیاء و آئمہ اُس کو صحیح راستہ دکھانے اور اس راستہ پر ڈالنے کے لیئے موجود ہوں۔ حشر و نشر، سزا و جزا، میزان اُس آخری عدالت کے شعبے ہیں جہاں مثقال ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ اِن کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ مظلوم کی داد رسی ہو جائے۔ ظالم کو سزا مل جائے۔ نیک بندوں کو اُن کے نیک اعمال کی جزا، اور بد بندوں کو اُن کے بد اعمال کی سزا مل جائے۔ دراصل سارا فقہ اسلام عدل اور محض عدل پر مبنی ہے۔ شرک کو بھی تو قرآن میں ظلم عظیم کہا ہے۔

صفاتِ خداوندی تو بہت ہیں، کہتے ہیں کہ خدا کے یک صد نام ہیں اور ہر ایک نام سے اُس کی خاص صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم نے جو محض پانچ صفات یعنی: ہستی، عدل، قدرت، وحدانیت اور علم رکھے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی صفات کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ وُہ تمام صفات، بلکہ سارا نظامِ فقہ ان ہی میں آگیا جیسا کہ نقشہ منسلکہ سے ظاہر ہے۔ اس نقشہ میں امورِ معاشرت کو اخلاقیات سے علیحدہ دکھایا گیا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی ایک کو دوسرے سے بہت تعلق ہے۔ ایک کے امور دُوسرے کے اندر آتے ہیں۔ مثلاً معاہدات کو اس خیال سے کہ اسلام میں معاہدات کی بنار اخلاق وخصائلِ حمیدہ پر رکھی گئی ہے، ہم نے زیرِ عنوانِ اخلاق دکھایا ہے۔ لیکن معاشرت کے عنوان کے نیچے بھی وُہ آسکتے ہیں۔ یہ ہی صورت قرض و سُود کی ہے۔ رومن قانون میں قرض و سود و معاہدات معاشرت کے تحت میں رکھے گئے تھے۔ ان میں ہمدردی اور مقروض کی بے چارگی کو دخل نہ تھا۔ لیکن اسلام نے ان پر بہت زور دیا ہے۔ یہ ہی بہت بڑا فرق ہے اسلام کی معاشرت میں اور مغربی تہذیب کی معاشرت میں۔ اب وُہ نقشہ ملاحظہ ہو:-

Marfat.com

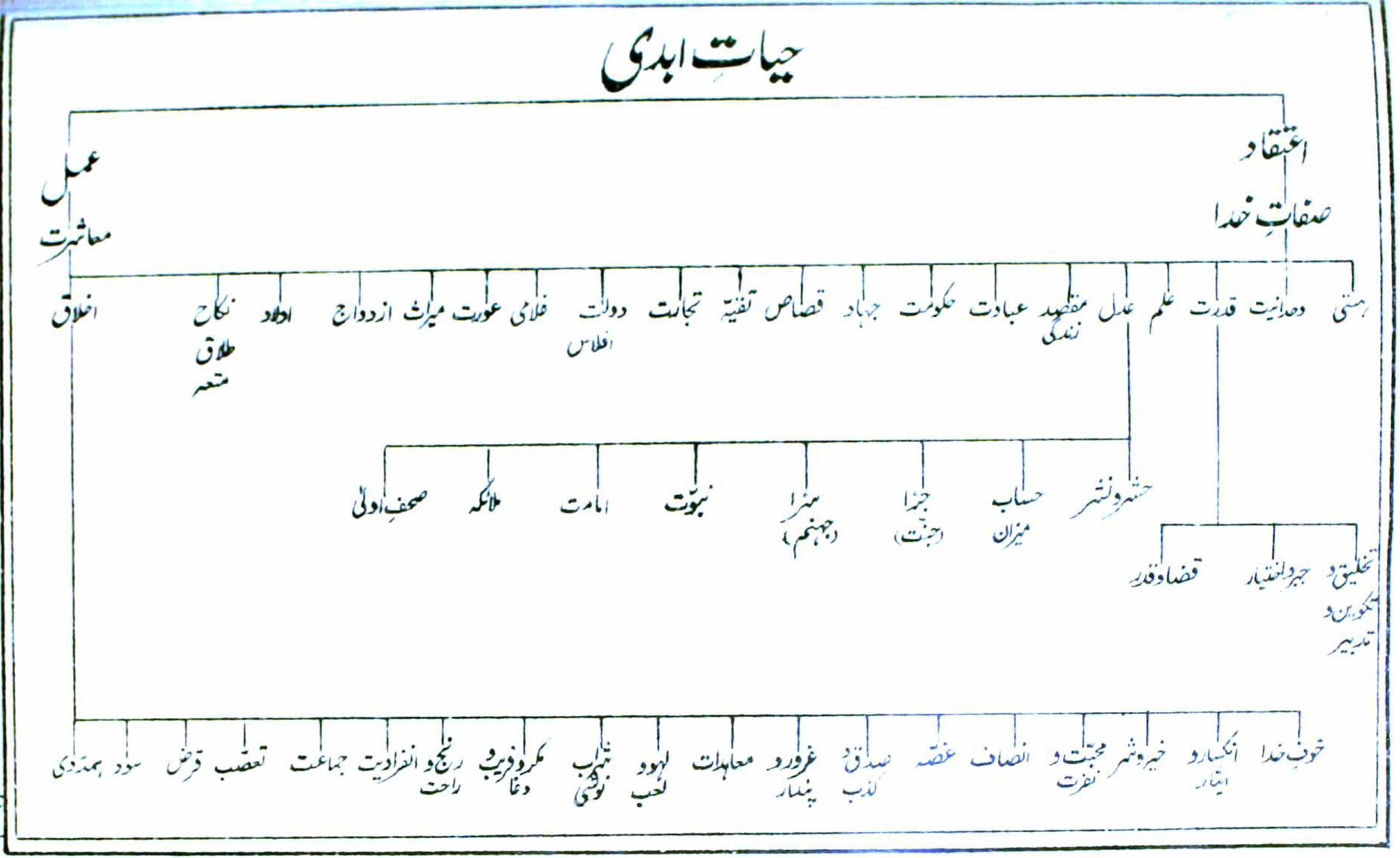
حیاتِ ابدی
اعتقاد
صفاتِ خدا
عمل
معاشرت
ہستی
وحدانیت
قدرت
علم
عدل
مقصدِ زندگی
عبادات
حکومت
جہاد
قصاص
تقیہ
تجارت
دولت
افلاس
غلامی
عورت
میراث
ازدواج
اولاد
نکاح
طلاق
متعہ
اخلاق
حشر و نشر
حساب
میزان
جزا
(جنت)
سزا
(جہنم)
نبوت
امامت
ملائکہ
صحفِ اولیٰ
تخلیق و تکوین و تدبیر
جبر و اختیار
قضا و قدر
خوفِ خدا
انکسار و ایثار
خیر و شر
محبت و نفرت
انصاف
غصہ
صدق و کذب
غرور و پندار
معاہدات
لہو و لعب
شراب نوشی
مکر و فریب دغا
رنج و راحت
انفرادیت
جماعت
تعصب
قرض
سود
ہمدردی

باب پنجم

غیر اسلامی فلسفے اور مذاہب

(ماسوائے فلسفہ و مذہبِ یونان)

دُماں کُجا کہ درد بدرماں فزوں شود ، دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیا

ہم کو ان ازدیاد رفتہ انسانوں اور قوموں کا فلسفہ معلوم نہیں جن کے حالات کو تاریخ اپنے صفحات میں محفوظ نہیں کر سکی۔ بنی نوعِ انسان کی تہذیب ایک رواں سمندر ہے جس کا ہر ٹکڑا دوسرے ملا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ قومیں نیست و نابود ہو گئی ہیں اور ان انسانوں کے نام و نشان ہم تک نہیں پہنچے۔ لیکن اُن کے خیالات اب تک زندہ ہیں۔ ان کے فلسفہ و خیالات نے اُن قوموں کے فلسفہ اور ذہن پر اثر ڈالا جن کے حالات اور فلسفے ہم تک پہنچے ہیں۔ زمانۂ حال کے انکشافات اور تحقیقات ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ تہذیب سے کہیں بہتر اور طاقتور تہذیبیں ماضی میں گزری ہیں جن کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ انسان بذریعہ ارتقا ترقی کر رہا ہے بلکہ یہ تو اب تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ نظریۂ ارتقا پر اب نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔ آگے چل کر اس کو ہم تفصیل سے بتائیں گے۔ ایک امریکن مؤرخ لکھتا ہے :-

Certainly it is probable, as Aristotle thought, that many civilisations came made great inventions and luxuries. were destroyed and lapsed from human memory. History. said Bacon, is the planks of a ship wreck ; more of the past is lost than has been saved (9).

ترجمہ:- یقیناً یہ اغلب ہے جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ بہت سی تہذیبیں معرضِ وجود میں آئیں۔ بہت سی ایجادیں کیں اور عیش و آرام کے سامان بنائے۔ اور پھر وہ

(9) Will Durant : Our Oriental Heritage, p. 107

ایسی نیست و نابود ہوگئیں کہ اُن کی یاد تک بالکل جاتی رہی۔ ہیگن کہتا ہے کہ تاریخ تو ٹوٹے ہوئے بڑے جہاز کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ ماضی کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے اُس سے کہیں زیادہ ضائع ہو گیا ہے۔

یہ تو انسانی ضائع شدہ تہذیبیں تھیں جن کا اثر زمانہ حال پر موجود ہے۔ انسان نے تو بہت کچھ جانوروں سے سیکھا ہے۔ کوّے کا قابیل کو جُرم چھپانے میں سبق پڑھانا قرآنی صداقت ہے۔ اور بھی بہت سے جانور ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، چیل، مچھلیاں وغیرہ۔ جن سے انسان نے علم حکومت و اتحاد و معیشت و معاشرت حاصل کیا ہے۔ چیل اور مچھلیوں سے ہوائی جہاز بنانے میں مدد لی۔ یہی امریکن مؤرخ لکھتا ہے:-

The dog that buried the bone which even a canine appetite could not manage, the squirrel that gathered nuts for a later feast, the bees that filled the comb with honey, ants that laid up stores for a rainy day-these were among the first creators of civilisation. It was they, or subtle creatures like them, who taught our ancestors the art of providing for tomorrow out of the surplus of today, or of preparing for winter in summer's time of plenty. (10)

ترجمہ:- وہ کتا جو باوجود اپنی مشہور جوع الکلب کے ہڈی کھاتے کھاتے چھوڑ دیتا ہے اور اُس کو آئندہ کے لیئے زمین میں دبا کر محفوظ کر لیتا ہے، وہ گلہری جو اخروٹ و بادام کو پھر کھانے کے لیئے بچا رکھتی ہے، شہد کی مکھیاں جو اپنے چھتّے کو شہد سے بھر لیتی ہیں، چیونٹیاں جو برسات کے دنوں میں کھانے کے لیئے ذخیرہ جمع کر رکھتی ہیں یہ ہماری تہذیب کے سب سے پہلے بنانے والے ہیں۔ ان جانوروں نے یا ان جیسے دوسرے زیرک جانوروں نے ہمارے آباؤ اجداد کو آئندہ کا خیال کرنا اور موجودہ زیادہ ذخیرے میں سے بُرے دنوں کے لیئے بچا رکھنا سکھایا تھا۔"

یہ تو انسان کی حقیقت ہے۔ جسمانی حالت تو یہ ہے کہ گندے پانی جیسے ایک قطرہ سے بنا ہے۔ ذہنی و عقلی کیفیت یہ ہے کہ کوّے اور کتے اور چیونٹیاں

(10) Will Durant : Our Oriental Heritage, p. 6.

Marfat.com

اس کو عقل سکھانے والے ہیں۔ اور ان قوانین کے ماتحت جو خداوند تعالےٰ نے اس کی پرورش کے لیئے پیدا کر رکھے ہیں بڑھ کر کچھ بڑا ہوا، تو کہنے لگا کہ مجھ سے بڑا کوئی بھی نہیں۔ اور میری عقل ہی سب کچھ فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس ذلیل ہستی کا خدا سے انکار کرنا یہ بھی عجائباتِ قدرت میں سے ایک اعجوبہ ہے۔

اب ہم غیر اسلامی ضوابطِ حیات یعنی فلسفوں کا اور مذاہب کا ذکر کرتے ہیں۔ کیوں کہ مقابلہ ہی سے اشیاء و نظریات کا حسن و قبح اچھی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جیسا ہم پہلے کہہ آئے ہیں فلسفہ و مذہب کا مضمون ایک ہی ہے۔ اکثر ان فلسفوں میں مذہبی اعتقادات شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے خالص فلسفہ اور فلسفۂ مذہب کو علیحدہ نہیں لکھا۔ ممکن ہے کہ ہمارے اس بیان سے چینی اور یونانی فلسفہ مستثنیٰ ہوں۔ لیکن پھر بھی یونانی فلسفہ میں مذہب کی آمیزش آ ہی جاتی ہے۔ اور مصری فلسفہ میں اخلاقیات و سیاسیات بہت نمایاں ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو اخلاق بھی مذہب ہی کا ایک جزو ہے۔ غیر اسلامی فلسفے سوائے فلسفۂ یونان کے جن کا ہم ذکر کریں گے یہ ہیں:۔

(۱) مصری فلسفہ اور مذہب۔

(۲) بابلی فلسفہ و مذہب جس میں عیلام، عقاد، بابل، سمیر اور اشوریوں کے فلسفہ اور مذہب کا ذکر ہے۔

(۳) ہندوستان کا فلسفہ۔ یعنی ویدوں کا فلسفہ اور مذہب۔

(۴) ایران کا فلسفہ۔ یعنی (ا) مذہب زرتشت، (ب) مذہب زرتشت اپنے بانی کے بعد۔

(۵)۔ (ا) بدھ مذہب اور اس کا فلسفہ۔ (ب) بدھ مذہب اپنے بانی کے بعد۔

(۶) جین مذہب اور اُس کا فلسفہ۔

(۷) چین قدیم کا مذہب اور فلسفہ۔

(۱) مصر قدیم کا مذہب اور فلسفہ

دُنیا میں سب سے پُرانا فلسفہ مصر کا ہے۔ اس کے بعد دُنیا پر بابل کا فلسفہ

Marfat.com

قابض ہونے لگا۔ بابل سے یونان نے سیکھا، اور وُہ مختلف صورتیں بدلتا ہُوا زمانہ حال کی مغربی تہذیب میں کارفرما نظر آتا ہے۔ بابل کے ساتھ ساتھ ہی ہندوستان و چین و ایران میں فلسفے نے عروج پکڑا تھا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے یہ وُہ زمانہ تھا، کہ جب تمام مہذب دُنیا پر فلسفہ کا قبضہ تھا۔

یونان میں مصری عقل بطور مثل کے مشہور تھی، اور اہل یونان فلسفہ میں مصریوں کے مقابلہ میں اپنے تئیں بچہ سمجھتے تھے۔ دنیا میں فلسفہ کی سب سے پہلی دستاویز یا نظیر وُہ ہدایات اور ضوابطِ عمل ہیں، جو ۲۸۸۰ قبل مسیح میں ممفس کے گورنر اور فرعون خاندان پنجم کے وزیر اعظم پتاہ ہوتپ Ptah-hotep نے اپنے لڑکے کے لیے تیار کی تھیں۔ اُن کو اٹھارہویں خاندان کے کسی منشی نے قدیمی نشانات سمجھ کر لکھ لیا تھا ہدایات ایسی تھیں مثلاً:- زیادہ بولنے کی نسبت خاموشی بہتر ہے۔ گفتگو اور فعل میں غرور نہ ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک مصری دانشمند اپوور Ipuwer ہے جس کے فلسفہ پر رنج غالب ہے۔ غالباً وُہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ خودکشی کی وارداتیں بڑھ رہی تھیں۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا اچھا ہو اگر تمام لوگوں کا خاتمہ ہو جائے۔ نہ عورتوں کو حمل رہے اور نہ بچے پیدا ہوں۔ آخرکار ایسے دانشمند حاکم کی خواہش کرتا ہے کہ جو ظلموں کو دُور کر دے، اور فتنہ و فساد کو ختم کر دے۔ اور کہتا ہے کہ کہاں ہے وُہ ظلموں کو دُور کرنے والا بادشاہ۔ وُہ ضرور ہے۔ لیکن اُس کی طاقت نظر نہیں آتی۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ یہودیوں کے مسیحا والے عقیدہ کا پرتو ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کا یہ خیال صحیح ہو۔ کیونکہ یہ خبر خداوند تعالیٰ کی طرف سے آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک سب انبیاء کو دی گئی تھی کہ زمانہ آخر میں ایک بزرگ ظاہر ہو کر دُنیا کو ظلم اور زیادتی سے پاک کرے گا۔ لہٰذا ہر زمانے کے غور و فکر کرنے والے انسان اُس کے منتظر رہے ہیں یہ ہی خیالات چھن چھن کر اس فلاسفر کے پاس بھی پہنچے ہوں گے۔ مصر میں وُہ زمانہ بھی یاس و ناامیدی کے خیالات کا زمانہ تھا۔ اُس وقت عرب کے چرواہے بادشاہ ہکسوس Hyksos مصر میں حکومت کر رہے تھے۔ ہکسوس کا غلبہ مصر میں ۱۶۸۰-۱۵۸۰ ق م قیاس کیا گیا ہے۔ ان کے ہی زمانہ میں حضرت یوسفؑ مصر میں آن کر حکمران ہوئے تھے۔

Marfat.com

مصرِ قدیم کا مذہب } تمام دُنیا کو صنم پرستی کا سبق مصر نے دیا تھا۔ اور اس صنم خانہ سے جو صنم نکلے وُہ ہی تمام دنیا میں پھیلے۔

مصرِ قدیم کا مذہب تقریباً ... ۳ ق م سے ۳۹۱ئہ تک کثرت آلہ Polytheism کا عقیدہ رہا ہے۔ مصری لوگ اپنی صنم پرستی میں ایسے راسخ الاعتقاد تھے کہ اُن کے ہر فعل میں، ہر قول میں، ہر حرکت میں مذہب ہی کا رنگ ہوتا تھا۔ مصری مذہب کو سمجھے بغیر کوئی شخص اہلِ مصر کو نہیں سمجھ سکتا۔ کثرتِ اصنام میں ہندوستان یونان اور مصر ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ان کے خدا مناظرِ قدرت اور حیوانات تھے۔ اوّل اوّل ان کے دو بڑے خدا تھے۔ ایک تو آسمان، اور دوسرے دریائے نیل۔ مصر کی صنم پرستی کے آخر تک یہ دونوں خدا رہے۔ مصریوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے آسمان موجود تھا، اور اُس کو ایک بہت بڑی گائے سنبھالے ہوئے تھی۔ دس ہزار ستارے اُس گائے کے پیٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ آسمان خدا تھا۔ زمین بھی خدائنی تھی۔ اُس کا نام Nuit تھا۔ خدا یعنی آسمان نے زمین خدائنی کے اُوپر لیٹ کر مجامعت کی۔ اس مجامعت سے زمین کو حمل ہو گیا۔ اور دُنیا پر جتنی چیزیں اور حیوانات ہیں وُہ سب اس حمل میں سے پیدا ہوئے۔ ستاروں کو بھی چھوٹے خدا سمجھتے تھے۔ ایک بہت بڑا خدا ساہو (Sahu) تھا جو دن میں تین مرتبہ خداؤں کو کھا جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک اور بڑا خدا کبھی کبھی چاند خدا کو کھا لیتا تھا۔ لیکن وُہ تھوڑی دیر کے لیے۔ کیونکہ انسانوں کی دُعائیں اور باقی خداؤں کا غیظ و غضب مل کر اُس کو چاند کے اُو گلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یہ چاند گرہن کی تشریح ہے۔

مصر میں سب سے پہلے چاند کی پرستش شروع ہوئی۔ لیکن سب سے بڑا خدا سُورج تھا جس کو Ra یا Re کہتے تھے۔ سورج کے متعلق مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر مختلف عقیدے رہے ہیں۔ ایک عقیدہ تو یہ تھا کہ زمین کو سورج اپنی شعاعوں سے حاملہ کرتا ہے۔ دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ سورج یعنی Ra تمام حیوانات، نباتات و انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔ جب پہلے پہل سُورج نے طلوع کیا تو دیکھا کہ زمین بنجر چٹیل میدان کی صورت میں پڑی ہے۔ اپنی شعاعوں کے ذریعے اُس نے زمین کو قوتِ پیدائش

Marfat.com

دی اور اُس کی آنکھوں میں سے دُنیا کی تمام نباتات، حیوانات اور انسان پیدا ہو گئے۔ ایک عقیدہ سُورج کے متعلق یہ تھا کہ سُورج خدا کا نام Horus ہے جو شاہین کی صورت اختیار کر کے روزانہ نگرانی کے لیے طلوع کرتا ہے، اور پرواز کرتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ ایک اعتقاد یہ تھا کہ سُورج ایک بچھڑا خدا ہے جو روزانہ پیدا ہوتا ہے اور روزانہ مر جاتا ہے۔

ہر شکل کی جان والی شئے کی پرستش کرتے تھے۔ مثلاً کھجور، چشمہ اور کنج درخشاں ان کے خدا تھے۔ اور ان کے پرستار اُن کے چڑھاوے کے لیے ککڑیاں، انگور اور انجیر لاتے تھے۔ کسی زمانہ میں پیاز بھی ایک خدا تھی۔

جانوروں میں مصریوں کے لیئے سب سے زیادہ خدا تھے۔ سانڈ، مگرمچھ، شاہین، گائے، ہنس، بکرا، مینڈھا، بلی، کُتا، مُرغی کے بچے، ابابیل، گیدڑ اور سانپ یہ سب خدا تھے، اور ان کو خداؤں کے نام دیئے ہوئے تھے۔ بسا اوقات خوبصورت نوجوان عورتوں کو ان جانور خداؤں کے پاس اُنہیں خوش کرنے کے لیئے بھیجتے تھے اور یہ عورتیں اُن نرجانوروں کے پاس جاکر اُن سے مجامعت کراتی تھیں۔ سانڈ اور بکرے کی خاص طور سے ان حسین عورتوں سے تواضع کی جاتی تھی۔ اور وُہ ایسے سُدھے ہوئے عادی ہو گئے تھے کہ ان عورتوں کو دیکھتے ہی بے چین ہو کر وُہ ہی حرکات کرتے تھے جو ہم یہاں اُن کو اپنی مادہ سے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور یہ عورتیں بھی اُن سے اسی طرح چمٹ جاتی تھیں اور اپنے تئیں اُن کے آگے پیش کر دیتی تھیں جس طرح کوئی عورت اپنے خاوند سے کرے۔ یہ خداؤں کو خوش کرنا تھا۔ اس میں بےشرم نہیں محسوس کی جاتی تھی۔ صنم پرستی کی ابتداء سے اُس کے خاتمہ تک یہ رسم باقی رہی سانڈ اور بکرا Osiris خدا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔

Osiris خدا کا بُت بنایا جاتا تھا۔ جس کے تین اعضاء تناسل کھڑی ہوئی حالت میں رکھے جاتے تھے۔ اُس کا ایک مذہبی جلوس نکلا کرتا تھا۔ اور عورتیں اُس بُت کو اُٹھاتی تھیں۔ اور وُہ اس طرح بنے ہوئے ہوتے تھے، کہ لچک دار کمانیوں کے ذریعہ سے عورتیں ان سے مجامعت کرتی تھیں۔ ایسی ہی رسم ہندوستان میں بھی تھی۔

پھر انسانوں کی شکل کے خدا ہونے لگے۔ لیکن ان خداؤں کی عادت و اطوار

Marfat.com

بالکل انسانوں کے سے تھے۔ خون، پوست، ہڈیوں کے بنے ہوئے۔ اسی طرح کھاتے تھے، بھوک لگتی تھی، پیاس لگتی تھی، عشق کرتے تھے، نفرت وحسد و بغض کرتے تھے، مارتے تھے، بڑے ہوتے تھے اور پھر مر جاتے تھے۔ ان بڑے خداؤں میں Osiris اور Isis کا جوڑا تھا۔ جن کا لڑکا Horus تھا۔ مصری لوگ Isis کی پرستش بڑے شوق سے اور محبت سے اُس کو خدا کی ماں سمجھ کر کرتے تھے۔ ان بے شمار خداؤں میں چار بڑے خدا تھے۔ Amon, Osiris, Isis, Horus, یا Re لیکن آخر میں تین خداؤں کی تثلیث مقرر کی گئی۔ وہ تین یہ تھے: باپ Osiris ماں Isis اور بیٹا Horus۔ یہ ہی خیالات فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ جن سے مسیحیت نے اپنی تثلیث لی ہے۔ فرعون بھی ایک خدا سمجھا جاتا تھا جو سورج Ra کا لڑکا تھا۔ بادشاہ مذہب کا سردار اور سب سے بڑا پروہت ہوا کرتا تھا۔ اور مذہب کی رسُوم وُہ ہی ادا کرتا تھا۔

ہندؤں کی صنم پرستی سے مصر کی صنم پرستی بہت مماثلت ہے۔ ہندؤں کی طرح اُن کے یہاں بھی ایسے خدا ہوتے تھے جن کا سر اور چہرہ تو جانور کا، اور باقی سارا بدن انسان کا۔ ممکن ہے کہ اُس مجامعت حیوانی سے جس کا ذکر ہم نے اُوپر کیا ہے ایسی مخلوط شکل کا کوئی بچہ پیدا ہو گیا ہوگا۔ اُس کو خدا سمجھ لیا گیا۔ اور پھر یہ تصور قائم کر لیا گیا۔ چند ایسے خدا ملاحظہ ہوں:-

(۱) گیدڑ کا سر اور چہرہ، باقی سارا بدن آدمی کا	Anubis
(۲) گائے کا " " " ، " "	Hathor
(۳) شاہین کا " " " ، " "	Horus
(۴) باز کا " " " ، " "	Munt
(۵) گدھ کا " " " ، " "	Mekhet
(۶) شیرنی کا " " " ، " "	Sekhet
(۷) سُورنی کا " " " ، " "	Set
(۸) مینڈھے کا " " " ، " "	Khanum
(۹) لقلق کا " " " ، " "	Theth

Marfat.com

مگرمچھ کا سر اور چہرہ، باقی سارا بدن آدمی کا۔ Sebek

مصر میں دو مذہبوں میں آپس میں رقابت رہی ہے۔ ایک تو وُہ مذہب، جو Osiris کو خدائے اعظم مانتا تھا۔ یہ عوام الناس کا مذہب تھا۔ دوسرا وُہ مذہب جس میں آفتاب کی پرستش Re یا Ra کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ مذہب بادشاہ کے خاندان اور اُس کے درباریوں کا تھا۔ پانچویں خاندان کے زمانہ میں ۔ 2564 (2424 B. C) فرعون کو خدائی Re کا بیٹا کہنے لگے اور سمجھنے لگے کہ Re کی شکل فرعون کی سی ہے۔ کیا بائیبل کے لکھنے والوں کا یہ کہنا کہ حضرت عیسےٰ خدا کے بیٹے ہیں، یا یہ کہ خدا نے انسان کو اپنے سانچہ پر بنایا ہے، ان ہی خیالات سے تو نہیں لیا گیا۔

ان دونوں مذہبوں کا فرق صرف موت کے بعد کی حالت کے اعتقاد میں تھا Osiris کے مذہب میں تو یہ اعتقاد تھا، کہ موت کے بعد Osiris ارواح پر حکومت کرتا ہے اور اُن کے دُنیاوی اعمال کی جانچ پڑتال کر کے اُن کو جنت یا ظلمت کی طرف بھیج دیتا ہے۔ Re کے ماننے والوں کا اعتقاد تھا کہ وُہ اپنے پرستاروں کو زندہ آسمان پر اُٹھا کر اُنہیں غیر فانی بنا دیتا ہے۔ یوں تو Re والا مذہب یقیناً زیادہ کشش رکھتا تھا لیکن خرابی یہ ہوئی کہ اس زندہ اُٹھنے اور حیات دوام پانے کی قیمت روپیہ پیسے کی صورت میں لی جاتی تھی۔ اہرام بنانے والوں کے زمانہ میں یہ قیمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ صرف فرعون یا اُس کے وُہ درباری ہی ادا کر سکتے تھے جن کو قیمت کی ادائیگی میں فرعون بھی حصہ دیتا تھا۔ یہ اہرام ان ہی کوششوں کی نشانیاں ہیں جو ان امراء نے بقاء دوام حاصل کرنے کے لیئے کی تھیں۔ ان اہرام کے بنانے میں قوم کا بہت سا روپیہ خرچ ہوُا جس سے تمدنی و مالی تنزل ہوُا۔ اور آخر کار غربا اور عوام الناس میں امراء کی طرف سے بددلی پھیل گئی۔ اُنہوں نے سوچا کہ ہم تو نہ قیمت ادا کر سکیں گے اور نہ بقاء دوام حاصل کر سکیں گے۔ پھر Re کی پرستش کیوں کریں Osiris ہی کی پرستش کیوں نہ کریں جس سے مرنے کے بعد سابقہ پڑے گا فرعون کے حصول بقاء دوام میں ہم کیوں مدد کریں۔ اس وجہ سے وُہ Osiris کی طرف چلے گئے۔ یہ خدا کی خدائی کیا ہوئی۔ یہ تو خدائی Democracy ہوگئی۔ جس کو جی چاہے گا رائے دیں گے، اور رائے کی قیمت وصول کریں گے۔

Marfat.com

Heliopolis وُہ شہر تھا کہ جہاں سورج Re کی پرستش کے لیئے بہت بڑا مندر یا ہیکل بنا ہوُا تھا۔ جب اُس کے پروہتوں نے یہ دیکھا کہ لوگ Osiris کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں تو اُنہوں نے اپنے خدا Re کے ساتھ Osiris کو بھی ملا لیا۔ یہ Coalition Government بن گئی اور Osiris بھی Re کی طرح اپنے پرستاروں کو بقار دوام دینے لگا۔

لیکن انبیاء سابقہ کی تعلیم بھی اپنا اثر ڈالنے لگی۔ لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ پتھر پر پتھر رکھنے سے خدا کیا خوش ہوگا۔ بلکہ Re تو عمل میں نیکی اور قول میں راستی چاہتا ہے۔ اس پہ لوگ بہت کچھ لکھنے لگے۔ اور ان کی تحریروں اور بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعلیم میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اب Osiris کے متعلق یہ عقیدہ قائم ہوُا کہ وہ ایک اخلاقی جج ہے جو مرنے کے بعد ہمارے نیک و بد اعمال کا موازنہ کرے گا۔ تمام مردوں کی رُوحیں اُس کے سامنے پیش ہوں گی۔ اور جن لوگوں کے نیک کاموں کا پلڑا بُرے کاموں سے بھاری ہوگا وُہ Osiris میں مدغم ہوجائیں گے۔ اُس کے متعلق یہ بھی عقیدہ تھا کہ وُہ خود بھی مرے گا۔ مرنے کے بعد زندہ ہوگا اور پھر اپنے پرستاروں کو حیاتِ ابدی بخشے گا۔

ایک امریکن عیسائی مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ ہی وُہ خیالات تھے جو مسیحیت میں داخل ہوگئے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ جسم کے اندر دوُ چیزیں ہیں۔ ایک Ka یعنی جسم کا چھوٹا نمونہ، اور دُوسرے رُوح۔ یہ تینوں چیزیں یعنی جسم، Ka اور رُوح موت کے بعد بھی اُس عرصہ تک زندہ رہتے ہیں کہ جب تک بدن کا گوشت باقی رہتا ہے۔ اور اس وجہ سے وُہ مصالحہ لگا کر جسم کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کو ممی کہتے تھے۔ لیکن جو روحیں نیک آدمیوں کی ہوں گی وُہ Osiris تک پہنچ جائیں گی۔ اور وُہ اُنہیں آرام و راحت کے ساتھ باغ میں بھیج دے گا۔ جہاں ہر ایک کھانے کی چیز نفاست اور کثرت کے ساتھ ہوگی۔ یہ بھی اعتقاد تھا کہ Osiris سوال و جواب کرے گا۔ جو اس میں فیل ہو جائے گا، وُہ ظلمتِ دوام میں اپنی قبر میں پڑا رہے گا۔ کہا جاتا تھا کہ Osiris ہر ایک کے دل کو ایک میزان میں تولے گا۔ تاکہ اُس کی صداقت معلوم کر سکے۔ یہ سب کچھ اصلی مصری مذہب اور انبیاء کی تعلیم کا ملا ہوُا معجون ہے۔

Marfat.com

انبیاء کی تعلیم کے اثر کا بیّن ثبوت اخناطون فرعون کی ہستی ہے۔ فراعنہ میں یہ ایک فرعون ہے جو کہ موحد تھا۔ اور اس کی مناجاتیں انبیاء سابقہ کی مناجاتوں کے نمونہ پر تھیں۔ وُہ ہی تخئیل کی رفعت۔ وُہ ہی اپنی عاجزی کی فریاد اور وُہ ہی خدائے واحد کی مدح۔ عظمت اور قدرت کے راگ ہیں۔ اُس کا اصلی نام Amenhotep IV تھا اور Ikhnaton کے نام سے معروف ہے۔ اُس کا زمانہ ۱۳۸۰ ق م سے ۱۳۶۲ ق م ہے۔ یہ Will Durant کی رائے ہے۔ لیکن Toynbee نے اُس کا زمانہ ۱۳۷۵ ق م سے ۱۳۵۸ ق م قرار دیا ہے۔ اُس کے زمانہ میں Amon سب سے بڑا خدا سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کا مندر Kanak میں تھا۔ اُس کے ساتھ بے شمار جوان عورتیں خدا کے نام پر رکھی ہوئی تھیں۔ خدا تو اُن کا کیا استعمال کرتا' وُہ سب پروہتوں کی عیش و عشرت کے لئے تھیں۔ اس نوجوان بادشاہ نے جو خود پرہیزگاری کا نمونہ تھا' اُس کو رنڈی خانہ سمجھا۔ اور مینڈھا جو خدائی Amon کے نام پر ذبح کیا جاتا تھا' اُس کے خیال میں فضول تھا۔ اسی طرح پروہتوں کے جادُو' تعویذوں اور پیشین گوئیوں کو دھوکہ بازی سے منسوب کیا۔ نہایت جرات کے ساتھ اُس نے ان تمام رسوم اور رنڈی خانہ کو بند کرایا۔ اور اعلان کیا کہ خدا صرف ایک خدائے واحد ہے جس کو اپنی زبان میں Aton کہا۔ اُس نے اپنا نام "اخن اطون" رکھا تھا۔ جس کے معنی ہیں اطون' یعنی خدا راضی ہوا۔ اُس نے اعلان کیا کہ کثرتِ الٰہ کا عقیدہ اور یہ رسوم سب بُت پرستی ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام بُت توڑ دیئے جائیں۔ اپنے باپ کا بُت بھی توڑ دیا۔ وُہ تین عقیدے جو مصر کی بلکہ تمام دُنیا کی صنم پرستی کی روح تھے' اُس نے ناجائز قرار دیئے۔ یعنی:-

(۱) ہر ملک بلکہ ہر شہر کے علیحدہ خدا ہونے'

(۲) کثرتِ الٰہ'

(۳) خدا کو شکل و جگہ میں محدُود کرنا۔

اخناطون نے کہا کہ خدائے واحد تمام دُنیا کا خدا و رب ہے' خدا ایک ہے' بہت سے خداؤں کا اعتقاد شرک و بُت پرستی ہے۔ خدا کی کوئی خاص شکل یا جسم نہیں ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ کوئی شخص خدا کی شکل کی تصویر نہ بنائے اور نہ بُت

Marfat.com

تراشتے۔ یہ وُہ خیالات اور احکام تھے جنہوں نے مصر میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مذہبی پروہتوں کی بہت طاقت تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں بتوں کی محبت راسخ ہو چکی تھی۔ لہٰذا اخناطون کے مرتے ہی مصر پھر اپنی صنم پرستی کی طرف عود کر گیا۔ ہم اُس کی مناجات کے چند حصّے نقل کرتے ہیں۔ یہ اُس کے انگریزی کا اُردو میں ترجمہ ہے:۔

ترجمہ:۔ عورت کے رحم میں نطفہ پیدا کرنے والے اور مرد کے تخم بنانے والے ماں کے پیٹ میں بچّہ کے اندر رُوح ڈالتا ہے۔ اور اُس کی تسلّی کے سامان پیدا کرتا ہے تاکہ وُہ بے چین نہ ہو۔ رحم کے اندر ہی تو اُس کی پرورش کرتا ہے۔ جو بچّہ تو بناتا ہے، اُس میں سانس ڈال کر جان پیدا کرتا ہے۔ جب وُہ ماں کے جسم میں سے باہر آتا ہے، تو اُس کو طاقتِ نطق دیتا ہے اور اُس کی ضروریات مہیّا کر دیتا ہے۔

انڈے میں چوزے کو تُو سانس دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے۔ اور تُو ہی اُس کو اس حالت میں لے آتا ہے کہ وُہ انڈے کو کھٹکے۔ وُہ انڈے سے باہر نکلتا ہی اور چہچہاتا ہے۔

تیرے مخلوقات طرح طرح کی ہے۔ ہماری آنکھوں سے وُہ پوشیدہ ہیں۔ اے خدائے واحد! جس کی طاقتیں کسی اور میں نہیں ہیں، تُو نے اپنی مشیت کے مطابق زمین بنائی۔ جب تُو اکیلا تھا (کسی نے تجھے مدد نہیں دی)

اے خدائے لایزال! تیرے کام کیسے اچھے ہیں"

ہم نے اخناطون کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں، تاکہ ہمارے اس نظریہ کی تائید ہو کہ حق کی تعلیم و ہدایت اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان دُنیا میں آیا، لیکن شیطان بھی ساتھ ساتھ ہی لگا رہا۔ اور یہ دونوں طاقتیں حق و باطل ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ انسان وحدانیت تک محض اپنی کوشش سے اور قواعد ارتقاء کے بموجب پہنچا ہے۔

مصر کے حالات ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں سے اخذ کیئے ہیں: (۱۱)

(11) Encyclopedia of Religion and Religions : Arts. Egyptians, Ancient ; and Atonism; (باقی حاشیہ صفحہ ۸۳ پر)

ہمارے ناظرین کو جو یہاں تک ہمارا ساتھ دیتے آئے ہیں، اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمام ممالک میں صنم پرستی تقریباً ایک ہی نمونہ کی تھی۔ ہندوستان سے لیکر ایران، یونان و مصر تک ایک ہی قسم کا Pantheon تھا۔ یعنی خداؤں کی ایک جماعت تھی۔ جو پہاڑوں کی چوٹیوں یا آسمان کے بادلوں، یا جنگلوں میں رہتے تھے۔ ہندوستان کا ہمالیہ، ایران کا کوہ دماوند، یونان کا کوہ اولیمپس، اور مصر کی وادی نیل۔ عراق کی دجلہ و فرات کی وادیاں، سب ایک ہی قسم اور ایک ہی صفات رکھنے والے خداؤں کی جولان گاہیں تھیں۔

یہاں ہم ان مذاہب کے دو مشترک عقائد کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں۔ (۱) ایک تو بھوت پریت کا عقیدہ جس کو انگریزی میں Demonology کہتے ہیں (۲) اور دوسرا اپنے بادشاہوں اور مشاہیر کو خدائی کا درجہ دینا جس کو انگریزی میں Deification کہتے ہیں۔

Demonology یعنی اعتقاد ارواح خبیثہ

ارواح خبیثہ کی موجودگی کا اعتقاد ازمنہ بعیدہ کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ بھوت، پریت اور ارواح خبیثہ ہم کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اُس کا دفعیہ اس طرح کرتے تھے کہ قربانیوں کے ذریعہ سے اُن کو خوش رکھتے تھے۔ بابل، سمیریا، عقاد، ایران، ہندوستان اور مصر کے مذاہب میں یہ اُن کا جزو ایمان تھا۔ اور جب زرتشتی مذہب بگڑا، تو اُس کے پیرو بھی پلٹ کر اسی سابقہ اعتقاد پر چلے گئے۔ ان مذاہب کے لوگوں کا خیال تھا، کہ ساری دنیا ان ارواح خبیثہ سے بھری ہوئی ہے اور وہ لوگ نہایت توجہ اور غور کے ساتھ ان ارواح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲ کا)

Toynbee's Study of History, Vol. I & Vol. V.

Will Durant : Our Oriental Heritage, Chap. viii.

Cambridge Ancient History, Vol. iii.

Encyclopedia of Religion and Ethics

Marfat.com

خبیثہ کی ماہیت اُن کے نام اور کام معلوم کرنے کی کوشش میں مشغول رہتے تھے۔ اسی طرح سحر و فسون و جادو کا اعتقاد عام تھا۔ ان معتقدات نے مسیحیت اور یہودیت اور ان کی کتابوں پر بھی اثر کیا۔ دیکھو (۱۲)

Deification

یعنی انسان کو خدا کا درجہ دیکر اور خدا مان کر اس کی پرستش کرنا

اس کے لفظی معنی ہیں خدا بنانا۔ اس اعتقاد کی ایجاد تو مذہب کے ذمّہ ہے لیکن اس کی نشو و نما میں مذہب اور حکومت دونوں نے مل کر کام کیا ہے۔ بادشاہوں کا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ اپنی حکومت کو کس طرح مستحکم و مستقل بنایا جاوے از منہ بعیدہ میں یہ کام بادشاہ کو خدا منوا کر کیا گیا۔ اور جب یہ ناممکن ہوگیا، تو عوام الناس میں ایسے نظریات و معتقدات ایجاد کر کے پھیلائے گئے کہ جن سے بادشاہ کی حکومت کی تائید ہو۔ وہ معتقدات در اصل مذہب ہی کے رنگ میں ہوتے ہیں۔ بادشاہانِ وقت یہ طریقہ مذہب کے خاطر اور اُس کی محبت سے نہیں اختیار کرتے، بلکہ یہ اُن کی سیاست کے اغراض کے لیئے ہوتا ہے اگرچہ اُس پر مذہب کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے۔ دیکھو (۱۳)

Deification کی تین صورتیں ہیں۔ (۱) بادشاہ کو خدا ماننا اور اُس کی پرستش بطورِ خدا کرنی، (۲) بادشاہ کو خدا کا بیٹا ماننا اور اُس کی پرستش کرنی اور (۳) بادشاہ کو خدا کا اوتار مان کر اُس کی پرستش کرنا۔

دُنیا میں یہ تینوں طریقے جاری رہے ہیں۔ یہ زیادہ تر اُن بادشاہوں اور فاتحین کے لیئے ہوتا تھا، جو تلوار کے زور سے اپنی حکومت کو بہت وسیع کر لیا کرتے تھے اور سابقہ بد امنی و پریشانی کو دُور کر کے اپنی رعایا کے لیئے امن و امان و خوشحالی کی زندگی ممکن بناتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل مذہب بذات خود بن گیا۔ اس کی مثالیں

(۱۲) (12) Toynbee's Study of History. Vol. v.p. 554

(۱۳) (13) Toynbee's Study of History, Vol. V. p. 647

تاریخ کے ابتدائی دور یعنی زمانہ سمیریا اور مصری تہذیب سے لے کر یونانی اور رومی تاریخ تک ملتی ہیں۔ جب دنیا میں مذہب عیسوی رائج ہوا تو اُس نے انسانوں کو خدا بنانے کی رسم کی مخالفت کی۔ مخالفت تو ضرور کی، لیکن اُن خیالات سے متاثر بھی ہو گئی یا متاثر ہونے پر مجبور ہو گئی۔ کیونکہ جس زمانہ میں مسیحیت کی ابتدا ہوئی، تو یہ خیالات لوگوں کے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ اور بغیر اپنے میں ان عقائد کو لیئے ہوئے ان لوگوں میں جذب و اثر پیدا کرنا مسیحیت کے لیئے ناممکن تھا۔ لہذا مسیحیت نے اپنے پیغمبر کو دُنیا کے سامنے خدا کا بیٹا قرار دے کر پیش کیا، اور یہ تخئیل لوگوں میں مقبول ہو گیا کیونکہ وُہ پہلے سے اس کے عادی تھے۔

چین کے مدبرِ اعظم اور فلاسفر Confucius نے بادشاہ کو خدا کا بیٹا ماننے کی تلقین کی۔ جاپان میں بھی بادشاہ کو خدا کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جاپانی سلطنت کے اوّل تین بانیوں کو خدا مانتے ہیں، موجودہ بادشاہ اُن کی اولاد سے ہے۔ (13a)

(۲) فلسفہ و مذہب بابل جس میں عیلام، عقاد، بابل، سمیر اور اشوریوں کے فلسفہ و مذہب کا ذکر ہے

دُنیائے قدیم میں بابل کی حکومت اور اُس کی تہذیب کو بہت شہرت حاصل تھی۔ دراصل آج کل کی مغربی تہذیب اُس کا ہی نتیجہ ہے۔ اس کی حکومت کا علاقہ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے درمیان کی وادی ہے۔ یہ قوم اور یہ حکومت دو اقوام قدیم عقاد اور سمیر کے ملنے سے پیدا ہوئے تھے۔ لفظ بابل دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ "باب اور ایل"۔ باب کے معنی دروازہ اور ایل کے معنی خدا کے ہیں جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزازئیل، عزرائیل۔ ان میں ایل خدا ہی کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ بابل کے معنی ہوئے باب اللہ۔ تعجب نہیں اگر زمانۂ حال کے ایرانی باب نے اپنا لقب بابل کے باب اللہ سے لیا ہو۔ بابل کا فلسفہ بہت مختصر ہے۔ اور اُس میں مذہبی تخئیل زیادہ ہے۔ چند

(13 a) Toynbee's Study of History, Vol. V. pp. 647, 651-56.

Marfat.com

الواح ملی ہیں جن میں کچھ فلسفیانہ انداز ہے۔ ایک تختی پر تو بال تترو کے خیالات کندہ ہیں اور دوسری تختی پر طبیعت الانلیل کے خیالات نقش ہیں۔ انلیل بھی خدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فلسفہ اس تعجب کو ظاہر کرتا ہے کہ دُنیا میں نیک آدمی کیوں تکلیف میں رہتے ہیں۔ بال تترو کہتا ہے کہ میں نے سب سے زیادہ خداؤں کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ لیکن پھر مجھ پر پے در پے مصائب پڑ رہے ہیں۔ میرے ماں باپ مر گئے، میری جائیداد برباد ہو گئی اور جو کچھ باقی تھی، وُہ ڈاکوؤں نے لوٹ لی۔ توریت کی کتاب ایوب کی طرح اُس کے دوست سمجھاتے ہیں کہ یہ غالباً کسی ایسے گناہ کی سزا ہے جو تم کو یاد نہیں رہا۔ یا تم کو جو غرور ہو گیا تھا، یہ اُس کی پاداشن ہے۔ وُہ اس کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ مصائب بھی در اصل بھلائی کی ایک شکل ہے۔ خدا کی ایک بڑی تجویز کا حصہ ہے۔ انسان اپنی کم فہمی کی وجہ سے خدا کے پورے منصوبہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ بال تترو کو چاہیئے کہ صبر کرے، اور خدا پر یقین کامل رکھے۔ نتیجہ اچھا ہوگا۔ اب بال تترو خداؤں کو مدد کے لیئے پکارتا ہے، اور یہاں وُہ تختی ختم ہو جاتی ہے۔ (۱۴)

طبیعت الانلیل Tabiutul Enlil غالباً Nippur کا حاکم تھا۔ وہ ایک سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے بہرا ہو گیا۔ جسم پر زخم ہو گئے۔ دوست نفرت کرنے لگے۔ اس تختی پر اُس کے الفاظ کندہ ہیں کہ میں کیسا پرہیز گار آدمی تھا۔ کیا میں نے خدا کے لیئے قربانی نہیں کی، اور کیا قربانی میں سے خدا کا حصہ ہمیشہ سب سے پہلے نکال کر علٰحدہ نہیں کر دیا، کیا میں نے خدا کی بیوی خدائی کو کھانے پر دعوت نہیں دی، کیا میں ہمیشہ خدا سے دُعاء اور التجا نہیں کرتا رہا ہوں۔ میں نے اپنی رعایا کو خدا کے نام کی حفاظت کرنا سکھایا۔ اور یہ سب کچھ اس اُمید پر کیا کہ خدا مجھ سے خوش ہوگا۔ آخر کار وہ اپنی بیماری پر غور کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے، کہ کوئی شخص آسمان کے خداؤں کی مشیت

(14) Hermann Schneider : History of World Civilisation, p. 66

Marfat.com

سے واقف نہیں ہو سکتا۔ خدا کی مشیت یا منصوبہ یا ارادہ جو محض ایک راز اور بھید ہے کوئی نہیں معلوم کر سکتا۔ ایک آدمی کل زندہ تھا آج مر گیا۔ کل خوش تھا آج رنج و غم میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک لمحہ میں وہ گاتا اور کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے لمحہ میں فریاد اور ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مجھے مصیبت نے جال میں پھنسا دیا ہے۔ میری آنکھ ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ کان ہیں لیکن سُن نہیں سکتا۔ میرے اعضاءِ تناسل میں زخم پڑ گئے ہیں۔ انتڑیاں جل رہی ہیں۔ تمام دن بیماری کا بھوت میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ اور رات بھی ایک لمحہ آرام نہیں کرنے دیتا۔ میرے اعضاء کٹ گئے ہیں۔ رات بھر بیل کی طرح اپنے پاخانہ میں لتھڑا ہوا پڑا رہتا ہوں۔ اور بھیڑ کی طرح میرا جسم میرے پاخانہ سے لت پت ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری یہ مصیبت دُور ہو جائے گی۔ اور ایک دن خدا میرے اُوپر اپنا فضل و کرم کرے گا آخر کار اُس کے دن پھرتے ہیں۔ ایک رُوح آتی ہے اور اُس کی ساری بیماریوں کو دُور کر دیتی ہے۔ ایک طوفان اُٹھتا ہے اور وہ اُس کے جسم سے بیماری کے تمام بھوتوں کو نکال دیتا ہے۔ (15)

بائبل کی کتاب ایوب سے اس میں کتنی مشابہت ہے۔ ایک مؤرخ کا خیال ہے کہ کتاب ایوب کے لکھنے والے نے اس یا ایسی ہی تحریروں سے متاثر ہو کر کتاب ایوب لکھی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تختیوں کی بنا پر کتاب ایوب تھی۔ کیونکہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب ایوب پہلے لکھی گئی، یا یہ تختیاں۔

دُنیا کی یہ حالت، کہ نیک آدمیوں کو حد سے زیادہ رنج و غم پہنچتا ہے، بال تنزو اور طبیعت الانلیل کو تو خدا کی طرف لے گئی، لیکن ایسے آدمی بھی تھے جو اس حالت کو دیکھ کر خدا کے اور اُس کے فضل و کرم کے منکر ہو گئے۔ لیکن یہ خدا وہ ہی اصنام تھے۔ چنانچہ ایک لوح دستیاب ہوئی ہے جس میں گبرد Gabarru کا حال درج ہے۔ وہ اس ہی بات پر اپنے خداؤں سے منکر ہو گیا۔ (16) یہ وہ حالت ہے، جو اکثر لوگوں کے مشاہدہ میں آتی ہے۔

(15) Morris Jastrow : The Civilisation of Babylonia & Assyria pp. 475-483, S. Langdon : Babylonian Wisdom

(16) G.R. Tabouis : Nebuchadnezzar, pp. 254-393

Marfat.com

اس پر مفصل بحث تو ہم فلسفۂ اسلام کے تحت میں کریں گے، لیکن ایک بات قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ جن کو ہم نیک آدمی سمجھتے ہیں، آیا وہ واقعی نیک بھی ہیں یا نہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کی چند نیکیاں جو سطح پر ہیں اُن بُرائیوں اور بدیوں کے مقابلہ میں کچھ نہ ہوں، جو اُنہوں نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں کی ہیں۔ محض ظاہری عبادت یا گفتگو تو نیکی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی نیکیوں کا انعام عاقبت کے لیئے محفوظ ہو اور یہاں اُن کی بدیوں کی سزا مل کر وُہ بدیاں محو ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اُن کا امتحانِ صبر و ایمان ہے اور دوسروں کے لیئے ایمان کی ازدیاد کا سبب۔

کسی خالص فلسفہ میں عاقبت اور دُوسری زندگی کا ذکر نہیں آتا۔ کبھی کبھی خدا کا نام تو اس وجہ سے آجاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی حدیں ملتی ہیں اور خدا کے ذکر کے لیئے انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ تعلیمِ انبیاء فضا میں پھیلی ہوئی تھی، یہیں تو حضرت ابراہیمؑ کا وطن تھا۔ وُہ تعلیم ان کے خیالات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

یہ ظاہر ہوا ہوگا کہ ان اقوام کا فلسفہ ان کے مذہب کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لہٰذا بغیر ان کے حالات و واقعات کے معلوم کیئے ہوئے ان کا مذہب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وُہ اقوام یہ ہیں:۔ عیلام، بابل، عقاد، سمیر، اور اشوری۔ ان کے واقعات کے معلوم کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک تو توریت، اور دوسرے آثارِ قدیمہ توریت میں پُرانے نام ہیں جن کا معلوم کرنا اور پتہ لگانا اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔ اور آثارِ قدیمہ تو مٹی پتھر ہیں جن کے سمجھنے کے لیئے قیاسات کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان اقوام کے حالات کو مسلسل ترتیب دے کر ان کی تاریخ لکھنی بہت مشکل ہے۔ اور پھر جو تاریخ بنتی ہے اُس میں قیاسات کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان قیاسات کو بھی تاریخی درجہ دیا جائے تو یہ تاریخ بھی حضرت نوح کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ان اقوام کے واقعات کی تاریخ میں ایک بہت بڑے طوفانِ آب کا ذکر آتا ہے۔ اور اس طوفان سے پہلے کی تاریخ نہیں ملتی۔ وُہ طوفان سوائے طوفانِ نوح اور کون سا طوفان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ طوفانِ نوح میں ساری دُنیا غرق ہو گئی سوائے اُن چند نفوس کے جو آپ کی کشتی میں بچ رہے۔ اُس زمانہ کی

Marfat.com

آباد دُنیا بھی کوئی زیادہ بڑی نہ تھی۔ بس شام، عرب، وادیٔ دجلہ و فرات اور کچھ وادیٔ نیل جو شام سے ملحق تھی۔ اُس زمانہ میں مصر و شام خشکی سے ملے ہوئے تھے۔ یہ تھی اُس زمانہ کی ساری کائنات۔ ابھی ہندوستان و چین مہذب دُنیا میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں ساری دُنیا نیست و نابود ہوگئی، اور اُس کو پھر سفینہ والوں نے آباد کیا، درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پُرانے تاریخی زمانہ میں مہذب دنیا میں دو ہی قومیں آباد تھیں: آریا اور سامی۔ تمام سامی اقوام کی ابتداء عرب میں ہوئی۔ اور یہ سب قومیں سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں۔ ایک انگریزی مورخ لکھتا ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

ترجمہ:۔ سامیوں کا منبع اور پہلی رہنے کی جگہ ملک عرب تھا۔ اُس خشک قطعہ آراضی میں سے کہ جہاں کوئی درخت سوائے شجرِ انسانی کے نشوو نما نہیں پا سکتا تھا، قافلے کے بعد قافلے اُن جفاکش لوگوں کے جن کے گزارے کے لئے جنگل اور نخلستان کافی نہ تھے اور جو اب اُس سے بہتر جگہ کی تلاش میں تھے، سمندر کی لہروں کی طرح ایک دُوسرے کے بعد نکلتے آئے۔ اور جو وہیں باقی رہ گئے، اُنہوں نے عرب اور بدوی تہذیب قائم کی۔ (17)

ان قافلوں میں سے بابل، شام، وادیٔ دجلہ و فرات یعنی عیلام وغیرہ وسطائی آبادیاں ہوئیں۔ عیلام وہ ہی رقبہ تھا، جو اب ایران کہلاتا ہے۔ شمال میں یہ ملک Caspian Sea تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ہی علاقہ سے پھر آریاؤں کی شاخ اٹھی ایک تو ہندوستان کی طرف گئی، اور دُوسری یورپ کی طرف گئی۔ اس ہی نام کو لے کر وہ ملک آباد ہوا جس کو ایران کہنے لگے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو بذریعہ انکشافاتِ ارضی اب تک ثابت ہو چکے ہیں۔ (18)

---

(17) Will Durant : Our Oriental Heritage, Chap. xi, p. 291, Chap. xiv. p. 397 & note.

(18) Toynbee : Study of History, Vol. I, p. 132 n ; Vol. ii, p. 134 ; Vol. iii, p. 447

Marfat.com

ان پر نظر غور ڈالنے سے اچھی طرح ثابت ہے کہ ان ممالک کی ساری آبادی کا سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے۔ اور وہ عرب ہے۔ اور زمانۂ قدیم کی مہذب دُنیا کی ساری آبادی ایک ہی رشتہ میں منسلک ہے۔ لہٰذا ان مقامات میں پیغمبروں کا مبعوث ہونا ایسا ہی تھا، کہ وہ گویا ساری دُنیا کے لیے مبعوث ہوئے۔ اور ہر قریہ بقریہ بھی ڈرانے والے اور بشارت دینے والے ہوتے رہے جیسا کہ قرآن شریف کی شہادت ہے۔

عرب میں سے نکل کر ساری دنیا میں آبادی کا ہونا مسلمات تاریخیہ میں سے ہو گیا ہے۔ پہلے وسط ایشیا کا جو نظریہ تھا، وہ اب قائم نہیں رہا۔ ایک نامور مؤرخ لکھتا ہے:۔

The term Semite comes from Shem in the Old Testament through the Latin of the Vulgate, the assumption being that the Semites were the descendants of Noah's eldest son. According to Scientific usage, however, the term is a linguistic one, it applies to him who speaks or spoke a Semitic tongue. The Semitic languages are now recognised as a distinct family comprising Assyro-Babylonian (Akkadian), Canaanite (Phoenician), Aramaic, Hebrew, Arabic and Ethiopic . . . . .

This linguistic kinship among the Semitic speaking peoples is the most important bond that justifies their inclusion under one name, but is not the only bond. A comparison of their social institutions, religious beliefs, psychological traits and physical features reveal impressive points of resemblance. The inference is inescapable : at least certain ancestors of those who spoke Babylonian, Assyrian, Amoritic, Canaanite, Hebrew, Amaratic, Arabic and Abyssinian-before they became thus differentiated— must have formed one community, speaking the same tongue and occupying the same locale.

Where was the home of that community ? The most plausible theory makes it the Arabian peninsula— (The author here gives

the reasons on which this view is based)

Around 3500 B.C. a Semitic migration from the peninsula moved north-eastward and spread its component nomadic parts over the settled and highly civilised Sumerian population of Mesopotamia, producing the Akkadians (later called Babylonians of history) . . . . . A millenium or so after the first migration another one from the desert brought and deposited the Amorites in the northern plains of Syria. This migration comprised the people who were seen later in occupation of the maritime plain calling themselves Canaanites and called Phoenicians by the Greeks with whom they traded.

Between 1500 and 1200 B.C. a third exodus from Arabia introduced the Aramaeans into Coel-Syria and the Damascus region and spread the Hebrews in the southern part of the country. About 500 B.C. still another Arabian outflow established the Nabataeans north-east of the Senaitic peninsula, with their capital at Petra, which attained an amazingly high degree of civilisation under Roman auspiees (19)

(اس نظریہ کے لیئے کہ عرب ہی تمام سامی اقوام کا ابتدائی گھر تھا' دیکھو (۲۰)

ترجمہ:۔ لفظ سامی حضرت نوحؑ کے بڑے بیٹے سام کی طرف منسوب ہے جن کا ذکر بائیبل سے عہد عتیق میں ہے۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اُن کی اولاد ہیں۔ لیکن سائنس زباندانی کے مطابق یہ لفظ زبان سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ اُس شخص پر حاوی ہوتا ہے جو سامی زبان بولتا ہے۔ اب سامی زبانیں ایک جُدا نوع سمجھی جاتی ہیں۔ جن میں اشوری، عقاد، کنعانی یعنی فینیقیہ، ارامی، عبرانی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں۔

(19) Philip K. Hitti : History of Syria. Part, ii, Chap. vi, p. 61-4

(20) Arz-ul-Quran, Vol. i, p. 109 by Syed Suleman Nadvi
Syke's History of Persia, Vol. i. p. 87 ; see also
Will Durant's Our Oriental Heritage, Chap. xi, p. 291

Marfat.com

یہ ہمزبانی کا تعلق یا رشتہ جو سامی زبانیں بولنے والوں میں سے نہایت اہم سلسلہ ہے جس سے ان سب کا ایک نام کے اندر آنا جائز ہے۔ لیکن یہ صرف تنہا رابطہ نہیں ہے۔ اگر ان معاشی اداروں، مذہبی عقائد، نفسیاتی علامتوں اور جسمانی شکل و شباہت کا آپس میں مقابلہ کیا جائے، تو بہت سے مشابہت اور مماثلت کے صریح نشانات ملتے ہیں۔ ان سب سے واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد جو بابلی، اشوری، اموراتی، کنعانی، عبرانی، ارامی، عربی اور حبشی زبانیں بولتے تھے، آپس میں جدا ہونے سے پہلے ایک ہی جماعت تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی جگہ رہتے تھے۔

اس جماعت کی جائے رہائش کہاں تھی؟ نہایت صحیح اور قابلِ یقین یہ نظریہ ہے کہ وہ جگہ عرب کا جزیرہ نما تھا۔ (یہاں مصنف اس تھیوری کے ثبوت میں وجوہات اور دلائل بیان کرتا ہے)

سنہ ۳۵۰۰ ق م کے لگ بھگ سامیوں کا ایک گروہ عرب سے نکل کر شمال مشرق کی طرف گیا، اور عراق میں وہاں کی مہذب قوم سمیر سے جا کر مل گیا۔ اور ان کے اختلاط سے اب قوم آکاد بنی جس کو بعد میں بابلی کہنے لگے۔

اس پہلی نقل مکانی کے تقریباً ایک ہزار سال بعد ایک اور جماعت اموریوں کی عرب سے نکل کر شام کے میدانوں میں آباد ہو گئی یہ جماعت اُن لوگوں پر مشتمل تھی جو بعد میں سمندر کے ساحل کے میدانوں میں دیکھے گئے تھے اور اپنے تئیں کنعانی کہتے تھے۔ لیکن یونانی جن کے ساتھ ان کی تجارت تھی، وہ ان کو فنیقی کہتے تھے۔

سنہ ۱۵۰۰ ق م اور سنہ ۱۲۰۰ ق م کے درمیان ارامی قوم عرب سے نکل کر شام اور دمشق میں پھیل گئی، اور اس طرح عبرانی قوم جنوبی حصے میں آباد ہو گئی۔

پھر سنہ ۵۰۰ ق م کے قریب ایک تیسری نقلِ مکانی عرب سے ہوئی اور اس میں بنطی لوگ تھے جو عرب سے نکل کر سینائی جزیرہ نما کے شمال مشرق میں آباد ہو گئے۔ اُن کا دارالسلطنت شہر **PETRA** تھا۔ جس

رومیوں کی تہذیب کے ماتحت نہایت اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا۔

اب ذرا ہم دُنیائے قدیم کا اطلس کھول کر اپنے آگے رکھ لیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ قومیں کہاں رہنے لگیں۔ ہمارے سامنے Hammond & Co کا اطلس ہے جس کا نام انہوں نے The March of Civilisation رکھا ہے۔

اس کے صفحہ B 6 پر دنیائے قدیم کا نقشہ ہے۔ یہ سب اقوام عراق میں دریائے دجلہ و فرات کی وادیوں میں رہتی تھیں۔ دُنیائے قدیم کی تہذیبیں ہمیشہ دریا کی وادیوں یا سمندر کے ساحلوں پر پیدا ہوئی ہیں اور نشوو نما پائی ہے۔ ہندوستانی آریاؤں کی تہذیب دریائے گنگا جمنا اور دریائے سندھ کی وادیوں میں بڑھی اور پلی۔ مصر کی تہذیب کا گہوارہ دریائے نیل تھا۔ فینیقی تہذیب سمندر کے ساحل پر قائم ہوئی۔

عیلام Elam (ایلام) دریائے دجلہ کے شمال و مشرق کی طرف میڈیا Media سے ملا ہوا تھا۔ بابل کی سلطنت دریائے دجلہ و فرات کے درمیان میں تھی۔ بابلی سلطنت کے شمال میں ان ہی دونوں دریاؤں کے درمیان سلطنت آکاد تھی۔ بابلی سلطنت کے جنوب میں سلطنت سمیر اور اُس کے جنوب میں ملک کلدانیان واقع تھا۔ اشوریا آکاد کے شمال میں بحیرۂ خضر یعنی Caspian Bay تک تھا۔ غرض یہ سب سلطنتیں زمانۂ حال کے عراق و ایران کے رقبہ میں خلیج فارس کے اُوپر Caspian Sea تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میڈیا کا رقبہ اب ایران میں شامل ہے۔ ان سب میں آپس میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اور ایک دُوسرے کے ملک پر قبضہ کرتے رہتے تھے۔ ایک مؤرخ زمانۂ حال کے موجودہ نقشہ پر عیلام کے دارالسلطنت سوسا کی حدود اس طرح بیان کرتا ہے: خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ اپنی انگلی شمال کی طرف بدیلو اور عمارہ تک اس طرح چلو۔ پھر مشرق کی طرف عراق کی سرحد کاٹ کر موجودہ قصبہ شوشتان تک پہنچ جاؤ۔ یہی زمانۂ ماضی کے سوسا (Susa) کا رقبہ تھا۔ اور یہ ہی مرکز تھا اس سلطنت کا جو عیلام کے نام سے مشہور تھی۔ یہ شہر سوسا جس کے مغرب کی طرف تنگی دلدل اور مشرق کی طرف ایران کے پہاڑ تھے، ایک بڑی تہذیب کا مرکز تھا جو قدیم قوم کے زمانہ میں تھی۔ اینٹوں اور جواہرات کے علاوہ یہاں کے مٹی کے برتن ایسے عمدہ اور نفیس بنتے تھے، جس سے بہتر انسان اب تک نہیں بنا سکا۔ پہیے دار گدھا

Marfat.com

کا استعمال تاریخ بنی نوع انسان میں سب سے پہلے یہاں ہوا۔ یہ شہر سوسا تاریخ کے چھ ہزار برس تک قائم رہا۔ اس کے اُوپر سے بہت سی سلطنتوں کے طوفان گزر گئے اور اس کی رونق ویسی ہی رہی۔ سمیریا، بابلی، مصری، اشوری، ایرانی، یونانی اور رومی سلطنتیں باری باری سے اس پر قابض ہوئیں۔ اور اب چودھویں صدی عیسوی تک شوشان کے نام سے اس کی رونق باقی تھی۔

ایران کی سب سے پُرانی تہذیب Elam (عیلام) سے شروع ہوئی۔ اس کا دارالسلطنت Susa (سوسا) دُنیا کا سب سے پُرانا شہر ہے جو اب تک معلوم ہُوا ہے۔ توریت میں اس ہی عیلام کا ذکر ہے۔ یہ قوم عرب سے نکل کر اس جگہ تقریباً ۲۵۰۰ سنہ ق م میں آباد ہوئی۔ بابل اور اسیریا سے اس کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار اسیریا کے بادشاہ نے اشور بانی پال نے اس کی دارالسلطنت پر قبضہ کر کے ۶۴۵ سنہ ق م میں اس کو ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیا۔ اس طویل جنگ میں تاریخ کا سبق پھر دھرایا گیا۔ قومیں اپنے ہی ہاتھ سے تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ عیلام کی شکست خود عیلامیوں کے ہاتھ سے ہوئی۔ نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر عیلام کے چند شہزادے جلاوطن کر کے نینوا میں بھیج دیئے گئے تھے۔ اس باہمی تفرقہ سے اشور بانی پال نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ عیلام کی پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑوا دیا۔ نینوا میں جو شہزادے جلاوطنی کی حالت میں تھے، اُن کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ فطرتِ انسانی کے مطالعہ کرنے والے کو اس فطرت کے متعلق نتائج نکالنے میں اس سے مدد ملے گی، کہ جس فوج نے عیلام کے دارالسلطنت سوسا کو فتح کر کے عیلامی سلطنت کو صفحۂ دُنیا سے مٹا دیا وُہ عیلامیوں ہی سے مرکب تھی۔ اور اُس کا جنرل عیلام کا ایک شہزادہ تھا۔ اشور بانی پال کے اصول پر رومیوں نے عمل کیا، اور اپنی پالیسی رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنا قائم کی۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اس پر ہی عمل کیا۔ اور شرم سے کہنا پڑتا ہے، کہ مسلمانوں کے بادشاہوں نے بھی یہ ہی طریقہ استعمال کیا۔ یہ تو فطرتِ انسانی کی گراوٹ کی حالت تھی۔ اب اُس کی رفعت بھی ملاحظہ ہو، اور صحیح اسلام کے بادشاہوں کی بھی شان دیکھو۔ معاویہ اور حضرت علیؓ کی لڑائیاں دنیا کی سلطنت کے لیئے فیصلہ کن لڑائیاں تھیں۔ اور معاویہ نے اس سازشی اصول پر بہت اچھی طرح عمل کیا۔ حضرت علیؓ کے لشکر میں روپیہ کی رشوت

Marfat.com

کے ذریعہ سے خُوب پھوٹ ڈالی۔ اور جو آدمی رشوت سے مل سکتے تھے، اُنہیں روپیہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور جو رشوت سے بالاتر تھے، اُن کا زہر سے خاتمہ کیا۔ اس پھوٹ کا دُوسرا ذریعہ حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ تھا۔ اور غلط پروپاغنڈا کرکے لوگوں کو اپنی طرف ملا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب آخری حیلہ قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کا اختیار کیا، تو حضرت علیؓ کی تقریباً ساری فوج ہی معاویہ کی ہم زبان ہوگئی لیکن حضرت علیؓ نے ان سازشوں اور مکروں کا جواب سازشں و مکر سے نہ دیا۔ اگر چاہتے، تو وُہ یہ اچھی طرح کر سکتے تھے۔ عمرو بن العاص متذبذب تھا کہ علیؓ کی طرف جائے یا معاویہ کی طرف۔۔۔ اگر چاہتے، تو علیؓ اُس کے تذبذب سے فائدہ اُٹھا کر اُس کو اپنی طرف کر لیتے۔ لیکن نہیں کیا۔ اور معاویہ نے حکومت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ علیؓ نے جب سقیفہ میں سازش نہ کی، تو یہاں کیا کرتے۔ تقریباً سارا چودھواں باب کتاب پیدائش یا تکوین عیلام کے ہی متعلق ہے۔ عیلام کا ایک بڑا بادشاہ "قدر لاعمر" تھا۔ جس نے سلطنت عیلام کو بحر متوسط تک بڑھا دیا تھا۔ اُس کا ذکر توریت کے اُس باب میں قدر لاؤمر Chad or loorner کے نام سے ہے۔

سمیریا اور عقاد (اکاڈ) پھر نقشہ کو لو۔ خلیج فارس سے وہاں تک جہاں دجلہ و فرات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں جاؤ اور پھر فرات کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف آ جاؤ۔ تو لائن یا راستہ کے شمال و جنوب میں سمیریا کے پُرانے شہر زمین میں دبے ہوئے ملیں گے یہ شہر Eridu (موجودہ ابو شہرین)، اُر، ur (موجودہ مکیر) اُرک (جو بائیبل میں Erech کے نام سے ہے اور موجودہ ورقہ)، لارسا Larsa (بائیبل کا Ellarsar موجودہ سینکرہ)، لگاش Legash (موجودہ شیرُولا) Nippur (Niffer) اور نیسین Nisin ہیں۔
اب اگر فرات کے ساتھ ساتھ چلو تو زمانۂ قدیم کا نہایت مشہور شہر بابل ملتا ہے۔ اُس کے مشرق میں نہایت قدیم تہذیب کی جگہ Kish کا مقام ہے۔ اس سے اور تقریباً ۶۵ میل آگے فرات ہی کے ساتھ ساتھ چلو، تو شہر Agade کا مقام ملتا ہے جو پُرانے زمانہ میں سلطنت اکاڈ کا دارالسلطنت تھا۔ یہ سارے شہر زمین میں دبے ہوئے تھے۔

Marfat.com

اور اب انیسویں صدی میں زمین کا سینہ چاک کر کے اُنہیں نکالا، تو اُس سمیرین تہذیب کا پتہ چلا جو زمانۂ قدیم کے عجائبات میں سے تھی۔ اس تہذیب کو زمین کھود کر نکالنا فن اثریات قدیمہ کا معجزہ ہے۔ یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں کو اس تہذیب کا علم نہ تھا جو ۴۵۰۰ ق م کے زمانہ میں اپنی جوانی پر تھی۔ ایک مؤرخ کہتا ہے کہ ابھی تو اس کی ابتداء ہے۔ جب کھدائی زیادہ ہوگی اور لوگ اُن چیزوں کا مطالعہ کریں گے جو نکلی ہیں، تو اس علم میں بہت زیادتی ہوگی۔ ان کھنڈرات سے انسان کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

پردہ داری میکند برطاق کسریٰ عنکبوت بوم نوبت میزند بر گنبدِ افراسیاب

اضحت منازلهم قفرا معطلة وساكنوها الى الاجداث قد نزلوا

"یعنی اُن کے رہنے کے گھر غیر آباد ویران ہوگئے، اور اُن گھروں کے رہنے والے قبروں میں اُتار دیئے گئے۔ صدق اللہ وھو اصدق الصادقین"

وما الحيوة الدنيا الا متاع الغرور۔ انسان کی زندگی دھوکا ہی دھوکا ہے۔

یہ مٹی کی الواح زمین میں سے نکلی ہیں جن سے ان کی تاریخ کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہوئے۔ جن میں سے ایک دو نیک اور باقی سب ظالم تھے۔ ان ظالموں میں سے ایک Lugal Zaggist تھا جس کا زمانہ غالباً ۲۷۷۷ ق م سے ۲۷۵۳ ق م تک تھا۔ ان کے شاعروں کے کلام میں ایک بہت بڑے پانی کے طوفان کا ذکر ہے۔ جس کی تصدیق ۱۹۲۹ء میں Prof. Woolley نے بھی اپنی کھدائیوں کے ذکر میں کی ہے۔

اس ہی درمیان میں قوم عقاد نے سلطنت قائم کر لی تھی۔ اُن کا بادشاہ سرغون Sargon تھا۔ جس کا زمانہ غالباً ۲۶۵۲ ق م سے لغایت ۲۵۹۷ ق م تھا۔ اس کی ماں مندر کی رنڈی تھی۔ مؤرخین اس کو سرغون اعظم کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نے بنی نوع انسان کے لیئے عظیم مصائب پیدا کئے۔ مؤرخین اُس کو ہی اعظم کا خطاب دیتے ہیں جو بنی نوع انسان کا سب

Marfat.com

زیادہ برباد کرنے والا ہوتا ہے۔ اس سرغون نے Lugal Zaggist کو شکست دی، اور قید کرکے Nippur لے گیا۔ عیلام کو بھی اس نے فتح کیا۔ اور آخرکار خلیج فارس تہپنچ کر اپنے اسلحہ اُس کے پانی میں دھوئے اُس کا ایک لڑکا Naram Sin اُس کا جانشین ہوا۔ اُس کا زمانہ غالباً ۲۷۰۵ قم سے ۲۵۱۷ قم تک تھا۔

Ur. بھی نہایت دولتمند اور آرام و عیش و عشرت کا شہر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ Ur ہی کے علاقہ کے رہنے والے بیان کئے جاتے ہیں۔ اُس شہر کا زمانہ ۳۵۰۰ قم سے ۲۰۰۰ قم تک تھا۔ اُس کا سب سے بڑا بادشاہ Ur-enger تھا۔ جس کا زمانہ پُرامن تھا۔ تمام مغربی ایشیا کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور تمام سلطنت سمیریا کے لیئے ایک ضابطۂ قانون مرتب کیا۔ تاریخ میں یہ پہلا ضابطۂ قانون ہے۔ اُس کا بیٹا Dungi اُس کا جانشین ہوا جس نے نہایت کامیابی سے اٹھاون سال حکومت کی۔ اُس کامیابی کی وجہ سے اُس کو خداؤں کی جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ اس کی، اور اُس کے تین جانشینوں کی پرستش برابر خدا سمجھ کر ہوا کی۔

اب یہ امن و امان کا زمانہ ختم ہوا۔ اہلِ عیلام اور دیگر اقوام نے جن کو اُنھوں نے فتح کیا تھا۔ سمیریا اور اکاڈ سے بدلہ لیا۔ یہ غالباً ۲۱۸۰ قم کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ بدامنی کا زمانہ ۲۰۰ سال تک رہا۔

پھر بابل کے رہنے والے اموری خاندان کے ایک فرد حمورابی Hammurabi (۱۹۴۷ قم تا ۱۹۰۵ قم) نے سلطنت سمیر و اکاڈ کو از سرِ نو زندہ کیا۔ دنیائے قدیم کا یہ بہت مشہور بادشاہ ہے۔ اس کی شہرت فتوحات سے زیادہ اس کے ضابطۂ قانون پر مبنی ہے جو اُس زمانہ کے لحاظ سے نہائیت اعلےٰ تھا۔ اکثر اس کا مقابلہ حضرت موسیٰؑ کے قانون سے کیا جاتا ہے جو قانونِ حمورابی سے تقریباً پانچ صدیوں بعد آیا تھا۔ لیکن اخلاقی معیار میں حمورابی کا قانون حضرت موسیٰؑ کے قانون کو نہیں پہنچتا۔ امورِ سیاست میں

Marfat.com

اخلاق کے معیار کو بلند رکھنا بڑی بات ہوتی ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے جیسا علامہ سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں لکھا ہے کہ حمورابی حضرت ابراہیمؑ کا ہمعصر ہو اور یہ قانون اُس نے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت سے لے کر بنایا ہو ۔ کرنل سائیکس نے اپنی تاریخ ایران میں حمورابی کا زمانۂ سلطنت ۲۲۶۲ ق م سے لے کر ۲۲۱۳ ق م تک لکھا ہے ۔ لیکن ہم اُوپر کی لکھی ہوئی تاریخوں کو جو Toynbee سے لی گئی ہیں، قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں ۔

حمورابی کا حُلیہ جو Toynbee نے حمورابی کے مجسمہ سے لے کر لکھا ہے، قابلِ ذکر ہے ۔ سر کے بال کترے ہوئے، اُوپر کا لب بالکل منڈا ہوا، ڈاڑھی لمبی ۔ یہ ہے اُس کا حُلیہ جو اُس نے اپنے اموری آباؤاجداد سے ورثہ میں پایا تھا ۔ گویا حضرت ابراہیم سے بہت پہلے سے یہ وضع قطع چلی آئی ہے ۔ آپ نے کبھی اپنے محلہ کی مسجد کے امام کو دیکھا ہے ۔ یہ ہی وضع قطع اُس کی ہوتی ہے ۔ مسجد کے یہ مُلّا واقعی قابلِ عزت ہیں جنہوں نے اتنی پُرانی وضع کو برقرار رکھا ہے ۔ (۲۱)

اہل سمیریا بھی اپنے مُردوں کے ساتھ سونا، چاندی، جواہرات، آلاتِ حرب وغیرہ دفن کر دیتے تھے جو اُن کی قبروں سے اب برآمد ہوئے ہیں ۔ غلامی کا رواج بہت زیادہ تھا ۔ بیماریوں کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ بدن پر بد ارواح کے قبضہ کر لینے سے پیدا ہوتی ہیں ۔ جھاڑ پھونک کو دوا پر ترجیح دی جاتی تھی ۔ قمری مہینوں کا استعمال تھا ۔ ہر ایک تیسرے یا چوتھے سال ایک مہینہ زیادہ کر دیتے تھے تاکہ مہینے موسم کے مطابق ہو جائیں ۔

مذہب :- بادشاہ **Ur-enger** نے اپنا ضابطۂ قانون اپنے خدا شمس کی طرف منسوب کیا تھا ۔ اُن کے یہاں بھی خداؤں کی کثرت تھی ۔ ہر ایک شہر کے لیئے خدا تھا ۔ انسان کا ہر کام کسی نہ کسی خدا سے منسوب ہوتا تھا ۔ سُورج کی پرستش بہت پُرانی تھی ۔ شمس خدا بہت بڑا خدا مانا جاتا تھا ۔ اُس کی نسبت خیال کیا جاتا تھا، کہ رات وُہ شمال کی تاریکیوں میں گزارتا تھا ۔ صبح ہوتے ہی

(21) Toynbee's Study of History. Vol. V, p. 229n

Marfat.com

وُہ آسمان پر چڑھ جاتا تھا۔ سُورج اُس کی رتھ کا صرف ایک پہیہ تھا۔ شہر Nippur کا بڑا خدا انلیل Enlil تھا۔ اُس کی بیوی ننِ لیل Nin-lil تھی۔ یورک Uruk ... کنواری خدائی Innini کی پرستش ہوتی تھی۔ آناڈ اُس کو ہی Ishtar کہتے تھے لگاش میں Ninkarsag خدائی کی عبادت ہوتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ رحمدل خدائی ہے جو انسانوں کے رنج وغم میں شریک ہے اور سنگدل خداؤں سے اُن کی سفارش کرتی ہے۔ غرض اسی طرح کے بہت سے خدا تھے۔ ان کا بھی یہی تصور تھا کہ ساری ہوا میں جن، بھوت، پریاں اور فرشتے رہتے تھے۔ فرشتے نیک ارواح تھیں۔ ہر ایک سمیری کے ساتھ ایک فرشتہ اُس کی حفاظت کے لیے ہوتا تھا۔ اور ایک بُری رُوح بھی ہوتی تھی۔ جس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اچھے فرشتے کو دُور کر کے خود سمیری کی روح و جسم پر قبضہ کر لے۔ اُن کا اعتقاد تھا، کہ ہر ایک مندر میں خدا رہتے ہیں جن کو خوراک، دولت اور عورت پہنچانا ان لوگوں کا فرض تھا۔ اُن کے خداؤں کے کھانے میں بیل، بکری، بھیڑ، فاختہ، مُرغی کے چوزے بطخیں، مچھلی، کھجوریں، ککڑیاں، کھیرے، انجیر، مکھن، تیل، روٹیاں ہوتی تھیں۔ پہلے پہلے انسان کا گوشت بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک لوح میں لکھا ہوا ملا ہے۔ بھیڑ Lamb انسان کے عوض میں ہے۔ اور انسان نے اپنی جان کے عوض بھیڑ دے دی ہے۔ یہ وُہ ہی تخیل ہے جو یہودیت اور مسیحیت میں Lamb کے متعلق ہے۔ قدرتی طور پر مندروں کے پروہت بہت دولتمند اور صاحب اختیار اور صاحب رسُوخ ہو گئے۔ درحقیقت وہ ہی بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ اور بادشاہوں اور مذہبی سرداروں کے تنازعات شروع ہو گئے تھے۔

اس موت کے بعد روح کی کسی حالت کے تو معتقد تھے، لیکن جنت و دوزخ کا خیال نہیں آیا تھا۔ یونانیوں کی طرح سمجھتے تھے، کہ تمام مُردوں کی روحیں خواہ نیک ہوں خواہ بد ایک تاریک جگہ پر بھیج دی جاتی ہیں۔ اُن کی عبادت، قربانیاں اور دُعائیں محض اس دُنیا کے مفاد کے لیئے ہوتی تھیں۔

اُن کا اعتقاد تھا کہ خداؤں نے انسان کو خوشی و راحت کے لیئے پیدا کیا تھا لیکن اُس کو اپنے ارادہ میں مختار بھی بنایا تھا۔ اس آزادی ارادہ کی وجہ سے

انسان نے گناہ کیئے۔ اور گناہوں کی سزا میں ایک بہت بڑا طوفان آب آیا۔ جس میں سب سوائے ایک جولاہے نامی ٹگ ٹگ کے غرق ہو گئے۔ لیکن پھر اس جولاہے نے بھی ایک شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ جس کی وجہ سے بقاءِ دوام اور طوالتِ عمر سے محروم کر دیا گیا۔ یہ صاف بتا رہا ہے کہ انبیاء کی تعلیم اُن کے کانوں میں پڑی ہوئی تھی۔

ان کی عبادت گاہوں کے ساتھ جوان اور حسین عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ خداؤں سے اور اُن کے نمائندگان پروہتوں سے مباشرت کرنے کی خدمت ان کے سپرد ہوا کرتی تھی تاکہ اُن کے خدا مندروں میں آن کر اس حظ و راحت سے محروم نہ رہیں۔ باعزت اور شریف خاندان کی عورتیں اس خدمت کو اپنا شرف سمجھتی تھیں اور لڑکیوں کے باپ فخر کرتے تھے کہ اُن کی لڑکیاں اس قابل سمجھی گئیں۔ بلکہ اُن کا جہیز بناکر اس مندر کے پروہتوں کے حوالہ کر دیتے تھے۔

بابل (Babylon).

عقاد اور سمیریوں کی تہذیبوں اور قوموں سے مل کر بابل کی تہذیب اور بابلیوں کی قوم پیدا ہوئی ہے۔ بابل تمام جنوبی عراق کا دارالسلطنت تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس کی تہذیب کے بہت سے حصے زمانہ حال کی تہذیب میں موجود ہیں۔ اور اس قوم نے دنیا کو وہ علوم سکھائے، جو اَب تک یاد ہیں۔ علمِ نجوم کی ابتدا بابل میں ہوئی اور یہ اُس کا خاص علم تھا۔ یونانیوں کو بابل ہی نے فلسفہ سکھایا۔ ریاضی سکھائی۔ اور علمِ طبیعیات کے سبق دیئے۔ سب سے پہلے قانون کا ضابطہ بابل ہی نے بنایا۔ ان کے مشہور بادشاہوں میں سے حمورابی پہلا مشہور بادشاہ ہے۔ اور اس کا ہی ضابطہ قوانین مشہور ہے۔ سحر و جادو دُنیائے قدیم میں بہت رائج تھا۔ اور اگر اس کی ابتدا بابل میں نہیں ہوئی، تو یہ تو یقینی امر ہے کہ اُس کا عروج یہاں ہی ہوا۔ زمانۂ قدیم کے بہت سے پیغمبروں کی تعلیم سے اہل بابل واقف تھے۔ ایک مؤرخ جو مذہب کی قیود سے آزاد ہے کہتا ہے کہ یہودیوں کو اُن کی داستانیں Mythology بھی بابل سے ملی ہیں۔ [۲۲] انبیا

(22) Will Durant : Our Oriental Heritage, chap. ix, p. 218

Marfat.com

کے حالات کو اُس نے داستانوں سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن شریف سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اہلِ بابل کو انبیاء اور اُن کی تعلیم کا علم تھا۔ اور نیز یہ کہ جادو میں اُنہوں نے بہت ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ ۲۳

جادو کیا ہے، اس کی اصلیت کتنی ہے، اس میں کچھ اثر ہے یا نہیں، اور اگر اثر ہے تو کیوں۔ اس بحث کو فلسفۂ اسلام حصہ دوم میں دیکھو جہاں یہ بحث تفصیل سے درج کی گئی ہے، اور اسلام کا نظریہ بتایا گیا ہے۔

اسی طرح نجوم اور نجوم کی پیشین گوئیوں کی مفصّل بحث فلسفۂ اسلام حصہ دوم میں دیکھو۔

بابل کی کہانی تو بہت بڑی ہے۔ جس نے یونان کو فلسفہ سکھایا۔ دُنیا کی توجہ علم ہیئت کی طرف دلائی۔ بہترین ضابطۂ قانون پیش کیا جو موجودہ مغربی تہذیب کا سرچشمہ ہے، جس نے نہایت عظیم الشان سلطنت پیدا کی اُس کی داستان کے لیئے تو کئی راتیں چاہئیں اور پھر بھی یہ کیفیت ہوگی کہ ع شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ مے خیزد۔ اختصار کے ساتھ ہم چند باتیں کہتے ہیں۔

اس کے دو بادشاہ بہت عظیم الشان گزرے ہیں۔ ایک تو حمورابی، اور دُوسرے دور میں بنو خذ رزار Nebuchadrezzar جس کا ذکر بائیبل کی کتاب دانیال میں ہے۔ اور جس کا زمانہ ۶۰۵ ق م سے ۵۶۲ ق م تک تھا۔

حمورابی Hammurabi اُس کا زمانہ ۲۱۲۳ ق م سے ۲۰۸۱ ق م تک رہا ہے اس کا ضابطۂ قوانین بہت مشہور ہے جس کو ۱۹۰۲ء سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اُس سال Susa کی کھدائیوں میں ایک بڑے مخروطی شکل کے خاص پتھر کے ستون پر یہ ضابطہ کھدا ہوا ملا جہاں اس کو تقریباً 1100 B.C. میں بابل سے بطور مالِ غنیمت عیلام کی افواج لے گئی تھیں۔ اس ضابطہ میں 285 دفعات ہیں۔ ایک امریکن مؤرخ کہتا ہے کہ یہ ضابطہ زمانۂ حال

(23) Holy Quran Sura Al-Baqar, Ayets 102, 103.

کے یوروپین ممالک کے ضابطوں سے کسی حالت میں کم نہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ کئی امور میں اُن سے بہتر ہے اُس کی رائے میں اس کا اور حضرت موسیٰؑ کے ضابطہ قانون کا مخرج ایک ہی ہے [۲۴] حمورابی اور حضرت موسیٰؑ دونوں کا دعویٰ ہے کہ اپنا اپنا ضابطہ و قانون براہ راست اُنہوں نے خدا سے حاصل کیا ہے۔

حمورابی کا ضابطہ قانون انصاف، رحم، زیرکی پر مبنی ہے۔ اور اُس میں بہت سے اصول ایسے ہیں جو اسلام کے فقہ کے مطابق ہیں۔ مثلاً قصاص، عدل، غریبوں کی حفاظت، ظلم سے پرہیز وغیرہ وغیرہ۔ اس ضابطہ کے انصاف کا نمونہ ہم بتاتے ہیں۔ اس میں ایک دفعہ یہ تھا کہ اگر ملزم نے ڈاکہ ڈالا ہے، چوری کی ہے یا کسی کو ناجائز قتل کیا ہے اور ملزم بھاگ گیا ہے، دستیاب نہیں ہوتا، تو مستغیث خدا کے سامنے قسم کھا کر کہے گا کہ میرا اتنا نقصان ہوا ہے تو وہ رقم شہر کے گورنر کو ادا کرنی ہوگی۔ قتل کی صورت میں ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حکومت کی غفلت ہی سے ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آج مہذب دنیا میں کوئی مُلک ایسا ہے جو اپنے یہاں یہ نہایت عادلانہ قانون جاری کرے۔

حمورابی کی حکومت ۲۱۲۳ ق م تا ۲۰۸۱ ق م رہی ہے۔ اس کے خاندان کا خاتمہ حطی قوم کے بادشاہ نے ۱۷۵۰ ق م میں کر دیا۔ وُہ تو لوٹ مار کرکے چلا گیا اور بابل پر قوم Kassites کا قبضہ ہوگیا۔ ان کی سلطنت ۱۷۵۰ ق م سے ۱۷۰۳ ق م تک رہی۔ ایک مؤرخ نے اس سلطنت کا زمانہ ۱۷۴۶ ق م سے ۱۱۶۹ تک لکھا ہے۔

اس ہی دوران میں اشور (Assyria) کی طاقت بڑھنے لگی۔ اور آخر کار Assyria کے بادشاہ سناخرب (۷۰۵ ق م تا ۶۸۱ ق م) نے ۶۸۹ ق م میں بابل پر قبضہ کرکے اپنے لڑکے Esarhaddon کو اپنی طرف سے وہاں کا گورنر جنرل بنا دیا۔ لیکن بابل نے میڈیا Media سے ساز باز کرلی۔ اور میڈیا نے اسیریا کے دارالسلطنت نینوا پر ۶۱۲ ق م میں قبضہ کرکے اسیریا کو ختم کر دیا۔ اور

---

(24) Will Durant ; Our Oriental Heritage, chap. ix. p. 22on.

Marfat.com

نینوا ایسا برباد ہوا، کہ پھر نہ آباد ہوا۔ بابل کو ایران کے بادشاہ کروش اعظم Cyrus the Great نے ۵۳۸ ق م میں فتح کر کے اپنے ملک میں ملا لیا۔

مذہب:۔ اہل بابل کا وہی مذہب تھا جو سمیریوں اور آغادیوں کا تھا۔ شہر کا بادشاہ شہر کے خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی وجہ سے ٹیکس خدا کے لیئے ہوتے تھے۔ اور اُس کی طرف سے ہوتے تھے۔ اور جمع ہو کر مندروں کے خزانوں میں جاتے تھے۔ جس طرح یورپ کے بادشاہوں کا طریقہ تھا۔ اور انگلستان کا اب تک ہے کہ بادشاہ بادشاہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک پوپ یا اہل چرچ اُس کو تاج نہ پہنا دیں۔ اسی طرح بابل کا بادشاہ اپنی حکومت اور اپنا اختیار پروہتوں سے لیتا تھا۔ اس کی بڑی رسم یہ ہوتی تھی، کہ ایک جلوس نکلتا تھا اور بادشاہ سب سے بڑے خدا مردک کی مورتی ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلتا تھا۔ بادشاہ کی پوشاک بھی پروہت کی سی ہوتی تھی۔ بادشاہ کے لیئے اس کا سب سے زیادہ فائدہ یہ تھا کہ بادشاہ سے بغاوت کرنا خدا سے بغاوت کرنے کے مرادف تھا۔ بابل کی سلطنت ہمیشہ مذہبی سلطنت رہی ہے۔ اس طرح مندروں کی دولت بہت بڑھ گئی تھی۔ امرا اپنے گناہوں کے تاوان کا روپیہ مندر کو بھیجتے تھے۔ اور بادشاہ کو اگر کچھ خوشی کا موقع ہوتا تھا، تو وُہ بھی نذرانہ اور شکرانہ مندروں ہی کو بھیجتا تھا۔ فوج کے مالِ غنیمت کا بہت بڑا حصّہ سب سے پہلے مندر کو ملتا تھا بہت سی زمینیں مقرر تھیں، جن کی پیداوار مندروں کو ملتی تھی۔ اس طرح پروہت بہت امیر ہو گئے۔ اور وُہ تجارت کرتے کرتے بڑے تاجر بن گئے۔ اپنا روپیہ کم سُود پر لوگوں کو دیتے تھے۔ بسا اوقات غریب قرض داروں سے اصل بھی واپس نہیں لیتے تھے۔ یہ کہہ کر اُن سے در گزر کر جاتے تھے، کہ جب مردک تم پر مہربان ہوگا اور تم امیر ہو جاؤ گے، تو ہمارا روپیہ دے دینا، ورنہ نہیں۔

بابل کے بھی بے شمار خدا تھے۔ ایک دفعہ حکومت نے ان کی فہرست بنوائی تو وہ ۶۵۰۰۰ نکلے۔ ہر ایک شہر، ہر ایک گاؤں کے ہر ایک خاندان کے علٰحدہ علٰحدہ خدا تھے۔ اُن کی علٰحدہ علٰحدہ پرستش ہوتی تھی۔ اور سب سے بڑے خدا کو بھی مانتے تھے۔ اُس کی بھی پرستش کرتے تھے۔ وُہ خدا بھی آدمیوں سے ملے جُلے

Marfat.com

رہتے تھے۔ مندروں میں اُن کی بود و باش تھی۔ وہیں وہ کھانا کھاتے تھے۔ اور وہیں وُہ مذہبی حسین عورتوں کے وصل سے متمتع ہوتے تھے۔ اور بابل کی آبادی بڑھایا کرتے تھے۔ غرض کہ پروہت ہر بہانے سے ہر ایک عمدہ چیز لیتا تھا۔ دولت، عزّت، عورت سب اُس کو مل جاتے تھے۔ اور وُہ سب خدا کے نام پر۔

بابل کے سب خداؤں کا تذکرہ کرنا بے سُود ہے اور اس کتاب کے مقصد سے باہر۔ ان خداؤں میں مردوک سب سے بڑا خدا تھا۔ لیکن BAL یا BEL بھی بہت اہم تھا۔ یہ زمین تھی جس کو خدا تصوّر کیا گیا تھا۔ ہر ایک آدمی آخر کار اس میں ہی جاتا تھا۔ لہٰذا اُس کی بہت پرستش کی جاتی تھی۔ بابل در اصل بابِ بل تھا۔ یعنی بل خدا کا دروازہ۔ کثرتِ استعمال سے بابل ہو گیا۔

ایک خدائنی اشتر Ishtar تھی۔ یہ وہ ہی تھی جو شام میں Astarte، یہودیوں میں Ashtoreth تھی۔ مصر میں اُس کے مقابلہ میں Isis یونان میں Aphrodite اور روم میں Venus تھیں۔ Ishtar کی صفات بھی دلچسپ اور متضاد تھیں۔ وُہ عشق کی دیوی بھی تھی، اور لڑائی کی بھی خدائنی تھی۔ وُہ ماؤں کی بھی محافظ خدائنی تھی، اور رنڈیوں کی بھی۔ اور اس کو مہربان قحبہ کہتے تھے۔ اہلِ بابل اس کو کنواری، مقدس کنواری، اور کنواری ماں کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دفعہ اُس کو ایک شیر سے عشق ہو گیا۔ اُس کو بُھلا کر اپنے پاس بُلا لیا اور اپنا کام کرا لیا اور پھر اُس کو قتل کر دیا۔

تخلیق کائنات کا قصہ بھی سُنئے۔ پہلے کچھ نہیں تھا۔ طیامت (Tiamat) خدائنی اور Apsu یعنی سمندر باپ تھے۔ ان دونوں کے پانی ملے، اور چیزیں بننی شروع ہوئیں۔ اتنے میں طیامت نے باقی تمام خداؤں کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس وقت مردوک بڑے خدا نے مداخلت کی، اور طیامت کو قتل کر دیا۔ اس طرح کہ جب اُس نے مردوک کو نگلنے کے لیئے مُنہ کھولا، تو مردوک نے اندر نیزہ ڈال کر ختم کر دیا۔ مردوک نے مُردہ طیامت کے دو حصّے کیئے۔ ایک حصّہ کو اُوپر لٹکا دیا، تو وُہ آسمان بن گیا۔ دُوسرا حصّہ اُس نے اپنے پیروں

Marfat.com

کے نیچے رکھا، اور وُہ حصہ زمین بن گیا۔

اسیریا Assyria

بابل کی سلطنت کے دوران میں اُس سے تین صد میل شمال کی طرف اسیریا کی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ عیلام، سمیریا، عقاد، اور بابل کی تہذیبیں ایک ہی سلسلہ میں اور ایک دُوسرے کے مشابہ تھیں۔ جو تہذیب سمیریا میں شروع ہوئی تھی، وہ ہی بابل میں پختہ ہوئی۔ اور جو تہذیب بابل میں پختہ ہوئی تھی، وہ اسیریا میں جا کر مکمل ہوئی۔

اسیریا کی سلطنت چار شہروں کے ارد گرد قائم ہوئی تھی۔ یعنی (۱) اشور موجودہ قطعات شیر گھاٹ۔ (۲) اربیلا موجودہ اربل۔ (۳) کلخ موجودہ نمرود اور (۴) نینوا موجودہ کیونجک Kuyunjik اشور در اصل ان کا ایک خدا تھا جس کے نام پر اشور شہر آباد ہوُا۔ نینوا بھی ایک خدانی Nina کے نام پر آباد ہوُا تھا۔

اسیریا کی سلطنت کے دو امور بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو اس کی فتوحات اور وسعت، اور دوسرے اس کے بے انتہا مظالم۔ اگر ان کے ظلموں کی مثال ملتی ہے، تو وہ اسیریا کے جانشینوں یعنی دمشق کے فرماں رواؤں ہی کے کارناموں میں ملتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسیریا نے وُہ ظلم اپنے دشمنوں پر کیے، اور اموری شاہانِ دمشق نے وُہ ظلم اپنے بھائیوں پر کیے۔ فتوحات میں بھی دمشق ہی نینوا سے ٹکر کھاتا ہے۔

شروع شروع میں اسیریا کی حکومت محض شہر اشور پر مشتمل تھی۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے Agade کے شمال کی طرف واقع تھا۔ اشور کی حکومت کی تاریخ کئی حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ ایک تو وُہ زمانہ تھا جب تقریباً ۳۵۰۰ ق م میں عرب کی سرزمین سے کئی جماعتیں نکل کر یہاں آباد ہوئیں۔ اُن میں سے ایک جماعت نے اشور میں سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت ۳۵۰۰ ق م سے ۱۸۰۰ ق م تک اسی حال میں رہی۔ پھر ۱۸۰۰ ق م

اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان یہ اسیریا کی سلطنت بڑھنی شروع ہوئی اور شمال کی طرف پھیلی۔ اب اشور کی بجائے نینوا دارالسلطنت ہو گیا۔ اسیریا اس راستہ پر واقع تھا جو بابل سے مغرب کی طرف ملتا تھا۔ اس نے ہمسایہ سلطنتوں کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ اس کی لڑائیاں اکثر بابل سے رہی ہیں۔ ۱۳۰۰ ق م کے قریب ارامی (عربی) قوم نے عرب سے نکل کر ان تمام سلطنتوں پر قبضہ کر لیا اور اسیریا کی پرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ۹۷۰ ق م میں پھر اسیریا نے ابھرنا شروع کر دیا۔ یہ اسیریا کی حکومت وسطی کہلاتی ہے جو ۹۷۰ ق م سے ۷۴۵ ق م تک رہی۔ ظلم و فتوحات میں اس سلطنت کا درجہ بہت اونچا تھا۔ اس زمانہ میں ایک بادشاہ اشور نذیر پال Assurnazirpal تھا جس کا زمانہ حکمرانی ۸۸۴ ق م سے ۸۶۰ ق م تک تھا۔ اس نے بہت سے ملکوں کو فتح کر لیا۔ قیدیوں کو جمع کرکے جن میں بچے بھی ہوتے تھے، یک لخت آگ میں زندہ جلا دیتا تھا۔ اس سلطنت کے ظلموں سے تنگ آ کر تمام ماتحت سلطنتوں نے اس کے خلاف سازش و اجتماع کرکے بغاوت کی اور آزادی حاصل کر لی۔ اب تیسری اور آخری دفعہ پھر اسیریا کی حکومت قائم ہوئی جو ۷۴۵ ق م سے ۶۱۲ ق م تک رہی۔ اس آخری دور میں اشوریا کے بادشاہ سات ہوئے ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ ظالم تھا۔ اور ان میں بھی اشوربانی پال Assurbanipal بہت ہی ظالم تھا۔ اسیریا کی سلطنت دنیائے قدیم کی تہذیب و تمدن کی وارث تھی۔ یونانی تہذیب پر اس کا بہت زیادہ اثر تھا۔ یوں بھی یونان کے اولین اور بڑے بڑے فلاسفر ساحل ایشیائی کوچک کے رہنے والے تھے۔ اسیریا کا اثر اسیریا یعنی شام سے ہوتا ہوا یورپ میں پھیلا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی تہذیب کے اثرات اور اس کی فوجی تنظیم اور طریقۂ جنگ کے بہت سے اصول اب تک دنیا کی بڑی طاقتوں کے زیرِ عمل ہیں۔ دمشق کے امویہ بادشاہوں نے اپنے ظلموں میں اسیریا کی تقلید کی ہے۔ سلاطینِ سابق کی تقلید میں یزید نے اپنے تئیں خدا منوانے کی کوشش کی تھی۔ اسیریا بہت ہی لڑاکا قوم تھی۔ اور جب تک یہ سلطنت قائم رہی اس نے اپنے ہمسایوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

اشور بانی پال Assurbanipal کا زمانۂ سلطنت ۶۶۸ ق م سے ۶۲۶ ق م تک

Marfat.com

تھا۔ یہ بڑا فاتح اور ظالم تھا۔ اس نے خود اپنے ظلموں کی فہرست دی ہے، اور ان کو فخر سے بیان کیا ہے۔ جب اُس نے عیلام کو فتح کیا تو وہاں کے تقریباً سارے باشندوں کو تہہ تیغ کر دیا یا قیدی بنا لیا۔ کوئی جانور اور وہاں کا کوئی خدا نہ چھوڑا۔ سب کو اپنے دار السلطنت نینوا میں لے گیا۔ اس زمانہ میں اور اُن کے مذہب میں خدا بھی قیدی بنائے جا سکتے تھے۔ عیلام کو ۶۳۹ ق م میں فتح کیا۔ پھر Susa کو لوٹ لیا۔ اور وہاں کے مُردہ بادشاہوں کی ہڈیوں کو ان کی قبروں سے اُکھیڑ کر نینوا میں بھیج دیا۔ اور اُن کی ہڈیوں پر وہ رسُومات ادا کیں جو اُن کے عقائد کے بموجب ہڈیوں کے اندر رہنے والی ارواح کو از سر نو زندہ کر دیتی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ وُہ زندہ ہو کر اپنے ملک کی تباہی کو دیکھیں، اور جلیں۔ مُردوں کی ارواح کو تکلیف دینے کی یہ نئی ایجاد تھی جو اسیریا جیسے ظالموں ہی سے ممکن ہے۔ عیلامی بادشاہ کا سر اس کی محفل عیش و عشرت میں رکھا گیا۔ پھر اُس کو نیزے پر چڑھا کر نینوا کے دروازے پر لٹکا دیا۔ اس ہی رسم و رواج کی تقلید اموی بادشاہ یزید کیا کرتا تھا۔ عیلامی جنرل کی زندہ کھال کھنچوائی گئی اور پھر بکرے کی طرح اُسے ذبح کیا گیا۔ اُس کے بھائی کو جانور کی طرح ذبح کر کے اُس کی بوٹیاں کیں اور اُن بوٹیوں کو تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی اسیریا ہی کی تقلید کی جب وُہ زندہ آدمیوں کی کھال کھنچواتے تھے، اور گدی کے پیچھے سے زبان نکلواتے تھے۔ فقہ اسلام اس نوعیت کی سزا کو کبھی روا نہیں رکھتا۔

آخر کار اُس کے ظلم رنگ لائے۔ مفتوحہ اقوام نے مل کر اس کے خلاف ایک بڑی سازش کی۔ اشور بانی پال نے اپنی طرف سے اپنے بھائی Shamesh shum ukin کو بابل کا حاکم مقرر کیا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھو وُہ ہی بھائی اُس سازش کا لیڈر تھا جو اشور بانی پال کے خلاف اُٹھی تھی۔ اُس سازش میں سلطنت بابل، عیلام، کلدانی، قبائل، ارامی قبائل، شمالی عرب، اور بہت سی شام کی جنوبی ریاستیں، اور مصر کی سلطنت شامل تھیں۔ اشور بانی پال کو بہت تعجب ہوا جب اُس نے دیکھا کہ اس بڑی تحریک کا لیڈر خود اُس کا بھائی ہے۔ بادشاہوں کو اکثر ایسے تعجب کے مواقع پیش آئے ہیں۔ اشور بانی پال کی دلی حالت کا اندازہ اُس کی اپنی تحریر سے ہوتا ہے جسے ہم نیچے درج کرتے ہیں۔

Marfat.com

"میں نے سارے مذہبی فرائض ادا کئے ہیں۔ میں نے مُردوں کے لیئے قربانیاں کی ہیں اور اپنے آباؤ اجداد بادشاہوں کے بھوتوں کے لیئے شراب چڑھائی، پہلے یہ باتیں موقوف ہو گئی تھیں۔ میں نے از سرِ نو ان کو جاری کیا۔ اور اُن کے قواعد بنائے۔ میں نے خداؤں اور آدمیوں کے ساتھ نیکی کی۔ مُردوں اور زندوں کے ساتھ بھلائی کی۔ پھر کیوں بیماری، مصائب اور آلام نے مجھے گھیر لیا ہے۔ ملک میں جو بد امنی ہے میں اُس کو دُور نہیں کر سکتا۔ اور میرے خاندان میں جو تفرقے اور جھگڑے ہیں اُن کو میں نہیں روک سکتا۔ تکلیف دینے والی بدنامیاں مجھے ہمیشہ ستاتی ہیں، دماغی اور جسمانی کوفت مجھے مارے ڈالتی ہے۔ میں رنج و غم میں رو رو کر اپنے دن گزار رہا ہوں۔ شہر کے خدا کی عید کے دن بھی میں مصیبت زدہ بدبخت غمگین ہوں۔ موت میری طرف آ رہی ہے غم و ماتم، آہ و زاری میں میں اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں اے خدا میرے جیسے گنہگار کو بھی توفیق دے کہ میں تیرا نور دیکھوں۔ کب تک اے خدا تو مجھ پر عذاب نازل کرے گا۔ میرے ساتھ تو وُہ سلوک ہو رہا ہے جس کا وُہ شخص مستحق تھا جو کبھی نہ خدا سے ڈرا ہو، اور نہ اُس کی بیوی خدائی سے ڈرا ہو۔" [25]

یہ دُنیا کی بے وفائی کا اچھا نمونہ ہے۔ یہ اُس زمانہ کے سب سے بڑی سلطنت کے بادشاہ کی حالت ہے۔ اب کس طرح بے گناہ بن کر اُن احسانات کو جتا رہا ہے جو اُس نے اپنے زعم میں اپنے خداؤں پر کیئے تھے۔ اور خود جو ظلم کیئے تھے، وُہ بالکل بھول گیا۔ یہ ذہنیت ایسی ہی ہے کہ جو شخص حج، نماز، عبادت اس غرض سے کرتا ہے کہ پچھلا کیا ہوا گناہ تو سب دُھل جائے، اور اب مزید موقع دوبارہ وُہ ہی ظلم و ستم کرنے کا مل جائے۔

اپنے ڈیڑھ سو سال کے زمانۂ اقتدار میں اسیریا نے یہ ظلم و ستم کیئے۔

(25) Cambridge Ancient History, vol. iii, p. 127

Will Durant : Our Oriental Heritage. Chap. x. p. 282

دمشق کا تخت و تاراج	۷۳۲ ق م
ساریا 〃 〃	۷۲۲ ق م
سامر 〃 〃	۷۱۴ ق م
بابل 〃 〃	۶۸۵ ق م
سڈن 〃 〃	۶۷۷ ق م
ممفس 〃 〃	۶۷۱ ق م
تھیبز 〃 〃	۶۶۳ ق م
سوسا 〃 〃	۶۳۹ ق م

زمانۂ حال کے ایک مشہور مورخ کی انگریزی عبارت کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

"جس طرح رومی قوم ہر فتح کے بعد ہزاروں قیدی بنا لیتی تھی، اور اُن کو قید خانوں میں ڈال دیتی تھی، اور ہزاروں کو قومی سرکس میں بھوکے درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا، اور اُن کے ٹکڑے کیئے جانے کا تماشہ لوگ دیکھتے تھے، اسی طرح اہلِ اسیریا کو قیدیوں کے تکلیف دینے میں خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بچوں کی آنکھیں اُن کے والدین کے سامنے نکالتے تھے، اور اُن کو اندھا کر دیتے تھے۔ لوگوں کی زندہ کھال کھنچواتے تھے۔ دیگوں میں زندہ آدمیوں کو ڈال کر اُن کے کباب بناتے تھے۔ اپنے لوگوں کے تماشہ کے لیئے انسانوں کو پنجروں میں بند کر کے اُن کی نمائش کرتے تھے۔ اور پھر جو بچتے تھے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتے تھے۔ اشور بانی پال کہتا ہے کہ میں نے تین ہزار قیدیوں کو زندہ جلا دیا۔ ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ ان دشمنوں کے منہ میں سے زبانیں میں نے کھینچ لیں۔ ان کے اعضاء میں نے کتوں اور سوروں کے آگے ڈال دیئے"۔

ان ہی ظلموں کی تقلید اموی بادشاہان خصوصاً ان کے نائب حجاج بن یوسف

(26) Our Oriental Heritage Chap. x. p. 275

Marfat.com

اور عباسی منصور دوانیقی نے کی تھی۔ اس زیادتی کے ساتھ کہ یہ مؤخرالذکر لوگوں کو زندہ دیواروں میں بھی چن دیتے تھے، اسلامی فقہ کو خود مسلمانوں نے کتنا بدنام کیا ہے
اسیریا کی فتوحات بہت زیادہ تھیں لیکن ان فتوحات سے اسیریا کو بجائے فائدہ کے نقصان ہوا۔ مسلمانوں کی فتوحات میں اسیریا کی فتوحات اور ان کے نتیجہ میں اتنی مشابہت ہے، کہ ہم مؤرخ کی اصل عبارت یہاں نقل کرتے ہیں:-

The extent of her conquests had helped to weaken her ; not only had they depopulated her fields to feed insatiate Mars, but they had brought into Assyria, as captives, millions of destitute aliens who bred with the fertility of the hopeless, destroyed all national unity of character and blood, and became by their growing numbers a hostile and disintegrating force in the very midst of the conquerors. More and more the army was filled by these men of other lands, while semi-barbarous marauders harassed every border, and exhausted the resources of the country in an endless defence of its unnatural frontiers.

ترجمہ:- اس (اسیریا) کی فتوحات کی وسعت نے اس کو کمزور کر دیا۔ یہی نہیں کہ متواتر لڑائیوں کی وجہ سے کھیتوں کی زراعت کو مزارعان کی کمی کی وجہ سے نقصان پہنچا۔ لڑائی کا سلسلہ جب شروع ہو جائے، تو ختم ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بھی ہوا کہ ان لڑائیوں کی وجہ سے کروڑوں غیر ملکی لوگ قیدیوں کی صورت میں آئے، اور انہوں نے قومی نسل اور خصلت کی یکرنگی اور یکجہتی کو برباد کر دیا۔ اور اپنی کثرت اور بڑھتی ہوئی افزائش کی وجہ سے اپنے فاتحان ہی کے بیچ میں ایک مخالف اور انتشار پیدا کرنے والی طاقت بن گئے۔ خود فوج کے اندر ان غیر ملکی لوگوں کی زیادتی ہوگئی۔ اس کے علاوہ ملک کی وسعت کی وجہ سے سرحدیں بڑھ گئیں اور ان پر وحشی اور لٹیرے لوگ یلغار کر کے ستانے لگے جس کی وجہ سے ان غیر قدرتی سرحدوں کی دوامی حفاظت میں ملک کے وسائل اور ذرائع کو بہت نقصان پہنچا۔

(27) Our Oriental Heritage, Chap. x. p. 283
See also Toynbee's Study of History, Vol. iii, pp. 150-4, 167-174

اشور بانی پال ۶۲۶ ق م میں مرگیا۔ اور بابل کی سازشوں نے ۶۱۰-۶۱۴ ق م میں اسیریا کی سلطنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ۶۱۲ ق م میں اسیریا کا دارالسلطنت نینوا ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے محو ہوگیا۔ وُہ نینوا جو دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کا دارالقرار تھا۔ وُہ نینوا جس کے آگے تمام مہذب دنیا کے سرکش بادشاہوں کے سرخم تھے۔ وُہ نینوا جس نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو فتح کرکے برباد کر دیا تھا۔ وہ نینوا جس کے عیش و عشرت کے افسانے تمام مہذب دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور قابل رشک سمجھے جاتے تھے۔ تمام ظلموں اور گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لے کر ہمیشہ کے لیے صفحۂ دنیا سے ملیا میٹ ہوگیا۔ اب اُس کے افسانے عذاب الٰہی سے ڈرانے کے لیے عبرت کا سبق دے رہے ہیں۔ آج اُس کی یہ حالت ہے کہ اس کے کھنڈرات پر جنگل کے خود رو سبزے نے بھی اُگنے سے انکار کر دیا۔ اور وہاں الٰہی نحوست برستی ہے کہ جو بھولا بھٹکا مُسافر وہاں آجاتا ہے تو وہ بہت جلد وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ روایت ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام دشت نینوا میں پہنچے تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہاں سے جلد نکل چلو۔ کیونکہ اس خطۂ زمین پر عذاب الٰہی ہے۔

اب وُہ سلطنت قائم ہوئی جس کو مؤرخین نے نیو بابل (Neo-Babylonian Empire) کا خطاب دیا ہے۔ آخر کار اس سلطنت کو بھی ایران کے کوروش اعظم Cyrus the Great نے ۵۳۹ ق م میں فتح کرکے ختم کر دیا۔ ۶۳۹ ق م میں عیلام کی سلطنت دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ ۶۱۰ ق م میں اسیریا کی سلطنت فنا ہوئی۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام سچ ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (النمل ۲۷: ۶۹) الٰہی قوموں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (یونس ۱۰: ۱۳، ۱۴)

یعنی تم سے پہلی اُمّت والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب اُنہوں نے ظلم کیا حالانکہ ان کے وقت کے رسول واضح اور روشن نشانیاں لے کر آچکے تھے۔ اور وہ لوگ ایمان

Marfat.com

نہ لائے۔ ہم مجرموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ہم نے اُن کے بعد تم کو زمین میں اُن کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا کام کرتے ہو۔

جیسا کام مسلمانوں نے کیا وہ اُن کی موجودہ حالت سے ظاہر ہے۔ اور جو جو عذاب الٰہی اُن پر آتے رہے اور آرہے ہیں، وہ بھی عیاں ہیں۔

(۳) ویدوں کا فلسفہ اور مذہب

ہندوستان کا فلسفہ کبھی خالص فلسفہ نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ اس میں مذہب کی آمیزش رہی۔ اگرچہ مذہب وہ ہی قیاسی مذہب تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں ویدوں میں خالص وحدانیت بھی ہے۔ لیکن زرتشتی مذہب کی طرح وہ بہت جلد مفقود ہو گئی۔ اوپانیشد نے کبھی کچھ کچھ فلسفہ کی طرف میلان ظاہر کیا ہے۔ پہلے ہم اُن کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اوپانیشد دو الفاظ سے مرکب ہے۔ اوپا جس کے معنی نزدیک کے ہیں، اور شد جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ جو نہایت ذہین اور مقرب شاگرد ہوا کرتے تھے اُن کو گرو یعنی معلم اپنے پاس بٹھا کر راز داری کے امور بیان کرتے تھے۔ ان رازکے خطبات ہی کا مجموعہ اوپانیشد ہیں۔ مصر کے بعد یہ سب سے پرانا فلسفہ ہے۔ اوپانیشد ۸۰۰ ق م اور ۵۰۰ ق م کے مابین مرتب ہوئے تھے۔ ان میں ایسے ۱۰۸ خطبے یا تقاریر ہیں جو مختلف رشیوں یا اُستادوں کی بیان کردہ ہیں۔ ان سب میں سب سے بڑا یجنوالکی Yajnavalkya مردوں میں، اور گرگی Gargi عورتوں میں ہوئے تھے۔ یجنوالکی نے دنیا کے مصائب سے گھبرا کر گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ اس کا فلسفہ جرمنی کے فلاسفر Schopenhaur کی قنوطیت (یاس و ناامیدی) سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے۔[۲۸]

ہندو فلسفہ کی ہمیشہ یہ تلاش رہی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ مل جائے، جس سے بار بار کے پیدا ہونے سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

28
R.E. Hume : The Thirteen Principal Upanishads Oxford U.P.

پہلا سبق جو اوپانیشد دیتے ہیں وُہ یہ ہے کہ انسانی ذہن محدود ہے۔ صرف اس کی مدد سے حق نہیں مل سکتا۔ کمزور دماغ جس میں ذرا سے ہوا و خوراک کی تبدیلی سے بد پیدا ہو جاتا ہے، یہ کس طرح حقیقت لامحدود کو جس کا یہ ایک بہت ہی چھوٹا حصہ ہے معلوم کر سکتا ہے۔ وُہ دوسری شئے جس سے اس کو مدد لینی چاہیئے "آتما" ہے۔ یہ آتما دنیا کی روحِ اعظم ہے۔ وُہ باہر کی آنکھیں بند کر کے اندر غور کرنے سے ملتی ہے۔ اس کے لیئے انسان کو اپنے علم کا غرور اور اپنے ظاہری حواس کا بھروسہ چھوڑنا چاہیے۔ پندرہ دن تک برت رکھے، صرف پانی پی لے اور کچھ نہ کھائے۔ اس طرح دماغ کو امن ہوگا اور خاموشی کی عادت پیدا ہوگی۔ حواس میں پاکیزگی آجاتی ہے۔ اور ان کی بغاوت جاتی رہتی ہے۔ اب خاموشی کے ساتھ روح اپنے تئیں محسوس کرتی ہے اور اس بڑی روح کو سمجھتی ہے جس کا یہ خود ایک حصّہ ہے۔ آخر کار انسان کی شخصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اور وحدانیت و حقیقت اُس کے سامنے آجاتے ہیں۔[29]

ہندو فلسفہ کی باطنی تعلیم میں یہ پہلا قدم ہے کہ ہماری خودی کی ماہیت جسم، ذہن، عقل یا شخصی نفس میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ وُہ خاموش، پرسکون عمیق ہستی ہے جو ہمارے ہی اندر ہے اور جس کو آتما کہتے ہیں۔ دوسرا قدم براہمہ ہے۔ یہ تمام کائنات کی روحِ عظیم ہے جو ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ نہ مذکر ہے، نہ مؤنث ہے۔ بغیر کسی شخصیت کے سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ہاتھ سے نہ چھوئے جانے والی ہے۔ اور کائنات کی ہستی یہ ہی ہے۔ یہ ہی حقیقت کی حقیقت ہے۔ نہ پیدا ہوئی نہ مرے گی، اور نہ کبھی کمزور ہوگی۔ یہ براہمہ تمام کائنات کی روح ہے جس طرح آتما تمام روحوں کی روح ہے۔ یہ ہی وہ قوت اور طاقت ہے جو تمام طاقتوں اور تمام خداؤں کے اُوپر غالب اور مستولی ہے۔

غالباً اس ہی فلسفہ کی بناء پر اہلِ ہنود حضرات کا خیال ہے کہ اُن کا مذہب بھی بہت اعلےٰ ہے۔ بُت پرستی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اس

(29) Katha Upanishad, iv, I.II.24; Chandogya Upanishad, vi. 7·
Radahakrishnan : Indian Philosophy, Vol h, pp. 145,151

فلسفہ میں بھی دوسرے خداؤں کی ہستی کو مان لیا گیا ہے۔ اور یہ محض تخئیل ہے مذہب کے لیئے عمل چاہیئے۔عمل کہاں ہے۔ براہمہ تمام کائنات کی روح ہے۔ اچھا ہے لیکن عملی امور تو یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے ظلم و جور و مصائب کے لیئے سزا و جزا ہو۔ اس کی طاقت براہمہ میں نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کو بخش سکتا ہے۔نہ معاف کر سکتا ہے۔ نہ سزا دے سکتا ہے۔انسان کی کمزوری اور اُس کے ماحول کی سختیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اس کے گناہانِ صغیرہ کو بخشنے والا بھی کوئی ہو۔ وہ اس فلسفہ میں موجود نہیں ہے۔ ایک مشین ہے کہ لوگوں کو بار بار اس دنیا میں پیدا کر رہی ہے۔ دنیا میں آنا تو پھر سزا ہی ہے۔ کیونکہ وُہ ہی دُنیا اور وُہ ہی دُنیا کے مصائب۔ اگر بادشاہ کے یہاں بھی پیدا ہوگئے تو کیا ہوا' بادشاہ کے یہاں پیدا ہونا امن و راحت و خوشی کی گارنٹی تو نہیں ہے۔ یجنوالی حکیم سے ایک دانشمند نے سوال کیا کہ خدا کتنے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ تین صد تین اور تین ہزار تین۔ پھر یہ سوال دُہرایا گیا۔ اُس نے کہا تینتیس۔ پھر سوال کیا گیا اُس نے کہا کہ چھ۔ پھر سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا کہ دو۔ پھر سوال کیا گیا' اُس نے جواب دیا کہ ڈیڑھ۔ پھر سوال کیا گیا' تو اُس نے جواب دیا کہ ایک۔ (نمبر۳۰) غالباً اگر پھر سوال دُہرایا جاتا تو وہ کہتا کہ کوئی نہیں۔

تیسرا درجہ نہایت اہم ہے۔ اور وُہ ہی ہندو فلسفہ کی جان ہے۔ وُہ یہ کہ آتما اور براہمہ ایک ہی ہیں۔ جو ہمارے اندر قوت ہے اور جس کو ہم نے روح الارواح کہا ہے وہ وہی ہے جو روحِ کائنات ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں **Subjective** اور **Objective** ایک ہی ہیں۔ اگر ہم میں سے ہماری شخصیت نکال لی جائے اور اُس کو نظر انداز کر دیا جائے' تو ہماری حقیقت اور خدا کی حقیقت ایک ہی ہو جاتی ہے یہ کائنات خدا میں سے کس طرح نکلی' اس کو ایک استاد اپنے شاگرد کو یوں سمجھاتا ہے:-"یہ انجیر ہے۔ اس کو توڑو۔ اس کے اندر بیج نظر آتے ہیں۔ اُن میں سے ایک کو توڑو۔ اب وُہ اتنا باریک ہے کہ نظر نہیں آتا۔ ایسی باریک شے کائنات کی روح ہے۔ وہ ہی حقیقت ہے۔ وُہ ہی آتما ہے' وُہ ہی تم خود ہو۔ (نمبر۳۱)

(30) Bribadaranyaka Upanishad, Vol. iii, p.9

(31) Chandogya Upanishad, Vol. vi, p. 2

خدا اور انسانیت کی ماہیت ایک ہی ہے۔ یہ ہے اوپانیشد کے فلسفہ کی روح۔ اسلام کا فلسفہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ عابد اور معبود، خالق اور مخلوق کبھی ایک ماہیت کے نہیں ہو سکتے۔

بادشاہ جنک نے یجنوالکی سے پوچھا کہ مہاراج! اس بار بار کی پیدائش سے کس طرح چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے؟ اُس نے جواب میں فلسفہ یوگ کی تلقین کی۔ اور کہا کہ ریاضت و مشقت کے ذریعہ سے تمام خواہشات نفسانیہ کو مار کر انسان کی شخصیت معدوم ہو سکتی ہے۔ اور وہ اپنے تئیں روح کائنات کے اندر مدغم کر سکتا ہے۔ اس فلسفہ کے نزدیک انسان کی یہ ہی انتہا اور آخری منزل ہے۔ یہ ہی اُن کی جنت ہے۔ تصوف پر بھی یہ ہی اثر ہے۔ غالب کہتے ہیں :ـ

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ؎ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی زندگی ایک درد ہے۔ مصیبت ہے۔ وُہ درد حد سے گزرا تو فنا ہو گئے۔ فنا ہونا تھا کہ خدا میں مل گئے۔ خدا میں ملنا تھا کہ عشرت نصیب ہو گئی۔ قطرہ بھی تو دریا میں جا کر فنا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہی اُس کی عشرت ہے۔ غالب کو تصوف سے خاص لگاؤ ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ؎ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

خود بھی کہتے ہیں ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ؎ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے میخانہ کا خیال نہ رہا جہاں بادہ خواری بھی ولی بننے کی ایک شرط ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم ؎ اے بے خبر ز لذتِ شرب مدام ما!

ممکن ہے یہاں تاویل کو کام میں لایا جائے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

بکوئے مے فروشانش، بجامے برنمے گیرند ؎ زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمے ارزد

اوپانیشد کا یہ فلسفہ شریعت و فلسفۂ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

شریعت اسلام کا نظریہ یہ ہے :ـ يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَٱدْخُلِى فِى عِبَٰدِى ﴿٢٩﴾ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ﴿٣٠﴾ الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰۔

Marfat.com

روح کتنی ہی ترقی کرلے، کتنے ہی اعلیٰ درجۂ اطمینان و رضا تک پہنچ جائے پھر بھی خدا سے علیحدہ اُس کے بندوں میں رہے گی، اور جنت میں علیحدہ داخل ہوگی۔ خدا کے اندر حلول کرنے کا کوئی بھی امکان نہیں۔

ویدوں کا زمانہ اور مذہب۔ جیمس ہیسٹنگز James Hastings نے اپنی انسائکلوپیڈیا میں لکھا ہے، کہ ویدوں کا زمانہ ۱۴۰۰ ق م سے ۲۰۰ ق م تک سمجھا جاتا ہے۔ وید چار ہیں: رگ وید، اتھر وید، شام وید اور یجر وید۔ اور یہ چاروں وید غالباً ۱۴۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان تیار ہوگئی تھیں۔ ان میں سب سے پرانا رگ وید ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ زرتشت کے استاد میں ویدوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ جب آریوں نے ایران چھوڑا، تو ایرانی ان کو عداوت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ جدائی کسی لڑائی کی وجہ سے ہو۔

رگ وید میں خداؤں کی تعریف اور بزرگی کے گیت ہیں۔ اتھر وید میں قربانیوں کا ذکر ہے۔ گویا یہ وید قربانی کی نگرانی کرنے والے پجاریوں کے لیے ہے۔ یجر وید میں دعائیں اور قربانی کے اصول ہیں۔ شام وید میں محض راگ اور گیت ہیں۔ رگ وید کے اشبد زیادہ تر علم الاصنام (Mythology) کے متعلق ہیں۔ ان میں کثرت و تعدد الٰہ یعنی Polytheism کا عقیدہ جلوہ گر ہے۔ یہ ہی مذہب اُس زمانہ میں قدیم یونان، روم، مصر اور میکسو کا تھا۔ چنانچہ صحیح طور سے کہا گیا ہے کہ الکفرۃ ملۃٌ واحدۃ۔ کہیں کہیں ایک سب سے بڑے خدا کا عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس طرح کہ جو کچھ موجود ہے وہ ہی خدا ہے۔ خدا کی ہستی مادہ کے ساتھ وابستہ سمجھی گئی تھی۔ تمام کائنات ہی خدا تھی۔ انگریزی میں اس کو (Pantheism) کہتے ہیں۔ رگ وید کا کچھ حصہ جادو کے متعلق بھی ہے۔

اتھر وید کا زیادہ حصہ جادو کے متعلق ہے۔ اور اس میں خاص طور سے ہمہ اوست یعنی Pantheism کی تعلیم ہے۔ سام وید اور یجر وید بالکل قربانی کے متعلق ہیں۔

Marfat.com

براہمنا۔ یہ دراصل ویدوں کے ضمیمہ ہیں۔ اور اُن کے رسوم اور ارکان کے متعلق ہیں۔ ویدوں کے بعد ہی مرتب ہوئے تھے۔ ان کا زمانہ ۵۰۰ ق م رکھا گیا ہے۔ ان کی تعلیم کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ بہت سے خداؤں کی ہستی ۰ اور موجودگی مانتے ہوئے ایک سب سے بڑے خدا کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے۔ وُہ ایسا ہی ہے کہ جیسا امریکہ کا پریذیڈنٹ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ویدیوں سے پہلے اور آریوں کے آنے سے قبل ہندوستان کے قدیم باشندوں میں جن کو ناگا کہتے تھے، ایک مذہب رائج تھا۔ آج کل بھی یہ لوگ آسام کی طرف پائے جاتے ہیں۔ اس مذہب میں اُن بے شمار بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی پرستش رائج تھی جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ پتھروں، جانوروں، درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، اور ستاروں میں رہتے ہیں۔ سانپوں اور اژدہوں کی پرستش عام تھی۔ ناگ یعنی سانپ خدا، ہنومان یعنی بندر خدا، نندی یعنی آسمانی بیل خدا، اور یاکشا یعنی درختی خدا اس زمانہ کی یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ یہ مذہب اُس زمانہ میں تمام دنیا میں عام تھا۔ انجیل کے تصنیف کرنے والے بھی اُس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ انجیل میں اس آسمانی ناگ (Dragon) کا ذکر یوحنا کے مکاشفہ میں بار بار آتا ہے۔ گوتم بُدھ کا مشہور درخت بھی درختوں کی پرستش و عظمت کے زمانہ کی یادگار تھی۔ کچھ بھوت اور ارواح تو نیک تھے، لیکن کچھ بُرے بھی تھے۔ اور وہ ہی بیماری اور جنون پیدا کرتے تھے۔ ان کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اشلوک اور منتر کی ضرورت تھی۔ سوائے ان کے وُہ کسی اور چیز سے مریض کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا اتھروید ایسے منتروں اور اشلوکوں کے لیے مخصوص ہے۔

ویدوں کے خدا۔ شروع شروع میں ویدوں کے خدا بھی محض عناصر و مناظرِ قدرت تھے۔ مثلاً آسمان، زمین، سورج، آگ، ہوا اور پانی۔ یہ بھی ایک بڑا تعجب خیز قدرت کا کرشمہ تھا، کہ انسان کو انسان کے اندر ہی سے پیدا کر دیا۔ پھر عورت و مرد کی ایک دوسرے سے خواہش مواصلت۔ اور اس کا حظ۔ یہ ایسے امور تھے کہ ان کو ضرور خداؤں کی فہرست میں داخل ہونا چاہیئے تھا لہٰذا داخل ہو گئے۔ عورت کے اندامِ نہانی کی بھی پرستش ہونے لگی۔ اور مرد کے

Marfat.com

اعضاء تناسل کی بھی ۔عورتیں مردوں کے عضو تناسل کا جلوس نکالتی تھیں ۔ اور اُن کو دیوتا سمجھ کر اُن سے مجامعت بھی کر لیتی تھیں ۔ اس خیال کی بے ہودگی یہاں تک بڑھی کہ ہر دُلہن کا ازالۂ بکارت اُس ہی معبود لنگ سے کیا جانے لگا ۔ یہ شہوت پرستی تھی جس کا نام زبانِ حال کے تکلف میں خدا پرستی رکھا گیا ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندو عورت خدا پرست ہوتی ہے ۔ مرد عورتوں کی اندام نہانی کا جلوس نکالتے تھے ۔ ان ہی طاقتوں، قوتوں، اور عناصر کو شخصیت دے کر خدا بنا لیا ۔ چنانچہ آسمان "ورن" اور زمین "پرتھوی" ہو گئے ۔ دونوں نے آپس میں مجامعت کی ۔ بارش جو ہوئی تو وُہ آسمان کی منی تھی جو زمین پر گر کر اُس کو حاملہ کرتی تھی ۔ چنانچہ سبزہ اُگا یعنی اُس مجامعت کا نتیجہ پیدا ہوا ۔ "ورن" باپ ہو گیا، اور "پرتھوی" ماں ہو گئی ۔ آگ "اگنی" کے نام سے، ہوا "ردرا" کے نام سے، طوفان "اندرا" کے نام سے، سورج "مترا" کے نام سے خدا بن گئے ۔

ویدوں کے خداؤں کی خوراک دودھ، مکھن، غلہ، بھیڑ، بکری، گائے، بیل اور گھوڑے کے گوشت تھے ۔ ویدوں کے ماننے والے یہ چیزیں قربانیوں میں رکھتے تھے اور وہاں سے یا تو آگ کا دیوتا یعنی اگنی ان اشیاء کو آسمان پر خداؤں تک پہنچا دیتا تھا، یا وہ خدا خود مقام قربانی پر نازل ہو کر ایک سبز ہری گھاس کے قطعۂ زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے ۔ ہر ایک قربانی کی جگہ پر یہ سبز گیاہی قطعہ اس غرض کے لیئے خالی رکھا جاتا تھا ۔ پینے کے لیئے سوما کا عرق ہوتا تھا ۔ یہ ایک نشہ آور شے تھی جو ایک پودے سے نکالی جاتی تھی ۔

ویدوں کے خداؤں کے رہنے کی جگہ تیسرا آسمان ہے ۔ جو وشنو کی سیڑھی کا آخری قدمچہ ہے ۔ اُس جگہ بیٹھ کر وُہ سب خدا سوما کا عرق پیتے ہیں ۔ اور اُس کے نشہ میں مسرور ہو کر خوشی اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں ۔ انسان نے اپنے خداؤں کو بھی شراب پلا دی ۔ ویدوں کے زمانہ میں کچھ عرصہ تک اگنی دیوتا یعنی آگ سب سے بڑا دیوتا تھا کیونکہ وہ ہی قربانیوں کو اپنے ساتھی خداؤں تک پہنچاتا تھا ۔ وُہ ہی انسان اور دُنیا کی زندگی میں نمایاں تھا ۔ یہاں ایک مشابہت کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قربانی کے قبول ہونے کی یہ علامت تھی کہ آسمان سے آگ اُترتی تھی، اور وُہ مقبول شدہ قربانی کو جلا دیتی تھی ۔ اگرچہ اگنی بڑا خدا تھا لیکن لوگوں میں بہت ہر دلعزیز اندرا تھا جو بجلی کی کڑک اور طوفان باد و باراں کا خدا تھا ۔ وہ ہی مینہ برساتا تھا جو ان لوگوں کے لیئے بڑی نعمت تھی ۔

Marfat.com

وہ سب سے بڑا خدا سمجھا جاتا تھا۔ اور لڑائیوں میں اُس کی کڑک اور گرج کی مدد مانگی جاتی تھی۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وُہ ایسا عظیم الشان خدا ہے۔ کہ ایک دفعہ میں یک صد بیل کھا لیتا تھا۔ اور شراب سے بھری ہوئی جھیلوں کو لپ لپ کر کے ایک گھونٹ میں ختم کر دیتا تھا۔ اس کا اُٹھتا ہؤا مدمقابل کرشنا تھا جو ابھی شہرت میں بچہ ہی تھا اور محض ایک چھوٹے سے قبیلے کرشنا کا مقامی خدا تھا۔ اُس زمانہ میں وشنو کی بھی ماتحت حالت تھی۔ حالانکہ بعد میں تو اُس نے تقریباً سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا، اور کرشنا اُس کا اوتار سمجھا جانے لگا۔

یونان کے کوہ المپس کے خداؤں کی مانند، بلکہ ساری صنم پرست دنیا کے خداؤں کی طرح یہ خدا بھی بالکل خواہشات و نفسانیت اور جسمانیت میں انسانوں کی طرح تھے۔ انسان کی جہالت، خباثت اور خوئے بد سب ان خداؤں کے اندر داخل کر دی گئی تھی وہ ہی حسد، رشک، لاعلمی، خواہشاتِ نفسانیہ وغیرہ سب ان میں تھے۔ قربانی کے لالچی تھے۔ سوما درخت کا عرق جو ایک قسم کی شراب تھی، ان کو بہت پسند تھا۔

تخلیق و تکوینِ کائنات۔ اس مضمون پر کوئی صاف یا قطعی بیان نہیں ہے قیاسات و توہمات ہیں جن کو سنکر ہنسی آتی ہے۔ اوّل تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خداؤں میں سے کس خدا نے دنیا کو پیدا کیا تھا۔ کبھی اگنی خدا کو یہ عزت دی گئی اور صدیوں تک اس کو خالقِ ارض و سما سمجھ کر اس کی پُوجا کی گئی۔ کبھی اندرا کو، کبھی سوما کو، اور کبھی پرجاپتی کو خالق سمجھا گیا۔

یہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی، یہ بھی سننے کے قابل ہے۔ ویدوں کی تعلیم کے مطابق دنیا اُسی طرح بنائی گئی۔ جس طرح ایک عمارت بنائی جاتی ہے۔ میٹریل جو اس میں استعمال کیا گیا ہے، وہ لکڑی ہے۔ آسمان و زمین لکڑی کے ستونوں پر کھڑے ہیں۔ اس کے بنانے والے یا تو سب خدا مل کر معماروں کی طرح بنانے والے تھے، یا کسی خاص خدا نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

رگ وید کے آخری حصّہ میں ایک اور نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شروع میں ایک بہت عظیم الجثہ دیو تھا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ وُہ خود کیوں کر پیدا ہؤا یا کب سے تھا۔ تمام خداؤں نے مل کر اُس کی قربانی کی یعنی اُس کو ذبح کر ڈالا۔ اور بھینٹ پر چڑھا دیا۔ اُس کا سر تو

آسمان بن گیا۔ اُس کی ناف ہوا بنی اور اُس کے پَیر ہماری زمین ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا، کہ سورج، چاند اور ستارے کس طرح بنے۔ اُس دیو کے دیگر اعضاء سے ہندوستان کی چار ذاتیں پیدا ہوئیں۔ اتھروید اور اوپانیشد میں اُس ہی دیو کو عالمی رُوح کہا گیا ہے۔

رگ وید کے دو گیتوں میں فلسفیانہ نظریہ بھی بتایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم (ست) ایک معدوم شے (است) سے بذریعہ ارتقاء پیدا کیئے گئے ہیں، یعنی عدم سے موجودات ہوئے ہیں۔

ایک اور شبدہ میں چوتھا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ گرمی Tapas کے ذریعہ سے سمندر پیدا ہوئے۔ اُس کے بعد خالق Dhata نے چاند، آسمان، زمین، ہوا اور ایتھر پیدا کیئے۔

ایک اور شبدہ میں پانچویں تھیوری نظر آتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے، کہ آسمان، زمین اور بڑے بڑے سمندر سونے کے بہت بڑے کرّہ سے پیدا ہوئے ہیں اُس کو Haryana garbha (ہریانہ گربھ) کہا گیا ہے۔ اور یہ ہریانہ گربھ ابتداء میں تمام خداؤں سے اُوپر ظاہر ہؤا تھا۔ معلوم ہؤا ہے کہ اُس سے پہلے بھی خدا تھے۔

ان تمام پیدائشی بھجنوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وُہ یہ کہ سب سے پہلے پانی تھا، اور پانی ہی سے یہ ساری چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔

ان نظریات کے علاوہ رگ وید میں ایک اور نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ وُہ یہ کہ اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد سب خدا پیدا ہوئے ہیں۔ اِس سے پہلے کیا تھا، اور یہ کائنات کیونکر وجود میں آئی کسی کو نہیں معلوم۔ خداؤں کو بھی نہیں معلوم۔ ٹھیک ہے۔ جب خدا محدود ہؤا تو وہ جاہل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تماشہ بھی تو دیکھو۔ جن ویدوں میں یہ اٹکل پچو اور ایک دوسرے سے متضاد خیالات وقیاسات ہیں، وہ خدا کی تحریر کردہ ہیں۔ وُہ ایسا خدا ہے کہ اُس کو نہیں معلوم کہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی۔

تخلیق انسان وحیوان۔ مخلوق کس طرح پیدا ہوئی؟ یہ قصّہ بھی سُننے کے قابل ہے۔ جب کوئی زندہ شے نہ تھی، تو پیدا کرنے والا خالق تھا۔ وہ قدو قامت میں اتنا بڑا تھا، جتنے ایک مرد اور ایک عورت حالتِ مواصلت میں مل کر ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اُس خدا کو تنہائی سے پریشانی ہوئی غمگین رہتا تھا۔ اب اُس نے اپنے جسم کے دو ٹکڑے کیے۔ اب وہ ایک مرد اور ایک عورت علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ پھر خدا نے عورت سے مباشرت کرنی چاہی۔ مباشرت ہوئی۔ انسان پیدا ہوئے۔ اب اُس عورت کو خیال آیا کہ یہ مجھ سے کیونکر جماع کر سکتا ہے حالانکہ اُس نے مجھ کو اپنے ہی جسم سے نکالا ہے۔ اب جو اُس خدا نے اُس سے مباشرت کرنی چاہی تو عورت اُس سے بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے گائے بن گئی۔ جناب خدا سانڈ بن گئے۔ مباشرت کی گائے بیل پیدا ہوئے، اور اُن کی نسل دنیا میں پھیلی۔ پھر مباشرت کرنی چاہی۔ پھر بھاگی۔ اس دفعہ گھوڑی بن گئی۔ خدا صاحب بھی اس کے پیچھے بھاگے اور وہ گھوڑا بن گئے۔ مباشرت کی۔ گھوڑوں کی نسل چلی۔ اسی طرح ہر جانور، ہر پرندہ، ہر چوپایا یہاں تک کہ ہر کیڑا پیدا ہوا۔ خدائی خاتون اس نوع کی مادہ بنتی گئی، اور خدا صاحب نر بنتے گئے اور مباشرت کرتے رہے۔ اور یہ مختلف انواع کی مخلوق پیدا ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ چیونٹی اور گندگی کے کیڑے اسی طرح پیدا ہوئے۔ خدائنی چیونٹی یا گندگی کے کیڑے کی مادہ بنی، اور خدا صاحب اُس کے نر بنے۔ آپس میں مباشرت ہوتی رہی، اور مخلوق پیدا ہوتی رہی۔ [32]

یہ نہیں بتایا گیا کہ مادہ خدائنی کے دماغ میں ان ہزارہا مخلوقات کی شکلیں کیونکر آتی رہیں اور وہ ان کی شکلیں اختیار کرتی گئی یا بغیر مرے ہوئے جنم لیتی گئی۔ اصل میں تو دیوی خدا کا کام تو مزیدار ہی رہا اور بہت آسان۔ اس کو دیکھ کر وہ اس کے نر بنتے رہے اور مزہ لیتے رہے۔ یہ ہے اُن کے خالق ارض و سما کا نقشہ اُن کے مذہب میں۔

تخلیقِ انسان کا ایک اور نظریہ بھی رگ وید RV.10.10 سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کے پہلے ماں باپ دو بھائی بہن تھے۔ جو توام پیدا ہوئے تھے۔ بھائی کا نام یاما تھا، اور بہن کا نام یامی۔ یامی نے اپنے بھائی کو ورغلایا کہ وہ اس کے ساتھ ہمبستری کرے۔ پہلے تو یاما نے انکار کیا۔ جب یامی نے طعنہ دیا کہ تو نامرد

(32) Brihadaranyaka Upanishad, 1.4. Hume, R.E. : The thirteen Principal Upanishads

Will Durant : Our Oriental Heritage. P. 404

معلوم ہوتا ہے۔ تو وُہ راضی ہوگیا۔ اُن کے بچے بنی نوع انسان ہیں۔ ۳۳ے

مسئلہ تناسخ۔ ویدوں میں تناسخ ارواح کا عقیدہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر اپنی شد میں پایا جاتا ہے۔ یونان کے فلسفہ میں تناسخ ارواح کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔ اس سوال کا حل کرنا ہے کہ تناسخ ارواح کا عقیدہ ہندوستان نے یونان سے لیا یا یونان نے ہندوستان سے لیا۔ اُس زمانہ میں تجارتی کاروانوں کی آمدورفت ایک ملک سے دُوسرے ملک تک اتنی عام اور ضروری تھی کہ ایک قوم دوسری قوم کے خیالات و عقائد سے متاثر ہوتی رہتی تھی۔ اس عقیدہ کے ہوتے ہوئے جنت و دوزخ کی ضرورت چنداں نہیں رہتی۔ کیونکہ سزا و جزا یہاں کے جنموں ہی میں ہو جاتی ہے۔ ہاں! ویدوں کے زمانہ میں جب یہ عقیدہ نہ تھا، تو اُنہوں نے ایک سیدھی سادھی جنت و دوزخ اپنے خیالات کے مطابق بنالی تھی۔ بُری ارواحیں ایک تنگ و تاریک خندق میں ڈال دی جاتی تھیں، اور وہاں ہمیشہ رہتی تھیں۔ اچھے اعمالوں والی روحیں آسمان پرخوشی کے فضا میں رہتی تھیں۔ لیکن بعد میں یہ عقیدہ جاتا رہا۔ اوراُس کے بدلہ تناسخ کا عقیدہ قائم ہوگیا۔ یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ اس کی بنا پر بحث کی جاسکتی ہے کہ تناسخ ارواح کا عقیدہ ہندوستان نے یونان سے لیا۔

ویدوں کے زمانہ میں مردوں کو جلایا نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ قبروں میں دفن کر دیئے جاتے تھے۔ ۳۳ے

ویدوں کے بعد کا زمانہ۔ برہمنوں کے مذہب سے بغاوت!

برہمنوں کا مذہب خداؤں کی کثرت کا معمہ تھا۔ اور برہمنوں نے اُس معمہ کو ایک رازِ مخفی بناکر اپنے ہی میں رکھنا چاہا۔ خداؤں کی کثرت اور برہمنوں کی رعونت نے ہندوستان کی فضا میں ان کی طرف سے بغاوت پیدا کردی۔ جس کا آخری نتیجہ بودھ مذہب اور جین مت ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد عوام الناس کا ذہن جو خداؤں کی کثرت سے مرعوب ہوگیا تھا، پھر ان کو برہمنوں کی طرف لے آیا۔ ہم آئندہ چل کر بتائیں گے

(33) Our Oriental Heritage, PP. 408, 409.

Marfat.com

کہ کس طرح بدھ مذہب اور جین مت پھر برہمنوں کے مذہب یعنی ہندو مت میں تبدیل ہو گئے۔ برہمنوں نے آخر کار بدھ مذہب کو بالکل ہندوستان سے نکال دیا۔ اور اُس نے برہما، جاپان، تبت اور افغانستان میں جا کر پناہ لی۔ اب ہم برہمنوں کے موجودہ اس مذہب کا ذکر کرتے ہیں۔ آج کل ہندوستان میں وہ ہی مذہب رائج ہے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ ہندو اب اُس سے بھی بدظن ہو چکے ہیں۔

موجودہ ہندو مذہب

ہندو مذہب ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے دامن میں سینکڑوں مذاہب نے آن کر پناہ لی۔ یا بالفاظ دیگر کہہ سکتے ہیں کہ برہمنوں نے اپنی عظمت اور مکرمت قائم رکھنے کے لیئے ہر مذہب کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے۔ ان تمام مذاہب میں چار عقائد مشترک ہیں۔ (۱) ذاتوں کا قیام اور برہمنوں کی رہنمائی اور افسری۔ (۲) گائے کو خدا کا اوتار سمجھ کر اُس کی عظمت اور پرستش کرنا۔ (۳) تناسخ ارواح اور عقیدۂ کرم جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ (۴) ویدوں کے خداؤں کی بجائے بے شمار اور مختلف دیگر خداؤں کو ماننا اور اُن کی پُوجا کرنا

جب برہمنوں نے دیکھا کہ بُدھ مذہب عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکا ہے، تو اُنھوں نے اُس کا مقابلہ کرنے کے لیئے وہ ہی تدبیر کی جو سینٹ پال نے مذہب متھرا سے مقابلہ کرنے میں کی تھی۔ یعنی مخالف اور رقیب مذہب کے بہت سے وہ تصوّرات اور رسومات جو عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکے تھے اپنے مذہب میں داخل کر لیئے۔ انھوں نے دیکھا کہ گوتم بدھ کی محبت لوگوں کے دلوں سے نکلنی مشکل ہے، تو اُنھوں نے گوتم بُدھ کو خدائی کا درجہ دے کر اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔ اور اُس کے مذہب کی بہت سی رسومات اور تخئیلات بھی اپنے مذہب میں داخل کر لیئے اور اس طرح ہندوستان سے بدھ مذہب کو نکال دیا۔

Marfat.com

ہندو مذہب میں خدا کی طاقت اور قوت کا اظہار اُس کے عضو کے اضافت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً براہمہ کے چار چہرے، کارتکیا کے چھ چہرے، شیوجی مہاراج کی تین آنکھیں، اندرا کی ایک ہزار آنکھیں اور تقریباً ہر ہر خدا کے چار ہاتھ۔ اس جدید مجمع خدائیگان میں بھی براہمہ کو صدر بنایا گیا۔ لیکن ایسا صدر جس سے ہر ایک اختیار سلب کر لیا گیا ہے۔ اب اُس کو خدائی میں اتنا ہی اختیار ہے جتنا کہ آج کل کے یورپ کے دستوریہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہنشاہ کو اپنی سلطنت میں ہے۔

ہندو مذہب میں تین بڑے خدا ہیں، براہمہ، شیوا، اور وشنو۔ ان کو ہی تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ براہمہ کو خالقیت کا جامہ پہنایا گیا ہے اور بس۔ انسان کو پیدا کیا، اور اب اُس کے امور میں اُسے کوئی دخل نہیں۔ وشنو خدائی عشق ہے، اور اُس کا سب سے بڑا اوتار کرشنا مہاراج ہیں جو اندھوں اور گونگوں کو اچھا کرتے تھے۔ جذامیوں کی مدد کرتے تھے۔ غریبوں پر مہربانی کرتے تھے اور کبھی کبھی مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے تھے۔ مہابھارت کی لڑائی میں مارے گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ تیر لگا تھا، کوئی کہتا ہے کہ دشمنوں نے درخت پر لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ مرنے کے بعد دوزخ میں اُتر گئے، وہاں سے آسمان پر چلے گئے۔ اور آخرکار مُردوں اور زندوں کے اعمال کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لائیں گے۔ اُن کو عورتوں سے بہت عشق تھا۔

وشنو اور شیوجی کے پوجاریوں اور مقلدین کی دو علیحدہ جماعتیں ہیں۔ بلکہ یہ دو علیحدہ مذہب ہی ہو گئے ہیں۔ وشنو کے ماننے والوں کی یہ نشانی ہے کہ وہ سرخ گیرو سے اپنے ماتھے پر وشنو کی مثلث نما نشانی یا علامت لگا لیتے ہیں اور شیوجی کے مقلدین اپنے ابرو کے اوپر گئو ماتا کے جلے ہوئے گوبر کی راکھ سے متوازی لکیریں بنا لیتے ہیں۔ یا بازو پر مرد کے عضوِ تناسل کی شکل کا آلہ باندھتے ہیں یا گردن میں لٹکا لیتے ہیں۔ قدیمی مذاہب میں مرد کی قوتِ جماع کی اکثر پرستش ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اس ہی آلہ تناسل سے تو ساری دنیا کا قیام تھا۔ شیوائی خدا کے مندر میں اکثر عورتیں مقرر کر دی جاتی تھیں۔ جن کا مقصد زندگی

اور مذہبی خدمت یہ تھی کہ پجاریوں کی شہوت کو پورا کریں۔ بائیبل میں ان عورتوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی ایسی مذہبی عورتیں مندروں کے ساتھ ملحق ہوا کرتی تھیں۔ موہنجو دارو میں جس کی شمولیت کا شرف صوبہ سندھ کو حاصل ہے۔ شیوجی مہاراج کی اس قسم کی پرستش عام تھی۔ اس جگہ کہیں تو شیوجی کی مورتی تین سروں کے ساتھ ملی ہے، اور کہیں محض ایک گول کھڑے پتھر کی شکل میں ہے جس کو مرد کے عضو تناسل کے مشابہ بنایا گیا ہے۔ شیوجی کے اس مذہب کو شکتی پوجا کہا جاتا ہے۔ شکتی کے معنی طاقت اور قوت جماع Sexual Power ہیں۔ شیوجی میں مار ڈالنے اور نیست و نابود کرنے کی طاقت بھی تصور کی گئی ہے۔ اس طرح گویا دونوں طاقتیں پیدا کرنا اور مار ڈالنا ایک ہی ذات میں مجتمع سمجھی جاتی ہیں۔

شیوجی کی اہلیہ کالی دیوی ہیں۔ جن کے مختلف نام مختلف مقامات پر ہیں۔ کالی، پربتی، اوما، درگا۔ یہ سب اُن کے ہی نام ہیں۔ ہندوستان کے بعض مقامات میں، خصوصاً بنگال میں اُس کی شکتی پوجا ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی تک اس کی پوجا نہایت خونخوار شکل میں ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے انسانوں کی بھینٹ دی جاتی تھی۔ اس خاتون خدا کی شکل نہایت ڈراؤنی ہے۔ کوّے جیسی سیاہ عورت، منہ کھلا ہوا، جیسے کھانے کو آدمی مانگتی ہے۔ زبان باہر نکلی ہوئی، سانپوں کے ہار پہنے ہوئے اور خود انسانوں کی لاشوں پر ناچتی ہوئی، کانوں میں بالیوں کی جگہ مردہ انسانوں کی لاشیں لٹکتی ہوئی، گلے میں انسانوں کی کھوپریوں کا ہار، چہرہ اور چھاتیاں خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ نسوانی خدا جس کی پرستش صدیوں سے قدیم الایام سے ہوتی چلی آتی ہے۔ اس کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں۔ دو میں تو تلوار اور انسانوں کا کٹا ہوا سر، اور دو ہاتھ پھیلے ہوئے۔ گویا اپنے معتقدین اور پجاریوں کو اتنی قربانیاں کھانے کے بعد راحت و آسائش عطا کر رہی ہے۔ اس میں ماتا کی طرح رحم اور مہربانی کا مادہ بھی ہے۔

یہ تو ہندو مذہب کے بڑے خدا ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً تین کروڑ خدا ہیں۔ اُن میں سے کچھ تو بھوتوں کے اوصاف اور شکل کے ہیں، کچھ فرشتوں کی طرح کے سمجھے گئے ہیں، اور کچھ آسمانی اجرام مثلاً سورج چاند اور ستارے ہیں۔

Marfat.com

بعض نیک شگون والے ہیں جیسے مچھلی اُن میں سے بہت سے جنگلوں میں بسنے والے جانور یا ہوا میں اُڑنے والے پرندے ہیں۔ مثلاً ہاتھی جو گنیش کے نام سے خدا ہوا۔ اُس کی تصویر مصیبتوں کو ٹالنے والا تعویذ سمجھی گئی ہے۔ بندر اور سانپ اپنی ضرر پہنچانے کی طاقتوں کی وجہ سے خدا سمجھے گئے۔ کالے ناگ کی خاص طور سے پُوجا ہوتی ہے۔ ہر سال ہندوستان میں ان سانپوں کی پُوجا کے لیئے اجتماعات ہوا کرتے ہیں۔ اور لوگ ان کے بلوں کے مُنہ پر دُودھ اور کیلے چڑھاتے ہیں۔ سانپوں کی تعظیم میں بہت سے مندر بنائے گئے ہیں۔ مشرقی میسور میں اب تک ایسے مندر پائے جاتے ہیں۔ اور وہاں سینکڑوں سانپ اور رینگنے والے جانور آن کر جمع ہو گئے ہیں، اور اُن کے لیئے باقاعدہ پجاری رکھے گئے ہیں جو اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں، اور کھانا دیتے ہیں۔ اسی طرح مگرمچھ، شیر، مور، طوطے، یہاں تک کہ چُوہے اور بلیاں خدا سمجھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عزت گئو ماتا کی ہے۔ بسا اوقات انسان کے دماغ کی کیفیت عقل کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتی۔ برہمنوں کے مذہب میں گائے کو ہرگز ذبح نہ کرنا چاہیئے۔ کسی جانور کو، کیڑے مکوڑے تک کو ذرا سی بھی تکلیف نہ دینی چاہیئے۔ لیکن بیوہ کو زندہ جلا ڈالنا چاہیئے۔

عام ہندوانی اعتقادات۔ عوام الناس کے اعتقادات کے لیئے چند لوگوں نے سنہ ۵۰۰ ق م اور سنہ ۵۰۰ء کے درمیان "پورانا" لکھے۔ وہ تعداد میں اٹھارہ ہیں اور ان کے لفظی معنی پرانے قصے ہیں۔ پورانا تو ہر شخص سمجھتا ہے۔ یہ پرانی باتوں یا اعتقادات کے مجموعے ہیں جن میں کائنات کی ابتداء، اُس کا درجہ بدرجہ ترقی کرنا، پھر فنا ہو جانا، اسی طرح اس سلسلہ کا جاری رہنا، خداؤں کا نسب نامہ، اور پُرانے زمانہ کی تاریخ، یہ سب کچھ ان پورانوں میں ہے۔ خلق یعنی کائنات کی ابتداء کس طرح ہوئی یقینی طور سے تو کسی کو نہیں معلوم۔ پورانے ہم کو بتاتے ہیں کہ ان کے خالق برہما نے ایک انڈا دیا۔ پھر اُس پر خود بیٹھا۔ مرغی کی طرح سے بیٹھ کر بچہ نکالا وہ بچہ یہی کائنات ہے۔ غالباً یہ خالق کی غلطی ہے یا اُس کا بہت بڑا مذاق ہے۔ دُنیا کے کئی چکر یا دور ہیں۔ ہر ایک دور ایک ہزار مہاجگ یا مہایوگ کا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک مہاجگ ۴۳۲۰۰۰۰ سال کا ہوتا ہے۔ گویا دنیا کا ایک دور ۴۳۲۰۰۰۰۰۰۰ سال

یعنی ۴ ارب ۳۲ کروڑ سالوں کا ہوا۔ دنیا کے ایسے کئی دَور گزر چکے ہیں اور اسی طرح یہ دَور گزرتے رہیں گے۔ دنیا بالکل نیست و نابود نہیں ہوگی۔ ہر ایک مہایوگ میں چار یوگ یا چار جگ ہوتے ہیں۔ جن میں بنی نوع انسان درجہ بدرجہ تنزل کرتی رہتی ہے۔ موجودہ مہایوگ میں تین یوگ گزر چکے ہیں جن کے ۳،۸۸۸،۸۸۸ سال ہوئے ہم چوتھے جگ میں سے گذر رہے ہیں۔ اس کو کلجگ کہتے ہیں۔ یہ مصیبت کا جگ ہے اس کے ۵۰۳۵ سال گزر چکے ہیں اور ۴۲۶،۹۶۵ سال مزید باقی ہیں۔ پرانوں میں اس اعتقاد کو ظاہر کیا گیا ہے کہ کائنات کے ہونے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ ایک مہایوگ کے بعد دنیا کا فنا ہوجانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک چوہے کا مرجانا اور اس سے زیادہ اس کی اہمیت بھی نہیں۔ اور نہ کوئی ترقی ہے۔ صرف لاتعداد دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی بلکہ کل کائنات کی بے قدری اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ برعکس اس کے قرآن شریف کہتا ہے:۔

۲۳ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۝ انبیا ۲۱ : ۱۶ دخان ۴۴ : ۳۸

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ آل عمران ۳ : ۱۹۱

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ ص ۳۸ : ۲۷

صاحبانِ علم و عقل پر عیاں ہے کہ ان دونوں مذہبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کوئی نسبت ہی نہیں۔

ہندو اعتقاد کے بموجب ان کروڑہا برس تک ارواح نے نہ کچھ کام کیا، اور نہ ترقی کی۔ سوائے اس کے کہ ایک جسم سے ہوکر دوسرے جسم میں گزرتی رہیں۔ کیڑے مکوڑوں سے لے کر انسان تک ہر ایک جاندار ہستی میں سے گزریں اور اسی طرح گزرتی رہیں گی اور پہلے جنم کے تجربہ کو دوسرے جنم میں بھولتی جا رہی ہیں۔ کچھ حاصل بھی نہ ہوا۔ ایک روہت کی بہت بھوک تھی۔ ہر ایک بھوجن اُس کے لیئے کم تھا۔ اُس نے اس کا یہ سبب بتایا کہ پہلے جنم میں وہ ہاتھی تھا، اب کرموں سے انسان ہو گیا۔ گویا قانونِ کرم نے جسم کی شکل تو بدل دی، لیکن معدہ بدلنا بھول گیا۔

ہندو اعتقاد ہے کہ تمام زندگی ایک ہے۔ خداؤں سے لگا کر کیڑے مکوڑوں تک وہ ہی ایک زندگی ہے۔ شخصیت یا شخصی علحدگی کوئی نہیں ہے۔ یہ ایک دھوکہ ہے

ساری زندگی ایک ہے۔ جسم مختلف ہیں۔ اور کرم جسموں کو بدلتا رہتا ہے۔ تمام ارواح بھی ایک ہی عظیم روح کے مختلف مظاہر ہیں۔ قسمت بھی کوئی شے نہیں۔ جیسے کرم ہوں گے۔ ویسی شکل یا نوع دے دی جائے گی۔ اور اس کے کرموں کے مطابق واقعات ہوتے رہیں گے معلوم نہیں وہ شکل یا نوع کون دے گا۔

ہندوؤں کے یہاں جنت و دوزخ کا بھی عقیدہ ہے۔ لیکن اُن کا کوئی اثر قانون کرم اور مسئلۂ تناسخ پر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جنّت و دوزخ میں روحیں صرف تھوڑے عرصہ کے لیئے ٹھہر سکتی ہیں۔ پھراُن کو دوسرا جسم لینا پڑتا ہے اور پھر وُہ ہی قوانین اپنا عمل کرنے لگتے ہیں۔ کسی کے خاص بُرے اور خاص اچھے افعال کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیئے اُسے جنت یا دوزخ میں جانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کیا خاص اچھے اعمال ہوئے کہ ان روحوں کو پھر جنّت میں سے نکلنا پڑتا ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ سات بہشت ہیں۔ اُن میں ایک تو دنیا ہی میں ہے، باقی ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں ۲۱ دوزخ ہیں۔ لیکن ان اعتقادات میں یہ ایک بڑا نقص ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس جگہ، اور کس کے فیصلہ کے مطابق اعمالوں کا امتحان لیا جاتا ہے اور جنت دوزخ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بغیر حشر اجساد، میزان عدل کے جنت ودوزخ کا تخیل ممکن نہیں ہوسکتا۔ ہندوؤں میں حشر اجساد بالکل نہیں ہے۔

کائنات کی تمام زندگیوں کو ایک زندگی سمجھنا اور تمام ارواح کو ایک ہی رُوح سمجھنا ہندو فلسفہ کا وُہ عقیدہ ہے، جو بظاہر بہت سے آدمیوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سے فکر سے اس عقیدہ کی ماہیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ تو ایک خیال و تصوّر ہے جس کی کچھ اصلیت نہیں۔ وُہ ایک زندگی کیوں کر دائرہ ہست میں آئی، وُہ زندگی عاقل ہے کہ غیر عاقل۔ اگر غیر عاقل ہے، تو اس سے زیادہ عقل والی کون سی ہستی تھی۔ جس نے اُس کو پیدا کیا۔ اگر عاقل ہے تو یہ کیسی عقل ہے کہ پہلے خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اب پھر مل کر ایک ہو جائے گی۔ مقصد کیا ہوا۔ نتیجہ کیا نکلا۔ خود بخود ٹکڑے ہو جانا اور پھر خود بخود ایک ہو جانا۔ اسی عقیدہ پر بھگوت گیتا کا سارا فلسفہ قائم کیا گیا ہے جس کی تعریف میں تمام ہندو دُنیا رطب اللسان ہے۔

بھگوت گیتا کے لفظی معنی بھگوان کا گیت۔ یعنی خدا کی منظوم تقریر۔ در اصل

کرشناجی مہاراج اور ارجن کا معاملہ ہے اور یہ مہا بھارت کے میدان جنگ میں واقع ہوا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیئے جنگ مہا بھارت کے اسباب وقوع معلوم کرنے ضروری ہیں۔ قصّہ تو بہت بڑا ہے، ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔ پانچ بھائی پانڈو چچا زاد بھائی تھے۔ کوروں اگرچہ یہ سب ساتھ پلے تھے۔ لیکن پانڈو اور کوروں میں رقابت ہو گئی۔ اور پھر وہ رقابت دشمنی کی حد تک پہنچ گئی۔ ارجن نے ایک خوبصورت دروپدی کو سوئمبر میں جیتا لیکن وہ دروپدی ان پانچوں بھائیوں کی بیوی بنائی گئی۔ اس کے بعد کوروں نے پانڈو کو جوئے کی بازی میں مدعو کیا۔ یودھشتر جو پانڈوں میں سب سے بڑا بھائی اور دروپدی کا پانچ خاوندوں میں سے بڑا خاوند تھا، جوا کھیلنے لگا۔ سب کچھ ہار گیا۔ یہاں تک کہ دروپدی کو بھی ہار گیا۔ اور آخرکار یہی بڑا سبب مہا بھارت کی لڑائی کا ہوا۔ جس میں ایک فریق پانڈو، اور دوسرا فریق کورو تھے۔ اور دونوں کے طرفداران بھی شامل ہو گئے۔ لارڈ کرشنا پانڈو کی طرف تھے۔ ارجن نیک آدمی تھا۔ اُس نے کرشنا سے کہا کہ فریقِ مخالف میں ہمارے رشتہ داران اور گورو ہیں۔ میں اُن پر ہاتھ اُٹھانا نہیں چاہتا۔ کرشنا مہاراج نے اُس کو لڑائی پر بہت بحث کر کے آمادہ کیا۔ ان دونوں کا مکالمہ بھگوت گیتا کا متن ہے۔

اگر کرشن مہاراج ایسی ہی عظیم الشان ہستی تھے کہ جیسا بیان کیا جاتا ہے، تو پھر یہ یقینی امر ہے کہ بھگوت گیتا میں اُن کی مسخ شدہ اور محرف گفتگو ہے کیونکہ ارجن کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں، وہ تسلی بخش نہیں ہیں۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ کہ قاتل و مقتول دونوں کے جسم میں خدا کی رُوح ہے۔ جسم کے قتل ہونے یا مرنے سے وہ روح نہیں مرتی، وہ بدستور زندہ رہتی ہے۔ لہذا قتل بلکہ موت ایک اہم اور قابلِ غور چیز نہ رہی۔ وہ رُوح دُوسرے جسم میں چلی جائے گی۔ اور اسی طرح زندہ رہے گی جیسے کہ قتل یا موت سے پہلے تھی۔ اگر اس بحث کو صحیح اور معقول سمجھ کر اُس پر عمل کیا جائے، تو ساری دُنیا میں ایک فساد پیدا ہو جائے۔ کرشنا مہاراج خود اپنے تئیں اس بحث میں کائنات کا خالق اور مدبر کہتے ہیں۔ خالق و مدبر سے بعید ہے کہ وہ اتنی سی بات کو نظر انداز کر دے، اور معمولی بادشاہوں کی طرح اپنی فوج یا اپنے سرداروں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لیئے ایسی گفتگو کرے۔

Marfat.com

دوسری بات جو قابلِ غور ہے وُہ یہ ہے کہ ارجن کہتا ہے کہ فریق مخالف میں ایسے نیک گرو اور بہترین اخلاق کے لوگ ہیں، کہ اگر اُن کو میں نے قتل کر دیا تو ان کے بعد میری زندگی پر تُف ہے۔ کرشن مہاراج اس کی تردید نہیں کرتے پھر وُہ قتل کرنے کو عمل نیک کیوں کہتے ہیں۔ کیا نیک آدمیوں کو قتل کرنا عمل نیک ہے، جس کی وجہ سے جنت ملے گی؟

تیسری بات یہ ہے کہ کرشن مہاراج لڑائی کے اسباب پر تو غور ہی نہیں کرتے۔ یہ فیصلہ ہی نہیں دیتے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر ہے۔ فرض کرو کہ فریق مخالف حق پر ہے تو کیا اہلِ ظلم کا اہلِ حق کو قتل کرنا بھی عمل نیک ہُوا؟

آگے چل کر جہاں کرشن مہاراج نے خدائے واحد کی صفات کو بیان کیا ہے، وُہ نہایت اعلےٰ کلام ہے۔ اور اس سے بہت اعلےٰ اور خالص وحدانیت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پھر برہمنوں کے خداؤں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ بھگوت گیتا اگر کرشن مہاراج کا کلام ہے تو تو برہمنوں نے اُس کو محرف کر دیا ہے۔ محض بہادری کو جو حق و ناحق کے خیال کے بغیر لوگوں کو قتل کرتی جائے، نیک عمل قرار دینا اتنی بڑی ہستی کے شان کے شایان نہیں ہے۔ اس میں تو ہندوؤں کے چھ فلسفوں میں سے صرف ایک فلسفہ سانکیا کی تائید کی گئی ہے۔

لڑائی کے بعد جب دریودھن کی والدہ میدان میں آکر اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھتی ہے تو ایسے الفاظ میں بَین کرتی ہے کہ جن کو پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اور جب ہم خیال کرتے ہیں کہ اس جانفزا غم و الم کا باعث ایک وُہ ہستی ہے جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کائنات کا خالق اور مدبر ہے بلکہ اس ہی کتاب میں وہ خود اپنے تئیں یہ ہی کہتا ہے، تو پھر اس سارے فلسفہ کی نسبت یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ ؏ "ایں دفتر بے معنی غرق مئی ناب اولےٰ"۔

ہندوؤں کے مذہب کا رُکنِ اعظم شو کے لنگ (عضوِ تناسل) اور اُن کی زوجہ محترمہ کالی کی یونی (اندامِ نہانی) کی پرستش ہے۔ ایک مؤرخ کہتا ہے، کہ یہ

پرستش نہایت قدیمی زمانہ سے اب تک ہندوؤں کے مذہب کا رُکن ہے۔
[34] ان دونوں اعضاء مقدسہ کے بڑے لمبے جلوس نکلتے ہیں۔ اور مرد و عورت
ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں بُرائی کیا ہے
گاندھی جیسے مہاتما ان کو بے ضرر و بے عیب بتاتے تھے۔ اُنہیں ان میں کچھ مخرب
اخلاق بات نظر نہیں آتی تھی۔[34] عریاں تصویریں تو بُری۔ اور یہ نمایاں مجسمہ
لنگ دیوتی بہت عمدہ۔

ہر ایک گھر میں مختلف خدا ہوتے ہیں جن کی پرستش کرنا ہر ہندو کا فرض ہے۔ اپنے ان خداؤں کے لئے کھانا مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ اگر اُن کو یہ کھانا نہ دیا جائے، تو وہ خدا بھوکے مرجائیں گے۔ ان خداؤں کو بھوک سے بچانے کے لئے انسانوں کی قربانیاں ہوتی رہی ہیں۔ ۱۸۵۴ء تک یہ قربانیاں ہندوستان میں رائج تھیں۔ ان کے یہاں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے لئے ایک نہایت پوتر (پاک) مکسچر ہے جو بہت شوق سے پیا جاتا ہے۔ یہ گئو ماتا کی پانچ چیزوں کا مرکب ہے یعنی دودھ، گھی، دہی، گائے کا پیشاب اور گائے کا گوبر۔ ان پانچوں کو ملا کر یہ لوگ صفائی قلب کے لئے پیتے ہیں۔

کوئی مسلمان ہے جو اسلام کو چھوڑ کر اس ہندو مذہب کو خوشی سے قبول کرے گا۔ سنا ہے کہ آج کل ہندوستان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی خوب شدھی ہو رہی ہے۔ عقل کی شکست کے بعد ڈنڈا میدان میں نکلتا ہے اور وہ خوب کارگر ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ کے بیان متذکرہ بالا کے لئے یہ کتابیں دیکھو[35]

(34) Will Durant : Our Oriental Heritage, P. 519-21
(35) 1. Encyclopedia of Religion and Ethics, Edited by James Hastings. Vol. xii
2. Encyclopedia of Religion and Religions, by Royston Pik[e]
3. Our Oriental Heritage by Will Durant
4. Popular Hinduism, published at Madras in Papers on Indian Reforms series, 1890
5. Vedic Philosophy by Pt. Guru Datta Vidhvarti, M.A.
6. Bhagvad-Gita : English Translation by Mrs. Annie Besan[t] published by M/s. G.A. Natesan & Co., Madras.

Marfat.com

آخر میں ہم اس کو ہندوستان ہی کے قول پر ختم کرتے ہیں:۔

Yatha devah, tatha bhaktah: As is the god, so is the worshipper.

جیسا خدا ہوتا ہے، ویسا ہی اُس کا پرستش کرنے والا ہوتا ہے۔

(۴) الف، ب

زرتشت، اُن کا مذہب و فلسفہ اور اُن کے بعد اُن کی تعلیم کی تنسیخ و تحریف

زرتشت کس زمانے میں ہوئے ہیں، اس میں بہت اختلاف ہے۔ زمانہ حال کے محققین کی رائے کے مطابق وہ ۶۶۰ سنہ ق م میں پیدا ہوئے اور ۵۸۳ سنہ میں انتقال کیا۔ مغربی ایران کے رہنے والے تھے: ان کا پیدائشی مقام شہر رے ہے۔ یہ وہی رے ہے جس کی حکومت کی تمنا میں عمر ابن سعد نے اپنی دین و دنیا دونوں کھوئے اور وہ نہ ملی۔ زرتشت نے اپنے دین کی تبلیغ مشرقی ایران میں کی۔ زیادہ تر یہ شہر بلخ میں رہے۔ ان کے والد کا نام پوراشسپ تھا۔ اور خاندان سپتما میں سے تھے۔ قوم کے یہ Magus یعنی مجوسی تھے۔ فارسی میں اس کو "مغ" کہتے ہیں، مغاں اس کی جمع ہے۔ پیر مغاں آپ نے سنا ہوگا۔ یہ لوگ شراب بہت پیا کرتے تھے اس ہی لیئے فارسی ادبیات میں پیر مغاں کو بادہ فروشی کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ مغبچۂ بادہ فروش حافظ شیراز کا بڑا محبوب ہے۔ انگریزی میں Magus کی جمع Magi ہی اور اس کو Magian بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی جادوگر کے ہو گئے ہیں۔ لفظ Magie (جادو) اس ہی سے نکلا ہے۔ ایران قدیم میں یہ پجاریوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی۔ جس نے اپنا پورا اقتدار و تسلط سلطنت ایران کے عروج کے زمانہ تک قائم رکھا۔ ان کے مذہب میں اور زرتشت کے مذہب میں فرق یہ تھا کہ زرتشت نے تمام خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کا اعتقاد قائم کیا تھا۔ زرتشت کا دعویٰ یہ تھا، کہ خدا نے جس کو وہ اہرمزد کہتے تھے، ان کو خاص طور سے اپنے دین کی تبلیغ کے لیئے مبعوث کیا ہے۔ زمانہ مابعد میں Magie کی

Marfat.com

شہرت اُن کے جادُو کی وجہ سے خراب ہو گئی - دیکھو Webster بہر صُورت اُس زمانہ میں یہ لوگ نجومی، حکیم، جادوگر، بیماریوں کو دُور کرنے والے اور لوگوں کے مددگار مشہور تھے -

زرتشت کی تعلیم کتاب اوستا میں ہے جس کو زرتشتی مذہب کی بائبل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا وُہ حصہ جس کو گتھا کہتے ہیں، خود زرتشت کا لکھا ہوُا بیان کیا جاتا ہے۔ اُس زمانہ میں جادو کا بڑا زور تھا، اور جادوگر نہیں چاہتے تھے کہ یہ نیا مذہب پھیلے۔ لہٰذا زرتشت کو بہت مشکلیں درپیش آئیں۔ دس سال کے عرصہ میں صرف ایک شخص نے اُن کا دین قبول کیا، اور وُہ خود اُن کا چچا زاد بھائی تھا۔ لیکن جب گشتاسپ بادشاہ نے اُن کا دین قبول کر لیا، تو پھر اُس کو ترقی ہونے لگی۔ کلدانی نجومی بھی تھے، اور جادوگر بھی۔ لوگوں نے اُن کی ان صفات کو زرتشت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ زرتشت نے ساحری کلدانیوں سے لی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایران کے آریاؤں کو سمیرین Sumerian اور سامی Semilics وغیرہ اقوام کے خیالات سے واقفیت تھی۔

اوستا میں ہرمز کو خدائے واحد بتایا گیا ہے۔ زرتشت کی تعلیم خالص وحدانیت تھی، ہرمز کے علاوہ وُہ کسی اور خدا کو نہیں مانتے تھے۔ اوستا میں ہرمز قادر مطلق اور تمام طاقتوں کا مظہر ہے۔ زرتشت نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کو ہرمز (اہورامزدا) نے براہ راست اس دین کی تبلیغ کے لیئے مبعوث کیا تھا۔ ہم نے جو ذکر انتباہ کے عنوان کے تحت میں شروع کتاب میں کیا ہے، وُہ اس جگہ دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ اسلام میں زرتشت کے مقلدین کو زرتشت کی قومیت کی نسبت سے مجوس کہتے ہیں۔ اور مجوسیوں کو اہل کتاب کی حدود کے اندر داخل کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ اوستا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اصُولِ اسلام کے معیار پر ٹھیک نہیں اُترتیں۔ یہی حالت یہودیوں کی توراۃ اور نصاریٰ کی انجیل کی بھی ہے۔ اور یہی حالت قرآن شریف کی بھی ہوتی، اگر حضرت علیؓ نے قرآن نہ جمع کر لیا ہوتا اور حکومت کے جمع قرآن کے وقت حضرت علیؓ نہ ہوتے یا خلفاء اُن کو اُس اعلیٰ عدیم المثال ضبطِ نفس اور صبر کی توفیق نہ عطا کی ہوتی جو اُن سے ظاہر ہوُا۔

اپنے اس تبلیغ دین سے پہلے زرتشت غور وفکر کے لیئے لوگوں سے بچ کر پہاڑوں

میں چلے گئے تھے، اور وہاں درختوں کے پھلوں پر گزارہ کرتے تھے۔

موت کے بعد آخرت کی زندگی کا اعتقاد بھی اویستا میں پایا جاتا ہے۔ زرتشت کہتے ہیں کہ جنت میں Haurvatat یعنی خالص اور مکمل خوشی اور A neretat یعنی دائمی زندگی بغیر موت کے ہوگی۔ یہ بھی اُن کی تعلیم ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں حکومتِ الٰہیہ بھی قائم ہوگی جب سارے عالم میں عدل ہی عدل ہوگا۔ نا انصافی نہ ہوگی، بے چینی نہ ہوگی۔ ایسی حکومتِ الٰہیہ کا نام اُنہوں نے Xshathra Vairya رکھا ہے۔ یہ خیال ابتداء سے اب تک ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ یہودیت اور اسلام میں بھی اس خیال کو نہایت صراحت سے بیان کیا ہے۔ مسیحیت میں بھی یہ ہی خیال پایا جاتا ہے۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں ابھی تک ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی جس میں عدل و امن عام ہو۔ لیکن ہر مذہب نے خصوصاً اسلام نے اس کا حتمی وعدہ کیا ہے کہ ایسی حکومت دُنیا میں ضرور قائم ہوگی۔ اس ضمن میں علامہ مودودی کی مندرجہ ذیل عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے:-

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو۔ اس دور میں پیدا ہو، یا زمانہ کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام "الامام المہدی" ہے جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی کریم علیہ الصلٰوۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔"

تجدید و احیائے دین، ص۱۳۱

زرتشت کے پہلے جو دُنیا کی حالت تھی، اُس کی تصویر ایک انگریزی مؤرخ نے اس طرح کھینچی ہے۔ یہ اُس کا ترجمہ اُردو میں ہے:- دیکھو

Our Oriental Heritage, Chap, xiii p. 365

Marfat.com

ترجمہ:- جب وُہ (زرتشت) ظاہر ہوئے میڈ اور ایرانیوں کے آباؤ اجداد میں تو اُنہوں نے اپنی قوم کو جانوروں، متوفی آباؤ اجداد، زمین اور سورج کی پرستش کرتے ہوئے پایا۔ اور دیکھا کہ اُن لوگوں کے مذہب میں وُہ عناصر اور دُہ ہی خدا تھے جو ویدکے زمانے کے ہندوؤں میں پائے جاتے تھے۔ زرتشت سے پہلے کے اس مذہب کے خدا یہ تھے:- متھرا آفتاب کا خدا، عینا پیدائش اور افزائش کی خدائی، زمین، ہوما، سانڈ کے نمونہ کا خدا، جو مرگیا اور پھر زندہ ہوا، اور بنی نوع انسان کو زندگی دوام عطا کرنے کی غرض سے اپنا خون پینے کو دیتا تھا۔ زمانہ قدیم کے ایرانی اُس کی پرستش اس طرح کرتے تھے کہ ہوما گھاس کا نشہ آور عرق پیتے تھے۔ ان خداؤں کی پرستش اور کافرانہ رسوم کو دیکھ کر زرتشت کو بہت غم اور تعجب ہوا۔ اُس نے اُن مجوسی پجاریوں کے خلاف بغاوت کی جو اُن خداؤں کی پرستش کرتے تھے، اور اُن پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ اور اپنے ہمعصر انبیاء عاموس اور یسعیاہ کی سی جرات کے ساتھ دُنیا میں خدائے واحد کا اعلان کیا یہاں اُس خدائے واحد کا نام اہورامزدا تھا جو نور و سمٰوٰت کا خدا تھا۔ اور باقی مفروضہ خدا کچھ نہیں تھے۔ صرف اُس کی صفات کا دوسرا نام تھے۔

آگے چل کر یہ ہی مؤرخ زرتشت کی کامیابی اور اُن کے بعد اُن کے مذہب کے خراب ہو جانے کو اس طرح بیان کرتا ہے:- دیکھو

Our Oriental Heritage Chap. xiii pp. 366-7

ترجمہ:- زرتشت کے بعد جب یہ مذہب انبیاء کے دائرہ سے نکل کر ملکی سیاست دانوں کے قبضہ میں آیا، تو پھر خدائے واحد اہورامزدا کا تخیل ایک شاہنشاہ کا سا ہوگیا۔ لوگوں نے اعتقاد قائم کر لیا کہ وُہ دُنیا کا خالق اور مدبر ہونے میں بہت سے خداؤں کی مدد کا محتاج ہے۔ اور اُن کو چھوٹے چھوٹے خدا تصوّر کر لیا گیا جو زرتشت کے زمانہ میں صرف مظاہر قدرت سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً آگ، پانی، سورج، چاند، ہوا اور مینہ۔ لیکن اس کامیابی کا سہرا محض زرتشت کے سر ہے۔ کہ اُس نے خدا کو ہر ایک شے سے بالا تصوّر کیا۔ اور اُس کی توصیف و ثنا ایسے الفاظ میں کی، جو رفعت و بلندی میں انجیل کی کتاب ایوب کے برابر ہیں۔ مثلاً اُس کی یہ دُعا قابلِ غور ہے:-

Marfat.com

"یا اھورامزدا میں تجھ سے پوچھتا ہوں' مجھے سچ سچ بتا کہ کس نے سورج اور ستاروں کے راستے اُن کے لئے مقرر کئے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے حکم سے چاند گھٹتا بڑھتا ہے۔ کون ہے جس نے زمین کو نیچے اور آسمان کو اُوپر سنبھالا ہوا ہے' اور اُن کو پریشان ہونے سے بچایا ہوا ہے۔ کون بارش اور درختوں کو قائم رکھتا ہے۔ کون ہوا چلاتا ہے اور بادلوں کو سُرعت رفتار دیتا ہے۔ کس نے اے اھورامزدا عقل کو پیدا کیا ہے (وہ تُو ہی تو ہے)

اس عقل و ذہن سے انسانی عقل و ذہن مُراد نہیں ہے' بلکہ الٰہی عقل' یعنی کلمۃ اللہ جس سے اھورامزدا نے تخلیق کائنات کی ہے۔ زرتشت نے اھورامزدا کی سات صفات بیان کی ہیں۔ نور' عقل' حق' قدرت' خیر' حکمت اور دائمی بقا۔ لیکن اُس کے مقلدین نے جو اصنام پرستی اور کثرت الٰہ کے عقیدہ کے عادی تھے' ان صفات سے علٰحدہ خدا یا ہستیاں سمجھ لیا جن کو وہ امیش سپنتا (ساتھ باقی رہنے والی ہستیاں) کہتے تھے۔ اور جن کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ اُنہوں نے اھورامزدا کی ماتحتی میں دُنیا کو پیدا کیا' اور اب اُس کا انتظام کر رہے ہیں۔ مسیحیت کی طرح زرتشتی مذھب میں بھی بانیٔ مذھب کی اعلیٰ توحید کی جگہ اُس کے مقلدین کی اصنام پرستی نے لے لی۔

زرتشت کی تعلیم کو James Hastings اس طرح بیان کرتے ہیں:-

دیکھو: Encyclopedia of Religions and Ethics p. 864

ترجمہ:- جن دو ارواح اولین نے بطور توام اپنے تئیں خواب میں ظاہر کیا تھا وہ در اصل خیال' قول' اور عمل کی نیکی اور بدی ہیں۔ اور ان دونوں میں سے عقلمند آدمی تو نیکی کو پسند کرتے ہیں' اور احمق لوگ ایسا نہیں کرتے۔ (یعنی وہ بدی کو اختیار کرتے ہیں) زرتشت کی تعلیم کا یہ نچوڑ ہے۔ لیکن موجودہ زرتشتی مذھب تو بین بین کی مصالحت ہے درمیان زرتشتی مذھب اور اُس زمانہ کے اعتقادات کے جو دیگر اقوام میں رائج تھے۔ جب اس ثانویت سے اخلاقی رنگ تو جاتا رہا اور اسی اصول کی تاویل ان الفاظ میں اور اسی طریقے سے کی جاتی ہے جو دیگر اقوام مثلاً اہل بابل اور آریاؤں میں رائج تھے

Marfat.com

یعنی یہ کہ نیکی و بدی کے علحدہ علحدہ خدا ہو گئے، اور ان کی آپس میں لڑائی ہونے لگی بابل کے نیکی و بدی کے لڑنے والے خدا مردک، طیامت، زو اور الیل وغیرہ تھے اور آریاؤں کے یہاں یہ لڑائی طوفان باد و باران میں ہوتی تھی۔ جہاں نور یا آسمان کا خدا بدی کے بڑے اژدہے کو مارتا ہے۔

غلط تاویل کے کرشمے آپ نے دیکھے۔ زرتشت نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ انسان کے اندر نیکی و بدی کی دو طاقتیں ہیں۔ اچھے آدمیوں کو چاہیئے کہ وہ نیکی کی طاقت کو پسند کریں۔ ان کے مقلدین نے، جن کی عمریں کفر میں گذری تھیں، اپنی کفر دوستی کی وجہ ان الفاظ کی تاویل اپنے سابقہ ملحدانہ تخیل کے مطابق کرلی۔ اور نیکی و بدی کے دو خدا بنا لیئے جن کی دائمی لڑائی ہوتی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ انجیل بھی ان ہی تخیلات کے زیر اثر تحریر ہوئی ہے۔ خدا کے بڑے بڑے فرشتے بدی کے اژدہے سے خدا کی طرف سے ہوکر لڑنے نکلتے ہیں، اور خوب لڑائی ہوتی ہے۔ دیکھو یوحنا کا مکاشفہ باب ۱۲۔

موجودہ اوستا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میں Magian کی دو اصول لیئے گئے ہیں:۔

(۱) ایک تو مُردوں کو کُھلے میدان اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گیدڑوں کے کھانے کے لیئے ڈال دینا۔

(۲) دُوسرے نزدیکی رشتہ داروں کی شادی کا جواز۔

اوستا کی قافیہ بندی اور طرز بیان ویدوں کی تحریروں سے ملتے جلتے ہیں۔ اوستا میں بھی کلمۃ اللہ کا تخیل ہے جو لفظ Vohu Mana سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ وہی ہے جو انجیل میں Logos کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی کلمۂ خدا یعنی Word of God ہیں۔ سوریا کے مذہب میں زرتشتی اہورا مزدا (ہرمز) کی مشابہت اشوریا کے اسارا مزاش Assara Magash میں ہے۔ دونوں کے سات سات فرشتے ہیں۔ اشوریا کے Agigi اور زرتشت کے Spenta Manaya Amesha Spentas ہیں۔ اسی طرح رگ وید میں بھی کہیں کہیں ایک خدا کا ذکر آجاتا ہے جیسا کہ Max Muller نے بیان کیا ہے۔ وہ اس کی مثال کے لیئے

Marfat.com

Rig x 121 پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس میں وحدانیت کا عقیدہ اس صراحت سے بیان کیا ہے کہ اُس کا انکار ناممکن ہے۔ (۳۶)

اس سے ہمارا یہ دعویٰ کہ "یہ سب کچھ انبیاء سابقہ کی تعلیم کا اثر ہے" بہت اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ اور اس سے ارتقاءِ تخئیل و دماغ انسانی کی تھیوری بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس ارتقاء کی تھیوری کے مطابق تو وحدانیت کا تخئیل حال کی بات ہے۔ اور اویستا اور ویدوں کی وحدانیت تو اس وقت کا ذکر ہے کہ جب یہ دماغ انسانی پتھروں اور درختوں کی اُلوہیت میں اُلجھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وُہ اثر انبیاء کی تعلیم کا تھا، جن کو خداوند تعالےٰ نے یہ تعلیم دے کر مبعوث کیا تھا۔

(۵) بُدھ مذہب

دراصل برہمنوں کے بے شمار خداؤں والے مذہب سے ایک بغاوت کی تحریک تھی جس نے بُدھ مذہب اور جین مت پیدا کیئے۔ گوتم بُدھ کے سوانح حیات اس طرح افسانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں کہ اُن کا معلوم ہونا بہت مشکل ہے۔ بس اتنا ہی یقین کیا جا سکتا ہے، کہ یہ سلطنتِ کپل دست کے بادشاہ کے لڑکے تھے۔ کپل دست ایک چھوٹی سی ریاست ہمالیہ کے دامن میں نیپال کے جنوب میں بنارس سے یک صد میل شمال کی طرف واقع تھی۔ تاریخِ پیدائش و موت بھی یقین کے ساتھ نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ مؤرخین کا اس پر اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۵۶۳ قم میں پیدا ہوئے، اور ۴۸۳ قم میں انتقال کیا۔ ان کے ہمعصر ہندوستان میں مہاویرا، ایران میں زرتشت، چین میں Confucius اور Lao-tze سلطنت یہود میں Jeremiah اور Isaiah II اور یونان میں فیثا غورث اور ہراقلیس وغیرہ قبل سقراط کے فلاسفر تھے۔

دُنیا کے مصائب و آلام نے گوتم بودی کے دل میں خیالات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور یہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ (۱) دُنیا کی چیزوں میں منہمک ہونا عبث ہی

(36) Max Muller's History of Ancient Literature, pp 568 et Seq.

Marfat.com

اور (۲) پیدائش یعنی دُنیا میں آنا ہی سارے مصائب کا موجب ہوتا ہے۔ انہماک فی الدنیا کے خلاف دُوسری حد پر اتنے چلے گئے کہ وُہ بھی ان مصائب کا اچھا حل نہ ثابت ہوا۔ چھ سال تک ہندو یوگی کی سی زندگی گزاری۔ صرف جنگل کی گھاس پر گزارہ تھا اور کچھ عرصہ تک وُہ بھی چھوڑ دیا۔ اور صرف گوبر اور لید ہی کھاتے رہے۔ آخر کار کہنے والے کہتے ہیں، کہ صرف ایک چاول اُن کی روزانہ خوراک رہ گئی تھی۔ اپنے ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ نوچ کر اپنے نفس کو تکلیف اُٹھانے کا عادی بنایا۔ گھنٹوں کھڑے رہتے تھے، اور دنوں کانٹوں پر لیٹے رہتے تھے۔ صفائی اور غسل سے عار تھا۔ جسم پر اتنا گرد و غبار تھا، کہ جب کھڑے ہوتے تھے تو مٹی سے بھرا ہوا درخت کا تنہ معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہاں جایا کرتے تھے کہ جہاں مُردوں کی لاشیں میدان میں جانوروں کے کھانے کے لیئے رکھ دی جایا کرتی تھیں۔ وہاں سڑتی ہوئی لاشوں میں سوتے تھے — یہ تھی خود رَو قیاس کی خود آرائی — لیکن پھر جو قیاس نے اُلٹا پلٹا کھایا، تو دُوسری حد پر چلا گیا۔ اور کھانا جو شروع کیا تو وہ بھی بہت زیادہ۔ اچھا کھانا، اچھی جگہ کھانا، اور بہت زیادہ کھانا۔

بُدھ مذہب کی تعلیم، اور اُس کے اصُول: گوتم بُدھ کا طریقۂ تبلیغ مذہب یہ تھا کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ شہر بشہر پھرتے تھے۔ بعض دفعہ تو اُن شاگردوں کی تعداد بارہ سو تک ہو جاتی تھی۔ جہاں جاتے تھے وہاں کے آدمیوں کے ذمہ ان کا کھلانا اور مہمانی کرنا ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رنڈیوں کے گھر بھی اسی طرح کھانا کھانے چلے جاتے تھے۔ گاؤں کے باہر اپنا خیمہ لگاتے تھے۔ سہ پہر کو دھیان گیان میں مشغول ہوتے تھے، اور شام کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ زندگی دُکھ ہے۔ یہ دُکھ خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے، اور عقلمندی یہ ہے کہ اس خواہش کو خاموش کیا جائے۔ پیدا ہونا ہی دُکھ ہے۔ بیماری اور بڑھاپا دُکھ ہیں رنج و الم، نا اُمیدی، ہجوم یاس یہ سب دُکھ ہیں۔

ان کا فلسفہ یہ تھا۔ دُنیا میں رنج و الم ہی ہے۔ یہاں کہیں خوشی نہیں۔ کبھی راحت بھی ہوتی ہے، تو وُہ بھی چند لمحوں کی۔ اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے رنج و الم ہی پیدا کرتی ہے۔ رنج و راحت دونوں گزران ہیں، بے معنی ہیں، بے حقیقت ہیں۔

Marfat.com

تمام خواہشات کو یک لخت ترک کر دینا چاہیئے۔ خصوصاً خواہشِ مجامعتِ نسواں، کیونکہ اس سے لوگ پیدا ہوتے ہیں، اور اس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ مصائب و تکالیف کا لا متناہی ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسٰے کی طرح گوتم بدھ بھی عورتوں سے گھبراتے تھے۔ اور اُن کو اپنے مذہب میں نہیں داخل کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بار بار پیدا تو اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ گناہان دُھلتے جائیں۔ ہم ایسی نیک زندگی بلکہ معصوم زندگی رکھیں کہ کوئی گناہ ہی نہ ہو۔ اور پھر دوبارہ پیدا ہونے کا موقعہ ہی نہ ہو یہ ہی نروان ہے۔ یہ نیک زندگی آٹھ باتوں سے ہوتی ہے: اعتقادِ صحیح، نیتِ صحیحہ، قولِ صحیح، فعلِ صحیح، رہائشِ صحیح، کوشش صحیح، تخیل صحیح، اور صحیح مراقبہ۔ کسی نے پوچھا کہ صحیح زندگی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے تو انہوں نے بتایا کہ پانچ باتوں سے۔ یعنی:-

(۱) کسی جاندار کو نہ مارو۔

(۲) کوئی چیز نہ لو جب تک وہ تمہیں دی نہ جائے۔

(۳) جھوٹ مت بولو۔

(۴) شراب اور دیگر منشی چیزیں نہ پیو۔

(۵) زنا مت کرو۔

گوتم بدھ تناسخ ارواح کے بہت یقین کے ساتھ قائل تھے۔ ان کے فلسفہ مذہب میں خدا کے لیئے جگہ نہیں تھی۔ جو کچھ تھا صرف کرم KARMA تھا۔ ان کا مذہب بالکل یونانی فلسفہ کی طرح اخلاقانہ تھا۔ (Ethics) جس میں نہ تو آئندہ کی زندگی تھی نہ حساب کتاب تھا، نہ خدا تھا۔ بلکہ رُوح بھی نہ تھی۔ وہ روح کی ہستی کے قائل نہ تھے وہ تو اس کو دماغ کی ایک حالت سمجھتے تھے۔ (۳۷)

بدھ مذہب پر تنقید: یہ کونسی ذات یا ہستی فیصلہ کرے گی کہ کسی شخص کی زندگی بے گناہ رہی ہے۔ معصوم رہی ہے۔ اور اب اس کے لیئے

(37) Our Oriental Heritage, Chap. XV

Marfat.com

دوبارہ پیدا ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہر ایک شخص کا تخیل صحیح و غلط خیر و شر کے متعلق مختلف ہوتا ہے۔ اور بحث ہر ایک طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ کس معیار سے جانچا جائے گا کہ یہ زندگی صحیح رہی ہے اور یہ غلط! اچھا۔ بار بار کی پیدائش سے چھٹکارا ہو گیا۔ تو اب کیا ہوگا۔ ظاہر نتیجہ ہے کہ وہ روح نیست و نابود ہو جائے گی۔ شخصیت نہ رہے گی۔ گویا Annihilation ہو جائے گا۔ کیا یہ Annihilation اچھی شے ہے۔ اس میں کیا جاذبیت ہے۔ بار بار کی پیدائش میں کیا خرابی ہے جو اس نیستی میں نہیں ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ پیدائش یعنی زندگی میں رنج و آلام ہیں اور نیستی Annihilation میں نہ رنج ہے نہ راحت۔ لیکن یہ خوشی تو نہ ہوئی۔ اگر بار بار کی پیدائش کا بہت نیک کام کرنے کے بعد یہی نتیجہ ہے یعنی مکمل نیستی، تو اس پیدا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ کیا یہ فعل عبث ہے یعنی تخلیق انسان فعل عبث ہے تو یہ کس نے کیا، کیونکر وقوع میں آیا۔ یہ وہ بات تو نہیں ہے جو دہریئے کہتے ہیں کہ دُنیا خود بخود مادہ سے پیدا ہو گئی۔ اگر یہ بات ہوتی، تو اس میں نیکی و بدی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ نیک ہونے سے کیوں بدی ہو، اور بد ہونے سے کیوں بار بار کی پیدائش ہو۔ یہ دہریوں کی Blind forces کا تو کام نہیں ہو سکتا۔ اُن کو نیکی و بدی سے کیا کام۔ اُن کے نزدیک تو دونوں ہی برابر ہیں کیونکہ دونوں مادہ کا نتیجہ ہیں۔ ایسی forces مثلاً تیز بارش یا تند ہوا ہیں تو یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ نیک آدمیوں کے گھر کو بچا دیں، اور بُرے آدمیوں کے گھر کو اُڑا دیں۔ اگر عورتیں ایسی شے ہیں کہ جیسی گوتم بُدھ نے خیال کیا تو پھر اُن کے پیدا ہونے یا زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیوں نہ اُن کو پیدا ہوتے ہی اس طرح مار دیا جائے جس طرح زہریلے سانپ کو مار دیا جاتا ہے۔

جب رُوح کی بحث کرنے پر آئے تو اس طرح بحث کرتے ہیں کہ گویا رُوح کوئی شے ہی نہیں ہے۔ وُہ تو ایک دماغی حالت ہے جو اعضاءِ انسانی سے کام کراتی ہے۔ اگر یہ ہے، تو پھر دوبارہ پیدائش کے کیا معنی۔

غرضکہ بدھ مذہب تو برہمنوں کی ضد میں پیدا ہو گیا تھا۔ کثرتِ الٰہ کی ضد

Marfat.com

میں کہہ دیا کہ کوئی خدا نہیں ہے، پھر خدا کی جگہ کرم کو لاکر بٹھا دیا۔ اس مذہب میں صحیح منطق کی برداشت نہیں ہے۔

بدھ مذہب اور جین مت دونوں برہمنوں کی فتح سمجھنی چاہیئے۔ کیونکہ آخر کار یہ دونوں مذہب اپنی ایک نئی قسم کی بُت پرستی میں تبدیل ہو گئے۔ ان میں بے شمار بودھ اور جن ہو گئے جن کی پرستش ضروری سمجھی گئی۔ ایک بُدھ کی مورتیوں کی پرستش کرنے میں مشغول ہو گیا، دوسرا اپنے جنوں کی پرستش میں محو ہو گیا۔

(۴) **جین مت**:۔ اس مذہب کے بانی ایک شخص تھے کہ جن کو ان کے مقلدین نے مہاویرا یعنی بہادر اعظم کا لقب دیا تھا۔ مہاویر ۵۹۹ھ ق م میں پیدا ہوئے اور ۵۲۷ ق م میں زندگی کے خلاف بھوک ہڑتال کر کے مر گئے۔ ان کے والدین ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھتے تھے کہ جس میں خودکشی سب سے بڑی نیکی تھی۔ لہٰذا جب مہاویرا کی عمر ۳۱ اکتیس سال کی ہوئی تو وہ دونوں بھوکی خودکشی کر کے مر گئے۔ اس واقعہ کا بہت اثر مہاویرا پر ہوا۔ اور جنگلوں میں بالکل ننگے نکل گئے۔ اور مغربی بنگال کے شہروں اور جنگلوں میں اسی طرح کی ۱۳ سال کی گردش کے بعد ان کے چیلے ہونے شروع ہو گئے اور ان کو جن کہنے لگے۔ جن کے معنی فتحیاب یا فاتح کے ہیں۔ اس ہی نسبت سے اس فرقہ نے اپنا نام جینی رکھ لیا، اور اُن کو مہاویرا کا لقب دے دیا۔

جین مت کے عقائد:۔ دُنیا میں مطلق حق نہیں ہے۔ جس کو ہم حق سمجھتے ہیں وہ ایک نقطۂ نگاہ سے ناحق ہوگا۔ ہاتھی اور چھ اندھوں کی کہانی ان کی ہی بنائی ہوئی ہے۔ جس کا ہاتھ ہاتھی کے کانوں پر پڑا تو وہ سمجھا کہ ہاتھی تو ایک موٹا کھمبا ہے۔ لہٰذا ہر ایک نظریہ غلط ہے۔ وید بھی بے فائدہ ہیں۔ وُہ خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہیں۔ دنیا اسی طرح خود بخود ازل سے چلی آئی ہے۔ اور اس میں جو تغیرات ہوتے ہیں، وُہ خود اس کی اندرونی طاقتوں اور حرکتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ کئی صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص بھی آتا ہے، جس کو حق مطلق سے آگاہی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ خدا کو تو نہیں مانتے تھے اور اُس کی ہستی کے قائل نہ تھے لیکن ان مقدس جنوں کی پرستش نہایت شوق سے کرتے تھے۔ وُہ ہی برہمنوں والی بات آ گئی۔ گوتم بدھ کے برعکس یہ روح، ہستی اور شخصیت کے قائل تھے۔ یہ بھی عقید

Marfat.com

تناسخ ارواح یا آواگون کے حامی تھے۔ ہر ایک جن یا پرماتما اپنی نیک زندگی کی وجہ سے صرف کچھ عرصہ کے لیئے چند پیدائش کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ زمانہ گزرنے کے بعد پھر پیدائش کے چکر میں آ جاتا ہے۔

ہر ایک جینی کے لیئے پانچ عہد کرنے ضروری ہیں: (۱) کسی جاندار شے کو نہ مارے (۲) کبھی جھوٹ نہ بولے (۳) صرف وہ ہی شے لے جو اُس کو دی جائے (۴) عورت سے مطلق مباشرت نہ کرے (۵) ظاہری حواس کی ہر ایک خوشی سے اجتناب کرے۔ جینیوں کے لیئے زراعت ممنوع ہے۔ کیونکہ زمین میں ہل چلانے کے وقت چھوٹے چھوٹے کیڑے مر جاتے ہیں۔ شہد بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ وہ شہد کی مکھیوں کی خوراک ہے۔ معلوم نہیں، دودھ اُن کے لیئے کس منطق سے حلال ہو گیا۔ جینی کے لیئے ضروری ہے کہ پانی چھان کر پیئے۔ منہ پر کپڑا باندھے رہے تاکہ کوئی جانور اندر نہ چلا جائے۔ زمین پہ پہلے جھاڑو دے لے، پھر چلے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی کیڑا ہو اور وہ اُس کے پیر تلے آ جائے۔ کسی جینی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کی جان لے۔ ہاں! اپنی جان لینی یعنی خودکشی بہت نیک کام ہے۔ یہ خودکشی بھوکے رہ کر ہونی چاہیئے۔ اب بھی سُنا ہے کہ ان کے بڑے بڑے مہاتما اسی طرح بھوکے رہ کر مر جاتے ہیں۔ غالباً مہاتما گاندھی بھی ایسا ہی کرتے لیکن قاتل نے اُنہیں اس نیک کام کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔

ہمارے ان مسلمان نوجوانوں کو جو بھوک ہڑتال کے بہت شیدا ہیں، معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ہندوانی رسم ہے۔ اور ہندوؤں کے لیئے اُن کے خیال کے مطابق جائز ہے کیونکہ اگر وہ اس میں مر بھی گئے، تو بہت بڑی نیکی کر گئے۔ لیکن مسلمان اگر بھوک ہڑتال کے دوران میں مرا، تو وہ نہ گھر کا رہا اور نہ گھاٹ کا۔ نیک کام تو ہوا نہیں کیونکہ وہ جینی نہیں۔ اور مسلمان وہ رہا نہیں۔ کیونکہ جینیوں کی طرح مرا۔

جین مت کے عقائد پر نکتہ چینی ضروری نہیں۔ کیونکہ وہ ہی تنقید اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جو بُدھ مذہب پر ہم کر چکے ہیں۔ علاوہ اس کے دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر بھوک ہڑتال یعنی بھوکی خودکشی فعل مستحسن ہے، تو وہ شروع ہی میں کیوں نہ کی جائے۔ اور اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ عورت سے مواصلت کر کے بچے نہ پیدا کراؤ۔ اس طرح جلدی سے خاتمہ ہو جائے گا، اور بھوکی موت کی

ضرورت نہ رہے گی۔

آواگون کے عقیدہ کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ کسی جاندار شے کو نہ مارنا چاہیئے کیونکہ اُس میں اُن کے ہی والدین یا کسی عزیز کی رُوح نہ ہو۔ لیکن اس عقیدہ والے لوگ دنیا میں محض اپنے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی وجہ سے زندہ ہیں جو موذی جانوروں کو مار دیتے ہیں ورنہ موذی جانوروں کی کثرت ان کو زندہ بھی نہ رہنے دے۔

(۷) فلسفہ چینی:-

چین کا فلسفہ خالص فلسفہ ہے۔ اس میں مذہب کی آمیزش نہیں۔ اس کا سب سے پہلا فلاسفر yu tze ہے۔ جو تقریباً ۱۲۵۰ ق م میں تھا۔ اس کا مشہور فلسفیانہ فقرہ یہ ہے کہ جو شخص شہرت کے خیال کو چھوڑ دیتا ہے اُس کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ چین کے فلسفہ کے دو بنیادی اصول ہیں Yang اور Yin ان لوگوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ مذکر اور مونث۔ Yang سے مذکر اور yin سے مونث مراد لیا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام حقیقت کا راز ان دونوں کی وصل اور جدائی میں ہے۔ جدائی سے یہاں مخالفت مراد ہے۔ اس نظام ثانویت میں مذکر Yang سے حرارت، روشنی اور حیات کے اثباتی، فاعلی، تخلیقی اور آسمانی اثرات مُراد ہیں۔ اور yin سے ظلمت، سردی، انجماد اور موت کے منفی، مفعولی اور اسفلی اثرات مُراد ہیں۔

چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں تمام دُنیا میں فلسفہ کا غلبہ تھا۔ ہندوستان، ایران، سلطنت یہودیہ، اور یونان سب میں اُس زمانہ میں فلاسفروں کی کثرت تھی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان صدیوں میں تمام دُنیا میں لڑائیاں اور بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مصیبت ہی کے زمانہ میں انسان غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عوام الناس میں بہت سے مفکرین پیدا ہو گئے جنہوں نے دیکھا کہ موجودہ مذہب بہت غیر یقینی تھا۔ حکومت بہت ناقص تھی اور اخلاقیات کا کوئی معیار مقرر نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی خیالی سوسائٹی اور خیالی حکومتیں بنانا شروع کر دیں۔ یہ خیالات حکومت کے خلاف بغاوت کے سرچشمے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خود چین کے بڑے فلاسفر Confucius نے جبکہ وہ لو (Lu) کی حکومت میں وزیر جرائم تھا، ایک افسر کو ایسی ہی بغاوت کے جرم میں قتل کی سزا دی تھی۔

ان سب میں بڑا باغی Teng Shih تھا۔ جس کو بغاوت کے جرم میں چینگ Cheng کے نواب نے قتل کی سزا دی تھی۔ یہ Confucius کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ وُہ اخلاقیات میں نیکی و بدی کا کوئی ذاتی معیار نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ کسی خاص نسبت سے کہہ دیا کہ یہ اچھا ہے اور وُہ برا ہے۔ اور وُہ ایسی بحث کرتا تھا کہ جس کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ ایسا ذہین تھا کہ ایک دن ایک شے کو وُہ اچھا ثابت کر سکتا تھا اور دُوسرے دن اُسی چیز کو برا ثابت کر دیتا تھا۔ اور وُہ اپنی بحث کی فیس لیتا تھا۔ اُس کا زمانہ ۵۴۰ ق م تھا۔ اُس کی بحث کا بہت اچھا نمونہ ایک قصہ سے ملتا ہے۔ تنگ شی کے شہر کا ایک دولت مند وائی Wei دریا میں گر کر مر گیا، اور اُس کی لاش ایک شخص کے ہاتھ آ گئی جس نے اُس کے ورثاء سے لاش دینے کے بدلہ بہت سا روپیہ مانگا۔ اُن خاندان والوں نے تنگ شی سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا کہ ابھی ٹھہر جاؤ کیونکہ کوئی اور خاندان اُسے اُس لاش کے عوض کچھ روپیہ نہ دے گا۔ جب اُس شخص کو خبر لگی، تو وُہ بہت گھبرایا اور وُہ برائے مشورہ تنگ شی کے پاس آیا۔ اُس نے صلاح دی کہ ابھی ٹھہر جاؤ کیونکہ اُن لوگوں کو یہ لاش کہیں اور سے تو مل ہی نہیں سکتی۔ ان لوگوں کا طرزِ عمل بعینہٖ وُہ ہی تھا جو یونان کے Sophists کا تھا۔ یہ مشابہت اتفاقاً نہ تھی بلکہ سلسلہ تجارت اور دیگر آمد و رفت سے ایک جگہ کے خیالات دوسری جگہ قافلوں کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

زمانۂ حال کی پوسٹر بازی کا بھی حال سُنئیے کہ اس کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی اس ہی چینی سوفسٹ تنگ شیہ نے گورنمنٹ کی پالیسی کی نکتہ چینی کے لئے پمفلٹ نکلوائے۔ وزیر اعظم نے حکم دیا کہ ان کو منظرِ عام پر چسپاں نہ کیا جائے۔ تنگ شی نے اس پوسٹر بازی کو تقریر بازی سے تبدیل کر دیا۔ اپنے پوسٹر زبانی تقریر والوں سنانے لگا۔ وزیر اعظم نے اس کو بھی منع کیا، تو اُس نے اپنے پوسٹر یا پمفلٹ دوسرے اسباب کے ساتھ چپکے سے رکھنے شروع کر دیئے۔ وزیر اعظم نے اس ذہن بازی کا خاتمہ تنگ شی کی گردن کاٹ کے کر دیا۔

اس کے بعد Confucius کے زمانہ سے پہلے کا سب سے بڑا [illegible]

Marfat.com

Lao-tze تھا۔ یہ غالباً ۶۰۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۱۷ ق م میں مر گیا۔ یہ بھی اپنے زمانہ کے سیاست دانوں کی بدمعاشیوں اور دغا بازیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ یہ "چو" Chou کے شاہی کتب خانہ کا داروغہ تھا۔ اس عہدے کو چھوڑ کر وہ بخوشی خود جلا وطن ہو گیا۔ کیونکہ اُس کو حاکمانِ مُلک کی دغا بازیاں پسند نہ تھیں۔ ہم تو دُنیا کے موجودہ زمانہ کی سیاست بازی سے نالاں ہیں۔ دیکھئے سیاستدانوں کی بدمعاشیاں بھی کتنی پُرانی ہیں۔ تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ سب کچھ جو اَب ہو رہا ہے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ تو محض ہماری ماضی پرستی اور حال دشمنی کا اثر ہے کہ جو کچھ خرابی آج ہم دیکھ رہے ہیں وُہ سب زمانۂ حال کی روش کے سر تھوپ رہے ہیں جب دُنیا میں شیطان ہوئے تو شیطنت جاری ہو گئی اور وُہ کونسا زمانہ تھا جب دُنیا شیطانوں سے خالی تھی۔ کبھی دَب گئے، کبھی اُبھر آئے۔ دنیا میں تو یہ ہی آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے۔ اور سیاستدانوں کی بدمعاشیاں تو ان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہیں۔ جب سے دنیا میں دنیا والی سیاستدانی شروع ہوئی ہے تب سے ہی یہ سیاسی بدمعاشیاں شروع ہو گئیں۔ جن بڑے آدمیوں نے اُس کی مخالفت کی وُہ مشہور ہو گئے اور چھوٹے آدمی "بدستور سابق" رو دھو کر چُپکے ہو گئے۔ خیر! یہ لوڈ زو Lao-tze جب فرنٹیر پہنچا تو وہاں کے آدمیوں نے اس کو اپنی رہنمائی کے لیے کتاب لکھنے کو کہا۔ اُس نے کتاب لکھی جس کا ذکر ہم ابھی کرتے ہیں۔ Lao tze تو لقب ہے جس کے معنی ہیں پُرانا اُستاد۔ اس کا نام تو Li بیان کیا جاتا ہے جس کے معنی بیر کے ہیں۔ یہ تو ابھی شبہ ہے کہ وُہ کتاب کس کی لکھی ہوئی ہے۔ بہر صورت وُہ دو حصوں پر منقسم ہے Tao اور Te. اور اس کا نام ہے Tao-Te-Ching یعنی کتاب صراط مستقیم۔ Te کے معنی راستے کے ہیں اور راستہ نیچر کا قرار دیا گیا ہے۔ Tao چین کے فلسفہ کا نام ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ڈو فلسفہ کے مطابق طریقۂ رہائش۔ یہ لکھا تو جاتا ہے Tao لیکن پڑھا جاتا ہے Dou۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ اور چین کی بہت بڑی آبادی اُس کو آج تک اپنا ضابطۂ مذہب و زندگی سمجھتی ہے۔ اس فلسفہ کی چند باتیں یہ ہیں:۔

خیال محض ایک اوپری غیر ضروری شے ہے۔ صرف بحث کے لیئے اُس کی

Marfat.com

ورت ہوتی ہے۔ یُوں تو اس کے نقصانات بہ نسبت اُس کے فوائد کے بہت زیادہ
ہیں۔ طریقہ یعنی طریقۂ زندگی یہ ہے کہ ذہن و قوت غور (Intellect) اور اُن کے
تمام لوازمات کو یکسر چھوڑ دیا جائے۔ اور گوشۂ عزلت کی سادہ اور پُرسکون دہقانوں
کی سی زندگی مناظرِ قدرت کے درمیان گزارنی چاہیئے۔ علم نیکی نہیں ہے بلکہ جتنی
تعلیم بڑھی ہے، اُس کے ساتھ ساتھ بد معاشیں بڑھ گئے ہیں۔ علم عقل نہیں ہے
چونکہ دانشمند سے کوئی شئے اتنی دُور نہیں ہے جتنی ہوشیاری سب سے بدترین حکومت
وہ ہے جس میں فلاسفر حکمران ہوں۔ دیکھئے افلاطون کے فلسفہ میں اور اُس فلسفہ
Taoism میں بعد المشرقین ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ بہترین حکومت وُہ ہے،
جس میں فلاسفر حکمران ہوں۔ اور دونوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے ٹھیک کہہ رہے
ہیں۔ اگر فلاسفران نیکی اور عدل کرنا چاہیں تو بہترین کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وُہ اس کو سمجھتے ہیں،
اور اگر علماء و فلاسفران اپنے علم کو بدی میں استعمال کریں تو بدترین ہو سکتے ہیں۔
اسلام کا فلسفہ کتنا صحیح ہے جس پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہوسکتا۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔ "خدا سے ڈرنے والے ہی بہترین حکمران ہوتے ہیں"۔ خدا سے
وہ ہی ڈرے گا، جس کے پاس علم ہوگا یعنی جو عالم ہوگا۔ اور چونکہ خدا سے ڈرتا ہے
لہٰذا اپنے علم کو نیکی اور عدل ہی کی طرف استعمال کرے گا۔

بہرصورت Tao-Te-Ching اور Taoism کا فلسفہ بھی بہت غور کے
قابل ہے۔ ان کے غور سے بے جا علم اور مفید جہالت کی خصوصیات اچھی طرح معلوم
ہوتی ہیں۔ وہ فلسفہ یہ ہے:۔

سیدھا سادا حکمران ہر ایک جگہ ... معقولات کرنے کے بجائے رعایا کو اپنا
طرزِ عمل خود تیار و مرتب کرنے کے لیئے آزاد چھوڑ دیتا ہے جب حکومت کی طرف
سے بے جا مداخلت اور اوامر و نواہی نہیں ہوتے، تو رعایا کی قدرتی اقتصادی اور اخلاقی
قوتیں اپنا عمل کرتی ہیں۔ اُن کی نہایت زبردست خواہشیں دو ہوتی ہیں۔ رزق
اور محبت۔ ان دونوں پہیوں کے ساتھ رعایا کی گاڑی سیدھے سادے راستہ پر
چلتی ہیں۔ بہت کم ایجادیں ہوں گی یہ ایجادیں ہی بہت مضر ہوتی ہیں۔ یہ دونوں
کی دولت، اور بارسوخ آدمی کے ... میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ اگر علم نہ ہوگا تو کتابیں

کلاں اور Industrialism نہ ہوں گے، اور لوگوں کی راحت اور اُن کا امن محفوظ رہے گا۔ حکومت میں بہت زیادہ امتناعی احکام سے لوگوں کی غربت بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں کے پاس جتنے زیادہ ذرائع نفع حاصل کرنے کے ہوں گے اتنی ہی زیادہ بے چینی اور بد امنی مُلک میں ہوگی۔ جتنی زیادہ مکارانہ ہوشیاری ہوگی، اتنے ہی زیادہ ذرائع لوگوں کو لُوٹنے کے ہوں گے۔ جتنا زیادہ قانون ہوگا، اتنے ہی زیادہ چور، ڈاکو اور ملزم بڑھیں گے۔ اس کے بعد وُہ ایک دانشمند کا طریقۂ حکومت بیان کرتا ہے۔ اور دانشمند کے مُنہ سے کہلاتا ہے، کہ مَیں لوگوں کو پچھلے زمانے کے سادہ طریقۂ زندگی کی طرف لوٹاؤں گا۔ اُنہیں چاہیئے کہ اپنے سادہ کھانے کو بہت میٹھا اور مزہ دار سمجھیں۔ اپنی سیدھی سادی پوشاک کو بہت خوبصورت سمجھیں۔ اپنے غربت کے جھونپڑوں کو جائے امن خیال کریں، اور اپنی روزمرّہ کی زندگی کو خوشی کا ذریعہ بنائیں۔ اگر میری ریاست کے بہت نزدیک کہ وہاں کے کتّوں اور مُرغوں کی آوازیں ہم تک آتی ہیں کوئی ریاست ہو، تب بھی میں اپنے رعایا کو وُہ مرتے دم تک بھی میں اس نزدیک کی ریاست کے لوگوں سے ملنے نہ دوں گا۔

دیکھیئے عقل میں کتنی دُور بینی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی ساری خرابیوں کو وہ دانشمند اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کچھ عقل کی بھی دُوربینی تھی، کچھ یہ بھی تھا کہ ایک جیسے ہی زمانے دُنیا پر کئی دفعہ آئے ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ہم احمقوں کا زمانہ ہے۔ زمانۂ حال کے مصائب اور مشکلوں کے اسباب صرف چار ہیں: (۱) عام تعلیم جو چھوٹے گدھوں کو بڑا گدھا بنا رہی ہے۔ (۲) وسعتِ سلطنت۔ اتنی بڑی سلطنت ایک بادشاہ یا قوم کے پاس ہوتی ہے، کہ انتظام درست نہیں رہتا۔ (۳) Industrialism جس نے زراعت کی زمینوں پر قبضہ کرکے انسان کی خوراک کو بہت کم کر دیا ہے اور جس کی مشینوں کے استعمال سے لاکھوں آدمی بے کار ہو رہے ہیں، اور جس کی وجہ سے انسانوں میں انسانی ہمدردی کی جگہ حیوانی خود غرضی نے لے لی ہے۔ اور (۴) جمہوریت بے معنی جس نے لوگوں کے رنج و راحت کی باگ ڈور خود غرض احمقوں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔

Marfat.com

یہ دانشمند کہتا ہے : نیچر میں تمام چیزیں خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہیں اور اپنا کام ختم کرکے اپنے اصلیت کی طرف چلی جاتی ہیں جہاں سے آئی تھیں۔ نہ انکو دولت کی خواہش ہے اور نہ شہرت کی ضرورت ہے۔ اپنے اصلیت کی طرف واپس جانے کا یہ مطلب ہے کہ سکون میں ہو جاتی ہیں۔ یہ سکون کیا ہے اُن کے فرض و مقصد کا پورا ہو جانا۔ سکون یعنی ایک قسم کا دانشمندانہ عمل نیچر کے کاموں میں مداخلت نہ کرنا، یہ ہے ایک عقلمند آدمی کی علامت۔

دیکھئے یہ چینی دانشمند آئمہ علیہم السلام کی تعلیم سے کتنا نزدیک ہو گیا ہے وُہ کہتا ہے :۔ اگر تم کسی سے جھگڑا نہ کروگے۔ تو کوئی تم سے جھگڑا نہ کرے گا۔ اگر کوئی تکلیف بھی پہنچائے تو تم اُس سے نیکی کرو۔ جو اچھے ہیں میں اُن سے اچھا ہوں، جو بُرے ہیں میں اُن سے بھی میں اچھا ہوں۔ لہذا سب کو اچھا ہو جانا چاہیئے۔ جو مخلص اور راست باز ہیں میں بھی اُن سے مخلص اور راست باز ہوں۔ اور جو مجھ سے مخلص اور راست باز نہیں ہیں میں اُن سے بھی مخلص اور راست باز ہوں۔ نرم اور نازک ترین شے دنیا میں سخت ترین شے کو توڑ ڈالتی ہے۔ دنیا میں پانی سے زیادہ کوئی نرم شے نہیں ہے۔ لیکن سخت ترین چٹانوں کو پانی کاٹ ڈالتا ہے۔

ان حکماء قدیم کی باتیں سُنکر ہم قرآن شریف کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وَمَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ اس پر تفصیل سے گفتگو ہم آئندہ چل کر کریں گے۔

Lao-tze نے نیچر پر بڑا زور دیا ہے۔ نیچر کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اسلام بھی دینِ فطرت ہے۔ لیکن اس چینی دانشمند نے حیوانوں اور درختوں اور پتھروں کی نیچر کو لیا ہے۔ اور قرآن شریف انسان کی فطرتِ صحیحہ کو معیار ٹھہراتا ہے۔ چینی فلاسفر کی غلطی عیاں ہے۔ جو چیز نیچر میں واقع ہے، وہ نیچرل ہے۔ بدی بھی انسان ہی کرتا ہے، اور بہت خوشی سے کرتا ہے۔ اگر نیچر پر انحصار کرتا ہے تو عام انسان بجائے عدل و انصاف کے ظلم و خود غرضی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ نہ کہ اُن پر رحم۔ انسان کے ایثار انکسار کے بہت کم امکانات ہیں۔ غرور و پندار بہت آسان ہے۔ انسان کا اصلی و نیچرل پیشہ تو

Marfat.com

شکار کرنا اور قتل کرنا ہے۔ زراعت تو اس کے لیئے نیچرل نہیں۔ ان ساری باتوں کو کرنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تہذیب کو چھوڑ کر اُسی طرح "بدستورِ سابق" جنگلوں میں عریاں پھرنا شروع کر دینا چاہیئے۔ اس ہی وجہ سے اسلام نے انسان کی فطرت صحیحہ کو معیار ٹھہرایا ہے۔

کون فیوشی اس Confucius۔

یہ چین کا بلکہ دُنیا کا بہت بڑا فلاسفر موضع کوفو Ch'ufu میں جو سلطنت Lu (موجودہ صوبہ Shantung میں ہے)، ۵۵۱ھ ق م میں جب کہ اُس کا باپ ستر برس کی عمر کا تھا اور ماں سترہ برس کی عمر کی تھی، اپنے باپ کے بستر پر پیدا ہوا۔ اُس کا سنہ فوتیدگی ۴۷۹ھ ق م بیان کیا جاتا ہے، اب سے ایک سو سال پہلے چین میں اُس کی اولاد گیارہ ہزار تھی۔ اس کا شہر پیدائش سارے کا سارا اُس کی اولاد سے آباد ہے اگرچہ اس کا صرف ایک ہی لڑکا ہوا تھا۔

جب کون فیوشی اس تین برس کا تھا، تو اس کا باپ مر گیا۔ جب ۱۹ سال کی عمر ہوئی تو اس نے شادی کر لی۔ چار سال کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دیا۔ اور اس کے بعد کوئی شادی نہیں کی۔ بہت چھوٹی عمر سے اس کو دُنیا کے طوفان میں پڑنا پڑا تاکہ اپنی والدہ کے لیئے قوت لایموت حاصل کرے۔ ۲۲ سال کی عمر میں اس نے پیشۂ مدرسی اختیار کر لیا، اور اپنے ہی گھر کو مدرسہ قرار دے کر بچوں کو وہاں پڑھاتا تھا اور کچھ فیس اُن سے لیتا تھا۔ اُس نے مصیبت اور غربت کے اس اسکول میں تعلیم حاصل کی، جس کے بغیر انسان انسان نہیں بنتا۔ اور غور و فکر کی قوت و اہلیت ہی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کی تعلیم سقراط کی طرح زبانی ہوا کرتی تھی۔ کچھ شاگرد اُس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ تو ایسے شاگرد ستر ہو گئے تھے۔ جس طرح ہندوستان میں ہندو گروؤں کے ساتھ اُن کے چیلے رہتے تھے Confucius شہرت اور عزت اور سرکاری ملازمت کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن صرف نیک بادشاہوں اور حکمرانوں

Marfat.com

کی ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ اُس نے اُن نوابوں کی ملازمت کرنے سے انکار کر دیا، جن کی حکومت اچھی نہ تھی۔ اس کا مقولہ تھا کہ ظالم حکومت ایک خونخوار چیتے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آخرکار اس کو موقعہ ملا اور اس کو شہر Chung-tu کا چیف مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ چینی روایات ناقل ہیں، کہ وہاں ایمانداری کا دور ہو گیا۔ اگر گلی میں سونا رکھا ہوا کوئی بھول جائے۔ تو وہیں پڑا رہتا تھا۔ کوئی اُسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ (Lu) کے حاکم نے اس کو ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ پبلک ورکس مقرر کر دیا۔ وہاں بھی اُس نے اصلاحات کیں۔ پھر ترقی ہو کر وزیر جرائم ہو گیا۔ اس کا نام سنتے ہی حکومت میں جرم معدوم ہو گیا۔ لوگوں میں وفاداری و ایمان داری آ گئی۔ اور عورتوں کی عصمت و فرماں برداری وایمانداری عام ہو گئی۔ دوسری حکومتوں سے آن کر لوگ یہاں آباد ہو گئے۔ اور کنفوشی اس لوگوں کا محبوب ہو گیا۔ یہ چاہتا تھا کہ حاکم لو (Lu) کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے جو بُری ہو۔ اس کا اصرار تھا کہ اچھی حکومت کا اصول ہی ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ حاکم خود اپنے عمل سے اچھی مثال لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

آخرکار اس نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا۔ اور اب یہ معہ اپنے شاگردوں کی جماعت کے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں پھرنے لگا۔ اس اُمید پر کہ شائد کسی صوبہ میں اُس کو حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ آخرکار ۶۹ برس کی عمر میں جب نواب یا ڈیوک گائی (Gae) شہر Lu کی حکومت پر قابض ہوا، تو اس نے کنفوشی اس کو اپنے شہر میں واپس بلا لیا۔ پانچ سال جو اس کی زندگی کے باقی رہ گئے تھے وہ اپنے وطن میں عزت سے گزرے۔ اکثر مدبران حکومت اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ بہتر یا تہتر سال کی عمر میں مر گیا۔

کنفوشی اس کا فلسفہ

اس کے چند بڑے عمدہ مقولے تھے:۔

(۱) ظالم حکومت چیتے سے زیادہ خطرناک ہے۔

(۲) اچھی حکومت کا ایک ہی گُر ہے۔ اور وُہ یہ کہ بادشاہ خود اپنے عمل سے رعایا کے لیئے اچھی مثالیں قائم کرے۔ یہ وُہ ہی عربی مقولہ الناس علےٰ دین ملوکھم دوسرے الفاظ میں ہے۔

(۳) وُہ کہتا تھا کہ میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا جو نیکی کا ایسا ہی عاشق ہو جیسا حُسن کا۔ غالباً اُس کا مطلب حُسن ظاہری سے ہو۔ ورنہ نیکی خود ایک حُسن ہے۔ نیکی کیا ہے؟ کسی شے کا اپنے موقعہ اور محل پر ہونا۔ بدی کیا ہے؟ کسی شے کا غیر موزوں موقعہ اور محل پر ہونا۔ سعدیؒ کا شعر اس کی تشریح کرتا ہے ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است ، کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اور پھر ظاہری حسن کا تو کوئی معیار نہیں۔ وُہ مستقل شے نہیں ہے۔ ایک شخص کا تصورِ حُسن دُوسرے کے تصورِ حسن سے مختلف ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ حُسن تو ایک شخصی معاملہ Subjective ہے۔

(۴) کنفوشس نے اخلاقیات اور عمل نیک پر بہت زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سارے کردار کی بنیاد خلوص پر ہے۔ بلند کردار آدمی کی نشانی خلوص ہے۔ وہ پہلے کام کر کے دکھاتا ہے۔ پھر بولتا ہے۔ لیکن جب بولتا ہے تو اپنے اعمال کے مطابق اور اُن کی نسبت سے بولتا ہے۔ تیر اندازی میں انسان اعلیٰ کے عمل کی مثال ملتی ہے۔ جب نشانہ خطا کرتا ہے تو تیر انداز یہ دیکھتا ہے کہ میں نے کیا غلطی کی۔ اسی طرح انسان اعلےٰ اپنی ناکامیابی کے اسباب اپنے اندر تلاش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے انسان ادنےٰ اپنی غلطی کے اسباب دوسروں میں دیکھتا ہے۔

(۵) انسان اعلےٰ کے کردار کی علامت اس کی حدوں سے اُبلتی ہوئی ہمدردی ہے۔ دوسرے لوگوں کی نیکیوں اور قابلیتوں سے اس کو غصہ (حسد) نہیں آتا بلکہ خود اُن سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وُہ اپنے سے کمتر انسان کو دیکھتا ہے، تو وُہ اپنے اُوپر نظر ڈالتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ جو بُرائیاں دوسروں میں نظر آتی ہیں، مجھ میں تو نہیں۔ کیونکہ بہت سے ایسے نقائص ہیں جو دُوسروں میں ہیں، اور ہم میں بھی ہیں۔ Confucius کے فلسفہ کا نچوڑ ان دو پیراگرافوں میں ہے۔

Marfat.com

قدما جب چاہتے تھے کہ ساری سلطنت میں نیکی پھیل جائے، تو سب سے پہلے اپنی ریاست کو درست کرتے تھے۔ ریاست کو درست کرنے سے پہلے اپنے خاندانوں کو درست کرتے تھے۔ خاندانوں کو درست کرنے سے پہلے وُہ خود اپنے تئیں درست کرتے تھے۔ اپنے تئیں درست کرنے سے پہلے وُہ اپنے دلوں کو درست کرتے تھے۔ اپنے دلوں کو درست کرنے کےلیے وہ پہلے اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرنے سے پہلے وُہ اپنا علم بڑھاتے تھے۔ اور اشیاء کے علم بڑھانے کے لئے اشیاء کی ماہیت کی تحقیقات میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جب اشیاء کی ماہیت معلوم ہو گئی، تو پھر علم مکمل ہو جاتا ہے۔ جب علم مکمل ہو جاتا ہے، تو ان کے خیالات میں بھی خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات کے بعد دل میں بھی خلوص آجاتا ہے۔ اور جب دل درست ہو جاتا ہے، تو خود وُہ درست ہو جاتے ہیں۔ جب وُہ درست ہو جاتے ہیں، تو اُن کا خاندان درست ہو جاتا ہے۔ جب اُن کے خاندان درست ہو جاتے ہیں، تو اُن کی ریاست درست ہو جاتی ہے۔ اور جب ریاستیں درست ہوئیں، تو ساری سلطنت درست ہو جاتی ہے۔

انسان اعلیٰ ان باتوں کا خیال رکھتا ہے

(۱) اُس کی آنکھیں صفائی سے دیکھیں۔

(۲) اُس کے چہرے سے نشان مہر و اُلفت نمایاں ہو۔

(۳) اُس کا رویّہ باعزّت ہو،

(۴) گفتگو میں خلوص ہو۔

(۵) معاملات میں ہوشیاری ہو،

(۶) جن امور میں شک ہو وُہ دوسروں سے سوال کرے۔

(۷) جب اُس کو غصّہ آئے، تو وُہ خیال کرے کہ اس غصّہ کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس کے لیئے کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

(۸) جب وُہ نفع حاصل کرنے کا خیال کرے تو سب سے پہلے حق و نیکی کا خیال کرے یعنی نفع اس طرح حاصل کیا جائے، کہ حق و نیکی کا پہلو قائم رہے۔

Marfat.com

کنفوشی اس کا فلسفہ زیادہ تر سیاسی امور سے تعلق رکھتا ہے۔
اس کی سیاست کا یہ بڑا جوہر ہے کہ حکومت کے اصول و طرز و مقصد کو عوام الناس کے خاندان کے افراد سے شروع کرتا ہے۔ چنانچہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت کے لیئے اطاعت اور اخلاقیات کی ضرورت ہے تو یہ خاندان سے شروع کرتا ہے اور اطاعت کو والدین کی اطاعت سے شروع کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ لڑکے کو اپنے باپ کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیئے۔ یہاں اسلام سے تقابل ضروری ہے، اور ہم اس کے موقع پر کریں گے۔
اس کا دوسرا اصول سیاست جو انگریزی کتابوں میں درج ہے اور وُہیں سے میں نقل کر رہا ہوں۔ کیونکہ چینی زبان پر مجھ کو عبور نہیں، یہ ہے کہ سیاسی حکومت کے اصل عطا کنندگان عوام الناس ہیں۔ کیونکہ کوئی گورنمنٹ جس کو عوام الناس کا اعتماد نہیں ہے، قائم نہیں رہ سکتی۔ غالباً اس کا مطلب وُہ ہی ہے جو دوسرے جملہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی حکومت بغیر عوام الناس کی حمایت کے قائم نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا حکمرانوں کو چاہیئے کہ عوام الناس کا اعتماد حاصل کریں۔ وہ محبّت کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ اور محبّت اُس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب حکام عوام الناس کی بہبودی کے کام کریں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن کنفوشی اس یہ نہیں کہہ سکتا کہ حکومت کے عطا کرنے والے عوام الناس ہیں۔ کیونکہ وہ کہہ چکا ہے کہ حکمران فلاسفران اور دانشمندان ہونے چاہئیں۔ لہٰذا عوام الناس ان کے انتخاب کرنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ جو علم یا ہُنر خود اُن میں نہیں ہے، وُہ دوسروں میں اُس علم یا ہُنر کے درجے کیونکر معلوم کر سکتے ہیں۔ اور بغیر درجے معلوم کیئے ہوئے انتخاب ناممکن ہے۔ یہ بہت اغلب ہے کہ کنفوشی اس کا وُہ ہی مطلب ہو جو ہم نے اُوپر لکھا ہے اور یہ انگریزی کا جملہ ان الفاظ میں ترجمہ کرنے والے کے دماغ کا نتیجہ ہو۔ انگریزی کا جملہ یہ ہے:۔

The people are the actual and proper source of political sovereignty, for any government that does not retain their confidence sooner or later falls

لفظ Retain ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے اور اصلی قیام حکومت کے بعد کی حالت یہ فلاسفر بیان کر رہا ہے۔ اور اسی ہی لفظ کے لحاظ سے Source

Marfat.com

کے معنی لینے چاہئیں۔ پہلے اور اصلی Source سے منشاء نہیں ہے۔ دوران حکومت کا ذکر ہے۔ گویا ہر لمحہ حکومت کو ایک Source کی ضرورت رہتی ہے جیسے ہم کہیں کہ انسان کی زندگی کا Source ہوا ہے تو مطلب لیا جائے گا کہ جس وقت بھی ہوا نہ ہوگی زندگی منقطع ہو جائے گی۔ اصل میں غالباً اسی طرح ہو لیکن مترجم نے مبہم اور ذو معنی بنا دیا۔

عمدہ حکومت کی شرائط میں سے اول درجہ خلوص کو دیتا ہے۔ اور خلوص عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ حکمران کا عمل نظیر پیش کرتا ہے۔ لہٰذا وہ نظیر عمل نیک ہو جو چھن چھن کر عوام الناس تک پہنچے۔ اور وہ بھی اپنا طرز عمل اس ہی نمونہ پر مرتب کریں۔

دوسری بات حکام ماتحت کا انتخاب ہے۔ یہ عقلمندی سے ہونا چاہیئے اور اُس کی بنیاد ایمانداری اور دیانت داری پر ہونی چاہیئے۔ یعنی صرف نیک اور دیانتدار آدمیوں کو عہدوں پر مقرر کرنا چاہیئے۔

جہاں تک ہو سکے بیرونی ممالک سے تعلقات نہ رکھیں۔ اور اپنی سلطنت کو غیروں کی اشیاء خوردنی و پوشیدنی اور ضروری کا محتاج نہ بنائیں۔

خوش خلقی اور حسن سلوک کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ہم آخر کار وہ ہی ہو جاتے ہیں۔ یعنی ویسا ہی بن جاتے ہیں، جیسی ہماری عادت خوش خلق اور حسن سلوک کرتے کرتے پیدا ہو جاتی ہے۔

موسیقی بھی حکمرانوں کے لیئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے سخاوت و مہربانی کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اسلام کا نظریہ اس کے خلاف ہے وہ ہم آئندہ چل کر بیان کریں گے۔

جہاں تک حسن عمل اور حسن سخن کا تعلق ہے، دنیائے قدیم میں کنفوشی اس کو بہت اعلٰے درجہ حاصل ہے۔ یونان کا کوئی فلاسفر خواہ افلاطون ہی کیوں نہ ہو، کنفوشی اس کے درجہ تک نہیں پہنچتا۔ یونانیوں نے جو کچھ سیکھا وہ کنفوشی اس ہی کے فلسفہ سے سیکھا ہے۔

Marfat.com

باب ششم

غیر اسلامی فلسفے:

(فلسفۂ یونان)

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کمتر گوئے ۔ ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

اہلِ یورپ کا خیال اب تک یہ رہا ہے، کہ دُنیا میں فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی ہے۔ لیکن اب وُہ خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا، کہ یونان نے اپنا فلسفہ ایشیاء سے لیا ہے۔ دراصل فلسفہ تو بنی نوع انسان کے ساتھ اُس کی ابتداء ہی سے رہا ہے۔ جب انسان سنّ شعور کو پہنچ جاتا ہے اور سوچنے کے قابل ہوتا ہے، تو اُس کا فلسفہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وُہ اُس کا فلسفہ اُس کے اپنے لیئے ہوتا ہے۔ بعض طاقتور دماغ ایسے ہوتے ہیں، کہ وہ اپنے سوا دوسروں کے لیئے بھی سوچتے ہیں۔ یا یُوں کہو کہ اپنے ماحول کے علاوہ ہر ممکن ماحول پر غور کر کے اپنی قوم یا اپنے ملک کے لیئے فلسفہ مرتب کر لیتے ہیں۔ اور پھر وہ ہی تمام دُنیا کے لیئے فلسفہ مقرر ہو جاتا ہے۔ ہمارا مطلب اس ہی قسم کے فلسفہ سے ہے۔

حضرت عیسٰےؑ سے قبل چھٹی اور پانچویں صدیاں ایسی گذری ہیں، کہ تقریباً اُس وقت کے ہر بڑے مُلک میں فلاسفران کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ اور سب بڑے بڑے فلاسفران جن کے نام اور واقعات اور تخیلات ہم تک پہنچے ہیں ان ہی صدیوں میں ہوئے۔ چین میں کنفوشی اس، ہندوستان میں اوپانیشد جو ۸۰۰ اور ۵۰۰ ق م کے درمیان مرتب ہوئے، یونان میں تالیس، ایران میں زرتشت۔ یہ سب تقریباً اُس ہی زمانہ میں یا اُس کے ارد گرد گذرے ہیں۔ لیکن فلسفہ اِس سے بہت پہلے سے تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ کہنا واقعہ کے خلاف نہ ہوگا، کہ انبیاء سابقہ کی تعلیم نے بنی نوع انسان کو غور و خوض کرنا سکھایا۔

ان کی تعلیم دجلہ اور فرات کی وادیوں سے شروع ہو کر تجارت کے قافلوں کے ساتھ ایک طرف تو سیریا اور کنعان ہوتی ہوئی مصر میں پہنچی۔ اور دوسری طرف ایران و ہندوستان ہوتی ہوئی چین تک پہنچی۔ وہ اس ہی تعلیم کا اثر ہے کہ باوجود ان حکماء کے محض دنیاوی فلسفہ ہونے کے ان کے فلسفے اخلاقیات کی صورت میں اس تعلیم سے متاثر ہوتے رہے۔ اور کبھی کبھی کسی نہ کسی تعلق سے خدا کا بھی ذکر آ ہی جاتا ہے۔ اس کو تفصیل سے ہم علیحدہ بیان کریں گے۔ مغربی تہذیب اس طرف بھی گئی ہے کہ انسان محض جانوروں اور کیڑوں کی طرح ایک جانور ہے اتفاق سے اس کا دماغ ایسا ہو گیا کہ ترقی کر سکتا تھا۔ جسم اس کا جانوروں کے جسم سے ارتقاء کے ذریعہ سے بنا ہے۔ مذہب کا تخیل رفتہ رفتہ دریاؤں اور درختوں کی خدائی سے ہٹ کر اب وحدانیت کی طرف پہنچا ہے۔ اسلام کا فلسفہ اس کے خلاف کہتا ہے۔ جس نے انسان کو فرشتوں سے سجدہ کرایا وہ کب مان سکتا تھا کہ انسان بھی ایک کیڑے کی طرح ہے۔ جس نے انسان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے اشیاء کے اسماء بتا دیئے تھے۔ اور مخلوق سے اپنے رب ہونے کا اقرار لے لیا تھا۔ اس کا اسلام کب مانے گا کہ یہ مذہب بذریعہ ارتقاء محض انسان کی کوشش سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اس کی بحث کے لیئے بھی ہم نے علیحدہ باب مقرر کر لیا ہے۔

اب یونان کے فلسفہ کا ذکر کرتے ہیں۔

دہریت کچھ ہی کہے، فلسفہ کچھ ہی خیال کرے عقل سلیم کو اس حقیقت کے تسلیم کیئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کائنات کا کوئی مدبر و منتظم صاحب عقل و حکمت ہے جس کے انتظام میں بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت بھی منجملہ دیگر امور کے شامل ہے۔ اور یہ نظام اپنے مقرر شدہ راستوں پر چل رہا ہے۔ انسان کے ماحول کی پیچیدگیاں اور دشواریاں اور اس کی عقل کی محدودیت اس امر کی مقتضی تھیں کہ وہ مدبر و منتظم اعلے اپنے مخصوص بندوں کو طرف سے علم دے کر انسان کی تعلیم و تربیت کے لیئے بھیجتا رہتا۔ چنانچہ انبیاء آتے رہے اور جاتے رہے۔ اس تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیئے ایسے اسباب بھی مقرر ہونے ضروری تھے کہ

جو بڑی بڑی جماعتوں کو آپس میں ملنے کے لیئے مجبور کریں - ان اسباب میں سے تجارت و نقل مکانی جو بڑے پیمانہ پر ہو، ضروری تھے - یہ امر بدیہات تاریخیہ میں سے ہے کہ انسان کی تہذیب و مجموعی ترقی کے اسباب میں سے تجارت اور تحریکاتِ نقل مکانی کو بڑا دخل ہے - دُنیا کے ہر ملک، ہر برِ اعظم کی تاریخ سے عیاں ہے، کہ دنیا میں نہایت بڑے پیمانہ پر بڑی بڑی جماعتوں اور اقوام کی ایسی حرکاتِ نقل مکانی ہوتی رہی ہیں جنہوں نے تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے - یہ ایسی عیاں بات ہے، کہ یہاں مثالیں بتا کر سمجھانے کی ضرورت نہیں - یہ تو اب تک جاری ہیں - اُنہوں نے دوسرا نام اختیار کر لیا ہے - اب اس کو تحریک نو آبادیات کہتے ہیں جس کو انگریزی میں Colonization کہا جاتا ہے - اس حرکت نقل مکانی یا Colonisation کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں - جن کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے - اس کے فوائد بھی بہت ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ دو یا کئی تہذیبوں کے ملنے سے ایک جدید اور بہتر تہذیب پیدا ہوتی ہے - نئی آنے والی قوم اپنے سابقہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر نئی جگہ ایک نئی زندگی شروع کرتی ہے -

ایسی ہی ایک بڑی حرکت یونان کے شمال سے شروع ہوئی جہاں Dorian قوم نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا - اور یہ یونانی وہاں سے آزادی کی تلاش میں غلامی سے بچ کر بھاگے، اور چاروں طرف پھیل گئے - اور اپنی ان نو آبادیات میں بس کر اُنہوں نے وُہ تہذیب پیدا کی جس کو Greek Civilisation کہتے ہیں اور جس نے نہایت قلیل عرصہ میں تمام دُنیا پر قبضہ کر لیا - ان میں سے ایک جماعت ایشیائی کوچک کے مغربی ساحل پر کنارے کنارے آباد ہو گئی - یونانیوں نے کبھی اپنی نسل کو خالص رکھنے کی کوشش نہیں کی - لہٰذا مقامی عورتوں سے دل کھول کر شادیاں کیں - اور مردوں کو غلام بنا لیا - جس غلامی سے خود بچ کر بھاگے تھے اُس ہی غلامی کا پھندا دوسروں کے گلے میں ڈالتے ہوئے اُنہیں کچھ جھجک نہ آئی - موجودہ مغربی تہذیب اس ہی سبق کو اپنے ہر طرزِ عمل میں دُہرا رہی ہے - اور اپنا نام تہذیب رکھتے ہوئے شرم نہیں آتی - اُن کو اولمپس کے خداؤں سے بھی دلچسپی نہیں رہی - کیونکہ جہاں وُہ گئے، اولمپس جیسے ہی خدا شہوت سے مست

اغوا، زنا، ڈاکہ اور چوری کے عادی اُن کو ملے۔ اور مقامی خدا مفید بھی ہو سکتے تھے۔ دُور کے خداؤں کو کیا پڑی تھی، کہ اُن کی حفاظت کرتے۔ لہٰذا اُنہوں نے ایشیائی کوچک کے مروّجہ خداؤں کو اپنا خدا بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ زمین بھی ایشیائی ہوا بھی ایشیائی، عورتیں بھی ایشیائی اور خدا بھی ایشیائی۔ عبادت کے رسم و رواج، اور معاشرت کے قواعد بھی ایشیائی۔ اُس وقت تک یونان کا کوئی فلسفہ تو اپنا تھا ہی نہیں۔ فلسفہ بھی وُہ ملا جو چین، ہندوستان، ایران سے تجارت کے قافلوں کے ساتھ لگا چلا آیا تھا۔ اب ان میں سوائے یونانی نام کے اور کیا رہ گیا تھا۔ لہٰذا جب ملطہ Miletus کے فلاسفران نے اپنی تعلیمِ فلسفہ شروع کی، تو وُہ بالکل ایشیائی تھے۔ اُن کی مادری زبان بھی مقامی تھی، اگرچہ یونانی زبان وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

تاریخِ فلسفہ میں یونان کے پہلے تین فلاسفران یعنی (۱) Thales تالیس، (۲) Anaximander انگزیمنڈر اور (۳) Anaximenes انگزیمینس اپنے وطن Ionia کی نسبت سے فلاسفرانِ آیونیا Ionia کہلاتے ہیں۔ اور ان کا فلسفہ اؤنین فلسفہ Ionian Philosophy کہلاتا ہے۔

آؤنین فلسفہ: وہاں نہ تو کوئی پہلی اور پورانی مذہبی کتاب تھی، اور نہ کوئی پادریوں کی حکومت۔ لہٰذا انسان کے قیاس کے لیئے کوئی حدود قیود نہ تھی۔ اور یہ فلسفہ بالکل دنیاوی فلسفہ ہو گیا جو اپنے تئیں قیودِ مذہب اور صنم پرستی سے آزاد سمجھتا تھا۔ یونانی فلسفہ کی یہ خاصیت آخر تک رہی۔ لیکن پھر بھی اُس کی تخییل انسانی کی سابقہ تاریخ اور روایات تھیں۔ ایشیائی کوچک کوئی نیا مُلک تو نہ تھا۔ مصری عقل اور مصری نظام پروہتی کی روایات یہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ یہاں، ایران اور برہمنی دانشمندان ہندوستان کے خیالات سے آگاہ تھے۔ کلدانیوں کی نجومیت کا بھی بہت اثر تھا۔ یونان کے صنفی تخیلات بھی یونان کے تاجروں کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ ان سب عناصر نے مل کر وُہ فلسفہ پیدا کیا، جس کو Ionian Philosophy کہتے ہیں۔ اور جس نے یونان کے فلسفہ کی ابتدا کی۔ کیا یہ کہنا عین مطابق واقعہ نہیں ہے کہ انبیاء جو اُس ہی زمانہ میں اور اُس ملک کے ہی

Marfat.com

نزدیک اپنی تعلیم کی مسلائے عام دے رہے تھے۔ اس فلسفہ پر اپنا پرتو اور اثر ڈال رہے تھے۔ اگرچہ یہ فلسفہ اُن کی رقابت اور مخالفت میں مرتب کیا گیا تھا لیکن پھر بھی بغیر ارادہ کے اس شئے کا اثر پڑ ہی جاتا ہے جس کی مخالفت کی جائے۔ مخالفت میں "اس لاگ" اس رقابت میں بھی ایک قسم کا لگاؤ نظر آ ہی جاتا ہے۔ غالب نے خوب کہا ہے کہ ؎

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ، جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

اس وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس محض دنیاوی فلسفہ میں بھی خدا کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں آ ہی جاتا ہے۔

یونانی فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے، کہ شروع ہی سے اس فلسفہ میں دو رنگوں کی لہریں نظر آتی ہیں۔ ایک تو نیچر پرستی، اور دوسرے توہم پرستی۔ جس نے مذہبی انداز حاصل کر لیا تھا۔ مقدم الذکر کے معلمین (۱) تالیس Thales (۲) انگزیمنڈر Anaximander (۳) زنوفینز Xenophanes (۴) پروطاغورس Protagoras (۵) ہپوکریقیطز Hippocrates (۶) ڈیمقراطیس Democritus سے (۷) اپی کیورس (Epicurus) اور (۸) لکریشی اس Lucretius تک تھے۔ موخر الذکر کے استاد (۱) فیثاغورث Pyhtagoras (۲) پارمینڈیز Parmenides (۳) ہریقلائیطس Heracleitus (۴) افلاطون Plato (۵) اور کلینتھیز Cleanthes (۶) پلوٹی نس Plotinus (۷) سینٹ پال St. Paul تھے۔ کبھی کبھی بڑے وسیع النظر فلاسفران مثلاً سقراط، ارسطو، اور مارکس آریلیس Marcus Aurelius نے ان دونوں شاخوں کو ملانا چاہا۔ لیکن ان میں بھی غالب خیال اور مقصد واحد صرف اپنی عقل کی پیروی تھی۔ نتیجہ نکلا کہ یونانی فلسفہ کی بنیاد اور اس کی آخری انتہاء محض عقل انسانی ہی ہے۔ جہاں تک عقل انسانی جا سکتی ہے، وہیں تک یہ فلسفہ گیا ہے۔ اور وہاں آن کر ٹھہر گیا ہے۔

یونانی فلسفہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ (۱) قبل سقراط، (۲) سوفسطائیوں سے ارسطو تک اور (۳) بعد سقراط۔ ان تینوں کا خاکہ ہم جدول کی صورت میں لکھتے ہیں۔ پھر اس کی مختصر تشریح کر دیں گے۔

Marfat.com

(١) فلسفہ قبل سُقراط

- آوُنی یا ملطہ کا فرقہ
  - تالیس
  - انکزامینڈر
  - انکرامینس
- فیثاغورث
- ایلیائی جماعت
  - زنوفانیز
  - پارمینڈیز
  - زینو
- ہیرافلیس
- امپڈوکلیز
- فلسفہ جوہر
- انکساغورث

(٢) سوفسطائیوں سے ارسطو تک

- سوفسطائی
- سقراط
- افلاطون
- ارسطو

(٣) ارسطو کے بعد

- رواقی
- حکماء لذیتہ
- حکماء لاادریت
- افلاطونیت جدید

آوُنی یا ملطہ کا فرقہ Ionics - اب ہم آوُنی فرقہ سے شروع کرتے ہیں پہلے ملطہ کا بیان ضروری ہے :-

ملطیہ Miletus تقریباً ۱۰۰۰ ق م میں یونان کے صوبہ Attica سے یونانیوں کا ایک قبیلہ جس کو Ionians کہتے تھے، ایشیائی کوچک کے مغربی ساحل کے اُس خطہ میں آباد ہوگیا جس کو اُن کی نسبت سے Ionia کہنے لگے اس میں بارہ بڑے شہر تھے۔ جن کا سب سے جنوبی شہر ملطہ Miletus تھا۔ وہاں اس زمانہ میں وُہ ہی تہذیب تھی جو اُس کے نزدیک کے جزائر میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ عورتیں نہیں لائے۔ اُنہوں نے عورتوں کے حصول کا یہ آسان انتظام کیا، کہ وہاں کے سب مردوں کو قتل کر دیا۔ اور اُن کی بیوگان سے شادی کرلی۔ اُس زمانہ میں یہاں ہر ایک شہر کی حکومت علیحدہ ہوا کرتی تھی ملطہ کی پہلی حکومت تو بادشاہی تھی جو لڑائی میں فوج کے جنرل اور کمانڈر ہوا کرتے تھے۔ پھر اُمراء کی حکومت ہوگئی۔ جو زمین کے مالکان تھے۔ اس کے بعد

ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی ۔ جو متوسط طبقہ کے ہاتھ میں تھی ۔ چھٹی صدی قبل عیسیٰ کے شروع میں یہاں ایک ڈکٹیٹر (Thrasybulus) حکمران تھا ۔ اس زمانہ میں یہ شہر ترقی کے عروج پر تھا ۔ دولت کی فراوانی نے علم ادب فلسفہ اور ہنر کو ترقی دی ۔ شہر میں کپڑا بُننے کی بہت سی ملز تھیں ۔ اندرونِ شہر سے اُون آتا تھا ۔ اور یہاں آن کر اُس کا کپڑا بُنا جاتا تھا ۔ یہاں کے سوداگروں نے مصر ، اٹلی اور بحرِ اسود میں اپنی کالونیاں قائم کر رکھی تھیں ۔ صرف ملطہ کی ایسی ۸۰ کالونیاں تھیں ۔ تمام یونان میں ملطہ کی دولت اور عیش و عشرت ضرب المثل تھی ۔

ملطہ کی یہ حالت تھی کہ اُس وقت یہاں سائنس اور فلسفہ کی ابتدا ہوئی ۔ تجارت کا دارالمقام ہونے کی وجہ سے تمام دُنیا کے خیالات ، معتقدات اور رسوم و رواج یہاں آن کر ملتے تھے ۔ خود اہلِ ملطہ دُنیا کے دُور دُور مقامات میں جاتے تھے اور مصر ، بابل ، فینیقیا کی تہذیبوں کے زیرِ اثر تھے ۔ کیا اندریں صورت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم سے واقف تھے ۔ اور کچھ نہ کچھ اُس سے اُن کے فلسفہ پر اثر بھی پڑا ہوا تھا ۔ یہ تو چھٹی صدی عیسوی کی بات ہے ۔ انبیاء علیہم السّلام تو عرصہ سے اپنی تعلیم دُنیا میں پھیلا رہے تھے ۔ مصر ، کنعان ، بابل وغیرہ سب جگہ اُن کی تعلیم اور اُن کے خیالات پھیل چکے تھے ۔ بابل میں بنو اسرائیل بہت عرصہ تک رہے ۔ اُس حالت کو بائیبل میں Babylonian Captivity کہا گیا ہے ۔ ہندوستان و ایران تک کے خیالات تو ملطہ میں پہنچ جائیں ، تو کیا وُہ تعلیم ان کے دائرۂ علم سے باہر رہی ہو گی ؟ یہ جو ہم اُوپر یونانی فلسفہ کی دو شاخوں کا ذکر کر چکے ہیں ۔ جن میں سے ایک مذہبی تھی ، وُہ ان انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم کی مسخ شدہ صورت ہو گی ۔

ثالیس (Thales)

ثالیس تقریباً ۶۴۰ ق م میں غالباً بمقام ملطہ پیدا ہوُا ۔ اور ۵۵۰ ق م میں مر گیا ۔ اس کے والدین فنیقیا کے باشندے تھے ۔ اور اس کی تعلیم زیادہ تر

مصر اور مشرق قریب کی تھی۔ یہ خود تجارت میں مشغول تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اپنے علم نجوم کے ذریعہ سے اُس نے معلوم کر لیا کہ اس سال بہت زیتون ہوگا۔ لہٰذا اس نے تمام تیل کے کارخانے کم کرایہ پر لے لیئے۔ اور جب تیل کا موسم ہوا تو زیادہ کرایہ پر وُہ ہی کارخانے لوگوں کو دے دیئے۔ شہر کی سیاست میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اس کے زمانہ میں شہر کا حاکم Thrasybulus تھا۔ اُس کو اس نے صلاح دی کہ تمام آؤنیا کی ریاستوں کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے تاکہ Lydia اور ایران سے حفاظت کر سکیں۔ مصر سے علم جیومیٹری اور بابل سے علم ہیئت سیکھا۔ اور یونان میں رائج کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ مصر میں تھا تو اہرام مصری کی اونچائی اس نے اس طرح معلوم کی کہ جب انسان کا سایہ زمین پر انسان کے قد کے برابر ہوتا تھا تب ہی وُہ اہرام کا سایہ جو زمین پر پڑتا تھا ناپ لیتا تھا۔ اس طرح اُن کی اونچائی معلوم کر لی۔ آؤنیا میں آن کر جیومیٹری کے بہت سے مسائل کو رائج کیا۔ جن کو بعد میں اقلیدس نے جمع کر لیا۔ اس زمانہ میں سورج گرہن کی پیشین گوئی اُس کے وقوع سے پہلے کر لینا بڑی تعجب کی بات تھی۔ تمام آؤنیا میں اس کی دھوم مچ گئی جب اُس نے پہلے ہی سے ۲۸ مئی ۵۸۵ ق م کے سورج گرہن کی پیشین گوئی کر دی۔

ثالیس کا فلسفہ:- اُس زمانہ میں تخلیق عالم کا مسئلہ زیر تحقیقات تھا کہ یہ تمام کائنات کس طرح بنی۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کی یہ تعلیم کہ تمام کائنات کا بنانے والا خدا قادر مطلق ہے۔ ان فلاسفروں کی عقل سے باہر تھی۔ کیونکہ یہ خدا کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا ان کو تلاش ہوئی کہ سب سے پہلے کائنات کی کیا صورت تھی۔ اُس کو ہی یہ حقیقتِ اول کہتے تھے۔ ثالیس نے کہا کہ حقیقت اول پانی ہے۔ اُس کے نزدیک دُنیا ایک نصف دائرہ کی شکل میں ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑے پہنائے آب پر قائم ہے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب سے پہلے پانی ہی تھا اور آخر میں آن کر بھی سب کچھ پانی ہو جائے گا۔ اور سوائے پانی کے کچھ نہ ہوگا۔ کیا یہ اثر یونان کے اس اعتقاد کا تو نہیں ہے کہ زمین کے گرداگرد، نیچے، اُوپر پانی ہے اور اس پانی کا خدا Oceanus ہے۔ جو سب خداؤں کا باپ ہے۔ لہٰذا پانی حقیقتِ اول

Marfat.com

ہوگیا۔ تالیس کا خیال ہے کہ دُنیا کے ہر ذرّہ میں زندگی ہے۔ مادہ اور زندگی ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں، کہ علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اور یہ ایک غیر فانی روح نباتات میں، معدنیات میں، حیوانات میں اور انسانوں میں ہے۔ یہ روح اپنی شکلیں بدلتی رہتی ہے، لیکن فانی نہیں ہے۔ کبھی اس کو فنا نہیں ہے۔ وُہ اکثر کہتا رہتا تھا، کہ زندہ اور مُردہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ زندگی اور موت ایک ہی شے ہے۔ کیا اس میں انبیار کی تعلیم کا بگڑا ہوا نتیجہ ہے۔ اسلام میں روح بہت حد تک غیر فانی ہے۔ لیکن قیامت کے دن سب ارواح یہاں تک کہ ملائکہ بھی مر جائیں گے۔ چونکہ تالیس نے قیامت پر اعتقاد رکھنا مناسب نہ سمجھا، لہٰذا اس حصّہ تعلیم کو نکال دیا۔ اسلام میں ہے:۔ یسبح للہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض ان من شیئ الا یسبح بحمدہ۔ اپنی سمجھ کے مطابق تالیس نے کہہ دیا کہ ان سب میں روح ہے۔ روح کا شکلیں یعنی ابدان بدلنا۔ کیا یہ تناسخ کا مسئلہ دُوسرے الفاظ میں نہیں ہے۔ لیکن اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وُہ تاکید سے کہتا ہے کہ رُوحیں اپنے ہی ابدانِ سابقہ میں قیامت کے روز جائیں گی۔

چند سوالات اور اس کے جوابات نہایت دلچسپ ہیں:۔

سوال: دُنیا میں سب سے زیادہ مشکل کیا ہے؟ جواب:۔ اپنا جاننا۔

سوال:۔ سب سے آسان کیا ہے؟ جواب:۔ دُوسروں کو نصیحت کرنا۔

سوال:۔ خدا کیا ہے؟ جواب:۔ وُہ جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔

سوال:۔ انسان کس طرح نیکی اور عدل کی زندگی بسر کر سکتے ہیں؟

جواب:۔ وُہ ہم خود بھی نہ کریں جو دوسروں میں معیوب سمجھتے ہیں۔

یہ جوابات نہایت عمدہ ہیں اور اسلام سے بہت نزدیک۔ ایسے ہی خیالات اور ارشادات کی وجہ سے یونان نے تالیس کو دنیا کے سات حکما اور دانشمندوں میں سے ایک حکیم اور ان سب سے بڑا دانش مند شمار کیا ہے۔ ہم کو اُس کی دانشمندی کا اعتراف ہے۔ لیکن حکیم اسلام حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے خیالات اور ارشادات اگر دُنیا کو معلوم ہو جائیں، تو وُہ ان ساتوں دانشمندوں کو بھول جائے۔ آپ کے نہج البلاغہ کے ارشادات خصوصاً آخری حصّہ میں جو آپ کے مقولے درج ہیں وُہ

Marfat.com

دُنیاوی دانشمندی اور مذہبی معرفت کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہیں۔ دُنیا اور عقبےٰ کا یہ اتحاد دُنیا کا کوئی فلاسفر پیش نہیں کر سکا۔ دنیاوی دانشمندی کو اپنی عقل کے مطابق اُنہوں نے بہت دُور تک پہنچایا۔ لیکن اس عقل کی انتہا اور ٹھہر جانے کے مقام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جب وُہ آگے بڑھے تو اُنہوں نے اپنی عقل کو انگریزی کے اس مقولہ کے مطابق کہ Extremes meet حماقت میں تبدیل کر دیا۔ برخلاف اس کے جناب امیر علیہ السلام کی دانشمندی آخر تک دانشمندی رہی۔ کیونکہ جب وُہ عقل انسانی کی انتہا تک پہنچ گئے، تو فوراً عقل الٰہیہ سے مدد لینی شروع کر دی۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تالیس نے اتھنز میں آن کر تعلیم کا دائرہ وسیع کیا اور لوگوں میں اپنے فلسفہ کی اشاعت کی۔ اور وہیں اس کے بعد کے دونوں ملطی فلاسفران رہے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

انگزیمینڈر Anaximander

پیدائش ۶۱۱ قم ، فوتیدگی ۵۴۹ قم

یہ تالیس کا شاگرد تھا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ اس کا فلسفہ ہربرٹ سپنسر Herbert Spencer سے ملتا ہے۔ انگزیمنڈر کہتا ہے کہ سب سے پہلے ایک غیر محدود عظیم الشان اجتماع مادہ تھا۔ جس کی کوئی خاصیت نہ تھی۔ لیکن خود بخود اپنی اندر کی طاقتوں کے ذریعہ سے اُس نے کائنات کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ یہ حرکت اور جان رکھنے والا قدیمی اجتماع مادہ ہی خدا ہے۔ اس بغیر خاصیت کے مادہ سے مختلف دُنیا میں کائنات کی پیدا ہوئیں۔ اور یہ سب کائنات کی شکلیں بڑھتی ہیں، مرتی ہیں۔ اور پھر اُس ہی اپنی اوّل شکل میں رجوع ہو جاتی ہیں۔ اس ہیولیٰ میں ان تمام اختلافات کی شکلیں موجود تھیں جو بعد میں اس طرح نمایاں ہو گئیں مثلاً گرم، سرد، تر اور خشک، سیال اور منجمد وغیرہ۔

زمین کی نسبت اس کا خیال تھا کہ یہ اسطوانی شکل Cylindrical کی کائنات کے مرکز میں لٹکی ہوئی ہے۔ اور اپنی جگہ میں ہر طرف سے مساوی فاصلہ ہونے کی وجہ سے قائم ہے۔ آفتاب، ماہتاب اور باقی سیارے اور ستارے

Marfat.com

زمین کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اس کے خیال میں ابتداء میں زمین محض پانی تھی۔ باہر کی گرمی نے اُس کے کچھ حصّے کو سُکھا کر زمین بنا دیا۔ کچھ پانی کا حصہ بھاپ بن کر بادل میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی طرح جو گرمی کا اختلاف پیدا ہوا اُس سے ہوائیں حرکت میں آئیں۔ زمین پر جو جاندار نظر آتے ہیں وُہ سب ابتداء میں مچھلیاں تھیں اور جب زمین خشک ہوئی، تو اُنہوں نے موجودہ شکلیں اختیار کر لیں۔ انسان بھی پہلے پہلے مچھلی ہی تھا۔ (آج کل کے سائنس کی بھی تحقیق یہ ہی ہے) کیونکہ موجودہ صورت میں ہی وُہ ابتداء میں ہوتا، تو وُہ اپنا رزق بھی حاصل نہ کر سکتا اور یوں ہی ختم ہو جاتا۔

انکسیمینیس Anaximenes

پیدائش ۵۸۸ قم، فوتیدگی ۵۲۴ قم

یہ کہتا ہے کہ سب چیزیں یعنی ساری کائنات ہوا سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہوا میں حرکت ذاتی ہے۔ اور وُہ ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ اور اسی حرکت ہی کی وجہ سے ساری کائنات پیدا ہو گئی۔ گرمی سے ہوا لطیف ہو کر اُوپر اُٹھی۔ اور آگ بن گئی۔ ستارے وُہ ہی آگ ہیں۔ سردی سے یہ ہی ہوا کثیف و منجمد ہو کر پہلے پانی بنی، پھر مٹی، پھر چٹان۔ زمانہ گزرتے گزرتے پھر یہ سب چیزیں ہوا بن جائیں گی۔

ان تینوں حکماء نے مادہ کو قدیم تصوّر کیا ہے۔ اور اسی مادہ نے کسی نہ کسی طرح یہ صورتیں اختیار کر لیں۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مادہ ہوا ہو، یا پانی، یا آگ، کس طرح وجود میں آیا۔ کس نے ان کو پیدا کیا اور ان میں یہ خاصیتیں کیونکر آ گئیں۔

فیثاغورث اور اس کے مقلدین

یونانی میں اس کو Pyhtagoras کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں پیشنگوئی کرنے والا۔

Marfat.com

پیدائش سنہ ۵۸۰ ق م ۔ اور سنہ ۵۷۰ ق م کے درمیان بمقام ساموس Samos درمیانی عمر میں بمقام Crotona جنوبی اطالیہ میں رہائش اختیار کرلی ۔ جب ۵۰ سال کی عمر ہوئی ، تو دانشمندی کی تلاش میں دنیا کا سفر اختیار کیا ۔ عرب ، شام ، فینقیا ، کلدیہ ، ہند اور فرانس تک گیا ۔ جب واپس Samos پہنچا ، تو وہاں کے حکمران سے اختلاف ہونے کی وجہ سے Crotona میں آن کر مستقل رہائش اختیار کی ۔ اور وہاں اپنا فلسفہ کا سکول کھول دیا ۔ جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو تعلیم کی اجازت تھی ۔ دُنیا میں یہ پہلا سکول تھا جہاں اس طرح آگ پانی کا ساتھ ہوا ۔ لیکن آج کل کے لڑکے اور لڑکیوں کے یکجائی مدرسہ میں اور اُس میں یہ فرق تھا ، کہ لڑکیاں لڑکوں سے بالکل علیحدہ رکھی جاتی تھیں ، اور اُن کو زیادہ تر خانگی امور کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ اس فیثاغورثی جماعت کے لیئے قاعدے بہت سخت تھے ۔ گوشت ، انڈا اور لوبیئے کے زیج ممنوع تھے ۔ ہر ایک جانور کے مارنے کی ممانعت تھی ۔ کسی شخص کو تکلیف پہنچانی ، اور ہرے درخت کو کاٹنا بھی ممنوع تھا ۔ ہنسنا بھی ممنوع تھا ۔ دن کے اختتام پر ہر ایک طالب علم اپنے دل میں سوچتا تھا ، کہ دن بھر میں اُس نے کیا کیا جو اُسے نہ کرنا چاہیئے تھا ۔ شراب کی ممانعت نہ تھی ۔ لیکن مشورہ یہ تھا ، کہ شراب کی بجائے پانی پینا چاہیئے ۔ اس سکول میں داخل ہونے کے بعد اُمیدوار کو پانچ سال تک خاموشی اختیار کرنی پڑتی تھی ۔ اپنے جسم کو پاک و صاف رکھنا ہوتا تھا ۔ اپنے اُوپر قابو رکھنا ، اور ہر ایک زیادتی سے پرہیز کرنا ضروری تھا ۔ دل و دماغ کی صفائی کا ذریعہ سائنس کی تعلیم کو قرار دیا گیا تھا ۔ مدرسہ میں ریاضی کو سب پر فوقیت تھی ۔ جب فیثاغورث نے جیومیٹری کی شکلیں حل کیں ، تو اس خوشی میں اپنے خداؤں کے سامنے یک صد جانوروں کی قربانی کی ۔ وُہ شکلیں یہ تھیں :۔ مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتا ہے یعنی ۱۸۰ درجہ ہوتا ہے ۔ اور مثلث زاویہ قائمہ کے وتر کا مُربع اُس کے باقی دونوں اضلاع کے مربعوں کے مجموعہ کے برابر ہوتا ہے ۔

فیثاغورث موجودہ علم ہیئت کا موجد ہے ۔ وُہ پہلا شخص ہے جس نے زمین کو گول بتایا ۔ دیگر تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں ۔

Marfat.com

فیثا غورث کا فلسفہ

تالیس اور ملطہ کے دیگر فلاسفروں نے حقیقت کو مادہ میں تلاش کیا تھا۔ لیکن فیثا غورث کہتا ہے۔ کہ حقیقت اوّل تعداد **number** ہے اُس کا خیال تھا، کہ تعداد اور اُس کا تناسب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ہر ایک چیز کی بنیاد اُس کے حصّوں کے آپس کی تعداد و تناسب پر ہے۔

دُنیا صرف تعداد پر قائم ہے، اور اسی سے بنائی گئی ہے۔ تمام نمبر ایک سے شروع ہوتے ہیں۔ لہٰذا اکائی یا وحدانیت ہی تمام عالم کی رُوح ہے۔ نمبر کی تقسیم طاق و جفت میں ہوتی ہے۔ دُنیا اور یہ سب عالم مختلف جوڑوں کا مجموعہ ہیں۔ اور ان کی خاص صفت یہ ہے کہ یہ یا تو جفت سے مرکب ہیں، یا طاق سے۔ جفت کو اُنہوں نے غیر محدود سمجھا ہے۔ کیونکہ وُہ ہمیشہ دو سے تقسیم ہو سکتا ہے۔ اور اُس کی انتہا نہیں ہے۔ طاق کسی سے تقسیم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وُہ محدود ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عالم دو ہی ہیں۔ یا جفت، یا طاق۔ ان پر ہی عالم کا قیام ہے۔ اِس جماعت نے اس طرح متضاد امور یا عناصر مقرر کیے۔ جن سے تمام عالم مرکب ہے:۔

(۱) محدود و غیر محدود (۲) طاق و جفت (۳) ایک اور ایک سے زائد (۴) راست و چپ (۵) مذکر و مؤنث (۶) سکون و حرکت (۷) مستقیم و منحنی (۸) نور و ظلمت (۹) خیر و شر (۱۰) مربع و مستطیل۔

اُنہوں نے ان نمبروں کے صفات و خواص و اثرات بھی بیان کیں۔ ہر ایک نمبر کو ایک خاص صفت کے ساتھ منسوب کر دیا۔ مثلاً ۱ نقطہ ہے، ۲ خط ہے، ۳ سطح ہے، ۴ منجمد شے ہے، ۵ جسمانی طاقت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور حروف کو بھی نمبروں کی طرف منسوب کیا۔ اس سلسلہ میں حروفِ ابجد کے خواص و تعداد پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان کا خیال تھا، کہ تمام کائنات جس میں سورج بھی شامل ہے، ایک ہی آتشی مرکز کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں۔ ہم کو یہ آتشی مرکز نظر نہیں آتا۔ کیونکہ زمین کا رُخ جس پر

Marfat.com

آبادی ہے، اس مرکز نار کی طرف نہیں ہے۔

رُوح کے تین حصے ہیں:۔ (۱) احساس، (۲) وجدان یا ادراک بلا واسطۂ احساسِ ظاہریہ، اور (۳) عقل یا نفسِ ناطقہ۔ احساس کا مقام دل ہے اور باقی دو حصوں کا مقام دماغ ہے۔

فیثاغورث تناسخ ارواح کا بڑا سختی سے قائل تھا۔ اس کا خیال تھا، کہ مرنے کے بعد تو فوراً انسان کی روح مقام موتی یعنی HADES میں چلی جاتی ہے۔ اور پھر کچھ تصفیہ کے بعد زمین پر آن کر ایک جدید جسم میں چلی جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اسیطرح قائم رہتا ہے، جب تک مکمل نیک زندگی سے اس کو ختم نہ کیا جائے۔ اپنے پہلے جنم کی باتیں بھی بتایا کرتا تھا کہتا تھا، کہ ایک سابقہ جنم میں وہ رنڈی تھا۔ ایک اور جنم میں وہ جنگ ٹرائے کا بہادر Euphorbus تھا۔ اور اپنے وہاں کے کارنامے اب تک اُسے یاد ہیں۔ اور ایک مندر میں جو اسلحہ رکھے ہوئے تھے، اُس نے شناخت کیا، کہ یہی اسلحہ اُس زمانہ میں اُس کے زیرِ استعمال تھے۔ ایک دفعہ ایک کُتے کو جو چلاتے ہوئے سُنا تو وہ دوڑ کر اُس کے بچانے کے لیئے گیا، اور کہا کہ اس کی آواز کو میں شناخت کرتا ہوں۔ یہ میرے ایک دوست کی آواز ہے۔ جو مرچکا ہے۔ شاعر تو ایسے وہمی خیالات کے شکار ہوا ہی کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ مرض حکما، تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ پُرانے زمانہ کے تبادلۂ خیالات کا اندازہ جس نے چھٹی صدی ق م کی تمام دُنیا یعنی یونان، افریقہ، اور ایشیا کو ایک کیا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تناسخ کا عقیدہ ایک ہی وقت میں ہندوستان، یونان اور جنوبی اٹلی میں عام تھا۔ یونان میں جو Orphic مذہب تھا، اس کی بنیاد اس ہی عقیدہ پر تھی۔ تو کیا انبیاء علیہم السلام کی تعلیم جو اس سے بھی بہت پہلے سے رائج تھی اور جس کے اثر کو موجودہ یورپ صرف عیسائیت تک محدود کرتی ہے، دُنیائے ماضیہ کے سارے فلسفہ پر اثرانداز نہ تھی؟ ضرور تھی۔

ہندو تناسخ نے افلاطون کے فلسفہ پر کافی اثر ڈالا تھا۔ فیثاغورث کے

فلسفہ کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد محض اس سلسلہ پیدائش سے نجات پانا تھا۔ یہ نیکی ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا تھا۔ نیکی کیا ہے؟ جو انسان کی رُوح اور خدا کے ساتھ ہم آہنگی رکھے۔ بسا اوقات یہ اتحاد، یہ ہم آہنگی عقل فراست سے حاصل ہوتی ہے۔ فیثاغورث نے موسیقی کو ایک بہت بڑا ذریعہ مانا ہے۔ یعنی وُہ نیکی کی تعریف میں آتا ہے۔ موسیقی بھی اس بحث کے حساب سے نیکی ہوئی۔ نتیجہ نکلا، کہ ان کی رائے کے مطابق انسان گا بجا لے تو بس نیک ہو گیا۔ آج کل اسلامی ممالک میں بھی موسیقی کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یورپ میں تو موسیقی تمام نیکیوں کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ مغربی تہذیب کا اثر ہے۔ فلسفۂ اسلام میں موسیقی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون سا فلسفہ درست ہے۔ مسلمان کو تو قطعاً اس میں کچھ شک و شبہہ ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ جس کو اسلام نے اُس کے لیئے ممنوع قرار دیا، وُہ ممنوع ہے۔ صرف دہریوں اور متشککین کے لیئے ہم کچھ لکھتے ہیں، موسیقی کے ضرر رساں پہلو یہ ہیں:۔

(۱) یہ لہو و لعب میں شامل ہے، اور لہو و لعب تضیعِ اوقات ہے۔ انسان کی زندگی اتنی کم ہے۔ اور اُسے دُنیا میں اتنا کرنا ہوتا ہے کہ اس طرح وقت کو ضائع کرنا نقصان دِہ ہے۔ موسیقی کے سیکھنے میں، اور اس کو ہُنر کے درجہ تک پہنچانے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔

(۲) اس سے انسان کی صحت پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔

(۳) موسیقی سے انسان کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ ہیجان اتنا تیز ہوتا ہے کہ وُہ انسان کی عقل و غور و فکر کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی اکثریت کی طبیعت بدی کی طرف مائل ہوتی ہے، اور بدی کی طرف جانا اُس کے لیئے آسان ہوتا ہے۔ لہذا جس طرح سیلاب والے دریا کا رُخ نشیب کی طرف تیزی سے ہو جاتا ہے، اسی طرح اس ہیجان جذبات کا رُخ بدی کی طرف ہو جاتا ہے۔ انسان کی فطرت بدی کی طرف اسی طرح مائل

Marfat.com

ہے، جس طرح پانی کی فطرت نشیب کی طرف۔

(۴) ممکن ہے کہ قوالی کے "حال" کا حوالہ دیا جائے۔ بسا اوقات تو یہ حال بناوٹی ہوتے ہیں۔ اور اُن کے بناوٹی ہونے کے بہت سے قصّے مشہور ہیں دوم یہ کہ یہ حال بھی اُن شعروں پر آتے ہیں یا بُلائے جاتے ہیں جن میں عاشقی و معشوقی کی چاشنی ہو۔ خداوند تعالیٰ کو زلفیں اور حسین چہرہ اور نازک ادائیں دے کر اُس سے محبت کی جاتی ہے۔ خدا کے لیئے زلف و حسن و ادا کی کیا ضرورت ہے۔ چونکہ قرآن شریف میں تاکید ہے کہ خدا سے محبت کرو، تو یہ لوگ محبت نہیں کر سکتے جب تک زلف و حسن کا ذریعہ نہ اختیار کریں۔ اور معلوم نہیں دل میں تو کس کے حسین چہرہ اور کالی کالی زلف پریشان کا خیال ہوتا ہے۔ ایسے شعر سُن کر اُچھلنے کُودنے لگتے ہیں۔ یہ ہوئی خدا کی پرستش اور رسولؐ کی منقبت۔ یا تو یہ لوگ سمجھتے نہیں، یا سمجھنے سے عمداً پہلو تہی کرتے ہیں۔ کہ محبت کا جزوِ اعظم اطاعت ہے، اور خدا و رسولؐ سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے احکام کی اطاعت ہر حال میں اور دلی خوشی اور آمادگی کے ساتھ کی جائے۔ دماغ کو اُچھلنے کودنے کی طرف زبردستی مائل کر کے اُچھلنا کُودنا یہ محبت کا مظاہرہ نہیں ہے، بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے دماغ پر سے عقل کی حکومت اُٹھ گئی ہے، اور وہ ہیجان جذبات کے زیرِ اثر آگئے ہیں۔ قوّالی کے حال ہمارے دعوے کی دلیل ہیں، نہ کہ اُس کے مخالف۔

فیثاغورث کی سیاست وُہ ہی تھی جس کو بعد میں افلاطون نے اختیار کیا تھا۔ اس کی جماعت امراء کی اشتمالی حکومت کا نمونہ تیار کرتی تھی۔ عورت اور مرد کا ساتھ ساتھ تعلیم پانا، اپنے سارے مال و متاع کو جماعت کے تصرّف میں دے دینا، اور ایک ہی طرح کے اخلاقیات پیدا کرنا اور پھر اپنے افراد کو حکومت کے لیے پیش کرنا، یہ اُس کی خصوصیات تھیں۔ اُس کے شاگرد اس جوش و خروش کے ساتھ اُمراء کی پارٹی کا ساتھ دیتے تھے کہ کروتونا Crotona کی جمہوری حکومت اُن کے خلاف ہو گئی۔ اُن کے گھر کو جلا دیا جس سے بہت فیثاغورثی جل گئے اور

آخر کار جلا وطن کر دیئے گئے۔ فیثا غورث کو بھی قتل کر دیا گیا۔ دوسری روایت یہ ہے۔ کہ وہ ایک اور شہر میں بھاگ گیا، اور وہاں Hunger Strike بھوک ہڑتال کرکے مرگیا۔

ایلیاتی حکماء the Eleatics

ان کو ایلیاتی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کا مکتب فلسفہ جنوبی اٹلی کے شہر .Elea میں واقع تھا۔ اس فلسفہ کا بانی زنوفینیز (Xenophanes) تھا۔ اس کا نقطۂ خیال زیادہ تر مذہبی تھا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس فلسفہ کا اصلی بانی Parmenides تھا۔ زنوفینیز ۵۷۰ ق م میں بمقام کولوفن (Colophen) جو ساحل ایشیائی کوچک پر واقع ہے، پیدا ہوا تھا۔ ۵۱۵ ق م کے قریب Elea میں آیا، اور وہاں اپنا فلسفہ کا سکول جاری کیا۔ سب سے پہلا یہ شخص ہے جس نے فلسفہ اور مذہب کا تنازعہ شروع کیا۔

اس نے یونانی عوام الناس کے مذہب کو بہت برا بھلا کہا۔ اُس نے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے خداؤں کو اپنی شکل پر تصور کرکے اپنے سارے عیوب اُن کے حوالہ کر دیئے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کئی خدا نہیں ہو سکتے۔ یہ نہایت نامعقول اعتقاد ہے کہ خدا ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے ہیں، اور آپس میں لڑائیاں لڑتے ہیں۔ جیسا کہ یونانی مذہبی قصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی طرف دھوکہ بازی، زنا، چوری اور مکاری جیسے جرائم کی نسبت دینا احمقانہ تخئیل ہے۔ خداؤں کی ایک ابتداء ماننا، اور ان کا پیدا ہونا فضول اعتقاد ہے۔ ان اعتقادات کا ذمہ دار ہومر (Homer) اور ہیسی اوڈ (Hesiod) شاعروں کو ٹھہراتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا در اصل ایک ہے جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا ہے۔ اور یہ خدا کسی صفت میں بھی انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کا کوئی جسم نہیں اس کی ساری ذات دیکھتی ہے۔ ساری ذات سنتی ہے۔ بغیر کسی تکلف کے وہ تمام عالم پر حکومت کرتا ہے۔ اور اس کا نظام قائم رکھتا ہے۔ اس کو ان امور میں کوئی زحمت نہیں ہوتی کہ خدا تغیر و تبدل سے بالا تر ہے۔ اس میں

Marfat.com

تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ جذبات و احساسات سے بری ہے۔ (۳۸) دیکھئے یہ فلسفہ اسلام سے کتنا نزدیک ہے۔ کیا اب بھی کوئی شبہہ باقی رہتا ہے کہ اس فلسفہ پر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اثر نہیں ہے۔ نہیں۔ یہ فلسفہ بالکل اُن کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

وُہ کہتا ہے کہ دُنیا میں تغیر و تبدل ہے۔ وُہ ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ تمام حدوث اور چیزوں کی کثرت اور ان کا ایک دوسرے سے جداگانہ ہونا عارضی باتیں ہیں۔ ان کی تہہ میں ایک تغیر و تبدل سے بالاتر وحدت ہے، اور یہ ہی خداوند تعالیٰ کی اصلی صفت ہے۔

اس فلسفہ کی بنیاد پر پارمینڈیز نے وحدانیت کا تخیل قائم کیا۔ اس پر ہی افلاطون نے اپنے فلسفہ کی بنا رکھی۔ اور یہ ہی آگے چل کر یورپ کا تصوراتی فلسفہ Philosophy of Idealism ہو گیا۔ جس کی لڑائی آج تک مادیت Materialism سے جاری ہے۔

پارمینڈیز (Parmenides)

یہ فلاسفر ۵۱۴ ق م بمقام ایلیا (Elea) پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ اس کی ایک ناصحانہ مثنوی کی صورت میں ہے۔ جس کا حصۂ اول "راہِ حقیقت" اور حصۂ دوم "راہِ قیاس" کے نام سے مشہور ہیں۔ راہِ حقیقت میں حق معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور راہِ قیاس میں قیاس سے بحث ہے۔ جو محض حواس پر مبنی ہے اس کے فلسفہ کا نچوڑ یہ ہے:

"دنیا حادث ہے۔ بدلتی رہتی ہے۔ ایک ایک لمحہ میں اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حق کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی متغیر نہ ہو، حادث نہ ہو۔ قدیم و مستقل ہو۔ لہٰذا یہ دُنیا حقیقت نہیں ہے۔ دُنیا بدلنے والی، غیر حقیقی محض فریبِ نظر ہے۔ نیستی ہے۔ حقیقت ہی ہستی ہے۔ لہٰذا تمام عالم کی ابتدا ہستی ہے۔ ہستی کی حقیقت وُہ یہ بتاتا ہے کہ اس میں تغیر نہیں ہے۔ فنا ہونے والی

(38) C. Bakewell : Source Book in Ancient Philosophy

Marfat.com

نہیں ہے۔ ہستی کے علاوہ سب نیستی ہے۔ نیستی میں ہستی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہستی کے لیے نہ ماضی ہے، نہ حال ہے، نہ مستقبل ہے۔ وُہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ تقسیم نہیں ہو سکتا۔ وُہ قدیم ہے غیر متحرک ہے۔ کیونکہ حرکت تو فضا ہی میں ہو سکتی۔ اگر فضا ایک موجودہ شے ہے، تو یہ ہستی ہے۔ ہستی کی نسبت یہ کہنا کہ یہ فضا میں حرکت کرتی ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ ہستی ہستی میں حرکت کرتی ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ وُہ ساکن ہے۔ اور اگر فضا نیستی ہے کچھ نہیں ہے، تو پھر حرکت بھی نہیں ہے۔ ہستی ناقابل تقسیم کل ہے۔ اس میں کہیں خلا نہیں۔ ہستی اور ہستی کے مابین کہیں فصل نہیں ہے۔ اس میں نہ تو خواہشات ہیں، اور نہ جذبات، نہ حاجات۔ ہستی صرف ایک ہے۔ قدیم، غیر متحرک اور مسلسل۔ جس میں نہ تبدیلی ہے اور نہ تغیر ہے۔ لامحدود ہے، اور بے ہمتا ہے۔ اُس کی صرف یہ ہی صفت ہے کہ وُہ ہے۔ اور اُس کی کوئی صفت نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وُہ یہ صفت رکھتا ہے، اور یہ صفت نہیں رکھتا۔ سوائے "ہونے" کے اور کوئی صفت ہی نہیں ہے جو انسانی احساس اور ادراک سے محسوس و مفہوم ہو سکے۔ وُہ حقیقت نہیں ہے جو محض عقل سے معلوم ہو سکے وُہ حقیقت ہی جو حس سے معلوم ہو سکے، وُہ حقیقت نہیں ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ حقیقت محض عقل میں ہے۔ یعنی عقل ہی سے اُس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ احساس کی محسوس دُنیا میں حق نہیں ہے۔ ادراکِ حق میں عقل اور حس کو علیحدہ کرنے والا یہ پہلا شخص ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ ہستی کے سوا کچھ اور نہیں ہے:-

Not being cannot be ; there is no void; the One fills every nook and cranny of the world; and is for ever at rest.

ترجمہ: نیستی کچھ نہیں ہے۔ اُس کی موجودگی ناممکن ہے۔ کائنات میں کوئی خلا نہیں ہے۔ وُہ ذاتِ واحد کائنات کے ہر ایک خلا کو پُر کیے ہوئے ہے، اور خود ہمیشہ غیر متحرک ہے۔

اس طرح پارمینڈیز افلاطون کی تصوریت اور سقراط کی وحدانیت کا پیشرو ہے۔

Marfat.com

آگے چل کر دُوسرے حصّہ میں وُہ کہتا ہے کہ ہستی کا مقام فضا میں ہی محدود ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہُوا کہ وُہ مادہ ہے۔ کیونکہ جو چیز مکان رکھتی ہے وہ محدود ہے، اور مادہ ہے۔ ہستی کی شکل اُس نے کرہ کی سی بتائی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ دوسرا حصّہ پہلے حصّہ سے متناقص ہے۔ اس طرح پارمینڈیز کا فلسفہ مادیت بھی ہے، اور تصوریت بھی ہے۔ یہ موجودہ فلسفہ کی زبان میں کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ امرِ واقعہ وُہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا کہ ایک فلسفہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔

پارمینڈیز کے دو جانشین ایمپڈوکلیز (Empedocles) اور ڈیمقراطیس Democritus ہیں۔ جنہوں نے اس کے فلسفۂ مادیت کو لیا ہے۔ ایک فلاسفر مؤرخ نے خوب کہا ہے کہ تصوریت احساسات اور جذبات کے خلاف بغاوت ہے۔ اور مادیت رُوح کے خلاف بغاوت ہے۔ تصوریت سوائے محسوس دُنیا کے ہر ایک شے کی تشریح کرتی ہے۔ اور مادیت ہر ایک شے کی تشریح کرتی ہے سوائے حیاتِ انسانی کے۔ ۳۹ھ۔ اور یہی فلسفۂ اسلام کی برتری ہے کہ دونوں کی صحیح تشریح کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک کامل انسان وُہ ہے جس میں کمالِ جسم اور کمالِ روح کا امتزاج و اتصال صحیح مناسبت میں ہو۔

فلسفۂ یونان نے بھی اس نقص کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہمارے ناظرین خود معلوم کر لیں گے کہ وُہ اس کوشش میں ناکامیاب ہو گئے ہیں۔ سوائے اسلام کے کسی اور مذہب کا مروجہ فلسفہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ انگزاغورس Anaxagoras نے اپنے خیال میں اس قیاس سے اس نقص کو دُور کیا، کہ حقیقتِ اوّل ایک عالمی دماغ ہے۔ اور ایمپڈوکلیز Empedocles نے قیاس کیا کہ خود اس مادی دنیا اور اُس کی اشیاء میں اندرونی طاقت ہے۔ جو بذریعہ

۳۹ھ (39) Toynbee : A Study of History

Will Durant : Story of Civilisation

ارتقا، نشو و نما کر رہی ہے۔ لیکن ان دونوں قیاسوں میں سے ایک قیاس بھی حیاۃ انسانی کے عنصر اعظم۔ ظلم۔ کی وجہ ہست و بود اور اس کے آخری انجام اور اس کے مداوا کی تشریح نہیں کرتا۔ اور یہ بہت بڑا نقص ہے۔ بغیر اس کے حیاۃ انسانی نامکمل ہے۔ اور جتنی جلدی اس کو خودکشی سے ختم کر دیا جائے، بہتر ہے۔ ہمارے خیال میں ان دونوں قیاسوں کی عملی حد خودکشی ہونا چاہیئے۔ اور یونان نے بہت عرصہ تک اس پر عمل بھی کیا۔

ایران و یونان کی کشمکش عظیم میں بڑی جنگوں میں سے ایک جنگ میراتھن Marathon تھی۔ اُس ہی سال ۴۹۵ ق م میں ایمپڈوکلیز پیدا ہوا تھا یہ بھی مسئلہ تناسخ اور آواگون ارواح کا بہت ہی زیادہ معتقد تھا۔ اور اپنے شاعرانہ تخئیل کی مدد سے اُس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جنموں میں ایک نوجوان، پھر ایک کنواری لڑکی اور پھر ایک پھولدار جھاڑی تھا۔ میں پرندہ بھی رہا ہوں۔ اور کسی جنم میں مچھلی بھی تھا۔ جب میں گہرے سمندروں میں تیرتا پھرتا تھا۔ غیر الہامی دماغوں نے اپنے خیال میں دنیا کی خیر و شر اور رنج و راحت کی تقسیم کا مسئلہ آواگون کو بہترین حل تصور کیا تھا۔ ایک فارسی شاعر جو اسلام کی کنہ کو نہیں پہنچا تھا، کہتا ہے ؎

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جائے، تو مسئلہ تناسخ یا آواگون ارواح کوئی قابل تسلیم حل نہیں پیش کر سکتا۔ محض بار بار کی پیدائش کبھی انسان کی صورت میں، کبھی کیڑے کی صورت میں اور کبھی سبزہ کی حالت میں نہ تو مقصد اصلاح کو پورا کر سکتی ہے، اور نہ تخئیل سزا کو۔ کیونکہ دونوں ناممکن ہیں جب پہلے جنم کی یاد اور اُس کے اچھے اور بُرے کاموں کا احساس نہ ہو۔ اور یہ قدرت کی اُس مسلمہ سنت کے خلاف ہے جس میں بدستور ترقی و نشو و نما کا مستقل عمل جاری ہے۔ ترقی معکوس اس عمل و اصول کے بالکل خلاف ہے۔ بندر سے انسان بننا تو شائد سمجھ میں آ بھی جائے، انسان سے بندر بننا تو سنت رائجہ کے

بالکل خلاف ہے۔

اپنے اس اعتقاد کے مطابق ایمپڈوکلیز نے گوشت خوری اور آدم خوری کو ایک ہی سطح پر رکھا تھا۔ اور گوشت خوری کی قطعی ممانعت کی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ دُنیا میں آنے سے پہلے تمام لوگ خدا تھے۔ لیکن اپنی آسمانی رہائش اپنے گناہوں کی وجہ سے کھو دی۔

کیا یہ انبیاءؑ کی تعلیم کی آواز بازگشت نہیں ہے جنہوں نے انسان کی اصلی حالت اور مقصد اور ان کے گناہوں کی پاداش سے آگاہ کیا۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش، اور اُن کی لغزش اور اُس کے نتیجہ کی خبروں نے ان حکماء کی توجہ ادھر دلائی۔ اور اُس کو اپنے فلسفہ میں داخل کیا۔ فارسی کے شعراء کی شاعری پر بھی اس کا اثر ہوا ہے ؎

اے کہ بودی در حریم لامکاں　　چوں جدا گشتی بگو رازِ نہاں!
پاک بودی در حریم کبریا!　　از چہ پیدا شد ترا حرص و ہوا

اگرچہ یہ بالکل ایمپڈوکلیز کا فلسفہ تو نہیں ہے، لیکن اُس کا اثر ظاہر ہے۔ وہ کہتا تھا، کہ مجھے اب تک اپنی خدائی حالت یاد ہے بلکہ اب بھی میں خدا ہوں۔ افسوس کرتا تھا کہ کیسی اچھی جائے قدس میں سے گر کر مجھ کو ان فانی انسانوں میں رہنا پڑا۔ اپنے خدائی ابتدا کے اعتقاد کے بموجب وہ سنہری یا تانبے کی کھڑاویں استعمال کرتا تھا۔ گیروے سُرخ Purple کپڑے پہنتا تھا۔ اور اپنے سر پر پھولوں یا سبز پتیوں کا تاج رکھتا تھا۔ عوام الناس سے تو کہتا تھا کہ میں اپولو خدا Apollo کا دوست ہوں۔ لیکن تنہائی میں اپنے خاص دوستوں سے کہتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ سحر کا عامل تھا۔ فوق العادت طاقتوں کا دعوے کرتا تھا۔ اور انسانوں کی قسمتِ آیندہ کے علم کا دعوے دار تھا۔ اپنی پھونکوں سے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ وہ طبیب بھی تھا، انجنیئر بھی تھا، اور مقرر بھی تھا۔ شاعر بھی تھا۔ شہری سیاست میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اُس نے تمام چیزوں کو چار عناصر پر منقسم کیا تھا۔ آب، خاک، باد اور آتش۔ ان چاروں عناصر پر دو طاقتیں اپنا عمل کر رہی ہیں، قوتِ کشش اور قوتِ دفع۔

Marfat.com

بالفاظِ دیگر محبت و نفرت ۔ آگے چل کر وہ بیان کرتا ہے، کہ ان دونوں قوتوں سے کس طرح تمام کائنات پیدا ہوئی ۔ یہاں اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ جو اُس کے فلسفہ کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ مندجہ ذیل دو کتابیں ضرور پڑھے:۔

1. DIOGENES LAERTIUS LINES AND OPINIONS OF THE EMINENT PHILOSOPHERS "EMPEDOCLES" LONDON 1853 2. J.A SYMONDS : STUDIES OF THE GREEK POETS, LONDON, 1920

زینو (Zeno)

اس نام کے دو فلاسفر ہیں ۔ یہاں ہم اُس کا ذکر کر رہے ہیں جو ایلیا کا باشندہ تھا ۔ اس کا وہ ہی فلسفہ ہے جو پارمینڈیز کا تھا ۔ اُس نے کثرت اور حرکت کے خلاف بہت بحث کی ہے ۔ جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے ۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہستی محض ایک ہے ۔ اُس میں کثرت نہیں ہے اور نہ حرکت ہے ۔ دنیا محض فریبِ نظر ہے ۔ یہ نہ حقیقت ہے اور نہ ہستی ۔ ۴۷۵ ق م کے قریب گزرا ہے ۔

ہیراقلیطس Heracleitus

پیدائش ۵۳۵ ق م ۔ فوتیدگی ۴۷۵ ق م ۔ پارمینڈیز کا ہمعصر ۔ زینو سے عمر میں بڑا ۔ یہ Ionia کے شہر Ephesus کا باشندہ تھا ۔ یہ شہر اتھنز کے شہری آرتھیوں نے ۱۰۰۰ ق م میں بسایا تھا ۔ اس میں آرٹمیس Artemis دیوی کا بہت بڑا مندر تھا ۔ جو دُنیا کے ہفت عجائبات میں سے ایک ہے اس شہر کی تین بڑی مشہور چیزیں تھیں ۔ شعراء ، فلاسفران اور خواتین ۔ اس کے ایک فلاسفر Hipponax کا ایک مقولہ آج کل کی یورپ کے لیئے سبق آموز ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے لیئے صرف دو دن خوشی کے لاتی ہے ۔ ایک تو شادی کا

پہلا دن، اور دوسرا عورت کی زندگی کا آخری دن جب اُس کا خاوند اُس کو دفن کر کے اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ انگریزی کا فقرہ مختصر ہے:-

Woman brings two day of happiness to a man one when he marries her, the other when he burries her.

ہیراقلیطس لوگوں میں شامل ہونے کو پسند نہیں کرتا تھا، اور پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کا فلسفہ ہے کہ ہر ایک شے تغیر پذیر ہے۔ کسی میں دوام نہیں۔ ہستی بھی نیستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی ایک کشمکش کا نام ہے۔ ہر ایک شے کی ضد موجود ہے۔ تمام اشیاء آگ سے بنی ہیں اور پھر آگ ہی میں تبدیل ہو جائیں گی دنیا میں شر بھی ضروری ہے۔ ہر ایک لمحہ میں تبدیلی ہے۔ کسی شے کو قرار نہیں۔ بُت پرستی حماقت ہے۔ پتھر بھی کہیں خدا ہو سکتے ہیں۔ حقیقت ایک ہے۔ کثرت ہی میں وحدت ہے۔ وُہ حقیقت آگ ہے۔ لیکن وُہ آگ کو روح و خدا سمجھتا ہے۔ استعارہ کے طور پر آگ کہا ہے۔ بعض جگہ معمولی آگ بھی کہتا ہے۔ یہ دُنیا نہ خدا نے بنائی ہے، اور نہ انسان نے۔ ہمیشہ سے ہے۔ قدیم ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ لازوال ہے۔ موت اور زندگی ایک ہی شے ہے۔ ان میں کچھ فرق نہیں عاقبت نہیں ہے۔ حیاۃ بعد ممات نہیں ہے۔ موت کے اسباب بیرونی ہوتے ہیں۔ اگر ان اسباب کو روک دیا جائے، تو موت کبھی واقع نہ ہو۔ ہر ایک شے میں ایک کشمکش ہے۔ اگر کشمکش نہ ہو تو وُہ شے معدوم ہو جائے۔

ایک فلاسفر مؤرخ کہتا ہے کہ ہراقلیطس کا فلسفہ مسیحیت پر اثر پذیر ہوا ہے۔ اور مسیحیت نے بہت سے نظریہ اُس کے فلسفہ سے لیئے ہیں۔ آج تک یورپ کے فلاسفروں کے خیالات پر اثر پذیر ہے ؎۴۰۔ ہمارا خیال ہے کہ خود ہراقلیطس نے اپنے نظریات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اثر پذیر ہو کر قائم کیئے ہیں۔ وحدت کو مانتا ہے، تغیر کو مانتا ہے، بت پرستی کو حماقت کہتا ہے۔ موت محض ایک انتقال ہے۔ اگر بیرونی اسباب نہ ہوں تو یہ ظاہری موت بھی واقع نہ ہو۔ یہ وُہ حقیقت ہے

؎۴۰ (40) Will Durant : The life of Greece Chap. VI. p. 147

Marfat.com

جس کو دُنیا اب تک نہ سمجھی۔ اور خداوند تعالےٰ کے چند برگزیدہ بندوں کی طوالتِ عمر پر جو خداوند تعالےٰ نے اُن کو عطا کی ہے، اعتراض کیا جاتا ہے۔ اگر رنج و غم کے اسباب جو انسان کے اندر کیڑوں کی طرح گھن لگا رہے ہیں، فضا کی آلودگیاں اور غبار جو ہوا کے ساتھ مل کر انسان کے اندر جاتی ہیں، موسم کا ایک لخت تغیر و تبدل اور دیگر ایسے امور یعنی جو عمرِ انسانی کو قطع کرنے والے اسباب کسی خاص خطۂ زمین سے کسی خاص آدمی کے لیئے دور کر دیئے جائیں، تو پھر مشیت خداوندی کے علاوہ کون سی چیز ہے جو انسان کی عمر منقطع کر دے، جو صنعتِ الٰہی کا بہترین اور نادر ترین نمونہ ہے، اور جس کی نسبت خود صانع حکیم فرمائے کہ خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ مصنوع کی مضبوطی اور پائداری ہی صانع کی حکمت کی دلیل ہؤا کرتی ہے۔

ایمپیڈوکلیز Empedocles

پیدائش ۴۹۵ء ق م ۔ فوتیدگی ۴۳۵ء ق م ۔

اس کا مختصر تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں۔ اس نے پارمینڈیز کے فلسفہ مادیت کے حصہ کو لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مادہ قدیم ہے۔ غیر فانی ہے۔ اس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ یہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ اس کے فلسفہ کا بنیادی اصول ہے۔ تناسخ ارواح کا بھی قائل تھا۔ مادہ کی قدامت اور بقاء کا فلسفہ اُس کے جانشینان انکساگوراس اور سالمیین یعنی فلاسفۂ جوہر فرد Atomists کا بھی تھا۔ ایمپیڈوکلیز پہلا شخص ہے جس نے تمام مادہ کو چار عناصر میں تقسیم کیا۔ یعنی آب و خاک و آتش و باد۔ اس کی رائے میں مادہ بالکل مردہ اور بے حس شے ہے۔ اس میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ لہٰذا مادہ پر عمل کرنے والی دو بیرونی طاقتیں ہیں جن کا نام اُس نے Harmony اور DISCORD یعنی میل و دفاع یا انجذاب و انتشار رکھا تھا۔

سالمیین یا فلاسفۂ جوہر فرد Atomists

اس فلسفہ نظریہ جوہریت کا بانی لیوسی پس Leucipus تھا۔

تاریخ پیدائش و موت کا علم نہیں۔ غالباً ایمپیڈو کلیز کا ہم عصر تھا۔ اور اس ہی کے فلسفہ یعنی قدامت و بقاء مادہ (ازلیت و ابدیت مادہ) پر اس نے اپنا نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مادہ کا آخری تجزیہ قائم کیا جائے تو وہ ذرہ یا Atom رہ جائے گا جو آگے تقسیم نہ ہو سکے گا۔ اور وہ ہی غیر فانی ہے۔ (موجودہ سائنس طبیعیات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے) ان فلاسفہ کا خیال ہے کہ مادہ کے چار عناصر نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی عنصر ہے جو مختلف شکلیں اسباب کی وجہ سے اختیار کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے اصلی سبب یہ ہے کہ بعض ایٹم چھوٹے اور بعض بڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے شکل و قد کے اختلاف کی وجہ سے مادہ کی شکلوں میں فرق ہوتا ہے۔ اور اُن کی ترتیب اور مقام کے اختلاف کی وجہ سے مادہ کی خاصیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ مشکوک امر ہے کہ آیا (Leucipus) اور Democritus جس نے لیوسی پس کے فلسفہ کی تائید کی تھی ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل تھے یا نہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ اُن کے بعد آنے والے حکماء یعنی Epicureans ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل تھے۔

ان فلاسفہ کے خیال کے مطابق ایٹم ایک حد میں محدود ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ یعنی دو ایٹم کے درمیان خلا ہے۔ اس خلا میں وہ ایٹم حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اب گویا دو حقیقتیں ہو گئیں۔ ایک ایٹم اور دوسرے خلا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حرکت کیونکر پیدا ہوئی۔ اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں۔ جو فلاسفہ ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حرکت ایٹم کے وزن کی وجہ سے ہوئی۔ جو ہمیشہ اُوپر سے نیچے اپنے وزن کی وجہ سے گرتے ہیں اور حرکت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بحث ناقص ہے۔ فضا میں اوپر نیچے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ گرتے ہیں یا حرکت کرتے ہیں تو قوتِ کشش ہی کی وجہ سے کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہ سوال ہو گا کہ قوت کشش کیوں کر پیدا ہوئی۔ پہلے ذرات مل کر حرکت کر کے بہت سے کُرہ جات بنائیں، تو کشش پیدا ہو۔ غرضکہ حرکتِ اوّل کا وہ مسئلہ ہے جو ابھی تک سائنس اور فلسفہ حل نہیں کر سکے ہیں۔ حرکت اوّلین کا سبب اوّل نہ ثابت ہونے کی وجہ سے ان فلاسفہ جو ہریت کا نظریۂ تخلیق

Marfat.com

کائنات جو ذرات کے اُوپر سے نیچے گر کر آپس میں ملنے کے نظریہ پر منحصر ہے، غلط ثابت ہوتا ہے۔

اسی ہی زمانہ میں انکزاغورث (Anaxagorus) اپنا فلسفہ شائع کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے کہا کہ حرکت اولین پیدا کرنے والا ایک ذہن کل یا عقل کل تھی۔ دیکھئے اس پر انبیاء کی تعلیم کا اثر اچھی طرح نمایاں ہے۔ عقل کل (حکیم مطلق) نے کہا کن فیکون۔ مادہ معہ اپنی حرکت کے پیدا ہو گیا۔ لیکن ڈیموقراطیس Democritus کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ عقل کل یا ذہن کل کچھ نہیں ہے۔ بلکہ تمام مدرکات یا مظاہر قدرت اندھی مشین کے پُرزوں کی طرح چل رہے ہیں۔ کہتا ہے کہ نہ خدا ہے اور نہ مذہب ہے۔ مظاہر قدرت سے انسان کے دل میں ڈر پیدا ہوا اور اُس نے مذہب کا تخیل سامنے کھڑا کر دیا۔ لیکن تعجب ہے کہ وُہ خدا کو تو نہیں مانتا۔ کیونکہ وُہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن یہ مانتا ہے کہ تمام فضا انسانی شکل کی مخلوق یعنی جن، پری، دیو، بھوت سے بھری ہوئی ہے۔ وُہ انسان سے زیادہ طاقتور اور قوی ہیکل ہیں۔ اُس کے گمان میں خداؤں کا اعتقاد اس طرح پیدا ہوا کہ ان جنات اور بھوتوں کی شکلوں کا عکس جو فضا کے ایٹم پر پڑا تو وُہ انسان کو محسوس ہونے لگے۔ اور اُس نے سمجھا کہ یہ خدا ہیں۔

رُوح کے متعلق ان فلاسفروں کے خیالات یہ ہیں کہ آگ کے ایٹم گول، اور ہموار ہیں۔ رُوح بھی ایسے ہی ایٹموں سے مرکب ہے۔ روح دراصل ایک زیادہ صاف، خالص اور نفیس آگ ہے۔ جب مَوت واقع ہوتی ہے تو یہ تمام ایٹم بکھر جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں مَوت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کی زندگی اور گندگی کے کیڑے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اسلام انسان کی زندگی کی بڑی قدر کرتا ہے۔

انکزاغورث

انکزاغورث ایشیائی کوچک کے شہر کلیزومینی (Claromenae) میں تقریباً ۵۰۰ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ صاحب جائداد تھا۔ لیکن علم کے شوق میں شہر بشہر سفر کرتا رہا۔ اور آخر کار اتھنز میں اپنے فلسفہ کا مدرسہ کھولا۔ انکزاغورث

Marfat.com

پہلا شخص ہے جس نے یونان میں فلسفہ جاری کیا۔ اس سے پہلے ایتھنز میں فلسفہ کا نام نہ تھا۔ انکزاغورث نے اپنے درس کے دوران میں خیال ظاہر کیا کہ سُورج ایک آتشی پتھر ہے۔ اور چاند مٹی کا ہے۔ وہاں کے لوگ چاند سورج اور ستاروں کو خدا مانتے تھے۔ لہذا انہوں نے انکزاغورث کے خلاف الحاد اور توہینِ خدایان کا مقدمہ دائر کیا۔ اس کو سزا بھی ہو گئی۔ لیکن یہ وہاں سے بھاگ گیا۔ غالباً اس کی اس نجات میں اُس کے دوست Pericles کا ہاتھ ہو جو اُس زمانہ میں یونان کا بہت بڑا سیاسی رہنما تھا۔

انکزاغورث کے فلسفہ کے بنیادی اصول وُہ ہی ہیں جو امپیڈوکلیز اور فلاسفر جوہر فرد یعنی Atomists کے تھے۔ یعنی یہ کہ مادہ قدیم ہے۔ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہ کبھی معدوم نہیں ہوگا۔ دُنیا کی ہر ایک شے زندہ اور بے جان مختلف ذرات Atoms کے مختلف طریقوں میں ملنے سے وجود میں آئی ہے۔ دنیا کی کوئی شے معدوم نہ ہوگی اور نہ اس کی کسی شے کی ابتداء تھی۔ لیکن ان میں ایک فرق تھا۔ حکماء جوہرئین Atomists نے تو کہا تھا کہ مادہ ایک ہی قسم کا تھا۔ ہر ایک شے کے ذرات کے اختلاف قدوقامت وہیئت کی وجہ سے مادہ کی مختلف انواع اور شکلیں نظر آتی ہیں۔ امپیڈوکلیز نے کہا تھا کہ چار عناصر ہیں۔ لیکن انکزاغورث کا خیال تھا کہ مادہ کی ہر ایک نوع ابتداء ہی سے مختلف ہے۔ یعنی ہر نوع بذاتِ خود قدیم ہے۔ مثلاً ہڈی، بال، مٹی، لکڑی، سونا یہ سب اپنے اختلاف کے ساتھ شروع ہی سے ہیں۔ دوسرا اختلاف ان میں یہ تھا، کہ انکزاغورث تو کہتا تھا کہ وُہ اپنی آخری حد تک قابلِ تقسیم ہے۔ وہ دُنیا کی ابتداء اس طرح بتاتا ہے کہ شروع میں ہر قسم کے ذرات فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور فضا لامحدود تھی۔ دنیا اس طرح بنی کہ ایک ہی قسم کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے ذرات نے مل کر سونا بنایا، لکڑی کے ذرات نے مل کر لکڑی بنائی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ مادہ اپنی آخری حد تک قابلِ تقسیم ہے، اُس کے تقسیم ہونے کی کوئی حد ہی نہیں۔ لہذا وہ ذرّات آپس میں غیر محدود درجہ تک مل گئے۔ پھر جُدا ہونے کا

Marfat.com

عمل شروع ہوا جواب تک جاری ہے۔ اس تکمیل تک پہنچنے میں بہت عرصہ لگے گا۔ ایک ہی قسم کے خالص مادہ میں بھی دوسری قسم کے کچھ نہ کچھ ذرات ملے ہوئے ہیں۔ سونا اس وجہ سے سونا کہلاتا ہے کہ اس میں سونے کے ذرات کی اکثریت ہے۔

انکزاغورث کے سامنے بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ پہلے حرکت کا سبب یا موجب کیا تھا۔ اس کے متقدمین نے اس کا صاف تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا لیکن جو کچھ بھی سبب حرکت اولین انہوں نے بیان کیا تھا وہ مادی تھا۔ انکزاغورث نے مادی وجہ حرکت کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ اس نے کہا کہ وہ سبب یا طاقت جسمانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض ایک عقل کل یا ذہن کل ہے جس نے یہ حرکت پیدا کی، جس سے دنیا ظہور میں آئی۔ اس نے اس عقل کل Intelligence کا نام Nous رکھا۔ اس نے دیکھا کہ دنیا میں ایک نظام ہے، ایک ترتیب ہے، خوبصورتی ہے۔ مقصد ہے۔ اور نتیجہ نکالا کہ یہ سب کائنات اور اس کا نظام اندھی طاقت و حرکت سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان سب کا ترتیب دینے والا اور انتظام کرنے والا ایک صاحب عقل ذہن ہے۔ اندھی طاقتیں ایک بے ترتیب، گڈمڈ، پریشان اجتماع ذرات پر عمل کر کے یہ حسن و نظام نہیں پیدا کر سکتیں جو نظام و حسن پیدا کر سکتا ہے وہ ذہن و فہم ہی ہو سکتا ہے۔ وہ Nous ہے اور تمام دنیا پر اس کا قابو ہے۔

یہ نوس Nous یا عقل کل کیا ہے، اس کی کیا صفات ہیں۔ بہت عرصہ تک یہ امر متنازعہ رہا کہ آیا انکزاغورث Nous کو صاحب جسم سمجھتا ہے یا بغیر جسم کا۔ اب تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ انکزاغورث کے نزدیک Nous بغیر جسم کے ہے۔ یہ وہ ہے جس نے تمام زندہ جاندار جانوروں، آدمیوں، کیڑوں یہاں تک کہ درختوں میں ایک روح پھونکی ہوئی ہے۔ یا ان میں مثل روح کے سمایا ہوا ہے۔ Nous تو ایک ہی نوع کا ہے۔ لیکن ان چیزوں میں اس کے درجے ہیں۔ آدمیوں میں سب سے بڑا Nous ہے۔ یہ Nous بھی ایک قسم کا خیالی مفروضہ ہے۔ چونکہ حسن و ترتیب و نظام عالم کی اس کو کوئی اور

وجہ نہیں معلوم ہو سکی۔ لہٰذا اُس نے یہ خیالی تصور پیدا کر لیا۔ ان حکماء کے نزدیک دنیا کے ظلم اور اُن کی جزا و سزا یا تو قابل توجہ نہ تھے یا اُن کے فلسفہ کے حدود میں نہیں آتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے غور ہی نہ کیا کہ دُنیا کے بنانے والے کی صفات میں ایک صفت "اُس ظلم کی جزا و سزا دینی" بھی ہونی چاہیئے۔ انکزا غورث کا Nous بھی اس صفت سے عاری ہے۔

انکزاغورث کے Nous میں صفت خالقیت بھی نہیں ہے۔ اُس کا صرف یہ کام تھا کہ پہلی حرکت تمام عالم کو دے دی جو پہلے سے موجود تھا یعنی مادہ کے ذرات جو قدیم تھے ان کو ترتیب دی، اور یہ دُنیا اُس طرح بن گئی۔ یہ Nous دنیا کے پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اور اُس کے موجودہ نظام میں بھی اُس کو کوئی دخل نہیں ہے۔ انکزاغورث کے نزدیک Nous بالکل واحد خالص ہے۔ مادہ کا کوئی جزو اس میں شامل نہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر دونوں یعنی مادہ اور Nous قدیم ہیں، اور مادہ اس سے پہلے کا نہیں ہے، تو شروع ہی میں ان ذرات میں یہ بے ترتیبی کیوں ہوئی کہ بعد میں اس کو ترتیب دینے کی ضرورت ہوئی۔

نوس نے یہ حرکت کس طرح دی۔ پہلے فضا میں تمام ذرات Atoms بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے درمیان میں Nous نے ایک چکر پیدا کیا۔ اُس چکر نے حرکت دی۔ مادہ کے ذرات کی وہ ہی حالت ہوئی جو خاک کے ذرات کی بگولے میں ہوتی ہے۔ ایک بگولا پیدا ہو گیا۔ ایک ایک قسم کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے سونے سے، لکڑی کے لکڑی سے۔ نوس نے تو درمیانی یا مرکزی حرکت دی جس سے وہ بگولا پیدا ہوا۔ باقی سارا کام اس چکر یا بگولے نے کیا۔ پہلے گرم، خشک اور ہلکے ذرات علیحدہ ہوئے اُن سے اوپر کی ہوا بنی۔ اُس کے بعد سرد، تر، سیاہ اور کثیف ذرات علیحدہ ہوئے۔ اُن سے نیچے کی ہوا بنی۔ اور اُس چکر کی وجہ سے یہ کثیف ہوا مرکز کی طرف گئی۔ اور اُس سے زمین پیدا ہوئی۔ اس ہی چکر کی وجہ سے بڑے بڑے پتھر زمین میں سے ٹوٹے اور وہ چاند، سورج اور ستارے

بن گئے۔ اور تیز حرکت کی وجہ سے اُن میں روشنی پیدا ہو گئی۔ چاند زمین
میں سے بنا ہے۔ اور وہ سورج کی روشنی سے عکس لیتا ہے۔ انکزاغورث
پہلا شخص ہے جو چاند کی روشنی کی وجہ بتاتا ہے۔ اسی طرح اُس نے
گرہن کا بھی اصلی سبب صحیح بتایا ہے۔ اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ
ہمارے دُنیا کے علاوہ اور بھی دُنیا ہیں۔ جن کے چاند اور سورج علیحدہ ہیں
ان میں انسان آباد ہیں۔ سورج اتنا بڑا ہے جتنا کہ یونان کا ایک صوبہ
Peloponnese ہے۔

اگرچہ Nous کو بغیر جسم کے تصور کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی کہا گیا ہے
کہ وہ ایک جگہ میں ہے اور ایک خاص جگہ گھیرتا ہے۔ گویا مادیت کا کچھ نہ کچھ
تخیل اس Nous میں باقی ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے اس کا تخئیل
بالکل مادہ سے علحدہ کیا ہے۔

انکزاغورث نے مادہ اور نوس کو اس طرح علیحدہ کر کے اور اُن دونوں
کو قدامت دے کر بے معنی ثانویت پیدا کر دی۔ دوسری غلطی اس کی
یہ ہے کہ در اصل آخر کار اس نے بھی اپنے متقدمین کے مشینی
نظام ہی کو اختیار کر لیا۔ نوس نے ایک درمیانی حرکت دی، اور پھر مشین
کے پرزوں کی طرح سب کچھ بننے لگا۔ نوس کا تو بس صرف یہ ہی ایک
فعل تھا۔

قرآن شریعت میں اس مشینی تخئیل کی تردید اس طرح کی گئی ہے:-
يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ۔ الرعد ۱۳ : ۳۹
مسلمانوں کے وہ فرقے (اور اُن کی اکثریت ہے) جو اس فلسفۂ یونان سے
متاثر ہیں اور اُس کو حق سمجھتے ہیں اپنے خدا کو بھی ایسا ہی مجبور محض سمجھتے
ہیں اور اپنے اس فاسد خیال وعقیدہ کو معقول کا جامہ پہنا کر اس طرح بحث
کرتے ہیں کہ کیا زمانہ ابتداء یعنی ازل میں خدا سے کچھ غلطی ہو گئی تھی جواب
اس کو مٹا کر اور اُس میں تبدیلی کر کے اُس غلطی کی درستی کر رہا ہے۔
وہ یہ نہیں سوچتے کہ جب خداوند تعالیٰ نے انسان کو قول و فعل کی آزادی عطا فرمائی

جس کی وجہ سے سزاو جزا مقرر کی۔ تو اُس صورت میں کئی احکام شرع طاری ہو سکتے تھے کہ اگر انسان ایسا کرے گا، تو یہ ہوگا۔ اور ویسا کرے گا تو وُہ ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ ہر انسان کا فعل روزِ ازل ہی سے خدا کے علم میں تھا اور اُس کے مطابق بام الکتاب میں درج ہوا، تو پھر عقیدۂ سزاو جزا بے معنی ہوجاتا ہے جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور پھر یہ اُس Fatalism پر منتج ہوتا ہے جو حکمائے عالم میں بدنام ہے اور لیس للانسان الاما سعی کا فرمان بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُس صورت میں تو سعی بے کار ہوگئی۔ اور انسان کے افعال کو اپنے علم میں محدود کرنے کے یہ معنی ہوئے، کہ اب وُہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

سوفسطائی حکمائے یونان (Sophists)

سوفسطائی جماعت حکماء، دراصل اُس معنی میں فلاسفر نہ تھے جس معنی میں سقراط، افلاطون اور ارسطو بیان کیے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کوئی اپنا علیحدہ فلسفہ جاری نہیں کیا۔ وُہ تو منطقیوں کی ایک پیشہ ور جماعت تھی۔ جس نے اپنے ماحول کا اچھی طرح مطالعہ کرکے اپنے زمانہ کی ضروریات اور ذہنیات کو معلوم کرلیا تھا۔ اور لوگوں کو اُس زمانہ کی کشمکش کے لیئے تیار کرتے تھے اپنی اس تعلیم کی فیس لے کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ سب سے پہلی یہ ہی جماعت تھی جس نے عقل سکھانے کی اُجرت لی۔ چونکہ وُہ لوگوں کو زمانہ کی ضروریات سے آگاہ کرتے تھے اور اُن سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سکھاتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے ہر طبقہ میں بہت رسُوخ حاصل کرلیا تھا۔ دراصل وُہ اپنے زمانہ کی آواز تھے۔ اور اُس کے نمائندہ تھے۔ گویا وُہ ایک آئینہ تھے جس میں اُس زمانہ کا عکس اُترا ہوا تھا۔ لہٰذا اُن کے حالات کا علم اُس زمانہ کے مطالعہ کے لیئے ضروری ہے۔ اور اُن کے بھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ جب تک اُن کے زمانہ سے واقفیت تامہ نہ ہو۔ ایک اور بات بھی ہے۔ یونان کے اُس زمانہ میں اور آج کل کے زمانہ میں بہت مشابہت ہے۔ خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں۔ اپنے زمانہ کے حالات د

Marfat.com

ضروریات سے مجبور ہو کر جو اصول زندگی سوفسطائیوں نے قائم کئے تھے، وُہ ہی آج کل کار فرما ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آخری نتیجہ اب بھی وُہ ہی ہو گا، جو یُونان کے اُس زمانہ کا ہوُا۔ لہذا ہر نقطۂ نظر سے سوفسطائیوں کے حالات کا مطالعہ اور اُن کی عقلیات کا موازنہ ہمارے لیئے بہت ضروری ہے۔

سوفسطائیوں کا زمانہ:۔ سوفسطائیوں کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ اُن میں کئی مشہور آدمی ہوئے ہیں۔ جن میں سے ان تین کی شہرت بہت زیادہ ہے۔

(۱) پروطاغورث Protagoras سنہ ۴۸۰ تا ۴۱۱ ق م

(۲) غورجیاث Gorgias سنہ ۴۸۵ تا ۳۸۰ ق م

(۳) ہپ پیاس Hippias اِس کی تاریخِ پیدائش و موت نہیں معلوم لیکن ان ہی متذکرۂ بالا اشخاص کا ہمعصر تھا۔

یونان میں یہ وُہ زمانہ تھا جب طویل کشمکش کے بعد امرائیت مغلوب ہو گئی۔ اور جمہوریت کا دور شروع ہوُا۔ ہر جگہ اور ہر ادارہ میں جمہوریت نمایاں تھی۔ اور پُرانے آثار امرائیت کے مٹائے جا رہے تھے۔ ایتھنز میں جمہوریت کا نمایندہ Pericles برسرِ حکومت آ گیا تھا۔ یہ انکزاغورث حکیم کا بہت بڑا دوست تھا۔ اور اُس کی تعلیم کے زیرِ اثر اُس نے امرائیت کے ساتھ پُرانے مذہب کی حکومت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ وُہ مذہب تو تھا ہی اس قابل کہ نیست و نابود کر دیا جائے۔ بلکہ اگر جاری ہی نہ ہوتا، تو اچھا تھا۔ انسان کا ہر ایک فعل خواہ کیسا ہی مذموم اور مجہول ہو اُس مذہب کے خداؤں کے طرزِ عمل کے مقابلہ میں مستحسن نظر آتا تھا۔ یونان کے خدا بھی تو انسانی غنڈوں کے نمونے تھے۔ لیکن بُری سے بُری چیز کا کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اُس مذہب کا یہ فائدہ تھا کہ انسان کے ذہن اور عمل پر کسی کا ڈر تو تھا۔ اُس مذہب کے خدا کیسے ہی لغو اور فضول تھے۔ بہرصورت اُن کا ڈر تو تھا۔ اُس مذہب کو تو معدوم کر دیا گیا، لیکن اُس کی جگہ کوئی

اور شے قائم نہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی شتر بے مہار ہو گئے۔ کسی کا ڈر نہ رہا۔ حکومت تو تھی۔ لیکن جمہوریت کی وجہ سے لوگوں کو حکومت کا ڈر نہ تھا بلکہ حکومت کو لوگوں کا ڈر تھا۔ ہر شخص خود سر اور خود رائے ہو گیا۔ اپنے سے زیادہ کسی کو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ آجکل کی طرح نہایت بری قسم کا Individualism چل گیا۔ کسی تعلیم یافتہ شخص کو الہامی پیشین گوئی، شگون نیک و بد اور معجزوں پر یقین نہیں رہا۔ حکیمانہ عقل کے مطابق یہ سب امور بے معنی تھے۔ لیکن عوام الناس پر جو ان کا اثر تھا اور ان کے افعال پر جو تھیں اُن کا نتیجہ تو اچھا تھا۔ اب نکتہ چینی، تخریبی تخیل اور ہر ایک نظریہ سابقہ سے بدگمانی عام ہو گئی۔ ہر ایک جگہ تخریب پھیل گئی۔ تعمیر کہیں نہ ہوئی۔ اگر یہ فقرہ صحیح اردو ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی اوباشی اور آوارہ گردی عام ہو گئی جس نے عملی اوباشی اور آوارہ گردی کو رائج کر دیا۔ جن باتوں کو اُن کے آباؤ اجداد نے عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ ان کو یہ لوگ توہین و تحقیر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ رواج، اخلاق اور قانون کی بندشوں کو ان لوگوں نے سمجھا کہ انسان کی آزادی عمل پر یہ ناجائز حدود ہیں۔ اور انسان کو آزادی عمل کا کامل حق حاصل ہے۔ اندریں صورت حرص و آز، لالچ، خود غرضی، خود سری اور ضدیت کا نام آزادی رکھا گیا۔ اور وہ علانیہ اور عام طور سے رائج ہو گئے۔ سوفسطائیوں کی تعلیم جس کا ذکر آگے آتا ہے اس ہی حالت کا آئینہ تھی اور بالکل اُس کے مطابق تھی۔ یونان کی اس حالت کو پڑھنے والا سمجھے گا کہ وہ ہندوستان کے حالات پڑھ رہا ہے۔ یہ تو اُس وقت کی حالت ہے کہ جب یونان میں جمہوریت کامل تھی۔ اور اب تو ایک چوں چوں کے مربہ کی ڈبیا کا نام جمہوریت رکھ لیا ہے اور ناریل والے بندر کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہے یہ ہے۔ لوگوں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام بنانے والے لوگ بنا ہی رہے ہیں۔ یونان کے یہ حالات اُس کی جمہوری حکومت کے پیدا کردہ تھے۔ اس جمہوری حکومت کے نظام میں حکومت کی جماعت لوگوں سے خائف رہتی تھی اور اُس کا مقصدِ اولین عمدہ اور منصفانہ حکومت کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ بارسوخ آدمیوں کے خوش کرنے کو اپنی حکومت اور اپنے اثر کا مقصد سمجھتے تھے۔ اس جمہوری طرزِ حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام لوگوں میں طمع، لالچ، عہدوں کی خواہش، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش، خود غرضی، خود سری، حرص، تملق اور خوشامد کے جذبات پھیل گئے۔ اور ایک ابتری پیدا ہو گئی۔

Marfat.com

یہ تھے وہ حالات جن کے زیرِ نظر سوفسطائیوں نے اپنا طرزِ عمل، طرزِ تعلیم اور مجموعہ عقلیات مقرر کیا تھا۔

روپیہ کی قدر و قیمت کو اپنی عزت و آبرو سے زیادہ سمجھنا اُن کی زندگی کا پہلا اصول تھا۔ اس زمانہ میں حق و صداقت کی قدر و قیمت نہیں تھی اور نہ اُس کی پرواہ کی جاتی تھی۔ دنیاوی وجاہت اور غلبہ اُن لوگوں کا مطمحِ نظر تھا۔ لہٰذا سوفسطائی بھی حق و صداقت کے لیئے بحث نہیں کرتے تھے بلکہ حق کو ناحق، اور ناحق کو حق ثابت کرنا اُن کا کام ہوتا تھا۔ اور وہ فخر کرتے تھے کہ ہم کالے کو سفید اور سفید کو کالا ثابت کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس ہی زمانہ کی یادگار ہے کہ آج کل وکلاء میں اس صفت کو علانیہ ممدوح سمجھا جاتا ہے۔

سوفسطائیوں کا سب سے بڑا کام لوگوں کو سیاسی زندگی کے لیئے تیار کرنا تھا اور اس کے لیئے ضرورت تھی کہ آدمی خوب بول سکے، جواب فوراً دے سکے، حق و ناحق کی پرواہ نہ کرے، اپنے مخالف کو الفاظ کے ہیر پھیر سے، گفتگو میں الجھن پیدا کر کے، اُس کو الفاظ کے جال میں پھانس کر غرض کسی طرح مغلوب کر دے۔ وہ ہی کامیاب سیاستدان مدبر و منتظم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو ہی آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع ملتے تھے۔ لہٰذا یہ صفات اس جماعت نے بدرجۂ اتم حاصل کر لی تھیں۔ اور لوگوں کو اس ہنر میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر اس زمانہ کے مدبروں کی تقاریر کا نمونہ اور حق سے روگردانی کا ہنر اس زمانہ میں کوئی دیکھنا چاہے تو کسی ملک کے پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران میں جا کر دیکھ لے۔ اور اگر عقلِ انسانی کی حماقت کا آخری درجہ معائنہ کرنا ہے تو ان ہی مدبروں کو یہ کہتا ہوا سن لے کہ ہم دُنیا کے مہذب ترین زمانہ کی ترقی یافتہ قوم کے افراد ہیں۔

سب سے پہلا سوفسطائی پروطاغورث Protagoras تھا جو تقریباً ۴۸۰ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۱۱ ق م میں دریا میں ڈوب کر مرگیا۔ اس کا مشہور فقرہ یہ ہے:-

Man is the measure of all things یعنی انسان ہی تمام اشیاء کی حقائق کا معیار ہے۔ سوفسطائیوں نے اپنے طرزِ عمل اور اپنے عقائد و اصول کو اس ہی کلیہ پر مبنی کیا تھا۔ اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ کلیہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ کہتے تھے کہ حق و صداقت کچھ نہیں۔ ان کا معیار کچھ نہیں۔ جس کو میں حق و صداقت سمجھتا ہوں وُہ ہی

Marfat.com

حق و صداقت ہے۔

بعد کے آنے والے سوفسطائیوں نے پروطاغورث کے اس کلیہ کو سیاسیات اور اخلاقیات پر حاوی کر کے عجیب نتیجے نکالے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ کوئی حقیقت اپنی ذات سے حقیقت نہیں اور جو بات یا شے کسی فرد کو حق و صداقت معلوم ہو اُس کے لیئے وہ ہی حق اور صداقت ہے۔ لہذا اخلاقیات کا بھی کوئی معیار اور عالمگیر ضابطہ نہیں ہے۔ جو فعل، خصلت، عادت یا صفت کسی شخص کو اچھی معلوم ہو وہ ہی اس کے لیئے اچھی ہے۔ اور اُس کو اُسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ گویا اخلاقیات کو انہوں نے ہر ایک شخص کے جذبات کے تابع کر دیا۔ جو میں حق سمجھتا ہوں وہ میرے لیئے حق ہے، جو تم حق سمجھتے ہو وہ تمہارے لیئے حق ہے اگرچہ دونوں آپس میں متضاد ہوں۔ گویا حق کا کوئی اٹل معیار نہیں ہے اور حق متضاد بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح سیاسیات میں اُنہوں نے عجیب اصول قائم کیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا اور بُرا قانون کوئی شے نہیں۔ عدل و انصاف کچھ نہیں۔ عدل وہ ہی ہے جو طاقتور کی طاقت کر سکے، یا اکثریت کی رائے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ قانون دراصل کمزور آدمیوں کی ایجاد ہے جنہوں نے اس طرح چالاکی سے طاقتور آدمیوں کو اپنے قابو میں کر کے انہیں اُن کے حق سے محروم کرنا چاہا۔ اور جو ثمرات اُن کو اُن کی طاقت کی وجہ سے مل سکتے تھے، اُن سے اُن کو محروم کر دیا۔ طاقت ہی کا قانون ہے جو قدرت میں رائج ہے لہذا اگر کوئی طاقتور آدمی قانون کی خلاف ورزی کامیابی کے ساتھ کرتا ہے تو یہ اُس کے لیئے جائز ہے۔ اسی طرح اُنہوں نے کہا کہ خدا کا تخیل کسی چالاک مدبر کی ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے اُس نے عوام الناس کو اپنے قابو میں کرنا چاہا۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ ہر ملک میں ہر طبقہ میں ہر زمانہ میں خدا کا تخیل پایا جاتا ہے۔ تو کیا سب جگہ اُسی ایک چالاک مدبر کی ایجاد ہے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایسے بہت سے زمانے آئے ہیں۔ اس کو زمانہ حال کی زبان میں روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ایسے تخریب کے زمانے عام طور سے زمانہ تعمیر کے بعد ہی آتے ہیں۔ جب تعمیری عنصر اپنا عمل کر چکتا ہے تو پھر اُس کے بعد یہ "روشنی" کا زمانہ آتا ہے۔ دراصل یہ اُس تعمیر کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔

Marfat.com

تعمیری زمانے کے نئے خیالات جب انسانوں کے دماغ سے پرانے تخیلات اور توہمات کو دور کرتے ہیں۔ تو پھر وُہ عوام الناس میں ایک تخریبی تحریک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عوام الناس میں انکار، شبہ اور بداعتقادی کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر ہر ایک فرد انسان ہی کو حق سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جو اُس کا اپنا قیاس ہوتا ہے وُہ حق شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک "روشنی" کا زمانہ جناب رسولؐ خدا کے بعد عرب میں آیا جس سے فائدہ اُٹھا کر خلافت اولے کی تشکیل ہوئی۔ اور پہلے تعمیری زمانہ کے خیالات واصول کو تخریبی صورت میں بدل دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو اخلاقیات، سیاسیات اور الٰہیات کا مجموعہ مرتب ہوا وہ پہلے تعمیری زمانہ کے اخلاقیات، سیاسیات اور الٰہیات سے بالکل مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد تھا۔

ایسا ہی "روشنی" کا زمانہ ہمارا موجودہ عصر ہے۔ ایک انگریز مفکر سوفسطائیوں کے فلسفہ اور اُن کے زمانہ کے حالات لکھنے کے بعد کہتا ہے:۔

یہ انگریزی عبارت کا ترجمہ ہے (۴۱) اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ A.

ترجمہ:۔ انگلستان اور فرانس میں شروع اٹھارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ایسی ہی روشنی کا زمانہ تھا۔ اور وہ زمانہ بھی کہ جس میں سے ہم اب گزر رہے ہیں ایسی روشنی کا زمانہ ہے۔ پرانے راسخ شدہ عقائد و آراء کو شک و شبہات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہر طرف تخریب ہے۔ تمام پرانے قائم شدہ آئین و رواج اور اداروں مثلاً نکاح، خاندان، حکومت اور مقرر شدہ قوانین پر تخریبی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ یہ موجودہ تخریبی زمانہ انیسویں صدی کے زمانہ کے بعد آیا ہے جو تعمیری غور و فکر اور سائنس کے نشو و نما اور عروج کا نہایت اہم اور جلیل القدر زمانہ تھا موجودہ زمانے نے Protagoras کے فلسفہ کے نمونہ پر اپنا ایک علحدہ فلسفہ قائم کیا ہے جس کو یہ لوگ Pragmatist کہتے ہیں۔ یعنی حق وُہ ہے جس پر عمل کر کے انسان کے اغراض و مقاصد کو فائدہ پہنچے۔ اگر Pragmatism انفرادی خودی کو میعار حق نہیں سمجھتا، تو کم سے کم وہ انسانی خودی کو تو میعار حق قرار دیتا ہے۔ (جناب اقبال اس خودی کے بہترین

(40) Will Will Durant : The life of Greece Chap. vi, p. 147

(41) A Critical History of Greek Philosophy by W.T. Stace, p. 121

Marfat.com

اُستاد ہیں۔ لہٰذا اس زمانہ میں حق کو ایک حقیقت بذات خود نہیں سمجھا جاتا ہے جس کی پیروی تمام بنی نوع انسان کو کرنی چاہیئے۔ بلکہ برعکس اس کے حق کو بنی نوع انسان کی خواہشات و مقاصد کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اب تو وہ ہی اعتقاد حق سمجھا جاتا ہے، جس سے دنیاوی نفع ہو اور جو زیر عمل آن کر اس منفعت کو پورا کرے۔ لیکن چونکہ جو اعتقاد ایک زمانہ یا ایک ملک میں مفید ہوتا ہے وہ دوسرے زمانہ یا دوسرے ملک میں مفید نہیں ہو سکتا۔ جو اعتقاد آج مفید ہے وہ کل مفید نہ ہوگا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ حق بذات خود انسانی مفاد سے علیحدہ نہیں۔ پروطاغورث نے تو حق کو انسانی جذبات پر منحصر رکھا۔ لیکن آج کل وہ انسان کے ارادہ یا مرضی پر منحصر رکھا جاتا ہے۔ ان دونوں نظریوں کے مطابق انسان کے اندر کی مستقل و دائمی شے یعنی عقل صحیح پر حق و اخلاقیات کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔ بلکہ اُن کی بنیاد انسان کے خاص انفرادی عنصر پر رکھی گئی۔ (ترجمہ ختم)

اس مصنف کی تحریر نہایت عاقلانہ مطابق صحیح منطق کے ہے۔ لہٰذا ہم چند مزید اقتباسات اس کی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔ آگے چل کر یہ فلاسفر لکھتا ہے یہ اس کی انگریزی تحریر کا اُردو ترجمہ ہے۔ (اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ B

ترجمہ ۱۱۔ سوفسطائیوں کے اچھے اور بُرے اصولوں کی نہایت عمدہ مثالیں زمانۂ حال کا مذہب پروٹسٹنٹ اور زمانۂ حال کی جمہوریت ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ مذہب پروٹسٹنٹ انسان کے اُس حق پر مبنی ہے جو اُس کو اپنی قوت فیصلہ استعمال کرنے کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان کا ذاتی حق ہے کہ وہ اپنی قوت فیصلہ استعمال کرے۔ اگر اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ امور مذہبی میں اپنے وہم و قیاس کو قانون سمجھنے کا حق رکھتا ہے تو پھر یہ تو نہایت خراب قسم کا پروٹسٹنٹ مذہب ہے۔ اب جمہوریت کو لو دراصل یہ سیاسی پروٹسٹینزم ہے۔ جمہوریت کے تمام تخیلات اور اصول پروٹسٹینٹ ریفارمیشن کے براہِ راست نتائج ہیں۔ اور اُس ہی سے ماخوذ ہیں۔ جمہوریت کا اصول ہے کہ کوئی صاحبِ عقل و فہم شخص اس بات پر نہیں مجبور کیا جا سکتا کہ وہ اس قانون کی اطاعت کرے جس میں اُس کے عقل و فہم کی رضامندی نہیں ہے۔ لیکن جس قانون کو وہ ماننے کے لیئے تیار ہے، وہ بھی تو اُس عقل انسانی کے

مطابق جو ودیعتِ نوعِ انسان میں ودیعت دوام ہے۔ اگر ہر ایک شخص کی من مانی ضد اور اُس کے وہم و خواہشات کو سندِ یقین کی کو قانون کا درجہ دے دیا گیا تو پھر جمہوریت فتنہ و فساد کو خطرناک انتہا ہو میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ سمجھ لینا کہ سوفسطائیوں کے اصول و عقائد اب محض مُردہ پرانے فرسودہ خیالات اور سابقہ تمدن کی نشانیاں ہیں جو محض مؤرخین کے لیئے دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ ہمارے کسی مطلب کے نہیں تو یہ غلطی ہے۔ برخلاف اس کے زمانۂ حال کے تخیلات و عقائد پورا نیچ ہیں وہ سب قطعاً سوفسطائیوں کے خیالات اور میلانات سے بھرے پڑے ہیں۔ آج کل اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی مضبوط رائے اور عقائد رکھنے چاہئیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس کے عقائد کیا ہیں۔ لیکن جو عقائد وہ رکھے ان پر مضبوطی اور سختی کے ساتھ جما رہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص مضبوط عقائد رکھتا ہے وُہ زیادہ دلچسپ ہے بہ نسبت اُس شخص کے جو کوئی رائے ہی نہیں رکھتا۔ لیکن محض عقائد رکھنے پر زور دینا غلط ہے۔ آخرکار آخری معیار و قدر یہ ہونی چاہیئے کہ جو عقائد ایک آدمی رکھتا ہے وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں۔ حق کا ایک اپنا مستقل معیار ہونا چاہیئے۔ اس امر کو بھول جانا اور صرف مضبوط رایوں کا راگ گاتا گویا کہ ان کی مضبوطی ہی ایک خوبی ہے سوفسطائیوں کی غلطی میں پڑ جانا ہے۔

ایک اور عام مقولہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے یہانتک تو صحیح ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی عقل استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کے غلط معنی لیئے جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص صریحاً خلاف عقل رائے یا اعتقاد رکھتا ہے اور بحث کا کوئی پہلو اُس کے لیئے نہیں رہتا۔ اور جو نظریہ وُہ اختیار کرتا ہے اس پر وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اس سے اس کو ہٹنا پڑتا ہے۔ اور اب اُس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہتا اور وُہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرے۔ تو ایسا شخص اس متذکرۂ بالا مقولہ کی آڑ لینے لگتا ہے کہ بہر صورت تم جس طرح بھی چاہے بحث کرو، مجھے تو اپنی رائے رکھنے کا حق اور اختیار ہے۔ لیکن ہم اُس کے اس دعوے کو کبھی نہیں مان سکتے۔ کسی شخص کو غلط رائے رکھنے کا اختیار نہیں ہے

Marfat.com

غلط رایوں کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ تمہیں کوئی رائے رکھنے کا حق نہیں ہے جب تک کہ وہ معقول یعنی عقل انسانی کے مطابق نہ ہو۔ تم یہ حق صرف اپنے توہمات اور نامعقول خواہشات کے لیے نہیں طلب کر سکتے ہو۔ ایسا کرنا گویا سوفسطائیوں کی غلطی میں پڑنا ہے۔ (دیکھو ۴۲)

یہ اقتباسات بڑے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ کیونکہ جو کچھ ان میں کہا گیا ہے وہ دنیا کی تاریخ کے مطالعہ اور بنی نوع انسان کی فطرت دائمی پر مبنی ہے۔ ہر ایک ترقی و عروج کے زمانہ کے بعد ایک جھوٹا روشنی کا زمانہ بھی آتا ہے۔ انبیاء و مرسلین کے بعد جھوٹے نبیوں کا آنا، اور اصلی ہنی بال، قیصر اور نپولین کے بعد نقالی ہنی بال، قیصر و نپولین کا آنا ضروری ہے۔ سوفسطائیوں کا سا زمانہ اکثر دنیا میں آتا رہا ہے، اور آتا رہے گا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جناب رسولؐ خدا کے زمانہ کے بعد جو زمانہ آیا وہ بھی ایسی جھوٹی روشنی کا زمانہ تھا۔ پچھلے زمانہ کی نکتہ چینی اور محض اپنے قیاس و توہمات پر انحصار و اعتماد و کامل، ایسے زمانہ کی یہ دو خصوصیات ہیں۔

سوفسطائیوں کے فلسفہ سے متاثر ہو کر اور اس کے نمونہ کو دیکھ کر زمانہ حال نے مذہب و سیاست میں اپنی آسانی کے لیے چند غلط اصول بنا لیے ہیں جن کا ذکر ان اقتباسات میں کیا گیا ہے اور ان پر نہایت عمدہ تنقید کی گئی ہے۔

ان ہی اصول سے ایک اور گمراہ کن کلیہ بھی نکالا گیا ہے کہ جو کچھ ہے خودی ہے۔ سر محمد اقبال کے اس فلسفۂ خودی پر ہم نے مستقل کتاب لکھا میں بحث کی ہے۔

سقراط: پیدائش ۴۷۰ ق م یا ۴۶۸ ق م۔ خودکشی بحکم سلطنت ۳۹۹ ق م۔ خاندانی پیشہ بُت سازی تھا۔ اور کچھ دن سقراط نے بھی بُت سازی میں گزارے اس کا وہ زمانہ تھا کہ جب ایران میں سلطنت ہخامنشی اپنے پورے عروج پر تھی۔ کروش اعظم Cyrus the Great کا زمانہ ۵۵۹ ق م سے ۵۲۹ ق م تک تھا۔

---

(42) Ibid. p. 370

Marfat.com

اس کا ذکر تعریف کے ساتھ بائیبل کے عہد عتیق میں بھی ہے جہاں اس کو خدا کا خاص آدمی کہا گیا ہے۔ اُس کے بعد اس کا لڑکا کمبوجیا تخت نشین ہوا جس نے ۵۲۱ ق م میں خودکشی کر لی۔ اُس کے باڈی گارڈ کا افسر دارائے اعظم اوّل تخت نشین ہوا۔ جس نے ۴۸۵ ق م تک سلطنت کی۔ اس وقت ایران کی سلطنت اپنے عروج پر تھی اور اس کی یونان سے جنگ رہتی تھی۔ ان کا مذہب زرتشتی تھا۔ ہندوستان میں بدھ مذہب اور جین مت کا زور تھا۔ شام و مصر و عرب اور اُس خطۂ زمین میں جس کو اب عراق کہتے ہیں۔ عرصہ سے حضرت ابراہیم اور دیگر انبیاء سابقہ کی تعلیم عام تھی۔ یونان کے ان تین بڑے حکماء، سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ ۴۶۹ ق م سے ۳۲۲ ق م تک تھا۔ تجارت اور جنگ ہائے دوامی کی وجہ سے یونان، ایران، ہندوستان شام و مصر میں ارتباط اور تبادلۂ خیالات عام تھا۔ اندریں صورت یہ قیاس یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ دنیائے ماضیہ کے مذاہب اور نظریات فلسفہ پر حضرت ابراہیم اور انبیائے بنی اسرائیل کے خیالات کا اثر بہت پڑا ہے۔ مؤرخین اور محققین کی ایک جماعت جس کا نہایت نامور نمائندہ زمانۂ قدیم کا مذہبی مؤرخ Philo ہے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ یونانی فلسفہ کی خوبیاں انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیم کی مرہون منت ہیں۔ یقیناً افلاطون اور ارسطو حضرت موسیٰ کی تعلیم کے پیرو تھے۔ اور انہوں نے اپنے فلسفہ کی خوبیاں بائیبل کے عہدِ عتیق کے مطالعہ سے حاصل کی ہیں۔ (۴۳)

سقراط سوفسطائیوں کے آخری زمانہ میں ہوا ہے۔ اُن کی نظریات اور ان کے فلسفہ کا اثر سقراط پر بہت زیادہ تھا۔ اُس نے انسان کے عقل و ذہن پر اتنا زور دیا کہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی سوفسطائیوں کے عقیدہ Man is the measure of all things کا قائل تھا۔ بعض مؤرخین اتنا زیادہ کرتے ہیں کہ انسان سے مُراد اُس نے نوع انسان کے مستقل اور دائمی عقل و ذہن سے لی تھی جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا نہ کہ افراد کے عقل اور ذہن سے جو ہر وقت تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اور جس کا کوئی

(43) Ibid p. 370　　(۴۳)

Marfat.com

معیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہونے کے بجائے خوش عقیدگی زیادہ ہے اُس کے ہمعصر اُس کو سوفسطائی کہتے تھے۔ (۴۴)

عقل انسانی کو اُس کے آخری درجہ کمال پر پہنچانا سقراط کے فلسفہ کا مقصد اور منتہائی نظر تھا۔ اُس کا روز کا معمول تھا کہ بازار میں جا کر لوگوں کے ساتھ بحث کرتا تھا۔ دوران گفتگو میں اُن سے سوال کرتا تھا۔ لیکن یہ سوال ایسے ہوتے تھے۔ جن سے اُن کی نظریات کی نکتہ چینی ہوتی تھی اور پھر آخرکار اپنے اُس نظریہ پر ختم کر دیتا تھا۔ جو وہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ سقراط کا یقین تھا کہ ایک غیبی آواز اُس کے روزانہ افعال کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ پہلے ہی سے اُس کے مجوزہ کاموں کے نیک و بد نتائج سے آگاہ کر دیتی ہے۔

سقراط کے پہلے کے حکماء دنیا کی ابتداء اور حقیقت اول کی ماہیت پر بحث کرتے تھے۔ سقراط نے اس طرف کبھی غور نہیں کیا۔ اُس نے خیال کیا کہ یہ امور کبھی معلوم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ انسان کی زندگی اور موت اور اُس کے مقصد حیات کو اپنے فلسفہ کا خاص موضوع بنایا ہے۔ علم پر زور بہت دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی و بدی کچھ نہیں۔ نیکی علم ہے، اور بدی جہالت ہے۔ سوفسطائیوں نے علم کی بنا محسوسات یعنی Perceptions پر رکھی ہے۔ سقراط نے علم کی بنا عقل Reason یا Concepts پر رکھی ہے۔ لیکن اس فلسفہ کے رو سے نیکی کی تعریف بے معنی ہو جاتی ہے۔ اُس کے قول کے مطابق نیکی کیا ہے؟ علم ہے۔ کس شے کا؟ نیکی کا۔ تو گویا نیکی کی تعریف یہ ہوئی کہ نیکی علم ہے نیکی کا۔ سقراط کے اس فلسفہ پر ارسطو نے بہت اچھی تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سقراط یہ بھول گیا کہ انسان کے افعال صرف عقل ہی پر مبنی نہیں ہوتے۔ لیکن دراصل انسانوں کی اکثریت کے افعال کے محرک ان کے جذبات ہوتے ہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ نیکی اس وجہ سے نیکی نہیں ہے کہ خدا نے کوئی معیار مقرر کر کے اُسے نیکی تصور کیا ہے۔ بلکہ اُس کے خدا نیکی کو نیکی اس وجہ سے

(۴۴)

(44) 1. The Life of Greece by Will Durant, p. 373.

2. History of Philosophy by Alfred Weber, pp. 45, 46

سمجھتے ہیں کہ وہ دراصل نیکی ہے۔ یہ تخیل مذہبی نہیں ہے بلکہ منفعت پر مبنی ہے۔ Utilitarian امر واقعہ یہ ہے کہ اس کا نیکی کا تصور بھی اس زمانہ کے معیار کے مطابق تھا۔ اس زمانہ میں یونان میں Homo-Sexuality (مردوں کا آپس میں مجامعت کرنا) زیادہ رائج تھا۔ اور سقراط بھی لڑکوں اور رنڈیوں کے عشق میں آلودہ رہتا تھا چنانچہ ایک خوبصورت نوجوان سے اُس کا عشق اسی قسم کا تھا۔ وہ لوگوں کو سکھاتا تھا کہ لڑکوں اور رنڈیوں کا رجحان کس طرح نیکی طرف کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح عشق میں ان سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ (۴۴ھ) یہ تھی اُس کی نیکی جس کا شہرہ اتنا بڑھا ہوا ہے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب سے بڑی نیکی خوشی و راحت ہے۔ اور اُس کے حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ علم ہے۔ (۴۵)

سقراط واقعی بہت بڑا فلاسفر تھا۔ لیکن اپنے بعض متقدمین سے کم تھا۔ مگر اُس کی شہرت کو اُس کی موت نے زیادہ کر دیا۔ (۴۶)

سقراط جمہوریت کے بہت خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جمہوری حکومت جاہلوں کی جماعت ہے جس کو جاہل منتخب کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ رعایا کی مدد کریں اور نہ اُن کی رہنمائی کریں اور نہ ہی اُن میں رہنمائی اور مدد کی اہلیت ہوتی ہے۔ یہ ایک ذلیل توہم ہے کہ کثرت و تعداد سے عقل پیدا ہو جاتی ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک انبوہ میں لوگ نہایت ظالم اور احمق ہوتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ تو کچھ سوچ سمجھ بھی لیں۔ لیکن انبوہ تو محض احمقوں کا گروہ ہوتا ہے۔ کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے کہ ملک پر وہ لوگ حکومت کریں جنہیں محض زبان چلانی آتی ہے۔ اور جو کانسی کے برتن کی طرح ہیں۔ کہ جب اُس پر چوٹ پڑتی ہے تو وہ بولے جاتا ہے اور بولتا رہتا ہے جب تک اُس پر ہاتھ رکھ کر اُسے بند نہ کریں۔ قوم اور ملک اُسی وقت طاقتور ہو سکتے ہیں کہ جب سب سے زیادہ علم اور عقل والے لوگ حکومت کریں۔ اور جمہوریت میں یہ ناممکن ہے۔

(44a) The Life of Greece by Will Durant, pp. 364, 366.

(45) Ibid. p. 372

(46) 1. History of Philosophy by A. Waber, P.49.

2. Life of Greece P. 364.

اپنی روزانہ کی بحث میں بھی بارسوخ لوگوں کے عیوب ظاہر کیا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں جمہوری حکومت کے خلاف اُمراء نے ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہلِ حکومت سمجھے کہ اس میں سقراط کا ہاتھ ہے۔ کئی بارسوخ آدمی مثلاً Anytus Aristophanes اور Melotus اُس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اُس کی جان لی جائے۔ سقراط کی عمر ستر سال تھی کہ اُس پر تین الزامات لگا کر مقدمہ چلایا۔ (۱) سقراط مُلک کے خداؤں کی توہین کرتا ہے۔ (۲) اس نے اپنے علحدہ خدا قائم کر لیئے ہیں۔ (۳) ملک کے نوجوانوں کو اپنے بزرگوں سے منحرف کر دیا ہے اور اُن کے اخلاق خراب کر دیئے ہیں۔ دراصل یہ بہانہ ہی تھا۔ مقدمہ قائم ہوا۔ وہ ہی لوگ جج تھے جو سقراط کے دُشمن تھے۔ ۳۹۹ ق م میں ان جاہلوں کے ایک زہر کے پیالہ نے اتھنز کے بہترین آدمی کا چراغِ حیات ہمیشہ کے لیئے گل کر کے جہالت کے عیوب کو اچھی طرح نمایاں کر دیا۔ تاریخِ عالم کے ہر زمانہ میں یہ کلیہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ جاہلوں کو عقل سکھانا اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا ہے۔ یہ کلیہ انبیاء، آئمہ اور حکماء سب کے لیے ہے۔

ان الزامات میں سے ایک الزام سقراط کے مذہب کے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ سوال بھی دلچسپ ہے کہ سقراط کا مذہب کیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وُہ موحد تھا۔ اگر موحد کے وہ ہی معنی لیئے جائیں جو آج کل ہیں، تو یہ خیال قطعاً غلط ہے۔

اگرچہ سقراط کو موت کی سزا دینے میں ایک یہ بھی بہانہ تھا کہ وُہ مذہب کے خلاف ہے لیکن وُہ اپنے شہر کے خداؤں کی حمد کرتا تھا۔ مذہبی رسوم میں شامل ہوتا تھا۔ اور کبھی ایسا لفظ نہیں کہا کہ جس سے خدائیگانِ شہر کی توہین ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ وُہ کہتا تھا کہ ہمیں خداؤں کا علم نہیں ہے۔ اس موت کے بعد زندگی ہے یا نہیں۔ وُہ ڈلفی (Delphi) کی بصیرت پیشین گوئی کا بہت قائل تھا۔ اس کا فلسفہ محض اخلاقیات تھا۔ الٰہیات سے تعلق نہ تھا۔ الٰہیات پر غور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے کلمات کہتا تھا جن سے ترشح ہوتا تھا کہ وُہ ایک بہت بڑے خدا کو مانتا ہے۔ لیکن دیگر خداؤں کی بھی عزت کرتا تھا اور ان کا معتقد تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ کا قائل نہ تھا اگرچہ الا اللہ کہہ لیتا تھا۔ چونکہ تبرا نہیں کرتا تھا، لہٰذا تو وُہ مکمل نہ تھا۔

Marfat.com

سقراط نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اُس کی ساری تعلیم زبانی تھی۔ اس کے حالات اُس کے دو شاگردوں افلاطون اور زنوفن Xenophanes کی تحریرات سے معلوم ہوئے۔ لیکن وُہ تحریرات خالص تاریخ نہیں ہیں۔ ایک مؤرخ کہتا ہے کہ افلاطون کی تحریر تو محض خیالی ڈراما ہے۔ اور زنوفن کی تحریر سقراط کے متعلق محض تاریخی ناول ہے۔ خود سقراط کہا کرتا تھا افلاطون میرے متعلق بہت غلط باتیں لکھ رہا ہے۔ (۴۷) معلوم ہوتا ہے کہ سقراط کی شہرت و عظمت کو اُس کے بعد کے بہت بعید زمانہ کے لکھنے والوں نے اپنے تخیلات کو کام میں لاکر بہت بڑھا دیا ہے۔ ورنہ اُس کے زمانہ کے لوگ اور اُس کے نزدیکی زمانہ کے اُسے جاننے والے لوگ جب اُس کے حالات اور افعال لوگوں کے حافظہ میں تازہ تھے، اُس کی نسبت کچھ اچھے خیال نہیں رکھتے تھے۔ وُہ کہتے تھے کہ اُس کی تعلیم کچھ نہ تھی۔ وُہ تو محض ایک جاہل، عیاش و بدکار شخص تھا۔ (۴۸) دراصل اُس کی موت کے واقعہ نے اُسے ہر دلعزیز بنا دیا۔ بات تو یہی ہے کہ ؎

منشی کردہ ام رستم داستاں دگر نہ یلے بود در سیستاں

فلسفۂ کلبیہ سقراط اور اُس کے شاگرد افلاطون کے درمیان فلسفۂ کلبیہ کا ذکر ضروری ہے۔ جس کو سقراط کے ایک دوسرے شاگرد Antisthenes نے مرتب کیا تھا۔ اور وُہ ہی اُس فلسفہ کا بانی ہے۔ اس فلسفہ کا بیان اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اہل علم و عقل پر اچھی طرح عیاں ہو جائے کہ جب انسان خداوند تعالےٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیم سے انحراف کرکے اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے قیاس کے مطابق نظریات بناتے ہیں۔ تو انسانیت کے درجہ سے گرکر حیوانوں میں جا ملتے ہیں۔ یہ بڑے سے بڑے فلاسفر اور حکماء کی حالت ہوتی ہے۔ اس فرقہ کے بانی Antisthenes نے اس فلسفہ کے اصول سقراط سے اخذ کیئے تھے۔ جس کے درس میں وُہ روزانہ صبح پانچ میل کی مسافت پیدل طے کرکے جایا کرتا تھا۔ غالباً سقراط کے اُس درس میں یہ موجود تھا جس میں ایک سائل کے متعدد

(47) The Life of Greece p. 364

(48) Ibid.

سوالات پر سقراط نے ان اصول و خیالات کا اظہار کیا جن پر اپنے فلسفہ کلبیہ کو (ANTISTHENES) نے مبنی کیا تھا۔ یعنی جسمانی ضروریات کو ان کی کمتر ین ضروری حد تک رکھنا یہ اس فلسفہ کا اصول ہے ANTISTHENES (444-365 B.C) نہایت فقیرانہ پھٹا پرانا لباس پہنتا تھا۔ جس پر سقراط نے اس پر نکتہ چینی کی کہ اس گدڑی کے سوراخوں میں سے مجھے تکبرانہ انداز نظر آتا ہے۔ سقراط کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے فقط دکھاوے کے لیئے یہ لباس اختیار کیا ہے۔ اور اپنی درویشانہ طرزِ رہائش پر تکبر ہے۔ سقراط کے مرنے پر اُس نے اپنا علیحدہ درس دینا اختیار کیا، اور اپنی درس گاہ Gymnasium Cynosarges میں مقرر کی Cynosarges کے معنی DOG FISH کے ہیں۔ غالباً اسی جگہ کی نسبت سے یا زیادہ ممکن یہ ہے کہ ان کی ترش روئی اور ترش خوئی کی وجہ سے ان کو Cynics کہنے لگے یہ شخص غربت زدہ مزدوروں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے طلباء غریب ہوا کرتے تھے اور یہ فیس نہیں لیتا تھا۔ اور جو شاگرد سختیاں برداشت کرنے کے لیئے تیار نہ ہوتا تھا، یا غربت کو پسند نہیں کرتا تھا وہ نکال دیا جاتا۔ اس کا شاگرد رشید دیوجانس Diogenes تھا جو نہایت ہی پھٹے پرانے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اسی ہی نسبت سے غالباً اردو میں دقیانوسی کا لفظ پُرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے لیئے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس نے اپنے استاد کے عقائد کو تمام یونان میں مشہور کر دیا۔ یہ شخص غالباً ۴۱۲ ق م میں پیدا ہوا، اور ۳۲۳ ق م میں مر گیا شائد اس نے خودکشی کر لی۔

اس فلسفہ کی تشریح دقیانوس کی زندگی اور اس کے مقولوں سے بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی یہ تھی کہ شہر کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتا پھرتا تھا، اور بھیک پر ہی گزارہ تھا۔ جب اُس کو اس فلسفہ کے اصول معلوم ہوئے کہ یہ افلاس اور اس طرح بھیک پر گزارہ کرنا بھی نیکی اور عقل ہے تو اُس نے بڑی خوشی سے اس کو اختیار کر لیا۔ فقیروں کا لباس پہن کر فقیروں کی جھولی اور ڈنڈا لے لیا۔ اور بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ کچھ عرصہ تک اُس نے ایک مٹکے میں اپنا گھر بنا لیا۔ اور اتھنز میں Cybele دیوی کے مندر کے احاطہ میں

Marfat.com

لگا۔ جانوروں کی طرح رہنا اس کا مقصد حیات تھا۔ زمین پر سوتا تھا۔ اور جو مل جاتا تھا، وُہ کھا لیتا تھا۔ اور کتوں اور جانوروں کی طرح سب لوگوں کے سامنے ہی پیشاب و پاخانہ کرتا تھا۔ اور سب کے سامنے بغیر کسی جھجک کے عورتوں سے مجامعت کرتا تھا وہ عورتیں بھی غالباً اسی نیچری فرقے کی ہوں گی۔ کبھی کبھی ہاتھ میں چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ آدمی کو تلاش کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی مذاق بھی کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ ایک رنڈی کے لڑکے کو ایک انبوہ میں لوگوں پر پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا تو اُس سے کہا کہ دیکھو اس انبوہ میں کوئی تمہارا باپ بھی ہوگا، اُس کو نہ پتھر لگ جائے۔ ان نوجوانوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ جو عورتوں کی طرح بنتے اور سنورتے تھے اور اپنے بال بناتے تھے۔ ایسے ہی ایک نوجوان کو دیکھ کر اُس نے کہا بتاؤ تو بھی تم مرد ہو یا عورت۔ معلوم ہوتا ہے کہ حال نے ماضی کا جنم لے لیا ہے۔ آج کل کالج کے لڑکوں میں خصوصاً اس کالج کے طلبہ میں جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر پڑھتے ہیں یہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لڑکا کون ہے اور لڑکی کون ہے۔ لڑکے تو لڑکیوں کی طرح بال بناتے ہیں، اور لڑکیاں لڑکوں کی طرح بال کٹواتی ہیں۔ اور مُلّا لوگ چلاتے ہی رہ جاتے ہیں کہ قیامت نزدیک آگئی صورِ اسرافیل کے لیے تیار ہو جاؤ۔

دقیانوس یونان کے شہر کورنتھ میں رہنے لگا تھا۔ اُس کا اور سکندر کا قصہ تو مشہور ہے جس پر سکندر نے کہا تھا کہ اگر میں سکندر اعظم نہ ہوتا تو دقیانوس ہونا پسند کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں یونان میں دو ہی آدمی سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ایک سکندر، دوسرے دقیانوس۔ ان دونوں کے ستارے بھی ایسے ملے تھے کہ دونوں ایک ہی دن ۳۲۳ سنہ ق م میں مر گئے۔ سکندر بابل میں ۳۳ سال کی عمر میں، اور دقیانوس کورنتھ Corinth میں نوّے اور یک صد سال کے درمیان کی عمر میں۔

فلسفہ کلبیہ نہایت سیدھا سادا تھا۔ سوائے مطالعۂ نیچر کے اُنہوں نے دیگر تمام علوم کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ نیچر کا مطالعہ بھی دُنیا کی تشریح کرنے کی غرض سے نہیں۔ کیونکہ وُہ ناممکن ہے۔ بلکہ اُس سے عقل اور طرزِ رہائش سیکھنے کے لیے وُہ کہتے تھے کہ انسان کی زندگی کا مقصد محض خوشی حاصل کرنا

Marfat.com

ہے ۔ اصلی خوشی تلاش کرنے سے نہیں ملتی ۔ بلکہ نیچر کے مطابق سادہ زندگی قدرتی طریقہ پر بسر کرنے سے ملتی ہے جس میں باہر کی چیزوں مثلاً دولت، عمدہ لباس، اچھی خوراک سے مدد نہ لی جائے ۔ بغیر اشیائے عیش و عشرت کے سیدھی سادی نیک زندگی ہی سے قناعت ملتی ہے ۔ دولت سے اطمینان ضائع ہو جاتا ہے ۔ اور وُہ خواہشیں جن میں حسد کی آمیزش ہو، روح کو برباد کر دیتی ہیں ۔ دقیانوس کہتا تھا کہ خداؤں نے تو انسان کے لیئے آسان زندگی مقرر کی تھی ۔ لیکن خود انسان نے عیش و عشرت کے اسباب کی خواہش سے اُسے بگاڑ دیا اگرچہ خداؤں کا ذکر آمدِ سخن کر لیا ۔ ورنہ کلبیہ جماعت کو ان خداؤں پر اور اُن کے مذہب پر مطلقاً یقین نہ تھا ۔ نیکی کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ اتنا کھانا اور اتنی چیزیں رکھنی جو صرف ضرور ہوں ۔ اور کسی کو نقصان نہ دینا اور تکلیف نہ پہنچانا یہ نیکی ہے ۔ تمام خواہشات میں سے یہ لوگ عورتوں کی خواہش کو جائز تصور کرتے تھے لیکن شادی نکاح کے خلاف تھے ۔ ہاں رنڈیوں کو پسند کرتے تھے ۔ دقیانوس عورتوں اور مردوں کی آزاد عشقبازی اور عورتوں کی اشتراکیت کا حامی تھا ۔ یہ وہ ہی کمیونزم تھا جو آج کل بھی کہیں کہیں جاری ہو گیا ہے، اور اس کے عام ہونے کے سامان نظر آتے ہیں ۔ عورتوں کے ساتھ مباشرت اور مجامعت کرنے کی خواہش کو قدرتی اور جائز تصور کرتے تھے جس طرح وُہ بھوک کو جائز کہتے تھے ۔ لہٰذا اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ جس طرح لوگوں کے سامنے کھانا کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی، اسی طرح لوگوں کے سامنے عورتوں سے مجامعت کرتے ہوئے بھی نہیں شرمانا چاہیئے ۔ چنانچہ وُہ یہ فعل نیک و جائز، تمام لوگوں کے سامنے عین بازار میں کیا کرتے تھے ۔ موجودہ زمانہ کا منطق بھی اسی طرف جا رہا ہے ۔ اور وُہ دن بھی دور نہیں جب یہ نیک و مبارک فعل بھی لنڈن کے ہائڈ پارک کی طرح دنیا کے تمام کوچہ و بازار میں عام ہو جائے گا، اور علانیہ کیا جائے گا ۔ بلکہ یہ فیشن ہوگی ۔ ایسا کرنے والے مرد و عورت ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ کہلائیں گے ۔ اور اس فعل کو شرم و حیا سے پوشیدہ کرنے والے اگلے وقتوں کے جاہل لوگ سمجھے جائیں گے ۔ اس کا منطق تو بالکل صاف اور عیاں ہے، لیکن اس فلسفہ کی معقولیت بالکل پنہاں

ہے۔ یوں تو خوشی کے ہر ایک قسم و نوع کو رد کرنا اور اعلان کرنا کہ جسمانی راحت و خوشی ایک بہت بڑی بدی ہے۔ یہاں تک کہ ذہنی اور دماغی خوشی جو فلسفہ و علم سے حاصل ہوتی ہے اُس کو بھی بُرا بتانا، اور ساتھ ہی عورتوں کے جسم سے مرد کو خوشی حاصل ہوتی ہے اس میں اتنی افراط کرنی کہ کوچہ و بازار میں اس فعل کو علانیہ کرنا ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"۔ غرضکہ تہذیب و انسانیت کو چھوڑ کر عریاں نیچر اور حیوانیت کی طرف جانا ان کا اصول تھا۔ انفرادی آزادی اور عقلیت کا نظریہ جو سوفسطائیوں اور سقراط نے قائم کیا تھا۔ اُس کو ان کلبیوں یعنی کتوں نے زیر عمل لاکر دکھایا جس کی جرأت سقراط اور سوفسطائیوں کو نہ ہوئی وہ اُنہوں نے عیاں کر دی۔

ان لوگوں نے انفرادی اور شخصی آزادی کو اُس کے منطق کے آخری حد تک پہنچایا اور اصول قائم کیا کہ خودکشی جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے کیونکہ دُنیا کے مصائب و آلام اس طرح ہی دور ہو سکتے ہیں۔ اور تو کچھ اُمید باقی نہیں۔ معلوم نہیں خوشی و راحت سے احتراز کرنے کا اصول دل سے تھا یا فقط زبانی۔ کیونکہ عورت سے جو خوشی مرد کو حاصل ہوتی ہے اُس کے تو یہ لوگ بڑے شوق سے گرویدہ تھے۔ غالباً اُس کو اُنہوں نے نیچر کے اصولوں پر جائز سمجھا تھا۔

نیچر کی طرف پھر واپس چلنے کا کلبی فلسفہ اُس بڑی تحریک کا ایک حصہ تھا، جو پانچویں صدی قبل مسیح کے اختتام میں اُس زمانہ کی مصائب و آلام اور دقتوں سے بھری ہوئی تہذیب کے خلاف رد عمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ ایک انگریزی مورخ Will Durant کہتا ہے کہ آج کل کی تحریک عریانی۔ جو یورپ میں عام ہوتی جا رہی ہے، اُسی ہی کلبی فلسفہ کا نتیجہ ہے اور اُن ہی اسباب سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی تہذیب کے مصائب و مظالم و آلام جو آج کل بھی اُس زمانہ کے اختتام کی طرح رائج اور حاوی ہیں اُس کا موجب ہے۔ زمانہ حال کی تحریک عریانی Nudism کے چند رسالے جن میں اس کا فلسفہ اور مرد و عورتوں کی عریاں تصاویر ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس خاکسار کے پاس موجود ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیب اور قانون جن میں انسان کے آزاد عمل پر ہر جگہ بندشیں اور

Marfat.com

قیود ہیں۔ خلاف نیچر ہیں۔ نیچر میں لباس نہیں ہوتا لہٰذا ننگا رہنا چاہیئے۔ نیچر میں آگ سے خوراک نہیں پکائی جاتی، لہٰذا دقیانوس کچا گوشت کھایا کرتا تھا۔

دقیانوس کے شاگردوں Crates اور Stilpo نے اس کا فلسفہ تمام یونانی دنیا میں پھیلایا، اور اُس کے ہی اصول کی بنا پر آگے چل کر Stoicism نے جنم لیا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ کلبی فرقہ بطور ایک فلسفی جماعت کے تو ختم ہوگیا لیکن اس کا اثر یہودیت اور مسیحیت پر بہت ہوا۔ یہودیت کا فرقہ Essanes اس کا براہ راست نتیجہ تھا مسیحیت کا بہت بڑا رہنما John the Baptist اس فرقہ ہی کا ایک ممبر تھا۔

رہبانیت اور دیر کی زندگی اس کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ عورت و مرد کی مباشرت و مجامعت کو نیچر کے مطابق سمجھتے تھے۔ غالباً اُس ہی اصول کو مدِ نظر رکھ کر مسیحیت کے سالانہ میلے جن میں مرد مونک Monk اور عورتیں Nun شامل ہوتے تھے اور کہ بارہ بجے رات کو چراغ گل کر دیا جاتا تھا۔ اُس وقت یہ لوگ نیچر کے اس فعل میں بلا تمیز رشتہ اور عمر کے مشغول ہو جاتے تھے اس فلسفہ کا نتیجہ تھے۔ ان میلوں کا ذکر گبن نے اپنی تاریخ "زوالِ سلطنت روما" میں بہت اچھی طرح کیا ہے۔

اس کلبی فلسفے کے یہ تمام حالات ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں سے لیئے ہیں۔ (۴۹)

لذاتی فلسفہ: Cyrenaic School سقراط کے فلسفے سے جو فلسفے پیدا ہوئے (Cynic) کا تو ذکر ہم کر چکے ہیں۔ لذاتی فلسفہ Cyrenaic School اُس کے دوسرے شاگرد Aristippus نے سقراط کے اس نظریہ کی پیروی میں کہ انسان کا مقصدِ حیات خوشی و راحت ہونا چاہیئے، لذاتی فلسفہ کی بنا ڈالی۔ یہ شخص افریقہ کے ساحل کے شہر Cyrene کا باشندہ تھا۔ یہ بھی سقراط کا شاگرد تھا۔

(49) Life of Greece, pp. 503 to 509 The Story of Philosophy p. 57 Encyclopedia of Ethics & Religions. A Critical History of Greek Philosophy by W.T. Stace, p. 159. "But the Cynics, to show their indifference, flouted public opinion and gave frequent and disgusting exhibitions of indecency".

اور اس کی موت کے بعد مختلف شہروں کا سفر کرنے کے بعد اپنے شہر Cyrene میں مستقل اقامت اختیار کی اور وہاں اپنا فلسفہ کا یہ سکول قائم کیا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا:۔

جو کچھ ہم کرتے ہیں وُہ خوشی کی اُمید یا تکلیف کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں جب ہم اپنے دوستوں پر روپیہ خرچ کرتے ہیں، فوج کے سرداروں کے حکم پر اپنی جان دیتے ہیں وُہ بھی اس ہی اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ یقینی ہے کہ خوشی ہی اصلی اور آخری نیکی ہے۔ اور تمام علم و فلسفہ اور تمام نیکیوں کی خوبی کا معیار اس ہی تناسب سے ہے کہ وُہ ہم کو کس قدر لذت و حظ پہنچاتی ہیں۔ عقلمندی یہ نہیں ہے کہ ہم حق و صداقت کو تلاش کریں۔ بلکہ عقلمندی یہ ہے کہ ہم اُن چیزوں کو تلاش کریں جو ہم کو لذت و حظ پہنچاتی ہیں۔ بہترین حظ و لذائذ اخلاقیات یا علم میں نہیں ملتے۔ بلکہ جسمانی اور نفسانی حظ سے حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا عقلمند آدمی وہ ہے جو جسمانی حظ و لذت کو حاصل کرے۔ موجودہ لذت کو آئندہ کی اُمید میں نہ کھونا چاہئیے۔ ہمارے لیئے تو صرف حال ہی ہے مستقبل کچھ نہیں۔ زندگی کا نظریہ ہے کہ ہم ہر ایک لذت کو حاصل کریں جو ہم کو مل سکے اور جو موجودہ لمحہ میں لذت مل سکے اُس کو حاصل کریں۔ فلسفہ کا کام یہ ہے کہ ہم کو لذات کی طرف لے جائے۔ نہ کہ لذات کو ترک کرنے کی ہدایت کرے۔"

ارسٹی پس Aristippus اپنے نظریات پر پورا پورا عمل کرتا تھا۔ ہر طریقہ سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حکام کی خوشامد بہت کرتا تھا۔ ایک شخص نے اُس کو بُرا بھلا کہا کہ حاکم شہر Dionysius کے قدموں پر کیوں گرتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر حاکم کے کان پیروں میں لگے ہوں تو میں کیا کروں۔ یہ میرا قصور تو نہیں۔ اس طرح روپیہ حاصل کر کے وُہ اچھی پوشاک، اچھی خوراک اور حسین عورتوں اور رنڈیوں پر خرچ کرتا تھا۔ ایک شخص نے اُس کو ملامت کی کہ تو رنڈی کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اُس مکان میں رہوں یا اُس جہاز میں سفر کروں جس میں مجھ سے پہلے اور لوگ بھی رہ چکے ہیں یا سفر کر چکے ہیں۔ اُس کی رنڈی معشوقہ نے کہا کہ مجھے تمہارا حمل ہے اُس نے کہا کہ اگر تم خاردار جھاڑیوں میں سے گزرو تو تم کیونکر کہہ سکتی ہو کہ کونسا کانٹا تمہیں چبھا ہے۔

* فلاسفر غالباً ۴۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۵۶ ق م میں مر گیا۔ ایسے فلسفے ہیں

جن پر مغربی تہذیب کا کاخ خوشنما کھڑا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب پوری کیا منحصر ہے، ماضی وحال کے بادشاہوں کا بھی یہی فلسفہ تھا۔

ٹولمی ثانی، شاہ مصر PTOLEMY II PHILADELPHUS (309 B.C. TO 247 B.C) کا یہی فلسفہ تھا۔ اور اس فلسفہ کو اختیار کر کے اُس پر اُس نے پورا عمل کیا تھا۔ ہر ایک خوشی و لذت جو اُس کو حاصل ہو سکتی تھی وہ لیتا تھا بہت خوراک کھاتا تھا۔ بہت سی رنڈیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور آخرکار اپنی بہن سے شادی کر لی۔

رواقی یا لذاتیہ حکماء۔ کلبی اور لذاتی حکماء کا ذکر تو ارسطو کے بعد ہونا چاہیئے تھا کیونکہ یہ سب فلسفے مابعد ارسطو کے کہلاتے ہیں۔ ان تینوں حکماء یعنی سقراط، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات سے ان فلسفوں کا تعلق ہے۔ لیکن ہم نے سلسلہ قائم رکھنے کے لیئے سقراط کے بعد ہی کلبی فلسفہ کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ براہِ راست کی تعلیم کا نتیجہ ہے اور اس کے شاگردوں ہی نے اُس کی بنا ڈالی ہے۔ اسی طرح لذاتی فلسفہ بھی اُس کے شاگرد نے جاری کیا اور اُس کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اور اب جو ہم Epicurus کا ذکر کر رہے ہیں تو اُس کا لذاتی فلسفہ بالکل وہی تھا جو سقراط کے شاگرد Aristophanes نے جاری کیا تھا۔ اُس کو ہم نے Cyrenaic School کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دراصل یہ فلسفے سقراط کی تعلیم سے نکلے ہیں۔ افلاطون یا ارسطو سے ان کا زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے اس عام ترتیب و تجویز سے تجاوز کرنے کی معافی چاہتے ہیں۔

Epicurus یہ حکیم ۳۴۲ ق م میں بمقام Samos پیدا ہوا تھا۔ یہ شہر اس ہی نام کے جزیرہ کا دارالسلطنت ہے۔ اور یہ Samos جزیرہ بحرایجین میں ایشیائی کوچک کے ساحل کے پاس ہے۔ ۲۷۰ ق م میں پتھری کے مرض میں بمقام LAMPSACUS مرگیا۔ یہ شہر ایشیائی کوچک کے شمال میں طول البلد ۲۶ ۵۰ ۲ عرض البلد ۴۰ ۲۰ پر واقع تھا۔ یہ حکیم بھی لذتوں کا دلدادہ تھا اور اُس کے فلسفہ کی بنیاد حفظ نفس اور لذتِ جسم پر تھی۔ موجودہ لذتوں کا حاصل کرنا، عمدہ خوراک کھانا اور نفیس پوشاک پہننا اور عورتوں اور قحباؤں سے بہرہ اندوز ہونا اور ان سے

Marfat.com

لذت اٹھانا اس کی زندگی کے مقاصد اور اس کے عمل کے عناصر تھے۔ ہر قسم کے مرد و عورت اس کے شاگردوں میں داخل تھے۔ ایک قحبہ بازاری Leontium اس کی شاگرد تھی جس سے اس نے شادی بھی کر لی تھی۔ کسی نہ کسی طریقہ سے روپیہ کمانا اس کا ہنر تھا۔ اور عورتوں کی لذت میں مصروف رہنا اس کا وطیرہ تھا۔ مذہب سے اس کو نفرت تھی۔ یونان کے اس زمانہ کے خداؤں کے تخیل کے علاوہ اس کو الٰہیات کا علم نہ تھا۔ کہتا تھا کہ ان اولمپس کے خداؤں نے نہ دُنیا بنائی اور نہ اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ بہت دُور رہتے ہیں۔ ان کو اپنے ہی عیش و عشرت سے فرصت نہیں ہوتی۔ یہ کہتا تھا کہ ہماری جیسی بہت سی دُنیائیں ہیں۔ لیکن ہم کو اُن پر غور نہ کرنا چاہیئے۔ انسان اسی طرح بذریعہ ارتقا، جانوروں میں سے پیدا ہو گیا ہے۔ سب مادہ ہی ہے۔ نفس و روح بھی مادہ ہیں۔ لیکن انسان کا ارادہ آزاد ہے۔ اگر ہمارا ارادہ آزاد نہ ہوتا تو ہماری زندگی بے معنی تھی۔ فلسفہ کا کام دنیا کی تخلیق و حالت پر غور کرنا نہیں ہے کیونکہ کل کو جزو نہیں معلوم کر سکتا۔ سادہ زندگی بسر کرنا اور دنیا کی جسمانی لذات اور حظ میں مشغول رہنا ہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ اس کا یہ فلسفہ بظاہر ایسا دلآویز تھا کہ بہت جلد یونان میں پھیل گیا۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:۔

Epicureanism was publicly denounced and privately accepted in wide circles throughout Hellas(50)

یعنی اس فلسفہ کو لوگ بظاہر تو برا کہتے تھے، لیکن پرائیویٹ طور پر تمام یونانی دُنیا کے حلقوں نے اس کو قبول کر لیا تھا، اور اُس کی پیروی کرتے تھے۔

سسرو کے زمانہ میں روم میں یہ لوگ بہت تھے۔ یہاں تک کہ قیصر کانسٹنٹائن Constantine کے زمانہ میں بھی اُن کی کثرت تھی۔ یہ بادشاہ ۲۷۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۳۳۷ء میں مر گیا۔ اُس زمانہ کا کیا ذکر ہے۔ آج بھی عیسائی و مسلم و یہودی اور ایشیائی دُنیا میں اس ہی فلسفہ کی حکومت ہے بات وہ ہی ہے کہ زبان سے انکاری ہیں، دل سے اُس کے فدائی ہیں۔

(50) The Life of Greece, p. 649

اُس کے سب سے زیادہ محبوب اور مشہور شاگرد METRODORUS نے اس کے فلسفہ کو ان چند الفاظ میں بیان کیا ہے :-

All good things have reference to the belly

یعنی دُنیا کی تمام عمدہ اور نیک چیزیں آخر کار پیٹ سے تعلق رکھتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تمام خوشیاں، اُس کے تمام فلسفے اور تمام نیکیاں جسمانی لذت پر منتہی ہوتی ہیں -

اسی ہی فلسفہ پر Marx کا Materialism اور Engels کا Communism زمانہ حال میں تیار ہوا ہے - اور اس پیٹ کے ہی مسئلہ پر دُنیا میں اُس کا اقتدار مبنی ہے -

رواقی حکماء کا فلسفہ - رواقی فلسفہ Stoicism

انسان کا پیٹ یعنی اُس کے خواہشاتِ نفسانی اور دُنیا کے مصائب و آلام یہی وہ دو مسائل ہیں جن کا حل کرنا تمام دینی اور لا دینی فلسفوں کا مقصد رہا ہے - امرِ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی خواہشات نفسانی ہی دُنیا کے تمام مصائب و آلام کی ذمہ دار ہیں - دُنیا کے تمام مصائب و آلام نتیجہ ہیں اُس ظلم کا جو ایک انسان دوسرے انسان پر کرتا ہے - اور وہ ظلم پھر ظالم ہی کے گلے میں آن کر پڑتا ہے - اور اسی طرح یہ مصائب و آلام مرکب ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تمام دُنیا ان ہی مصائب و آلام سے بھر گئی ہے - اور اب دنیا میں دو ہی چیزیں نظر آتی ہیں - مصائب و آلام اور ظلم - اور یہ ظلم نتیجہ ہے انسان کی خواہشاتِ نفسی کا - ان تمام لادینی فلسفوں نے اصلی وجہ پر تو غور نہیں کیا، مصائبِ دُنیا سے گھبرا گئے - اور راہِ فرار ڈھونڈنے لگے - دُنیا جیسی بنائی گئی ہے، وہ بُری نہیں ہے - نہایت اچھی جگہ ہے - لیکن انسان نے اُس کو بگاڑ دیا ہے - ان حکماء نے دُنیا کے مصائب کو مدِ نظر رکھ کر دو مختلف اور متضاد نظریئے قائم کیئے - ان فرقوں کے بانیوں جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اس طرح بحث کی کہ مصائب و آلام سے تو چھٹکارا نہیں لہٰذا جتنی بھی زندگی ہے اُس میں اپنی جسمانی لذات کو اپنا مطمح نظر بنا لو - رواقی حکماء نے

جن کا ذکر ہم اب کریں گے ان مصائب کو مدنظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ان سے چھٹکارا تو ہو نہیں سکتا۔ اور دُنیا کی جو بھی خوشی یا لذّت ہے اس میں پائندگی نہیں۔ وُہ بہت جلد گزر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زندگی کو جتنی جلدی ختم کر سکیں وُہ اچھا ہے۔ اُنہوں نے نتیجہ نکالا کہ خودکشی بہت ممدوح و معقول فعل ہے۔ لیکن ان دونوں نظریات میں سے کوئی دُنیا کے مصائب و آلام کا حل نہیں پیش کرتا۔ بلکہ دونوں ان سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا اصلی حل محض اسلام نے کیا ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

رواقی فلسفہ کا بانی زینو Zeno جزیرہ قبرص کا باشندہ، آدھا یونانی آدھا فنیقی تھا۔ بطور تاجر کے زندگی بسر کی، اور بہت دولت جمع کی۔ لیکن یکایک اس کا سارا دنیا کا اثاثہ ایک جہاز میں ڈوب گیا۔ اور یہ خود سنہ ۳۱۴ ق م میں اتھنز میں آیا جب اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ اس مصیبت نے اس کی نظروں میں دنیا کی حقیقت کو عریاں کر دیا۔ اور دُنیا کے مصائب ہی اس کے فلسفہ کی بُنیاد ہوئے۔ دنیا کی طرف سے دل برداشتگی اور دنیا کو ہیچ سمجھنا اس کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔ اتھنز میں آن کر اس نے فلسفہ کو تلاش کیا۔ کچھ دنوں تک کلبی حکیم Crates کی تعلیم میں رہا۔ جو گداگری سے اپنی ضروریات زندگی بہم پہنچاتا تھا۔ ایک عورت Hipparchia اُس پر عاشق ہو گئی، اور ان دونوں نے اپنی اس آزاد باہمی زندگی کی اشاعت اور اس کا افتتاح بر سر بازار انبوہِ کثیر کے سامنے آپس میں مجامعت کر کے کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد Zeno نے Crates کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ مسئلہ زندگی کا یہ اچھا حل نہیں ہے۔ پھر دقیانوس کے دوسرے شاگرد Stilpo سے فلسفہ پڑھتا رہا۔ سنہ ۳۰۱ ق م میں اُس نے اپنا علیحدہ درس ایک جگہ Stoa Poceile (مختلف رنگوں کی دہلیز) میں جاری کیا۔ چونکہ زینو نے مصائب دنیا کو اٹل و دوامی اور لذائذ کو وقتی اور ناقص پایا، عاقبت کی سزا و جزا اور موت کے بعد زندگی کا قائل نہ تھا لہٰذا اس نے وہ ہی کیا جو ہر اُس شخص کو کرنا چاہیئے جو شخص دنیا ہی کو اپنی زندگی کا منتہا سمجھتا ہے یعنی خودکشی۔ سنہ ۲۷۰ میں جب اُس کی عمر ستر سال کی تھی، زینو نے خودکشی کر لی۔ لیکن دیوانہ بکار خوش ہوشیار۔ یہ خودکشی ستر سال میں کی جب قدرتی موت ایک دو ہی قدم پر سے تھی۔ دقیانوس نے نوّے سال کی عمر میں خودکشی کی اور Antisthenes نے ۱۱۱ سال کی عمر میں Cyrene کے

ایک کلبی فلاسفر Hegesias نے مصر میں خودکشی کی اتنی تلقین کی کہ سینکڑوں احمق اُس مدح خودکشی سے متاثر ہو کر زندگی کو کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ بادشاہِ مصر PTOLEMY II نے اُس کو جلاوطن کر دیا، لیکن آپ خودکشی نہ کی۔ دوسروں کو بے وقوف بنانے کا ہُنر بھی بہت پُرانا ہے۔

رواقی فلسفہ کے اصول :- دُنیا اور انسان دونوں بالکل مادی ہیں۔ لیکن ان کی ماہیت میں کچھ نہ کچھ مادہ سے علاوہ بھی خاصیت ہے۔ یہاں تک کہ نیکی، بدی، جذبات، روح، خدا، ستارے یہ سب مادی ہیں۔ لیکن مادہ میں خود اندر سے ایک طاقت ہے اور اُس طاقت ہی کی وجہ سے یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہ طاقت گرمی یا آگ کی شکل میں ہے۔ تمام کائنات بڑھتی ہے اور پھر خود بخود آگ کے زور سے جل کر تباہ ہو جاتی ہے ایسے ہی دَور اُس پر آتے رہتے ہیں۔ برباد ہونے کے بعد پھر بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ علل و نتائج کا سلسلہ تمام کائنات پر حاوی ہے۔ تمام واقعات، تمام ارادے ارادوں کے نتائج وغیرہ یہ سب شروع ہی سے مقدر ہو چکے ہیں اور اب اُس ازلی ترکیب کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر اُس سلسلہ میں ذرا سا بھی اختلاف ہو، تو دُنیا برباد ہو جائے۔

Stoics یعنی رواقی حکماء نے اپنے زمانہ کے قومی مذہب کو اخلاقیات کے قیام کے لیئے ضروری سمجھا۔ اور اُس کے مختلف طاقتوں کے خداؤں، بھوتوں اور پیشینگوئیوں کے اعتقاد میں ہارج نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کو توہمات کے سودے سے نکال کر فلسفہ کے احاطہ میں یہ کہہ کر داخل کر لیا کہ "یہ سب تمثالی اور مجازی ہیں" بعینہٖ وُہ ہی طریقہ جو مسیحی پادریوں نے بائبل کے بعید از عقل بیانات کو تمثالی اور مجازی کہہ کر اعتراض کو ٹالا ہے، اور جس طرح قرآن شریف کے ہمدرد شارحین جو مغربی لادینیت میں سرشار ہیں۔ یا یونان کے فلسفہ سے اپنے ذہن کو آزاد نہیں کر سکتے جنت و دوزخ کی تشریح مجازی رنگ میں کرتے ہیں۔ کلدانی جوتش کو صحیح سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ انسانی اور دنیاوی معاملات و واقعات ستاروں کی حرکت سے تشکیل پاتے ہیں اور اثر لیتے ہیں۔

فلسفۂ دین اور لادین کے درمیان دونوں کو ملانے والا ایک سلسلہ یا

Marfat.com

پُل تھا۔ اور اُس نے لوگوں کے دماغوں کو مسیحیت کی تعلیم قبول کرنے کے لیئے تیار کر دیا تھا۔ اُن کی تعلیم تھی کہ عالم و نظامِ عالم، زندگی، روح اور مقدر کا تعلق کسی نہ کسی طرح خدا سے ہے۔ اور اخلاقیات کو بھی خدا کی مرضی کے مطابق انسان نے مرتب کر لیا ہے۔ انسان کی طرح خدا بھی زندہ مادہ ہے۔ دُنیا اُس کا جسم ہے۔ اور دنیا کا قانون و نظام خدا کا ذہن و مشیت ہیں۔ تمام کائنات ایک بہت بڑا جسم حیوانی ہے جس کی روح پھونکنے والا نفس خدا ہے۔ خدا ہی اس کا ذہن ہے۔ اس کو چلانے والی آگ ہے ان کے بعض بعض حکما، نے تو ایک بغیر جسم لے خدا کا بھی تخئیل کیا ہے جو دُنیا کا انتظام اور اس کی رہنمائی عقل کے ساتھ کر رہا ہے، اور تمام اشیاء کو نیک آدمیوں کے فائدہ کے لیئے مقرر کر دیا ہے۔

بات تو انہوں نے ٹھیک کہی۔ لیکن نیک کی شرط لگا کر اُس کو خلاف واقعہ بنا دیا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا کی تمام اشیار خدا کے تمام بندوں کے لیئے یکساں ہیں اس میں نیک و بد کی تمیز نہیں۔ ہوا، پانی، مٹی، آگ سب کو یکساں فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ جنہوں نے ہوائی جہاز بنا کر ہوا پر قبضہ کر لیا ہے، آب دوز کشتیاں بنا کر پانی کو مغلوب کر لیا ہے، ادویات میں ایزادی کی ہے، کیا وُہ سب نیک بندے تھے؟ اگر یہ صرف نیک بندوں کے لیئے ہوتا، تو خدا کے انصاف پر حرف آتا۔ قرآن شریف نے اس مسئلہ کو کس عمدگی سے حل کیا ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۲) جو کچھ زمین میں ہے وُہ سب تمہارے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ سورج اور سیاروں، ستاروں سے بھی تو انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن ان اجرام فلکی کی ان چیزوں مثلاً حرکت اور شعاعوں سے فائدہ پہنچتا ہے جو اس دنیا میں آجاتے ہیں۔

ہم یہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب پھر دُہراتے ہیں کہ دُنیائے قدیم کے تمام فلسفے اب بھی مغربی تہذیب پر اثر ڈال رہے ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں اُن پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس فلسفۂ رواقیہ Stoicism کا نمائندہ زمانۂ حال میں Schopenhaur (1788 تا 1860) تھا۔ اُس نے فرانس کا انقلاب اور نپولین کی صبر آزما لڑائیاں اور سائیوس کُن فتنہ و فساد دیکھے تھے۔ اس کے باپ نے

خودکشی کرلی تھی۔ اُس کی دادی پاگل ہوگئی۔ اُس کی والدہ نے ہملیٹ کی ماں کی طرح آزادانہ زندگی گزاری تھی۔ ندریں حالات اس کا Stoicism اور Pessimism (قنوطیت) کی دامن میں پناہ لینا بالکل قدرتی امر تھا۔ دراصل فلسفہ انسان کے اپنے ہی تجربوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ کسی شخص کے فلسفہ سے تم بتا سکتے ہو کہ آیا اُس نے خوشیوں اور راحتوں کی گود میں پرورش پائی ہے یا مصائب و آلام نے اُس کے جھولے کو جھلایا ہے۔

Sceptics (حکماء لاادریت) ان کا بھی تقریباً وہ ہی زمانہ تھا جو لذتیہ اور رواقی حکماء کا تھا۔ انہوں نے بھی دُنیا کو اُسی ہی رُخ سے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی شے کا صحیح علم حاصل کرنا ناممکن ہے۔ حق یعنی اصلیت تک پہنچنے سے ناامید ہونا یہ ہی فلسفہ لاادریت ہے۔ دُنیا کے مصائب سے بچنے کے لیئے یہ ہی نظریہ قائم ہو سکتا تھا۔

اس فلسفہ کا بانی پرہو Pyrrho تھا۔ جو تقریباً ۳۶۰ء ق م میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۲۷۰ء ق م میں مرگیا۔ اس کا قول ہے کہ انسان کے سامنے تین سوالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ (۱) اشیاء کی اصلیت کیا ہے، اور اُن کی آپس کی ترکیب و تنظیم کیا ہے۔ (۲) ہمارا ان اشیاء سے کیا تعلق ہے۔ (۳) ہمارا طرزِ عمل ان کے متعلق کیا ہونا چاہیئے؟

ان سوالات کے جو جواب اُس نے دیئے وہ اس فلسفہ کے تین اصول ہیں:

(۱) یقین ناممکن ہے۔ (۲) عقلمند آدمی ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ دے گا۔ اور وہ حق کی بجائے امن و اطمینان کو تلاش کرے گا۔ (۳) چونکہ تمام نظریئے غلط ہیں لہذا بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے شہر یا ملک اور اپنے زمانہ کے مروجہ توہمات اور رسومات کو قبول کرکے لوگوں کے ساتھ ہو لے۔ اور حق کے متعلق کہہ دے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کیا حق ہے اور کیا ناحق۔

اس فلسفہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ بذاتِ خود کوئی شے نہ حق ہے اور نہ ناحق ہے۔ اسی طرح نہ کچھ نیکی ہے، اور نہ بدی ہے۔ صرف رائے، رواج یا قانون اُس کو اچھا کہہ دے یا بُرا کہہ دے۔ لیکن یہ حقیقت یا اصلیت نہ ہوئی۔

اس بحث کا یہ بھی نتیجہ نکلا کہ یہ فلاسفر مختلف اعمال یا افعال میں سے کسی ایک کو ترجیح نہ دے گا۔ لہذا کوئی فعل یا عمل نہ کرے گا۔ کسی ایک کام کو کرنا اور دوسرے اُس سے مختلف کام کو نہ کرنا یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی۔ اور چونکہ حقیقت

Marfat.com

معلوم نہیں، لہٰذا کسی کو ترجیح نہ دی جا سکے گی۔ انسان کا ہر ایک فعل اُس کے یقین اور اعتقاد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور ان حکماء کے نظریہ کے مطابق یقین یا اعتقاد محض ایک دھوکہ ہے۔ لہٰذا لاادریت کا فلاسفر بے حس بُت بن کر بیٹھا رہے گا، اور اپنے دل کو اپنے ہی خیال میں اس طرح تسلی دے گا کہ میری کوئی خواہش ہی نہیں۔ خواہش کے ہونے سے رنج ہوتا ہے۔ لہٰذا میں اس رنج سے دُور رہتا ہوں۔ اور مجھے پُورا اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ اس نظریہ کا مطلقاً خلاف فطرت انسانی ہونا ظاہر ہے۔ اور اس طرح اگر بُرے کام کرنے سے بچ گیا، تو اچھے کام کرنے کی بھی فضیلت حاصل نہ ہوئی۔

افلاطون: ہم اپنے بیان میں ذرا آگے بڑھ گئے افلاطون اور ارسطو کا ذکر باقی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ:

(۱) STOICS (رواقی) (۲) Epicureans (لذتیہ) (۳) Sceptics (حکماء لاادریت) (۴) Neo-Platonists (افلاطونیت جدید)

یہ سب فرقے ارسطو کے بعد کے یونانی حکماء کی جماعت میں آتے ہیں۔ لیکن ہم نے تین اول الذکر فرقوں کا ذکر پہلے اس وجہ سے کرلیا کہ یہ تقریباً براہ راست سقراط کے فلسفے سے ماخوذ تھے اور زیادہ تر اس کی ہی تشریح پر مبنی تھے۔ افلاطونیت جدید کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

افلاطون اتھنز کے خاندان امراء میں سے تھا۔ ۴۲۷ء ق م میں پیدا ہوا اور ۳۴۶ء ق م میں مرگیا۔ سقراط کا شاگرد تھا۔ جس کی عمر کے آخری دس سالوں میں اُس کے ساتھ رہا۔ افلاطون ہی کی کیا خصوصیت ہے، ہر ایک غور و فکر کرنے والے انسان کے لیئے اُس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک نیا سبق پڑھاتا ہے۔ مگر افلاطون کی زندگی میں دو ایسے عظیم الشان واقعات ہوئے جنہوں نے انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو کو افلاطون کے سامنے نمایاں کر کے رکھ دیا۔ ایک تو اُس کے شفیق اور محبوب اُستاد سقراط کے خلاف جو مقدمہ ہوا تھا اُس کی حاسدانہ ابتداء اور ظالمانہ انتہاء اور دُوسرے اُس وقت کی تمام معلوم شدہ دنیا کا سفر۔ اول الذکر نے جمہوریت کے تمام عیوب اور فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کو عیاں کر دیا۔ اور ساتھ ہی اُس بلندی کو بھی واضح کر دیا، جہاں تک عقل و حکمت کے ذریعہ سے فطرتِ انسانی پہنچ سکتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کو اُس نے سقراط کے مستغیثوں اور اُس کے مقدمے کے ججوں کی صورت میں دیکھا۔ اور اُس کے فلسفیانہ

Marfat.com

ارتفاع کو سقراط کے چہرے میں معائنہ کیا جس طرح دنیا نے کفر کی اصرار کو ابوجہل کی شکل میں اور اسلام کے انوار و ارتفاع کو حضرتِ علیؑ کے چہرۂ انور میں پایا۔ اور جنابِ رسولِ خدا نے یہ فرما کر لوگوں کی توجہ ادھر دلائی کہ "المنظر الی وجہ علی عبادۃ۔" مؤخر الذکر یعنی سیاحتِ عالم نے افلاطون کو فطرتِ انسانی کی مختلف حالتوں اور نیرنگیوں سے آگاہ کیا اور نیز دنیا کے تمام مذاہب اور طرقِ فلسفہ پر غور کرنے اور اُن سے علم حاصل کرنے کا موقع دیا اور غالباً یہ ہی اُس سیاحت کا مقصد تھا۔ اس بارہ تیرہ سال کے عرصہ میں اُس وقت کی ساری مہذب دُنیا سے عقل و تجربہ کی دولت سمیٹ لایا۔ ہر ایک دیر و مندر میں بیٹھ کر ان کے فلسفہ اور مذہب کی روشنی میں انسان، خالق، موت و حیات کے نکات پر غور کیا۔ بنو اسرائیل کے انبیاء کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے Judea میں گیا۔ اور اُس تعلیم کا اثر اُس کے فلسفہ پر بہت ہوا۔ کفر کی لن ترانیاں سُننے کے لیئے گنگا کے کنارے دھونی رما کے بیٹھا۔ افلاطون شاعر بھی تھا اور فلاسفر بھی۔ عقل و عشق کا ایسا اجتماع ایک شخص میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ افلاطون کے فلسفہ میں ہر دل کے لیے جو جاذبیت ہے، وُہ اُس ہی اجتماع کا نتیجہ ہے۔

افلاطون کا فلسفہ:۔ یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا کہ افلاطون نے اپنا فلسفہ اپنے پیش رو حکماء کے خیالات و تصورات سے اخذ کیا۔ لیکن اس کے فلسفہ پر کلبیت یعنی Cynicism کا بہت بڑا اثر تھا۔ اور اس کی ساری تعلیم کا رُجحان اُسی طرف تھا۔ اپنی تحریرات میں خصوصاً ریپبلک میں کمیونزم کے تصورات کی تائید کرتا ہے اور اُن کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ چنانچہ جب اپنی خیالی Republic کے فلاسفر حکمران تجویز کرتا ہے، تو اُس تجویز میں بالکل کمیونزم کا نقشہ نظر آتا ہے۔ اُس کی تجویز ہے کہ ان حکمرانوں کی نہ کچھ اپنی جائداد ہو، نہ مال ہو، نہ آمدنی ہو اور نہ کوئی بیوی ہو۔ اُن کی زندگی بہت سیدھی سادی ہو۔ اور یہ سب ضروریاتِ زندگی پبلک فنڈ اور پبلک کی طرف سے اُن کو مہیا ہونی چاہئیں۔ ان کے لیئے یہ سب مال مشترک ہو۔ اور عورتیں بھی مشترک ہونی چاہئیں۔ یہی وُہ کمیونزم ہے جس نے روس سے نکل کر تمام دُنیا پر قبضہ کر لیا ہے اور اب دنیا نے اُس کو عملی جامہ پہنا کر پھیلایا ہے۔

سقراط کی موت یا خودکشی ۳۹۹ء قم میں ہوئی۔ اُس کے بعد ہی افلاطون

اپنی سیاحت پر باہر چلا گیا۔ اور آخر کار ۳۸۶ ق م اتھنز میں واپس آگیا۔ وہاں اپنا سکول درختوں کے ایک سبز جھنڈ میں قائم کر لیا۔

مقامی خدا Academius کے نام پر اس جھنڈ کا نام Academia تھا۔ افلاطون نے یہاں اپنا مدرسہ یا مکتب کھولا۔ جو برابر نو صد برس تک اتھنز کا علمی مرکز رہا اور آخر کار ۵۲۹ء میں رومن قیصر JUSTINIAN کے زمانہ میں یہ بند کر دیا گیا۔ اس کے نام کی وجہ سے افلاطون اور اس کے ساتھی Academic Philosophers کہلاتے تھے اور اس ہی جگہ نے یورپ کو ایک لفظ Academy دیا جو یورپ کی تمام زبانوں میں رائج ہے۔

ابتدا میں یہ ایکاڈمی ایک مذہبی برادری تھی۔ جس کا مقصد یونان کی مؤنث خدائیوں Muses کی پرستش تھی۔ یونان کی لغت خدائیگان میں یہ مؤنث خدا تھے۔ جن کا مشغلہ راگ و رنگ تھا۔ لیکن بعد کے تخیل میں ان کو ہر سائنس و شاعری اور ہنر کے مؤنث خدا مانا گیا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں کہ جب صنم پرستی کا زور تھا، ہر ملک میں ہر ایک کام کو، ہر ایک تحریک کو، ہر ایک جگہ کو کسی نہ کسی خدا سے نسبت دی جاتی تھی۔ عرب میں بھی یہی دستور تھا۔ یہ خیال یا تو انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کا اثر تھا کہ "انسان اور اس کا ہر فعل خدا کے احکام و مشیت کا تابع ہے"۔ یا غالباً ان لوگوں نے سوچا کہ جب تک ان امور کو براہِ راست کسی خدا سے منسوب نہ کریں گے، تو لوگ ان کی طرف اپنی پوری توجہ نہ دیں گے۔

اس مدرسہ میں عورتیں بھی داخل کی جاتی تھیں۔ اور شاہ ڈایونی سی اس ثانی Dionysius II کی طرف سے اس مدرسہ کو سالانہ عطیہ ملتا تھا۔ اور وہاں کے امراء بھی بذریعہ وصیت اس کے لیے ترکہ چھوڑتے تھے۔ اس زمانہ میں اس مدرسہ کے طلباء کا نقشہ ان ہجو آمیز الفاظ میں کھینچا گیا تھا کہ "ہاتھ میں چھڑی لباس میں نزاکت" یونیورسٹی کا چغہ پہنے ہوئے تکبرانہ چال سے چلتے تھے۔

تعلیم بذریعہ مکالمہ Dialogues دی جاتی تھی۔ افلاطون کے مکالمے Dialogues بہت مشہور ہیں۔

سقراط کا فلسفہ بغیر افلاطون کی تشریحات کے، اور افلاطون کا فلسفہ بغیر ارسطو کی تنقید کے ایسا ہے جیسا بے نمک کا سالن۔ افلاطون کی شاعرانہ طبیعت نے اس

Marfat.com

فلسفہ میں وُہ چاشنی پیدا کر دی ہے جس کی لذت پر ہر ایک اہلِ علم مفتون ہو۔ صرف افلاطون ہی کی طبیعت کائنات کی اصل و نقل تمثالی صورت میں پیدا کر سکتی تھی۔

افلاطون کے فلسفہ میں دو امور نہایت اہم ہیں۔ ایک تو اُس کا تخیل حقیقت اور اصلیت، اور دُوسرا اُس کا نظریۂ سیاست۔

اُس کا تخیل حقیقت اور اصلیت یہ ہے، کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ حقیقی اور اصلی نہیں ہے۔ یعنی اس میں نہ حقیقت ہے اور نہ اصلیت۔ بلکہ حقیقی دنیا اس سے علیحدہ ہے۔ حقیقی دنیا وُہ ہے، جس میں روح اس جسم میں آنے سے پہلے رہتی تھی۔ اُس حقیقی دُنیا میں اُس دنیا کے محسوسات کے ھیولا کل Ideas Forms رہتے ہیں

ہیا کل یا IDEAS سے افلاطون کا مطلب یہ ہے۔ انفرادی چیزوں سے حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ایک ہی نوع کی اشیاء میں جو خاصیتیں مشترک ہیں وُہ حقیقت کو بتاتی ہیں۔ مثلاً جب آدمی کہا تو ہمارے دماغ میں وُہ سب تخئیل پیدا ہو جائے گا جو تمام آدمیوں میں مشترک ہے۔ میز، کُتا، مثلث، آدمی وغیرہ یہ سب فنا ہونے والی چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ جو خیالات وابستہ ہیں، وہ باقی رہیں گے۔ ہم ایک میز کو دیکھتے ہیں۔ ایک کُتے کو دیکھتے ہیں۔ ان کا علم ہمارے احساس کے ذریعہ سے آتا ہے۔ لیکن یہ سب فانی ہیں، مر جانے والے ہیں، ضائع ہونے والے ہیں۔ لیکن میز، مثلث، مربع، مستطیل، کُتا، آدمی، بلی وغیرہ وغیرہ کے انواع کے متعلق جو ہمارے ذہن میں تصورات ہیں، وُہ باقی ہیں۔ اور وُہ ہی ہیاکل یا Ideas ہیں۔ وہ حقیقی ہیں۔ وُہ چیزیں جن کو دیکھ کر جن کی وجہ سے وُہ تصور پیدا ہُوا وُہ نقلی ہیں۔ ضائع ہونے والی ہیں۔

افلاطون کے فلسفہ کے مطابق دُنیا کی کسی چیز کی حقیقت ہم کو معلوم نہیں۔ ہم کو تو ان کا وہ اثر معلوم ہوتا ہے جو ہمارے حواس خمسہ پر ہوتا ہے۔ مثلاً نیم گرم پانی کو برف وباراں میں سے آیا ہُوا شخص گرم بتائے گا اور اُس ہی پانی کو حمام میں سے نکلا ہُوا شخص ٹھنڈا کہے گا۔ خرگوش کو ہاتھی بہت چھوٹا جانور سمجھے گا لیکن اُسی خرگوش کو چیونٹی بہت بڑا سمجھے گی۔ ایک ہی تصویر کو ایک آدمی اچھا اور دُوسرا بُرا

سمجھتا ہے۔ ایک ہی عورت کو ایک آدمی حسین اور دوسرا بدصورت سمجھتا ہے۔ کسی ملک میں موٹا قد پتلی کمر اور چھوٹے پیٹ کو حسن کے لوازمات میں سے سمجھا گیا ہے۔ افریقہ میں یہ بدصورتی ہے۔ بلکہ وہاں بڑے پیٹ والی گڈ مڈالی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے آپ سے سوال کیا جائے کہ حسن یا خوبصورتی کیا ہے؟ آپ کہیں گے فلاں عورت خوبصورت ہے۔ گلاب کا پھول خوبصورت ہے۔ لیکن یہ تو خوبصورت چیزیں ہیں در اصل حسن یا خوبصورتی کیا ہے؟۔ اسی طرح انصاف، نیکی، رحم، وزن، سفیدی وغیرہ کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔ جو خیال حسن، نیکی، انسان، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کا ہے وہ ہی افلاطون کا Forms یا Ideas ہے۔ اس نظریہ کا ہی ضمنی نتیجہ ہے کہ حقیقی علم اس دُنیا کے محسوسات سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ خرد یا عقل Intellect, Reason کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح افلاطون نے اپنے سے پہلے سب فلاسفروں کی تردید کر دی جو کہتے چلے آئے تھے کہ علم فقط دنیا کی محسوس اشیاء سے حاصل ہوتا ہے۔

ایسے ہی ہیاکل سے افلاطون کی حقیقی دُنیا آباد ہے۔ ہماری دنیا کی چیزیں اس وجہ سے بھی غیر حقیقی اور مجازی ہیں کہ اُن میں ہر دم، ہر لحظہ، ہر لمحہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اور حقیقت تغیر سے بالاتر ہے۔ ان ہیاکل کا علم حاصل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے تاکہ ہماری روح اس دنیا سے دوسری اور حقیقی دنیا میں Forms Ideas یا ہیاکل کی صحبت میں چلی جائے۔ افلاطون کہتا ہے کہ موجودہ جسم میں آنے سے پہلے رُوح اس ہی حقیقی دنیا میں ہیاکل کی صحبت میں رہتی تھی۔ لیکن اب وہاں سے گر پڑی ہے۔ جب رُوح اس عالم بالا یا حقیقی دُنیا سے گر پڑتی ہے، تو کسی جسم میں چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اب وہ ان Forms یا ہیاکل کو اچھی طرح تو نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن چونکہ ایک دفعہ دیکھا ہُوا ہے اور کچھ نہ کچھ اس کی شکل آنکھوں میں سما گئی ہے، اس وجہ سے یہ موجودہ شکلیں دیکھ کر اس کا پچھلا تجربہ اُسے مدد دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی ان ہیاکل کی دھندلی سی شکلیں اس کو نظر آ جاتی ہیں۔ اور وہ ان مادی اشیاء میں روحانی جھلک

Marfat.com

دیکھ لیتی ہے۔ افلاطون کی حقیقت و مجاز نے مسلمانوں میں بھی بہت سے فرقے پیدا کر دیئے ہیں۔

افلاطون کے اس فلسفہ کی رو سے علمِ طبیعیات و کیمسٹری، علمِ ہیئت اور علم ریاضی وغیرہ سب بے معنی ہو گئے۔ کیونکہ وہ سب علوم محسوسات پر مبنی ہیں اور افلاطون محسوسات کو ذریعۂ علم و حقیقت نہیں سمجھتا۔ اُس کے یہاں، تو محض شاعری اور تصورات ہیں۔ علاوہ اس کے ان خیالی مفروضات اور ذہنی تصورات کی دنیا کو اصلی دنیا کہنا، اور جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جس کو ہم محسوس کرتے ہیں اُس کو اس خیالی دُنیا کا نقلی اور غیر حقیقی عکس کہنا کوئی معقول بات تو نہیں ہے۔ ایسی ہی افلاطون کی جنت ہے۔ تمام ارواح کا ان ذہنی تصورات میں رہنا افلاطون کے نزدیک ان ارواح کی خوشی کی معراج ہے۔ اگر انسان محض اپنے ذہن پر بھروسہ کرے گا تو یہ ہی نتیجہ ہوگا۔ فرانس کے فلاسفر روسو Rousseau (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) نے سچ کہا ہے کہ

If reason is against religion, so much the worse for Reason

اگر عقل مذہب کے خلاف چلتی ہے، تو وہ عقل بربادی کی طرف جا رہی ہے۔

افلاطون کے فلسفہ کا دوسرا اہم نظریہ سیاست ہے۔ جو اُس نے کچھ تو مصر کے طرزِ حکومت سے اخذ کیا، اور کچھ جاہلوں کی اُس جمہوریت کا مطالعہ کر کے مرتب کیا، جس نے سقراط جیسے فلاسفر کو زندہ رہنے کے قابل نہ سمجھا۔ مصر میں تو اُس نے دیکھا کہ حکومت ایک خاص جماعت کے ہاتھ میں ہے جو صدیوں کے تجربہ سے ہنرِ جہانبانی سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ اپنے ایتھنز کے جاہلوں کی جمہوریت پر جو اُس نے غور کیا، تو نتیجہ نکالا کہ محض جہال کی رایوں سے جو حکمران منتخب ہوں گے وہ بھی جاہل ہی ہوں گے۔

حکمرانوں کے تقرر و انتخاب کا طریقہ

افلاطون کے نزدیک جمہوریت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ایک کو حکومت کرنے کا

Marfat.com

مساوی حق ہے۔ بلکہ اُس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو ہُنر جہانبانی سیکھنے کے مساوی مواقع اور حقوق ہیں۔ جمہوریت مدرسہ میں ہونی چاہیئے نہ کہ گورنمنٹ ہاؤس میں حکومت کے عہدے رایوں کے فریب یا خفیہ سازش کی ریشہ دوانیوں سے تقسیم نہ ہونے چاہئیں، بلکہ اُن لوگوں کو ملنے چاہئیں جنہوں نے اپنے تئیں اس کے قابل ثابت کر دیا ہے۔ کسی شخص کو کوئی عہدہ بغیر خاص سابقہ تعلیم کے نہ ملنا چاہیئے غرض کہ ملک کا نظام حکومت بہترین آدمیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ حکومت کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کی ایک خاص جماعت ہونی چاہیئے۔ ان حکمرانوں کا نام افلاطون نے گارڈین یعنی محافظین رکھا ہے۔ اُن کو ہُنر جہانبانی کی تعلیم بچپن ہی ملنی چاہیئے۔ وُہ زمانہ ایسا ہے کہ جب ہر تعلیم اپنا دوامی اثر چھوڑ جاتی ہے۔ اگر بچپن میں مخالف یا غلط خیالات نے اُن کے دماغ پر اثر کر لیا ہے تو اُس پہلی تعلیم کا اثر کبھی زائل نہ ہوگا۔ ان کے بچّوں کے لیئے علیحدہ مدرسے ہونے چاہئیں۔ اور اُن کو عوام الناس کے بچّوں کے ساتھ نہ ملنا چاہیئے۔

جائداد، اولاد اور عورت ایسی چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے لوگوں کو بُرائی کی طرف راغب ہونا پڑتا ہے۔ اس بُرائی سے بچانے کے لیئے افلاطون نے ایک طریقہ کمیونزم ایجاد کیا جو مندرجہ ذیل تجاویز پر مبنی تھا:

(۱) ان امیدوارانِ حکومت کے لیئے نہ کوئی گھر ہونا چاہیئے، نہ گھر والیاں۔

(۲) ان سے بچّے لینے کا وُہ ہی طریقہ وُہ ہی ہے جو حیوانات کے ہسپتالوں میں آج کل رائج ہے۔ ان سب کی مشترکہ عورتیں ہونی چاہئیں۔ آج ایک عورت کو ایک اُمیدوارِ حکومت کے سامنے پیش کر کے اُس کا نطفہ لے لیا، کل دُوسری عورت کو دُوسرے اُمیدوارِ حکومت کے سامنے اسی طرح پیش کر کے اُس کا نطفہ جمع کر لیا۔ اور پھر جو عورت جس کے سامنے آجائے۔ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ ایک ہی عورت ایک ہی مرد کے سامنے بار بار آئے۔ ورنہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور نطفہ ضائع ہو جائے گا۔ مشترکہ عورتیں، مشترکہ مرد۔ نسلی کمیونزم مکمّل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے گا کہ فلاں میرا بچّہ ہے۔ اور کوئی عورت نہ کہہ سکے گی کہ میں فلاں بچّے کی ماں ہوں۔ کیونکہ سارے بچّے حکومت کے ہوں گے۔

Marfat.com

(۳) حکومت ان بچوں کی پرورش کرے اور تعلیم کرے۔

(۴) غرضکہ ان اُمید واران حکومت کی نہ تو کوئی اولاد ہو نہ بیوی ہو اور نہ جائداد ہو۔ لہذا بے تعلق ہو جائیں گے۔

(۵) یہ سب چیزیں ان کے لیئے قوم مہیا کرے اور وہ بھی ایک معین مقدار میں اور اشتراک کی صورت میں۔

(۶) یہ سب سختیاں اُن کو وطن کی خاطر برداشت کرنی چاہئیں۔

یہ سب طریقے فطرتِ صحیح اور عقلِ سلیم کے خلاف ہیں۔ گھر کی تعلیم، خاندان کی حکومت کا تجربہ۔ یہ سب ان کے لیئے مفقود ہو گیا۔ انسان کا اصلی اور دوامی کیرکٹر گھر میں بنتا ہے یہ سب جانتے ہیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ خاندان میں وہ صحیح طرزِ حکومت زیرِ عمل آتی ہے جو نہ کتابوں سے اور نہ ملکی سیاست سے حاصل ہو۔ مدرسہ کی تعلیم مصنوعی تعلیم ہے۔ گھر اور خاندان کی تعلیم اصلی اور قدرتی ہے۔ اتنی بڑی قدرت کی مہیا کی ہوئی درس گاہ کو مفقود کرنا اور اس کے بجائے مصنوعی درس گاہ کو مقرر کرنا افلاطون کی اُن بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے جس نے اُس کے اِس فلسفہ کو بالکل نکما بنا دیا۔ برخلاف اس کے اسلام کی تعلیم ملاحظہ ہو۔ جناب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

۱۔ النکاح من سُنّتی۔ ومن رغب عن سُنّتی فلیس منّی۔

۲۔ النکاح من سنن المرسلین۔

۳۔ خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ۔

۴۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

یعنی

۱۔ نکاح میری سُنّت ہے۔ اور جو میری سُنّت کو ترک کرے گا، وہ میری اُمت میں نہیں ہے۔

۲۔ نکاح انبیاء و مرسلین کی سُنّت ہے۔

۳۔ دُنیا کی سب سے بہترین دولت زوجہ صالحہ ہے۔

۴۔ تم سب اپنے خاندانوں کے محافظ اور حاکم ہو۔ اور قیامت کے دن تم سے

Marfat.com

رعیت کی نسبت باز پرس کی جائے گی۔

محبت، رحم، عدل، ہمدردی، صبر، ایثار، استقلال، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینا، دوسروں سے بغیر لوث اور اُمید کے محبت کرنی اور اُن کو راہِ راست دکھانی، مختلف طبائع و عادات میں انتظام اور عدل کرنا، یہ سب کچھ گھر میں ہی سیکھ سکتے ہیں۔ مدرسہ میں ان کی تعلیم ہوئی بھی تو محض کتابی ہو گی۔

علاوہ اس کے یہ بھی دیکھنا ہے کہ افلاطون کی تجاویز ملکی و سیاسی حکمران جماعت کو کیا سکھاتی ہیں۔ وُہ بے رحمی، بے حیائی اور بے غیرتی کا سبق دیتی ہیں۔ حالانکہ حیا و رحم و غیرت ہی وُہ صفات ہیں جو انسان کو حیوان مطلق سے ممیز کرتی ہیں۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ اپنی عورت کو دوسرے سے تعلق کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ جانوروں تک میں یہ حمیت و غیرت پائی جاتی ہے۔ ہاں جانوروں میں سُوّر ہی ایک فلاسفر ہے جو سمجھتا ہے کہ اس میں میرا کیا بگڑتا ہے۔ اور انتظار کرتا ہے کہ جب اُس کا ساتھی فارغ ہو جائے تو یہ اپنا فلسفیانہ عمل شروع کرے۔ حکمران جماعت کو انسان کے طبقے سے گرا کر سُور کی سطح پر لانا افلاطون کی اس تجویز کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت کی غیور و خوددار فطرت کو مٹا کر اس کی جگہ رنڈیوں کی کمینہ خصلت پیدا کرنا ہے۔ برعکس اس کے اسلام کا فلسفہ بھی ملاحظہ ہو:۔

جناب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم فرماتے ہیں:۔

۱۔ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

۲۔ اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔

۳۔ اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔

۴۔ مَا کَانَ الْحَیَاءُ فِیْ شَیْءٍ قَطُّ اِلَّا زَانَہٗ۔

۵۔ اَلْحَیَاءُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ۔

یعنی

۱۔ حیا ایمان کا حصہ ہے۔

۲۔ ہر ایک مذہب کی ایک فطرت و خصلت ہوتی ہے۔ اسلام کی فطرت حیا ہے۔

Marfat.com

۳۔ حیا، ساری کی ساری خیر ہے، نیکی ہے۔
۴۔ جہاں جہاں اور جس میں حیا ہوگی، اُس کو زینت دے گی۔
۵۔ انبیاء و رُسل اوّلین کی سُنّت حیا ہے۔

حیا اور غیرت تو صریحاً و عملاً و یقیناً گئی۔ رحم کی خصلت بھی ان افلاطونی حکمرانوں میں نہ رہے گی۔ ان کی طبیعت پر خود غرضی اور محض خود غرضی حکومت کرے گی۔

ایک اور بڑا نقص اُس تجویز میں ہے۔ وُہ یہ کہ ان حکمرانوں کو بیوی، بچوں، اقربا اور جائداد کا تو تجربہ نہ ہوگا۔ اور جب اُن کے سامنے ان تعلقات کے مقدمات آئیں گے تو جو وُہ فیصلہ کریں گے یقیناً غلط ہوگا۔ جس شخص کو کسی بات کا تجربہ و علم نہ ہو وُہ کیا تو اُس بات کو سمجھے گا، اور کیا اُس کے تنازعات کا فیصلہ کرے گا۔ جس پیچیدہ اور خطرناک راستہ پر کوئی چلا ہی نہیں، تو اُس راستہ کے خطروں کا کیا علم ہوگا۔ کہاں خندق ہے، کہاں گڑھا ہے، کس موڑ پر کونسا درندہ بیٹھا ہوا ہے، کہاں وُہ راستہ ناہموار ہے۔ یہاں یہ اعتراض درست نہ ہوگا کہ بدی سے بچنے کے لیے بھی بدی کا تجربہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ (۱) الہامی مذاہب خود بتا رہے ہیں کہ کیا کیا بدی ہے۔ (۲) بدی کا علم خداوند تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔ نفس انسانی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ اور یہاں ہم اپنے ناظرین کو اُن فلاسفران کی بحث کی طرف متوجہ کرتے ہیں جن کو Intuitionists کہتے ہیں۔

ایک اور خرابی بھی اس تجویز میں ہے۔ وُہ یہ کہ افلاطون ملک کے اُوپر افراد کی ہستی کو بالکل نیست و نابُود کر دیتا ہے۔ وُہ اُمیدواران حکومت یہ سب قربانیاں کیوں کریں، اور تکالیف کیوں اُٹھائیں؟ جواب ہے مُلک کی خاطر! ملک ہر ایک فرد کو کیا دے گا؟ جواب ہے، کچھ نہیں! صرف خود موٹا تازہ ہو جائے گا۔ یہ بحث سیاسی مدبران کو جچتی ہے جو حبِ وطن کا سبق پڑھا کر لوگوں کو اپنی اطاعت پر آمادہ کرتے ہیں اور اپنے لشکروں میں بھرتی ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تاکہ اُن کی حکومت قائم رہے۔ ایک فلاسفر اور حکیم کے مُنہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ برعکس اس کے اسلام کوئی قربانی کسی فرد سے بغیر اُس کو اُس کا عوض دیئے ہوئے نہیں مانگتا۔ اس کی تفصیل اور تشریح اپنی جگہ پر آئے گی۔

افلاطون کے اصولِ حکومت

جہاں تک اصول کا تعلق ہے افلاطون کے اصولِ حکومت و حکمرانی نہایت عمدہ ہیں اور مطابق فطرت و عقل سلیم ہیں۔ اور اسلام کے اصولِ حکمرانی کے موافق ہیں:۔

۱۔ عدل کی صفت حکمران کی فطرت کا خمیر ہونی چاہیئے۔

۲۔ حکمرانوں کو ذاتی مفاد یا اُمید نفع حکومت کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔

۳۔ حکمرانوں کا بے لوث اور بے غرض ہونا چاہیئے۔

۴۔ حکمران کسی صورت اور کسی حالت میں دولت مند اور بارسوخ آدمیوں کے محتاج نہ ہونے چاہئیں۔

۵۔ ایثار و صبر اُن کے لیئے بہترین صفات ہیں۔

۶۔ حکمران ایک ہی خاندان سے ہوں تاکہ عمدہ صفات بذریعہ توارث اُن کو ملیں۔

۷۔ توارث خصائل کے بعد بچپن کی تعلیم ہے۔ اِن اُمیدوارانِ حکومت کو شروع ہی سے اچھی تعلیم ملنی چاہیئے۔ نیک صحبت میں رکھے جائیں۔ ان کی صحبت خود اُن کے ہی خاندان کے بچوں کے ساتھ ہو۔ باہر کے بچوں سے اُن کو بچایا جائے۔

یہ تمام اصول اسلام کی حکومت و خلافت ہی کے ہیں۔ چنانچہ جناب رسولؐ خدا نے اسی ہی وجہ سے اپنے ولیعہد حکومت یعنی حضرت علیؓ کو بچپن ہی سے اپنے زیرِ نگرانی رکھا اور اسلام کی تعلیم دی اور کفر کی ہوا سے بچایا۔

ارسطو ARISTOTLE

پیدائش ۳۸۴ ق م۔ فوتیدگی ۳۲۲ ق م

مقامِ پیدائش: Thrace (تھریس) کے ساحل کا یونانی شہر Stagirus

ارسطو کا باپ مقدونیہ Macedonia کے بادشاہ Amyntas II (سکندرِ اعظم کا دادا) کا درباری حکیم تھا۔ سترہ سال کی عمر میں ارسطو کو افلاطون کی Academy میں برائے تعلیم بھیجا۔ افلاطون کے مرنے پر یہ وہاں سے نکل آیا۔ افلاطون کے مرنے کے بعد ۳۴۷ ق م میں بمقام Assus (شمال ایشیائی کوچک) چلا گیا۔ اور وہاں کے

Marfat.com

بادشاہ کی لڑکی Pythias سے ۳۴۴ ق م میں شادی کر لی ۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیوی مر گئی ۔ اور ارسطو ایک رنڈی Herpyllis کے ساتھ رہنے لگا ۔ ۳۴۳ ق م میں مقدونیا کے فلپ نے اپنے بیٹے سکندر کا اس کو استاد مقرر کر دیا جن فرائض کو اس نے ۳۴۰ ق م تک انجام دیا ۔ ۳۳۵ ق م میں یہ ایتھنز واپس آ گیا ۔ اور وہاں سبز درختوں کے جھنڈ میں جو چند عمارات تھیں اور جو اپولوں کے خدا Apllo Lyceus کے نام پر وقف تھیں ارسطو نے اپنا مدرسہ کھولا جو اسی نسبت سے Lyceum کہلایا جانے لگا ۔

ارسطو ازمنہ ماضیہ کا سب سے بڑا طبیب اور سائنس دان تھا ۔ اس نے بہت نظریئے علم الحیات Biology میں قائم کیئے جو اب تک قائم ہیں ۔ اس نے ایک نہایت اہم اصول قائم کیا جو بعد میں ہربرٹ سپنسر نے بھی معلوم کیا یا جس کی تائید کی ۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ جسم کی ترکیب و ساخت کی پیچیدگی اور بچوں کی تعداد میں نسبت معکوس ہے ۔ یعنی اگر جسم زیادہ پیچیدہ ہے تو بچے کم ہوں گے ۔ چوہوں ، سوروں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں ۔ انسان کا جسم چونکہ بہت زیادہ پیچیدہ ہے لہٰذا اس کے بچے کم ہوتے ہیں ۔ شیر ، ہاتھی وغیرہ کا جسم اُن سے زیادہ پیچیدہ ہے ، اور انسان سے کم پیچیدہ ہے ۔ لہٰذا اُن کے بچے بلی ، چوہوں ، کتوں سے کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے تو ہر سال ہیں ۔ انسان سے زیادہ ہوئے ۔ یہ ایک نظریہ ہے ۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بالکل ٹھیک ہے ۔

فلپ کے بعد سکندر اعظم نے جو اس کا شاگرد تھا اُس کے مدرسے کو بہت مالی مدد دی ۔ اس کے شاگردوں اور مقلدین کو Peripatetics (مشائین) کہتے تھے کیونکہ ارسطو کی عادت تھی کہ ٹہلتے ٹہلتے لیکچر دیتا تھا ۔

ارسطو کو اس کی علمی تحقیقات میں سکندر کی طرف سے بہت مدد ملی ۔ اول تو سکندر نے اپنے شکاریوں ، باغبانوں اور مچھیروں کو حکم دیا کہ ارسطو کو حیوانات ، نباتات وغیرہ میں سے جس کی بھی ضرورت ہو وہ اُسے مہیا کر دیں ۔ اس طرح ارسطو کی خدمت میں کئی ہزار آدمی تھے ۔ جو یونان و ایشیاء میں سے ہر ایک جانور اور پھولوں کے نمونے مہیا کرتے تھے ۔ اس طرح ارسطو نے ایک نہایت وسیع چڑیا گھر Zoological Garden

بنا لیا جو دُنیا کا پہلا چڑیا گھر تھا۔ پھر ان علوم کی ضروریات اور لوازمات مہیا کرنے کے لئے سکندر اعظم نے 800 Talents دیئے جو آج کل کے دس لاکھ پونڈ کے برابر ہوتے ہیں۔

ارسطو کا سب سے نمایاں طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اُس نے ایک نیا سائنس یعنی منطق خود اپنے غور و فکر سے ایجاد کیا جب کہ اُس سے پہلے کوئی اس کے لئے نظیر نہ تھی۔ طب، علم الحیات اور طبیعیات میں بھی ارسطو نے یونانی دُنیا کو راستہ دکھا دیا اور بہت تحقیقات کیں۔

ارسطو کو طب سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اُس زمانہ کی طب کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کا جسم چار عناصر سے مرکب ہے۔ آتش، آب، خاک، باد۔ ان چاروں عناصر کے اعتدال کا نام صحت، اور اُن کے تناسب میں فرق کا نام مرض ہے۔ اور بالکل ہی تناسب قائم رہنا موت ہے۔ بقولِ شاعر ع "موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا"۔ ارسطو نے اپنے فلسفہ کو بھی اس ہی اصول پر قائم کیا اور کہا کہ خیر الامور اوسطہا۔ متضاد خواہشوں کے درمیانی حصّہ کا نام اوسط ہے۔ مثلاً ایک بہادرانہ فعل وہ ہوگا جو بزدلی اور ناعاقبت اندیشانہ جرأت کے درمیان ہے۔ بخل و اسراف کے درمیان سخاوت ہے۔ مناسب انکسار وُہ ہے جو ذلیل عاجزی اور خود پسندانہ تکبر کے درمیان ہے؛ لہٰذا ارسطو کے نزدیک کردار کی بہتری اس میں ہے کہ انسان اُس عمل کو اختیار کرے جو دو حدوں کی اوسط ہے۔

رُوح اور خدا:۔ ان فلاسفروں کی کیا رُوح، اور ان کا کیا خدا۔ جدھر خیال دوڑ گیا وُہ ہی رُوح، اور جدھر قیاس ٹھہر گیا وُہ ہی خدا۔ ارسطو نے رُوح کی تعریف یہ کی ہے کہ ہر ایک نشوونما پانے والے جسم کی اصلیت و حقیقتِ خالص کا نام رُوح ہے۔ ارسطو کے نزدیک رُوح جسم کے اندر نہیں رہتی۔ اور نہ وہ جسم کا حصّہ یا اضافہ ہے۔ یہ تو ایک علٰحدہ شے جسم کے ساتھ ساتھ ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہی جسم ہے یعنی جسم کی نشوونما اور خود بخود فنا ہو جانے والی طاقت کا نام رُوح ہے۔ جسم میں جو کارکن طاقتیں ہیں اُن کے مجموعہ کا نام رُوح ہے۔ اُس کو جسم سے وُہ ہی نسبت ہے جو بصارت کو آنکھ سے ہے۔ لیکن یہ جسم کا وُہ کارکن اعظم ہے جو جسم پر پورا قبضہ رکھتا ہے۔ اُس کا ہی قابو خواہشات پر ہے۔ وُہ ہی اعضائے جسم پر حکومت

Marfat.com

کرتا ہے۔ قصہ مختصر یہ تمام اجسام روح کے اعضا ہیں۔

رُوح کے تین حصے یا درجے ہیں، نامیہ، حسیہ اور عقلیہ۔ نباتات میں صرف نامیہ روح ہے۔ جانوروں میں حسیہ اور نامیہ رُوح ہے۔ اور انسانوں میں رُوح کے تینوں درجے ہیں نامیہ، حسیہ اور عقلیہ۔ اس عقلیہ رُوح کے بھی ارسطو نے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک انفعالی عقلیہ یعنی Passive Rational یہ اعلیٰ قسم کے جانوروں میں ہوتی ہے۔ مثلاً بندر، گھوڑا، کتا، ہاتھی۔ دوسری عملی عقلیہ یعنی Active Rational۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وُہ استقراء کے ذریعہ سے نتائج نکال لیتا ہے، اور جدید اختراع بھی کر سکتا ہے۔ اور یہ قابلیت اختراع ہی ہے جو کائنات کی رُوح ہے۔ انسان میں اُس کا محض ایک حصہ ہے۔ اور یہ قابلیت کبھی نہیں مرتی۔ لیکن یہ بقا محض لا شخصی (Impersonal) ہے۔ جو باقی رہتی ہے، فنا نہیں ہوتی۔ وہ یہ طاقت ہے نہ کہ شخصیت۔ اُس طاقت کی تعریف نہیں کی۔ ایسی طاقت جو شخصیت سے علٰحدہ ہو۔ شخص تو نمو، حس، عقل کا مجموعہ ہے وہ مر جاتا ہے۔ اور اُس کو بقا صرف لا شخصی حاصل ہوتی ہے۔ ان فلسفیوں کی یہ معمہ بازی تو کوئی لا شخصیت ہی سمجھے، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ طاقت کو جسم سے الگ کرکے اُس کو کائنات کی روح کہنا ہمارے نزدیک تو ایک معمہ بازی ہے۔ بجلی ہی کی قسم کی کوئی طاقت ہوئی۔ لیکن پھر اُس میں فہم و ذکا کہاں سے آیا۔ جو کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ فلسفیوں کا یہ بے معنی خدا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہم نے تو یہ ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کر دیا ہے لیکن وُہ انگریز مصنف کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھا۔ [۵۱]

خدا کے متعلق ارسطو یہ کہتا ہے کہ جس طرح روح جسم کی ایک شکل ہے اُسی طرح خدا دُنیا کی رُوح یا شکل ہے۔ یعنی دُنیا کی اندرونی طاقتوں اور کاموں کی ایک شکل تمام اسباب ایک اوّل مسبب الاسباب کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور وُہ مسبب الاسباب کسی سبب کا نتیجہ نہیں ہے۔ کائنات کی تمام حرکتیں اسی اوّل محرک کی طرف راجع ہوتی ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ حرکت اور طاقت کا اوّل

(51) The Life of Greece, pp. 531-32 and the footnote.

Marfat.com

سرچشمہ معلوم کریں۔ اور وہ ہی سرچشمہ خدا ہے۔ خدا تمام حرکتوں کا موجب، اور تمام مقاصد کا آخری مقصد ہے۔ جس طرح سے کہ درخت اپنی اندرونی طاقت اور ماہیت سے روشنی کی طرف آتا ہے، اسی طرح تمام دنیا کی تمام اندرونی اور ذاتی طاقت اور قوتوں کا مجموعہ خدا ہے۔ خدا اس دنیا کا پیدا کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس دنیا کی طاقت اور قوت ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ خدا ایک پاکیزہ خیال ہے۔ عاقل اور فہیم روح ہے۔ یہ ہے ارسطو کا خدا۔ ایسے خدا کو لوگوں کے امور سے کیا تعلق، اور جزا و سزا، عدل و عاقبت سے کیا کام!

ارسطو کے بعد یونانی حکماء

ان کو چار جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱ (رواقی) Stoics (۲ Epicureans (لذتیہ) (۳ Sceptics (حکماء لا ادریت) (۴ Neo Platonists (افلاطونیت جدید)۔ ان میں سے ہم اول تین کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب افلاطونیت جدید کا ذکر کرتے ہیں:

NEO PLATONISTS یعنی افلاطونیت جدید

افلاطونیت جدید کا اصلی بانی Plotinus ہے جو مصر کے شہر Lycopolis میں ۲۰۵ء میں پیدا ہوا۔ ۲۴۴ء میں روم میں آیا جہاں اس نے اپنا علیحدہ مدرسہ کھولا۔ ۲۷۰ء میں مر گیا۔ افلاطونیت جدید در اصل ملحدانہ یونانی فلسفہ کی آخری لڑائی ہے جو اس نے خدا اور عیسائیت کے خلاف کی۔

It (Neo Platonism) is a survival of the Pagan Spirit in Christian times. In it the old Pagan spirit struggles desperately against its younger antagonist, and finally succumbs.

A Critical History of Greek Philosophy by W. Stace, p. 369.

ترجمہ: عیسائیت کے زمانہ میں کفر کی روح نے افلاطونیت جدید کا جسم

Marfat.com

اختیار کر لیا تھا۔ افلاطونیت جدید میں پُرانے کفر کی رُوح اپنے نئے نو عمر مدِ مقابل مسیحیت کے خلاف اپنی پوری کوشش کرتی ہے اور آخر کار مغلوب ہو کر مر جاتی ہے۔
آخر کار افلاطونیت جدید مر تو گئی لیکن مسیحیت کو بھی مسخ کر گئی۔ اس کو تفصیل سے ہم علٰحدہ باب میں بیان کریں گے۔ اس بگاڑ کی وجہ یہ ہوئی کہ مسیحیت نے ارسطو کی تعلیم کو غلط سمجھا یا عمداً اُس کی تعلیم کو اپنی مسیحیت کے موافق ثابت کر کے اپنے مذہب کی عظمت بڑھانی چاہی۔ مسیحیت ارسطو کو اپنا فلاسفر مان چکی تھی۔ اب افلاطونیت جدید نے ثابت کر دیا کہ افلاطون کا فلسفہ فنا و بقاء روح مسیحیت کے نظریہ سے بہت مختلف ہے۔ لہذا مسیحیت خود اپنی نظروں میں گر گئی۔
یہ تو غلط ہے کہ ہر ایک جزئیات میں تاریخ اپنے تئیں دوہراتی ہے۔ لیکن تاریخ کی بنیاد فطرتِ انسانی پر ہے۔ اور فطرتِ انسانی ابتدائی آفرینش سے اب تک باوجود سینکڑوں فلسفوں اور ہزاروں نبیوں کے ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ لہذا ہر زمانہ میں جب تقریباً ایک سے واقعات اس فطرتِ انسانی کے سامنے برائے عمل اپنے تئیں پیش کرتے ہیں۔ تو اس فطرت کا عمل اُن پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ایسے ہی سابقہ اجتماع واقعات پر پہلے ہو چکا ہے۔ اس محدود طریقے میں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اپنے تئیں دُہراتی ہے۔ افلاطونیت جدید اور مسیحیت میں کیسی مشابہت ہے جیسی تحریک بنو امیہ اور اسلام سے۔ بنو امیہ کی تحریک جو جناب معاویہ کے زمانہ میں بالکل عیاں ہو گئی وُہ ہی کفر کی آخری کوشش اسلام کے خلاف تھی۔ اور اگرچہ یہ اصلی کفر کربلا کے میدان میں ہمیشہ کے لیئے شکست کھا کر مر گیا لیکن مسلمانوں کی اکثریت کے مذہب کو اس تحریکِ کفر نے اسی طرح مسخ کر دیا جس طرح افلاطونیت جدید نے مسیحیت کو مسخ کیا تھا Phoenix کی طرح اُس کی جلی ہوئی راکھ سے اسلام کا طاقتور دُشمن منافقت کی شکل میں نمایاں ہو کر اصلی اسلام سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہا۔
Plotinus نے افلاطون کے فلسفہ کا یہ خیال لیا کہ دُنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے اور وُہ دنیا بلکہ کائنات سے اتنا اعلیٰ و ارفع ہے کہ دُنیا سے اور دُنیا کے آدمیوں سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا اور ہوا کہ ایسے ارفع و اعلیٰ اور بے تعلق ہستی نے دُنیا کو کس طرح پیدا کیا۔ Plotinus نے خیالی نظریہ قائم کیا

کہ اُس بے تعلق ہستی سے ایک اور ہستی نکلی جس کا نام اُس نے Nous رکھا اسں Nous میں سے رُوحِ عالم نکلی، اور عالم وجود میں آیا۔ اِسکا کوئی ثبوت نہیں ہے یہ تو محض ایک شاعرانہ تخئیل ہے۔ عقلاً بھی یہ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ یونانی فلسفہ کی یہ صریح ناکامیابی ہے کہ عقل پر اُس کا سارا دارومدار تھا۔ اور عقل سے وُہ اس معمّہ کو حل نہیں کر سکا۔ یہ سوال کہ مادہ کس طرح پیدا ہؤا۔ عقل کے لیئے ناقابلِ حل معمّہ رہا۔ اُس کو اس طرح شاعرانہ تخئیل سے حل کرنا صریح اقبالِ شکست ہے۔ اس کے بعد مذہب شروع ہوتا ہے۔

ایک تھوڑے سے وقفہ کے بعد جبکہ خدا اور رُوح کو ماننا فلسفہ کے لیئے ضروری تھا، یورپ کا فلسفہ پھر دہریت کی طرف چلا گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ زمانۂ حال میں یورپ نے کوئی نیا فلسفہ جاری نہیں کیا بلکہ وُہ پرانے یونانی فلسفہ کو ذرا حاشیہ آرائی سے بیان کر دیا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد عقل پر ہے۔ اور عقل انسانی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔

آج کل بھی یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وُہ ہی پُرانا افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اور بہت عزّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانۂ ماضی میں اور اب بھی عقل انسانی نے بہت کوشش کی۔ اتنی، کہ اب اس سے زیادہ کوشش نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی وُہ حق کو نہ پا سکی۔ (۵۲)۔ اس زمانہ کے فلاسفر کے قلم سے یہ بہت بڑا اقبالِ ناکامیابی ہے۔ اس سے ہی مذہب کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ افلاطون کے فلسفہ کے بڑے حصّہ کو مسیحیت نے اپنے میں لے لیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسیحیت محض افلاطون کے فلسفہ اور دیگر ملحدانہ تخئیلات مثلاً Orphisan کا دوسرا نام ہے (۵۳)۔ اس کی تفصیل ہم بعد میں کریں گے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے علم الحیات (Biology) میں ارسطو کے بہت سے نظریات کی

۵۲ (52) The Life of Greece, Chap. xxi, p. 513

۵۳ (53) Ibid p. 523

پیروی کی گئی ہے (۵۴)۔ مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کے کس کس فلاسفر نے اپنے فلسفہ کی بنیاد ماضی کے کس فلاسفر کے فلسفہ کے اُوپر رکھی ہے (۵۵)

زمانۂ حال کا فلاسفر	ماضی کا وُہ فلاسفر جس کے فلسفہ کی مطابقت اُس نے کی۔
Galileo	Thales
Hobbes	Democritus
Encyclopedists	Sophists
Voltaire	Protagoras
Spencer	Aristotle
Anatole Frauce	Epicurus
Pascal	Pyrrho
Hume	Arcesilus
Kant	Carneades
Schopenhauer	Zeno
Bergosan	Plotinus

اندریں صورت ہم اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ زمانۂ حال کے فلاسفروں کا ذکر کرکے ماضی کے فلسفہ کو دُہرانا نہیں چاہتے۔

۵۴ (54) Ibid p. 529

۵۵ (55) Ibid p. 659

Marfat.com

باب ہفتم

غیر اسلامی فلسفے

(مذہب یونان)

یونان کو اُس کی تہذیب اور اُس کا مذہب ہمسایہ جزیرہ قریطہ نے دیا ہے۔ لہٰذا پہلے اُس کا بیان ضروری ہوا۔

جزیرۂ قریطہ کے باشندوں کا مذہب

ہم نے جزیرۂ قریطہ کی تہذیب اور اُس کے مذہب کو اس وجہ سے منتخب کیا ہے کہ یہ یورپ کی سب سے پہلی تہذیب ہے۔ اور تجارت کے ساتھ ساتھ یہ تہذیب سارے یورپ پر مسلط ہوگئی۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ یونان کو قوم ڈورین Dorians نے فتح کر کے اپنی تہذیب اور اپنی آبادی دی۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جو آثار قدیمہ کے انکشافات ہوئے، اُنھوں نے اس خیال کو قطعاً غلط ثابت کر دیا۔ اور اب یہ امر مسلمہ ہے کہ اہل قریطہ نے یونان اور اُس کے ملحقہ ملکوں کو فتح کر کے اپنی تہذیب، اپنی آبادی اور اپنا مذہب یونان کو دیا۔ اور پھر یہ تہذیب و مذہب تمام یورپ میں پھیل گئی۔

جزیرۂ قریطہ بحر متوسط میں ایک طرف تو مصر اور یونان کے درمیان واقع ہے اور دوسری طرف اطالیہ اور ایشیائی کوچک کی ساحلی قوم کے ملک فینقیا کے درمیان ہے۔ تجارت کی رُو سے یہ بہت اچھا مقام تھا۔ چنانچہ تجارت بہت پھیلی۔ یہاں بہت عیش و عشرت اور اُس کے لوازمات بڑھ گئے کوئی بدی اور بداخلاقی نہ تھی جو یہاں نہ ہو۔ اُس کی تہذیب کو Minoan تہذیب کہتے ہیں۔

Marfat.com

چونکہ قریطہ دونوں کے درمیان تھا، لہٰذا اُس کی تہذیب بھی ایشیا اور مصر کا مخلوط نمونہ ہے۔ قومیت کے لحاظ سے تو یہ لوگ ایشیائی کوچک سے آن کر آباد ہوئے تھے لیکن زندگی کی ضروریات اور آرائش مصر سے لی گئی تھیں۔ اس تہذیب کا زمانہ Neolithic یعنی متاخر حجری سے ملا ہوا تھا۔ قریطہ کے خود اندرون ملک میں زندگی کے سامان کی اشیاء زیادہ نہ تھیں۔ اور آج کل کے انگلستان کی طرح اس کی زندگی بیرونی تجارت پر منحصر تھی اور اسی تجارت کی وجہ سے انگلستان کی طرح یہ ملک بہت دولت مند ہو گیا تھا۔ اور دولت اپنے ساتھ وہی عیش و عشرت کے سامان لائی جو دنیا کے ہر ملک اور ہر حصہ کی بربادی اور ہلاکت کا باعث ہوئے ہیں۔ قرآن شریف کی بیان کردہ سنت اللہ ہے کہ دولتمند اور امراء ہی اپنے اعمال کی وجہ سے باعث ہلاکت ہوتے ہیں۔ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا

(بنی اسرائیل ۱۷-۱۶)

یعنی ہم جب کبھی اُس کے اعمال کی وجہ سے کسی بستی کو ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے، تو ہم وہاں دولت مند لوگ بڑھا دیتے ہیں۔ وہ لوگ فسق و فجور کرنے لگتے ہیں تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے اور ہم اُس کو اچھی طرح برباد کر دیتے ہیں۔ اَمَرْنَا کے معنی "ہم نے بڑھایا" کے ہیں۔ یعنی زیادہ کئے۔ چنانچہ اس بستی پر تین دفعہ عذاب الیم آیا۔ لوگ نہ سنبھلے تو آخر میں یعنی تیسری دفعہ ایسا عذاب آیا، کہ صفحہ ہستی سے نابود ہو گئی۔ اور اب آثارِ قدیمہ سے اُس کی گزشتہ ثروت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی بربادی ہی کے لحاظ سے اس تہذیب کے تین زمانے مقرر کئے گئے ہیں۔

اس کا دارالسلطنت شہر نوسس Cnossus تھا۔ جہاں بہت بڑا قلعہ بھی تھا جس کے آثار اب تک ملتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں ڈاکٹر آرتھر ایونز Dr. Arthur Evans نے یہاں بڑے پیمانہ پر کھدائی کر کے حالات کا انکشاف کیا۔ اس تہذیب کے تین زمانے یہ ہیں:-

(۱) سب سے پہلی قریطی تہذیب تقریباً ۴۰۰۰ ق م تا ۳۰۰۰ ق م۔ ۳۰۰۰ ق م تا ۲۶۰۰ ق م۔ ۲۶۰۰ ق م تا ۲۳۵۰ ق م۔ گویا اس کے بھی تین حصے ہوئے۔

Marfat.com

(۲) قریطہ کی تہذیب کا زمانہ وسطی ۲۳۵۰ ق م تا ۲۱۰۰ ق م

۲۱۰۰ ق م تا ۱۹۵۰ ق م - محلات کے بننے کا یہ آغاز کا زمانہ تھا۔

۱۹۵۰ ق م تا ۱۷۰۰ ق م - اس کے بھی تین حصّے ہوئے۔

۱۹۰۰ ق م میں سب سے پہلی تباہی آئی۔

(۳) آخری زمانۂ تہذیبِ قریطہ ۱۵۰۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م اور ۱۴۰۰ ق م تا ۱۲۰۰ ق م۔

دوسری مرتبہ عذاب الٰہی نازل ہوا۔ یہ ۱۴۵۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م کا زمانہ تھا۔ اور تیسری دفعہ ۱۲۰۰ ق م میں تو یہ ملک ایسا برباد ہوا، کہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔

انکشافاتِ ارضی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عذاب دو شکلوں میں آیا۔ یعنی زلزلے اور آگ۔ اور اُس وقت آیا، کہ جب یہاں کی آبادی گمراہی اور ظلم کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ ایک امریکن مؤرخ کہتا ہے کہ زلزلہ نے تمام محلات کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ یہاں کے ظلموں اور گمراہی کی حالت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

یہ تباہی جب ہوئی، Accumulated oppressions of Centuries کہ جب صدیوں کے مظالم اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو Cnossus اور اس کا قلعہ برباد ہوا۔ پھر زلزلہ نے Phaestus کے شہر اور قلعہ کو برباد کیا۔ شہر Hagia Triada جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ ۱۴۵۰ ق م کی بات ہے۔ ان شہروں میں اور دیگر شہروں میں امراء کے گھر بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ ۱۴۰۰ ق م کے قریب شہر اور قلعہ Cnossus پھر تباہ ہو گئے۔ اس دفعہ غالباً بہت بڑی آگ نے ان کو تباہ کیا۔ اُسی زمانہ میں زلزلہ سے Gournic Zakro Pseira اور Palaikastro کے شہر برباد ہوئے۔

مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ شہر اُوپر سے نیچے اُلٹے دبے ہوئے نکلے ہیں۔ اور یہ عذاب ایسی بے خبری میں یکایک آیا کہ لوگ بازاروں میں معاملات کر رہے تھے اور گھروں میں عیش و عشرت کے دَور چل رہے تھے کہ یکایک عذاب الٰہی نے آ

دبوچا۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

In any case, the catastrophe was sudden; the workshops of artists and artisans give every indication of having been in full activity when death arrived. About the same time, Gournia, Pseira, Zakro, and Palaikastro were levelled to the ground.

(The Life of Greece by Will Durant pp. 21, 22)

ترجمہ:۔ بہرحال بلائے ناگہانی (عذاب الٰہی) بالکل اچانک بے خبری میں آئی دوکانداروں اور کاریگروں کی جو دکانیں دبی ہوئی برآمد ہوئیں ان میں اس کی اور یقینی علامات پائے جاتے ہیں کہ وہ اپنے کاموں میں مشغول تھے کہ یکایک موت نے اُن کو آدبوچا۔ اُسی وقت گورنیا، سائرا، ذکرو اور پیلیکاسٹرو کے شہر بھی زلزلے منہدم ہوکر زمین کے برابر ہوگئے۔

ان حالات کی مطابقت بلکہ پیشین گوئی قرآن شریف سے سنیئے۔ جو حالات اب جاکر ۱۹۰۰ء میں بڑی کھدائی کے بعد معلوم ہوئے ہیں۔ اُن کی پیشگوئی ساتویں صدی عیسوی کے نازل شدہ قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ اس تباہی و بربادی کا اصلی باعث معلوم کیجئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اور بھی ایسے کئی قریئے تھا جو اسی برباد کر دیئے گئے۔

(۱) وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۞ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۞ (النمل ۔ ۲۷: ۵۰، ۵۱، ۵۲)

(۲) فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۞ (الحج ۔ ۲۲: ۴۵)

(۳) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۞ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۞ (الحجر ۔ ۱۵: ۷۳، ۷۴)

(۴) قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۔ (آل عمران ۔ ۳ ۔ ۱۳۷)

ترجمہ: (۱) ان لوگوں نے مکر کی تدبیر کی ۔ ہم نے بھی اُن کے مکر کو توڑنے کی تدبیر کی ۔ اور (ہماری تدبیر کی) اُن کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ تو (اے رسولؐ) تم دیکھو اُن کی تدبیر کا کیا انجام ہوا ۔ ہم نے اُن کو اور اُن کی ساری قوم کو ہلاک کر ڈالا ۔ اب یہ اُن کے گھر ہیں کہ اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ویران پڑے ہیں ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس واقعہ میں جاننے والے لوگوں کے لیئے کتنی عبرت ہے ۔

(۲) کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے اُنہیں برباد کر دیا ۔ کیونکہ وُہ سرکش تھیں ۔ اب وُہ اپنی چھتوں پر منہدم پڑی ہیں ۔ کتنے کنوئیں بے کار ہو گئے اور کتنے مضبوط بڑے بڑے اونچے محل ویران ہو گئے ۔

(۳) سورج نکلتے نکلتے ان کو بڑے زور کی آواز چنگھاڑ نے لے ڈالا پھر ہم نے اس بستی کو اُلٹ کر اُوپر کو نیچے کر دیا ' اور اُن پر پتھروں کے مینہ برسائے ۔

(۴) تم سے پہلے بہتیرے واقعات گزر چکے ہیں ۔ پس تم ذرا رُوئے زمین پر چل پھر کر تو دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ۔

مذہب : ۔ اب ہم اُن کے مذہب کا ذکر کرتے ہیں :۔

اُن کے خدا وہ ہی تھے جو اُنہوں نے یونان کو دیئے تھے ۔ وُہ ہی آپس کا زنا اور چوری اور دھوکہ بازی ۔ تقریباً ۱۲۵۰ء ق م میں کریٹ (قریطہ) کا بادشاہ Minos تھا ۔ اُس کی بہت سی بیویاں تھیں ۔ لیکن ہر ایک سے سانپ اور بچھو پیدا ہوا کرتے تھے ۔ کسی ترکیب سے اُس کی بیوی Pasiphae کے یہاں اصلی روپ کے بچے ہوئے ۔ اُن میں سے دو لڑکیاں Phaedra اور حسین Ariadne تھیں ۔ Minos نے کسی طرح ایک خدا کو ناراض کر دیا ۔ اس خدا کا نام Poseidon تھا ۔ اُس نے اپنا انتقام اس طرح لیا کہ اس بادشاہ کی بیوی Pasiphae کے اندر شہوت پیدا کر دی کہ وُہ خدائی سانڈ سے جماع کرائے ۔ چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا ۔ دونوں کی مباشرت ہوئی ۔ اور اس مباشرت سے ملکہ نے ایک لڑکا Minotaur جنا ۔ جس کا جسم آدھا آدمی کا اور آدھا بیل کا تھا ۔ جس کی خوراک زندہ انسان ہوا کرتی تھی ۔

Marfat.com

اہل کریٹ بہت مذہبی آدمی مشہور تھے۔ وُہ پہاڑوں، غاروں، پتھروں، درختوں ستونوں، بکریوں، سانپوں، سانڈوں اور فاختہ کی پرستش کرتے تھے۔ تعداد تین (۳) کی پوجا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تمام ہوا اچھی اور بُری روحوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور یہ ہی عقیدہ اُنہوں نے یونان کو دیا۔ یونانیوں کا بھی عقیدہ تھا کہ جنگل میں خوبصورت پریاں اور بھوت رہتے ہیں۔ اور خوبصورت اور حسین مونث خدائنیاں پہاڑوں اور دریاؤں میں آباد ہیں۔ اگرچہ اہل کریٹ خود انسان کے اعضاء تناسل کی پرستش نہیں کرتے تھے، لیکن سانپ اور سانڈ کی قوت جماع کی تعظیم کرتے تھے، اور تعجب بھی کرتے تھے۔ اور ایسی خدائنی کو مانتے تھے جو ماں کی طرح مہربان تھی۔ اور اُس کے بڑے بڑے پستان اور موٹے موٹے کولھے تھے۔ سانپ اور دیگر رینگنے والے جانور اُس کے بازوں اور پستانوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اُس کے بالوں کی لٹوں میں بھی سانپ گندھے ہوئے ہیں، اور اُس کے سر پر بھی سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ خدائنی شہوت سے ہر وقت بھری رہتی ہے۔ اور چونکہ بچے جنتی ہے لہٰذا اُس کی پیدا کرنے کی قوت کی وُہ پرستش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وُہ اپنے بچہ Velchanos کو گود میں لیئے ہوئے ہوتی ہے جو ایک پہاڑی غار میں پیدا ہوا تھا۔ ایسی خدائنی کا تخیل اُس زمانہ کے ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً مصر میں Isis; Horus بابل، سمیر، آغاد میں Ishtar اور Tammuz یونان اور رُوم میں Aphrodite Attis Cybele اور Adonis اہل کریٹ نے اس عورت کے بچہ Velchanos کو بھی خدائی درجہ دیا۔ اور اُس کو بارش اور پانی کا ذرا سمجھا گیا۔ اہل کریٹ کے مذہب میں پانی کو وُہ ہی درجہ حاصل تھا جو حکیم تالیس نے دیا تھا۔ یعنی حقیقتِ اوّل سمجھا تھا۔ اہل کریٹ کے اعتقاد کے بموجب اُن کا خدا Velchanos مر گیا۔ مر کر قبر میں سے زندہ ہو کر پھر نکلا۔ اور اہل کریٹ کے پروہت اُس کے دوبارہ زندہ ہونے کی رسم کو نہایت خوشی و اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ پرانے زمانہ کے مذاہب کے اعتقاد میں خدا کا قبر میں سے نکل کر زندہ ہونا رائج تھا۔ چنانچہ مذہب متھرا اور مذہب عیسوی میں یہ اعتقاد پائے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے مُردہ جسم کو عیسائیوں کے اعتقاد کے بموجب قبر میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے دن وُہ

Marfat.com

قبر میں سے زندہ ہو کر نکلے۔ اہلِ کریٹ کا اعتقاد ہے کہ اُس خدا نے سانڈ میں
جنم لیا۔ اور یہ ایسا ہی سانڈ تھا جس نے Minos بادشاہ کی بیوی Pasiphae سے
جماع یا زنا کیا تھا۔

اُن خداؤں کی خاطر و مدارات کے لیئے وُہ بہت قربانیاں کرتے تھے۔ اور
اُن کے دل کو نرم کرنے کے لیے اُن سے بہت التجائیں کیا کرتے تھے۔ اور
یہ رسوم قربانی و التجا عام طور سے خواتین پروہت کیا کرتی تھیں۔ بعض دفعہ سرکاری
حکام اِن فرائض کو انجام دیتے تھے۔ بھوتوں کو دفع کرنے کے لیئے خوشبو جلاتے
ہیں۔ خداؤں کی غفلت دُور کر کے ان کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیئے باجا بجاتے
ہیں، اور اُن کو خوش کرنے کے لیئے بانسری بجاتے ہیں۔ درختوں میں پانی دیتے
وقت کچھ رسوم ادا کرتے ہیں تاکہ پانی کا خدا خوش ہو کر اُن میں سبزی اور فراوانی عطا کرے
زنانی پروہتیں بالکل ننگی ہو کر درختوں کے پکے پھل جھاڑتی تھیں۔ ایک بڑا جلوس
خدائنی کے اعزاز میں نکلتا ہے جس میں خدائنی کو پالکی میں بٹھا کر عورتیں گاتی اور
ناچتی ہوئی چلتی ہیں۔ ان کا کوئی مندر تو نہیں ہوتا لیکن پہاڑوں کے غاروں اور
درختوں کے جھنڈ ہی کو مندر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور وہاں اپنے
خداؤں کو رکھتے ہیں۔ چند چیزیں جن کو وُہ مقدس سمجھتے ہیں، وہاں رکھی جاتی ہیں
اور اُن کی پرستش کی جاتی ہے۔ مثلاً سپر، صلیب جن کی تصویریں وہ ایک سانڈ
کے ماتھے پر کاٹ کر یا داغ دے کر بناتے ہیں۔

اجداد پرستی بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ مُردوں کو یہ بڑے مٹی کے تابوت یا
مٹکوں میں بند کر کے دفن کر دیتے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے، تو
یہ مُردے شاید واپس آجائیں اور ہم کو نقصان پہنچائیں۔ اُن مردوں کو زمین کے اندر
مشغول رکھنے کے لیئے اُن کے ساتھ کچھ غذا، آرائش اور سنگھار کا سامان رکھ دیتے
ہیں۔ مٹی کی عورتیں بنا کر بھی رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ یہ عورتیں اُن کو خوش رکھیں
بعض دفعہ اصلی خوراک کی بجائے مٹی کے جانور رکھ دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ یا امیر
مُردہ ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ جواہرات و قیمتی پتھر بھی رکھ دیتے ہیں۔ شطرنج
کھلاڑی کے ساتھ شطرنج اور گویئے کے ساتھ مٹی کا ساز و سامانِ موسیقی بنا کر رکھ دیتے

Marfat.com

ہے۔اُس شخص کے مُردے کے ساتھ جو سمندر کا شائق تھا ایک مٹی کی کشتی بھی رکھ دی جاتی ہے۔اُن کا خیال ہے کہ اُن ارواح کو جن کو یہ لوگ اس طرح پاک و صاف کر دیتے ہیں، اُن کے خدا Velchanos کا لڑکا Phadamanthus جنت میں امن اور وُہ خوشی دے گا، جو ان کو اس دُنیا میں نہ مل سکی۔یہ اعتقادات مصریوں کے اعتقادات کے مشابہ ہیں۔ان کے حالات کے لیئے دیکھو (۵۶)

(۴) یونان کا مذہب!

ان مذاہب کے مطالعہ سے ایک بات بہت اچھی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ وُہ یہ کہ الکفرۃ ملۃٌ واحدۃٌ۔ یہ سب مذاہب ایک دُوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔بلکہ اُس ذات کا تخیل جس کو یہ خدائی کا درجہ دیتے ہیں، ایک ہی اندازہ پر مبنی ہے۔اگرچہ ہر ایک ملک میں یہ تخیل علحدہ آزادانہ طور سے قائم ہوا ہے لیکن چونکہ وُہ سبب جس نے اس مذہب کو تقویت دی یعنی ڈر، وُہ سب میں مشترک تھا۔ وُہ چیز جس نے یہ ڈر پیدا کیا (یعنی اندھیرا، مناظر قدرت اور اتفاقات) سب جگہ ایک سے تھے اور وُہ شے جس میں یہ ڈر پیدا ہوا یعنی دماغ انسانی، وہ بھی ایک تھا۔ لہٰذا وُہ مذہب جو ان سب سے مل کر پیدا ہوا، وُہ بھی تقریباً ہر جگہ ایک ہی ہوا۔ہاں ہر ملک میں کچھ کچھ واقعات علحدہ تھے لہٰذا چند جزئیات میں اختلاف ہوا۔

ان تمام مذاہب کو ایک ہی قالب میں ڈھالنے والا ایک اور سبب بھی تھا اور وُہ سبب باہمی ارتباط بذریعہ سیاحت و تجارت تھا۔اس صنم پرستی کا ابتدائی گھر مصر معلوم ہوتا ہے۔مصر سے شام، اشوریا اور بابل، سمیر، آنادہ میں ایک طرف اور کریٹ میں دوسری طرف یہ طوفان گیا۔بابل کی طرف سے ہندوستان میں اور کریٹ کے ذریعہ سے یونان و فرنگستان میں پھیلا۔اس طرح ساری دنیا کے

(56) Encyclopedia of Religions and Ethics ; Bury's History of Greece, chap. I, Sec. 2; Will Durant's Life of Greece. Chapt. 1 ; The Cambridge Ancient History.

کفر کا منبع مصر ہوا۔ اور جب خداوند تعالیٰ نے اپنے انبیاء خصوصاً ابراہیم، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام کو مصر میں ہدایت کے لیئے بھیجا، تو گویا تمام دنیا کے کفر کو ہدایت کا پیغام دیا گیا۔ اور ان سب کے فلسفے اور مذاہب میں جو اسلام سے ملتے جلتے تصورات کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، وہ اس ہی ہدایت کا اثر ہے۔ بادشاہ کو خدا تصور کرنا خاص طور سے مصر کی ایجاد معلوم ہوتی ہے اور اس ہی تخیل کو نیست و نابود کرنے کے لیئے حضرت موسیٰؑ فرعون مصر کی طرف بھیجے گئے۔

یونان کے مذہب میں دو باتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو خداؤں کی کثرت اور دوسرے اُن کے پرستاروں کی اطاعت۔ ہر ایک خاندان کا علٰحدہ خدا ہوا کرتا تھا، اور اُس کا بُت بھی خاندان میں رہتا تھا۔ اُس خدا کے نام پر ہر گھر میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی تھی۔ کبھی ایک لمحہ کے لیئے بھی نہیں بجھتی تھی۔ اُس کے پرستار اپنے ہر کھانے سے پہلے اُس بُت کے آگے کھانا اور شراب رکھتے تھے، گویا وہ اپنے خدا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ یہ ایک Holy Communion (مقدس شرکت) تھی۔ اس مذہب کا یہ خاص اور اہم رُکن تھا۔ اس ہی سے نمونہ لے کر عیسائیت میں Holy Communion (شرکت عشائی ربانی) اور Last Supper کی رسوم گئی ہیں۔ کم سے کم تخیل وہ ہی ہے۔ اس آتش فروزاں کے سامنے پیدائش، شادی اور موت کی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔

اس خاندانی نمونہ ہی پر ہر برادری، قبیلہ اور ہر شہر کا اپنا علٰحدہ خدا ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اتھنز شہر کے چند خدا تھے اُن کی پرستش مین شہر کے بیچوں بیچ اور نیز وہاں کے سب سے اُونچے مقام پر ہوا کرتی تھی۔ اُس پرستش کی شرکت ہر یونانی کی علامت اور اُس کا حق ہوا کرتی تھی۔ اور جو یونانی شہری حقوق کا خواہش مند ہوا کرتا تھا اُس کے لیئے اس پرستش میں شریک ہونا ایک لازمی شرط تھی۔ یونان میں شہری حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اکثر یہ شہری آپس میں برسر پیکار رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ جب لڑائی کے لئے نکلتے تھے تو ان کی فوجوں کے آگے آگے ان کے خداؤں کے بُت بھی جاتے تھے۔ ان کی کوئی اہم تجویز یا پالیسی بغیر خدا کے مشورہ کے نہیں ہوتی تھی۔ اور خدا کا مشورہ فال کے ذریعہ سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اب یہ خدا کا فرض تھا کہ ان کی فوجوں کے

آگے وہ ان کی طرف سے لڑے۔ شہر آپس میں کیا لڑتے تھے بلکہ اُن کے خدا آپس میں لڑتے تھے۔ اور شکست و فتح شہر یا شہر کے باشندوں کی نہیں بلکہ اُس کے خداؤں کی سمجھی جاتی تھی۔ ہر شہر کے ٹاؤن ہال میں دائمی آگ فروزاں رہتی تھی۔ خاندان کا باپ خاندانی خدا کی پرستش کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور وہی رسوم ادا کرتا تھا۔ اسی طرح شہری خداؤں کی پرستش کا ذمہ دار شہر کا حاکم یعنی چیف مجسٹریٹ ہوا کرتا تھا۔ وہ شہر کا High Priest سمجھا جاتا تھا۔ اور رسوم کی ادائیگی کا سردار ہوا کرتا تھا۔

خداؤں کی کثرت کی ایک تو یہ وجہ ہوئی کہ خاندان لاتعداد تھے۔ دوسرے ہر بات، ہر واقعہ، ہر تغیر کا ایک خدا علیحدہ ہوا کرتا تھا۔ زمین آسمان کی ہر قوت اور عمل کے لیئے علیحدہ خدا ہوتے تھے۔ آسمان کے لیئے باد و باراں، برق اور برف، چاند اور ستاروں کے لیئے علیحدہ علیحدہ خدا ہوتے تھے۔ دریاؤں، جنگلوں، سمندروں اور درختوں کے علیحدہ خدا ہوتے تھے اور بہت سے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ رنج و غم، خوشی و راحت، غصہ، حسد، محبت، نفرت کے مختلف خدا ہوتے تھے۔ ہر ایک پیشہ و صنعت کے خدا علیحدہ تھے۔ ان خداؤں کو اس یقین کے ساتھ خدا سمجھا جاتا تھا، کہ کوئی کام کوئی ارادہ کوئی فعل بغیر خدا کے نام لیئے ہوئے اور اُس کی طرف منسوب کیئے ہوئے نہیں کیا جاتا تھا۔ جبھی تو کہا گیا ہے کہ کفار اپنے جھوٹے خداؤں کی اتنی اطاعت کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے سچّے خدا کی اتنی اطاعت نہیں کرتے۔ ان سب خداؤں کو شخصیت اور انسان کی شکل دی گئی تھی۔ اور انسان کی طرح کے اعضاء اور عادات اُن کی طرف منسوب کیئے گئے تھے۔ یہ خدا اتنے ہوئے کہ ان کا گننا ایسا ہی ناممکن تھا کہ جیسا قطرہ ہائے باران کا۔ اب ان کے علاوہ ہزاروں جن، پریاں، بھوت، پریت ہوئے جن کی پرستش کرنی ضروری تھی۔ ان کے اندرونی خوف نے تخئیل کے ذریعہ سے ایسی شکلوں اور عادت والی عورتیں اور مرد پیدا کر لیئے تھے، جن کے خیال سے خواہ مخواہ انسان کے دل میں خوف اور ہیبت پیدا ہو۔ مثلاً چند ایسے عورت کی شکل کے جاندار تصور کر لیئے تھے، جن کے بیان سے ڈر لگتا ہے۔ تین عورتیں Sthuno Euryal اور Medusa تھیں۔ اُن کے اُڑنے والے بازو ہوتے تھے اور جسم پر بالوں کی جگہ پھنپھناتے ہوئے سانپ تصور کیئے گئے تھے

Marfat.com

اور اُن کو بھی خدا سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک خدا کے ساتھ چند قصّے منسوب کر دیئے گئے تھے۔ جن سے اُن کی خدائی کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا مطلوب ہوتا تھا۔

یونان میں بہت سے فلاسفر جن میں سے چند تو بظاہر مثلاً سقراط اور سب دل سے اس مذہب کو ایک لغویت سمجھتے تھے۔ لیکن یونانی تہذیب کے آخری وقت تک عوام الناس اہلِ یونان ان "خداؤں" کو خدا سمجھتے رہے اور اُن کی پرستش کرتے رہے۔ بلکہ نئے خدا بناتے رہے۔

یہ خدا تعداد میں اتنے تھے کہ ان کا شمار کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ لیکن اگر ہم ان میں کچھ ترتیب پیدا کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی سات قسمیں ہیں:۔

(۱) آسمان کے خدا۔

(۲) زمین کے خدا۔

(۳) پیدائش اور پیداوار کے خدا۔

(۴) جانوروں میں سے خدا۔

(۵) زمین کے نیچے دوزخ HADES میں رہنے والے خدا۔

(۶) قوم کے نامی لوگ اور خاندانوں کے آباؤ اجداد جن کو ہمیشہ خدائی کا درجہ دیا جاتا تھا۔

(۷) کوہِ اولمپس کے خدا۔

قسم اوّل

اوّل تو آسمان ہی ایک خدا سمجھا گیا تھا۔ جیسا کہ وید کے ہندوؤں کے یہاں تھا جو آخر کار یونان میں Zeus بن گیا۔ اہلِ سپارٹا گھوڑوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔ تاکہ وُہ گھوڑے اوپر آسمان میں سُورج کی گاڑی کو چلائیں۔ تخئیل یہ تھا کہ جس طرح اہل رتھ میں بیٹھا کرتے ہیں، اسی طرح سورج خدا بھی گاڑی میں بیٹھ کر آسمان پر اُڑا چلا جاتا ہے۔ جزیرہ روحدس Rhodes کے رہنے والے یونانی حکومت کے دنوں میں سُورج کو اپنا خاص خدا سمجھتے تھے۔ اور اُس کا نام Helios تھا۔ اور ہر سال

Marfat.com

اُس خدا کے واسطے ایک گاڑی اور چار گھوڑے سمندر میں ڈال دیتے تھے ۔ یونان میں بھی اس خدا کا اتنا زور تھا کہ یہ کہنے پر کہ سُورج تو محض ایک آگ کا کرہ ہے، انگزاغورس فلاسفر کو اتنا ستایا کہ قریب تھا کہ اُس کو قتل کر دیتے اگر وہ اپنی جان بچا کر بھاگ نہ جاتا ۔

قسمِ دوم

لیکن یونان کے خداؤں کی اکثریت زمین ہی پر تھی ۔ خود زمین دھرتی ماتا GE کے نام سے خدا سمجھی جاتی تھی ۔ زمین پر سینکڑوں خدا رہتے تھے ۔ پانی میں، ہوا میں، درختوں میں، جنگلوں میں، دریاؤں اور جھیلوں میں ۔ غرض زمین کے کونے کونے میں خدا تھے ۔ چرواہوں اور گلے کا خدا Pan بڑا مشہور اور دلچسپ تھا ۔ جنگل میں بانسری کی آوازیں آیا کرتی تھیں، اور سب سمجھ جاتے تھے کہ خدائے Pan تشریف لائے ۔ گانوں کی نوجوان عورتوں سے اُنہیں بڑا شغف تھا ۔ اکثر اُنہیں حاملہ کر دیا کرتے تھے ۔ اور وہ عورتیں اپنے والدین اور خاوندوں سے جا کر کہا کرتی تھیں کہ ہم کو خدائے Pan نے حاملہ کر دیا ہے ۔ اور وہ لوگ اس نعمت کے لیئے اس خدا کا شکریہ قربانی کی صورت میں ادا کیا کرتے تھے ۔ اس کی شکل نصف بکرے اور نصف آدمی کی تھی ۔ اس تحقیقات کی تو اُن کو کیا ضرورت تھی کہ یہ بانسری بجانے والا کون تھا جس نے ہماری لڑکی یا بیوی کو حاملہ کیا، اُن کو یقین مستحکم تھا کہ جناب Pan کا یہ کام ہے کوئی اور نہیں کر سکتا ۔

قسمِ سوم

طاقتِ پیدائش، اور پیداوار بڑی زبردست تھی اور بہت مفید تھی ۔ لہذا یونانی بھی ہندوؤں کی طرح مرد کے عضوِ تناسل اور عورت کے اندامِ نہانی کی خوب پرستش کرتے تھے ۔ اُن کی شکلیں بنا کر بڑے جلوس نکالا کرتے تھے ۔ ہر ایک مذہبی جلسہ پہلے اس اعضائے تناسل کے جلوس سے شروع ہوتا تھا ۔ بڑے بڑے شہروں کے مذہبی جلسوں اور جلوس میں چھوٹے چھوٹے شہر اپنے اپنے

Marfat.com

اعضائے تناسل بناکر اس جلوس میں شامل ہونے کے لیئے بھیج دیتے تھے۔ یہ عبادت کی تعریف میں آئے یا نہ آئے اس سے اُن کا مقصد تو حل ہوجاتا ہوگا۔ حکماء اور اطباء کے پاس اس سے بہتر کمزوری کا اور کیا نسخہ ہوتا ہوگا۔ اس طرح نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں خوب اولاد پیدا کرنے کا جذبہ زور کرتا ہوگا اور خوب اولاد پیدا ہوتی ہوگی۔

یونان کے کئی مشہور اور بڑے شہروں اور صوبوں میں ماتا دیویوں یعنی مؤنث خداؤں کی بڑی پرستش ہوتی تھی۔ ان ماتاؤں کے نسبت تصور تھا کہ یہ بغیر خاوند کی ہیں۔ اور جس خدا سے جب چاہتی ہیں مجامعت کراکر بچے لے لیتی ہیں۔ ندا عت کی ایک ایسی ہی ماتا دیوی (Demeter) تھی۔ اس کی نسبت یہ تصور تھا کہ اس کی لڑکی (Persephone) کو جبکہ وہ عطر آمیز نسیم سحر کی مسحور کن فضا میں اپنے گل عارض سے مقابلہ کرنے کے لیئے گلوں کے باغ میں سے گل چینی کر رہی تھی اور بلبل عاشق کے دل کو جلا رہی تھی کہ اتنے میں اندرون ارض کا خدا Pluto اُس پر عاشق ہوگیا اور اُس کو دبوچ کر اندرون ارض کی دوزخ کی تاریکی میں لے گیا۔ وہاں مُردوں کی ارواح رہتی ہیں اور اس Pluto کا حکم جاری ہے۔ اُس کی ماں (Demeter) روتی دھوتی وہاں پہنچی اور PLUTO سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ سال کے نو مہینہ تو Persephone اُس کے پاس زمین کے اُوپر رہے اور تین مہینے اندرون ارض کی تاریکی میں Pluto کی آغوش میں رہے۔ ایسے ہی قصے Isis اور Osiris کے مصر میں۔ Tammuz اور Ishtar کے بابل میں Astarte اور Adonis کے شام میں اور Attis اور Cybele کے ایشیائی کوچک میں رائج تھے۔ اور ہمارے اس نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ الکفرۃ ملۃٌ واحدۃٌ۔ غالباً ان کے ہی زیر اثر مسیحیت میں ماتا میری کو خدا کا درجہ دیا گیا۔

قسم چہارم

اسی طرح جانوروں کی پرستش اور اُن کی خدائیت ازمنہ قدیم کے تقریباً سلسلے

ہی ملکوں میں جاری تھی۔ مصر میں اور ہندوستان میں تو ان جانور خداؤں کا چڑیا گھر بنا ہوا تھا۔ تقریباً ہر ایک عجیب اور ڈراؤنا یا خوبصورت جانور خدا تھا۔ یونان میں بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ سانڈ خاص طور سے طاقت اور قوتِ جماع کی وجہ سے خداؤں کی فہرست میں داخل ہو گیا تھا۔ Zeus اور Dionysus خداؤں کی شکل میں سانڈ کی مشابہت بہت ہے۔ اسی طرح Hera جو ایک خدائنی تھی، اُس کی آنکھ گائے کی تھی۔ گویا وُہ گائے خدا تھی۔ اسی طرح سُؤر اور سانپ کو خاص طور سے شہری مندر کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔

قسم پنجم

زمین کے اندر کے خدا بہت خطرناک تھے۔ اور اُن کی پرستش رات کو کی جاتی تھی۔ اُن میں سے ایک عظیم الجثہ اژدہے کی شکل کا تھا جس کا نام Zeus Meilichios تھا۔ دُوسرا خطرناک خدا اس ارضِ تاریک کا Hades تھا۔ اُس کی یہ بڑی طاقت تھی کہ زمین کے ہر قسم کے درختوں کی جڑوں کو جلا کر خاکستر کر سکتا تھا۔ اس کو خوش کرنے کے لیئے خوشامد کے طور پر اس کا نام Pluto یعنی فراوانی کا دینے والا رکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک ایک دیوتی خدائنی تھی۔ جس کا نام Hecate رکھا گیا تھا۔ اُس کی یہ خاصیت تھی کہ جس کے پاس جاتی تھی، اُس کو برباد کر دیتی تھی۔ اُس کو خوش کرنے کے لیئے یُونانی کتوں کے بچوں یعنی پلّوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔

قسم ششم

یونان کی تہذیب سے بہت پہلے سے دنیا کے ہر حصّہ میں لوگ اپنے مُردہ آباؤ اجداد کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اور اُن کو خدائی کے درجہ پر رکھا کرتے تھے اُن کے غصّے کو قربانیوں سے ٹھنڈا کرتے تھے۔ اسی طرح یونانیوں نے کیا۔ یہ محبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ڈر کی وجہ سے تھا۔ اس میں دُوسری قسم اُن نیک نام یا حسین مردوں اور عورتوں کی تھی، جو دُنیا میں لوگوں کی توجہ کے مرکز رہ چکے تھے۔

تیسری نوع یہ بھی تھی کہ خدا کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو کر اُس کو خدا بنا دیتا تھا، یا خدا نازل ہو کر کسی انسان عورت سے مباشرت کر کے اُس کو حاملہ کر دیتا تھا، اور وہ بچہ خدا کا بچہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح Zeus خدا نے Alcmena عورت سے مباشرت کی اور Hades بچہ پیدا ہوا۔ اس کا قصہ بھی عجیب ہے۔ یہ Alemena ایک بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اور ایک شخص Amphitryon سے منسوب ہو گئی تھی۔ لیکن Zeus خدا کا دل اس پر آ گیا۔ اور وہ خدا Amphitryon کی شکل میں اس کے پاس آیا۔ اور عورت سے مزے اُڑا لئے۔ اُس کو دھوکہ دیا کہ میں ہی تیرا خاوند Amphitryon ہوں۔ دوسرے دن Amphitryon بھی آ گیا اور اُن خدا صاحب کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ تھے کفار کے خدا۔

قسمِ ہفتم

کوہ اولمپیا کے خدا جن کو ہومر کی شاعری نے آسمان ہفتم پر چڑھا دیا، یہ اُن قبیلوں کے خدا تھے جنہوں نے یونان پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے خدا بوجہ شکست کے اُن کے ماتحت ہو گئے تھے۔ اور یہ امراء کے خدا نمایاں سطح پر آ گئے ان خداؤں میں سب سے بڑا اُن کا سردار Zeus تھا۔ یہ تین بھائی تھے۔ دُنیا کی حکومت کے لئے آپس میں قرعہ اندازی ہوئی۔ Zeus کو آسمان ملا، Poseidon کو سمندر ملا اور تیسرے بھائی Hades کو اندرونی زمین کی حکومت ملی۔ تخلیق کائنات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان خداؤں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کائنات پیدا ہو چکی تھی۔ جس طرح ویدوں کے خداؤں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کائنات پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ کائنات کیوں کر پیدا ہوئی، اور کس نے پیدا کی۔ انسان کیوں کر پیدا ہوئے۔ ہاں اس کا تخیل ہے جب ان نر خداؤں نے اپنی مادہ خدائینوں سے جفتی کھائی، تو انسان پیدا ہوئے۔ پھر انسانوں کی عورتوں پر یہ خدا عاشق ہوتے رہے، اُن سے جفتی کھاتے رہے، اور انسان پیدا ہوتے رہے۔

ان خداؤں کی طاقت اور لیاقت بھی محدود ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کی طاقت

کو محدود کرتے تھے، آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے تھے، اور آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ بھی دیتے تھے۔ بہرصورت Zeus سب کا سردار ہے اور دربار لگاتا ہے۔ اُس کے دربار میں دیگر خدا مثل نوابوں اور ڈیوک کے حاضر آتے ہیں۔ اُس کے خاص کام یہ ہیں:۔ بچوں کو باپ کا مطیع رکھنا، خاندان اور اُس کی املاک کی حفاظت کرنا، جھوٹی قسم کھانے والوں کو سزا دینا، مہمانوں اور غریبوں کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ بڑا خدا پیدا کیونکر ہوا۔ اس کے باپ Cronus کی عادت تھی کہ اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی نگل جاتا تھا۔ جب Zeus کی ماں Rhea حاملہ ہوئی، تو اُس نے Uranus اور Ge. خداؤں سے التجا کی کہ اس بچہ کو بچائیں۔ اُنہوں نے اُس کو GRETE جزیرہ میں بھیج دیا۔ اور جب ZEUS پیدا ہوا تو اُس کی ماں نے ایک پتھر کو کپڑے میں لپیٹ کر Cronus کو دے دیا۔ وہ سمجھا کہ یہ اُس کا بچہ ہے، اور اُسے نگل گیا۔

Zeus کو عورتوں سے جفتی کھانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کی معشوقوں کی ایک بہت لمبی فہرست ہے۔ اولمپس پر اُس کی پہلی بیوی Metis تھی جو عقل کی خدائنی تھی۔ افواہ پھیلی کہ Metis کے بچے بڑے ہو کر ڈیوس Zeus کو تخت سے اُتار دیں گے لہٰذا وہ اپنی بیوی کو سالم نگل گیا۔ Zeus کے پیٹ ہی میں Metis کی بچی Athena پیدا ہوئی اور ZEUS کا سر چاک کرنا پڑا تب وہ نکلی۔ آخر میں جب بہت زنا کاری کر لی، تو اُس نے اپنی بہن Hera سے شادی کر لی۔ لیکن اُن کی زندگی خوشی سے نہ گزری۔ اب اُس نے بیویوں کا سلسلہ جاری کیا۔ انسانی عورتوں میں پہلی بیوی Niobe بنی اور آخری بیوی Alemena تھی جو Niobe ہی کی نسل میں سولہویں پشت میں تھی۔ یونانی اغلام کے بہت عادی تھے لہٰذا اُن کا خدا Zeus بھی اس ہنر سے عاری نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے ایک خوبصورت لڑکے Ganymede سے محبت شروع کی اور آخر کار اُس کو بھگا کر لے گیا، اور کوہِ اولمپس پر اپنی محفلِ شراب میں اُس کو ساقی بنا لیا۔

یہ تھا یونانی مذہب کا سب سے بڑا خدا جس کی پرستش بطور خدا کے صدیوں تک

ہوتی رہی - اُس کی اولاد نے بھی ایسا ہی بڑا نام پایا۔ اُس کی لڑکی Athena پوری جوان اُس کے سر میں سے پیدا ہوئی - وہ Athen کی خاص خدائنی تھی۔ اُس کا بھائی Apollo سُورج کا خدا، موسیقی کا عاشق اور Delphi کا خاص مدبر تھا۔ ڈیوسس کی اولادوں کے قصے اور دوسرے خداؤں کی داستانیں بیان کرنے کے لیئے تو ایک کتاب چاہیئے - ہم اس مضمون کو یہاں ہی ختم کرتے ہیں۔ ہم کو پھر ان خداؤں، اُن کی پرستش کی رسُوم اور اُن کے مذہب کے اسرار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جب ہم مسیحیت کا ذکر کریں گے اور دکھائیں گے کہ مسیحیت نے ان مذاہب سے کیا کچھ لیا ہے، بلکہ سب کچھ لے کر اپنے تئیں مسخ کر ڈالا۔

باب ہشتم

یہودیت اور مسیحیت

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ - (توبہ - ۹ : ۳۰)

یورپ کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسیحیت اور اسلام دونوں یہودیت پر مبنی ہیں - اور اُنہوں نے اپنے بڑے بڑے اصُول خصوصاً تخئیل الٰہیت، صفاتِ باری، جنّت، دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے عقائد یہودیت سے لیے ہیں - اُن کی بحث ہے کہ ان تینوں مذاہب میں چند اعتقادات مشترک ہیں - اور چونکہ یہودیت اِن سے پُرانا مذہب ہے، لہٰذا وُہ ہی مذہب اپنے بعد کے آنے والے مذاہب کا ماخذ ہوا۔ یہ بالکل سطحی بحث ہے اور جو شخص گہری تحقیق کی تکلیف نہیں اُٹھانا چاہتا وُہ اس کو جلدی سے قبول کر لیتا ہے - اور دھریت کے مبلغین کے لیئے یہ اچھا موقعہ مل گیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ یہودیت اور مسیحیت میں بہت سے اعتقادات ایسے ہیں کہ جن کو عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرتی اور ان دونوں کا آخری ماخذ خداوند تعالیٰ کی براہِ راست تعلیم کو رکھا گیا ہے - تو

اُنہوں نے کہا کہ نہ تو کوئی خدا ہے، اور نہ خدائی تعلیم۔ یہ تو سب کچھ انسانی تخیلات کا نتیجہ ہیں جو زمانہ حال کی روشنی میں قائم نہیں رہ سکتے۔ لیکن وُہ عقائد اسلام میں نہیں ہیں لہذا اُن کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہو سکتی۔

اسلام میں اور ان دونوں مذاہب کے چند عقائد میں مماثلت ضرور ہے۔ لیکن مخالفت بھی بہت سے اُمور میں ہے۔ اور ان تینوں مذاہب پر نظر غائر ڈالنے سے مماثلت و مخالفت دونوں عیاں ہو جاتی ہیں۔ مماثلت کیوں ہے؟ وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلام ان دونوں مذاہب پر مبنی ہے اور یہ دونوں مذاہب اُس کے ماخذ ہیں۔ بلکہ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ تینوں مذاہب چونکہ الہامی ہیں، ان تینوں کا ماخذ و منبع ایک ہی ہے۔ اور جب ماخذ و منبع ایک ہوا تو اُن اُمور میں جو واقعی ان سابقہ مذاہب میں الہامی باقی رہ گئے ہیں، مماثلت ضروری اور لازمی ہوئی۔ اور ان امور میں اختلاف بھی ضروری ہوا کہ جن میں یہ دونوں مذاہب اپنے الہامی منبع سے ہٹ گئے ہیں۔ کیونکہ یہودیت اور نصرانیت میں مذہب کے یہ بنیادی اُصول بھی سابقہ اقوام کے ملحدانہ و کافرانہ تخیلات سے اثر پذیر ہو چکے ہیں۔ وُہ آیاتِ قرآنی جو ہم نے عنوان میں نقل کی ہیں ایک بہت بڑے اختلاف کا ذکر کرتی ہیں۔ اور یہ بھی اطلاع دیتی ہیں کہ یہ اور ایسے ہی لغو عقائد اُن لوگوں نے سابقہ ملحدانہ مذاہب سے لیئے ہیں۔ یہ ذرا سی مماثلت اور بہت سا اختلاف اُس وقت اچھی طرح نمایاں ہوں گے جب ہم فقہ اسلام اور تعلیم آئمہؑ کا ذکر کریں گے۔ یہاں ہم اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ مُسلمانوں کی اکثریت نے بھی اپنے کو یُونانی فلسفہ اور ایرانی الحاد میں رنگ لیا ہے۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت کا اسلام بھی یہودیت اور مسیحیت کی طرح متغیر ہو گیا ہے۔ اور اس ہی اسلام کو دیکھ کر یورپ کے محققین اپنے اُس نتیجہ پر پہنچے جس کا ذکر ہم نے اُوپر کیا۔ لیکن اس تغیر و تاثیر میں بھی فرق ہے۔ یہودیت و نصرانیت کی وُہ کتابیں جن کو وُہ الہامی کہتے ہیں، اپنے متن میں اور اپنی عبارت میں اس تغیر کو ظاہر کرتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ وُہ الہامی کتابیں ہی نہ رہیں۔ اور موجودہ کتابیں اُن ملحدانہ و کافرانہ اثر میں تالیف ہوئی تھیں۔ برعکس اس کے اسلام کی الہامی کتاب اس اثر سے بالکل مُبترا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے جہاں یونانی فلسفہ کے زیر اثر مذہب میں تحریف کی ہے، وُہ اس کتاب کی تاویل ہی کی ہے۔ ایک دوسری بات

قابل غور یہ ہے کہ یہودیت اور مسیحیت میں کسی ایسے معلّم کی تعلیم باقی نہیں ہے جو اُن کی الہامی کتابوں کے صحیح الفاظ، معانی و تاویل سے واقف تھا، اور اس ملحدانہ اثر سے مبرّا تھا۔ برعکس اس کے اسلام میں آئمۂ آلِ محمدؐ ایسے گذرے ہیں جو قرآن شریف کے صحیح معانی و تاویل سے واقف تھے۔ اور ملحدانہ اثرات سے مُبرّا تھے۔ اور جن کی تعلیم اب تک باقی ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا عقیدہ نہیں جو مضحکہ خیز اور خلافِ عقل ہو جس کی طرف دہریت اُنگلی اُٹھا سکے۔

یہ سب امور متذکرۂ بالا ہم اپنی دیگر تالیفات میں اچھی طرح ثابت کر چکے ہیں۔ یہاں اس بحث کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ سلسلۂ کلام قائم رکھنے کی غرض سے یہاں ہم اُن کی طرف محض اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن مذہب یہودیت اور نصرانیت کے متعلق اس امر واقعہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ یہ دونوں الہامی مذاہب ہیں۔ ان کی اپنی اپنی الہامی کتاب علٰحدہ ہے۔ اور یقیناً اصلی توریت و انجیل کی تعلیم وہ تھی جو بعد میں اسلام نے دُنیا کو یاد دلائی۔ جس میں سے توحید خالص اور خداوند تعالیٰ کا جسم اور عوارضِ جسم سے منزّہ ہونا خاص سبق تھے۔ لیکن بوجوہات چند در چند جو ظاہر ہیں اور جن کو محققین نے تفصیل سے بیان بھی کیا ہے، بہت جلد یہ دونوں مذاہب اپنی صحیح تعلیم سے ہٹ گئے۔ موجودہ توریت و انجیل جب لکھی گئیں، تو ان میں الہامی جزو بہت کم تھا۔ بلکہ ضرورت وقت اور مصلحتِ زمانہ کے زیرِ اثر ان دونوں مذہبوں کے کارکنوں نے جنہوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں، اصلی کتابوں میں تبدیلیاں کر کے پیش کیا ہے۔ اور اُن تبدیلیوں کا موقعہ آسانی سے اس وجہ سے مل گیا کہ اُن اصلی کتابوں کی اصلی زبانوں سے ترجمہ کرنا تھا۔ ترجمہ میں الفاظ کے معانی آسانی سے بدلے جا سکتے ہیں۔ وہ ضرورت اور مصلحت کیا تھی؟ یہ ہم ابھی بتاتے ہیں۔

جب مسیحیت دُنیا میں آئی تو اُس کا نہایت مخالف ماحول سے مقابلہ ہوا۔ یہانتک کہ خود اُس کے پیغمبر کو دُنیا میں رہنا مشکل ہو گیا۔ حضرت عیسٰے کے رفع کے وقت اس مذہب کے سنبھالنے کا بوجھ اُن چند آدمیوں پر پڑا، جو اپنے ماحول میں دنیاوی لحاظ سے معزز نہیں سمجھے جاتے تھے۔ مقامی گورنمنٹ جو بہت منظم اور مضبوط تھی اُن کے خلاف تھی۔ اور اُس کے حکّام اُن کو طرح طرح کی ایذا دیتے تھے۔

یہ وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جنہوں نے اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر ایک ایسا مذہب اختیار کیا تھا، جو کسی کو پسند نہ تھا اور جس کی تعلیم سب سے علیحدہ تھی۔ یہودی جن کو چاہیئے تھا کہ عیسائیوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اُن کی مدد کرتے یا کم سے کم مخالفت تو نہ کرتے، اُن کو اپنا رقیب اور معاذ اللہ ایک جھوٹے شخص کا پیرو سمجھنے لگے۔ اور ان کی ایذا کے درپے رہنے لگے۔ نصرانیوں کے پیغمبر کا دنیا چھوڑنے کا سبب یہ ہی یہودی تھے۔ حکام ان کو باغی سمجھ کر ان کو سزائیں دیتے تھے۔ اُس زمانہ میں جو حکومت کے مذہب کے خلاف تھا، وہ حکومت کا باغی سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواریین جنہوں نے حضرت عیسےٰؑ کو دیکھا تھا، نہایت ایماندار آدمی تھے۔ اور وہ اپنے عقائد میں کفر و الحاد سے کسی قسم کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کے مرنے کے بعد عیسائیوں نے سوچا کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے اور اپنے مذہب کو قائم رکھنا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ موجودہ مذاہب سے جو لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو چکے ہیں مصالحت کرلیں۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اپنے عقائد کو اُن کے نمونہ پر ایسا مرتب کریں کہ ان کے لیئے اُس میں جاذبیت پیدا ہو جائے اور مسیحیت کو آسانی سے قبول کرلیں۔ اُن پادریوں نے دیکھا کہ کفاروں کے خفیہ راز دارانہ مذاہب Mystery Cults عیسائیت کے خطرناک رقیب ہیں۔ کیونکہ اُن کے عقائد اور تخیلات عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ اس ضرورت کی وجہ سے اُنہوں نے اپنے مذہب کے عقائد میں ترمیم و تنسیخ شروع کردی۔ اور اپنی بائیبل کو اس طرح مرتب کیا، کہ وہ لوگوں کے سابقہ اعتقادات کے مطابق ہوں۔ دیکھو (۵۷)۔ اور جہاں اُنہوں نے ایسا نہیں کیا، وہاں مسیحیت کامیاب نہیں ہوئی۔ چنانچہ چین اور ہندوستان وغیرہ میں اُن کی ناکامیابی کی یہ ہی وجہ ہے کہ وہاں پادریوں نے Confucianism اور Brahmanism وغیرہ کے اعتقادات مسیحیت میں نہیں لیئے۔ اور اُس وقت

---

(۵۷) (57) Toynbee's Study of History. Vol V. pp, 466, 367, 538; Cambridge Ancient History, Vol. IV pp. 528-9; The Rise of Christianity by Earnest Williams Bernes, p. 84.

Marfat.com

تک اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ وہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ تک اُن کے مذہب کی بائیبل مرتب ہو چکی تھی۔ اور اطرافِ عالم میں پھیل چکی تھی۔ اب اُس میں کوئی نئے اعتقادات نہیں داخل کر سکتے تھے۔ اس ناکامیابی اور اس کے وجوہات کے لیئے دیکھو (۵۸)۔

عہد جدید کی انجیلیں } حضرت عیسےٰؑ ۴؁ ق م میں پیدا ہوئے، اور ۲۹؁ء میں اس دُنیا سے انتقال فرمایا۔

مسٹر ہٹی نے صلیب کی تاریخ ۲۲ مارچ ۲۹؁ء لکھی ہے۔ جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تھی وہ بہت کچھ انبیاء سلف بیان کر چکے تھے۔ انجیل کا مشہور مقولہ کہ جو تم سے بدی کرے تم اُس سے نیکی کرو۔ اگر کوئی داہنے رخسار پر طمانچہ مارے تو تم بایاں رخسار طمانچہ کے لیئے اُس کے سامنے کر دو۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں اسیریوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ (۵۹)

مسٹر ہٹی کے نزدیک فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے ان اقوال پر عمل کیا اور انبیاء و حکماء سلف میں سے کسی نے ان پر عمل نہیں کیا۔

خود عیسائی محققین کی رائے ہے کہ جو تھیوری اور نظریئے ان انجیلوں کے متعلق عیسائیوں میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر تک رائج تھے، وہ اب حال کی تحقیقات نے غلط ثابت کر دیئے ہیں۔

زمانہ حال کی تحقیقات کے نتائج ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

یہ خیال غلط ہے کہ سب سے پہلے متی کی انجیل لکھی گئی اور اُس کے بعد دُوسری انجیلیں لکھی گئیں۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ جن شخصوں کی طرف یہ منسوب ہیں وہ ہی لوگ ان کے لکھنے والے تھے۔ بلکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ سب سے پہلے مرقس Marks انجیل لکھی گئی، اور پھر اُس کو دیکھ کر اور سامنے رکھ کر متی Mathew اور لوقا Luke کی انجیلیں لکھی گئیں۔ ان دونوں مؤخر الذکر انجیلوں کا ماخذ ایک اور کتاب بھی تھی جو اب ناپید ہے۔ اُس کا نام لوگوں نے Q رکھ لیا ہے۔

(۵۸) (58) Toynbee's History. Vol. V, p. 367. N. 2

(۵۹) (59) History of Syria by P.K. Hitti, pp. 328-9

Marfat.com

مرقس } کا لکھنے والا ایک عیسائی تھا جس کا نام تک نہیں معلوم۔ Marks کی طرف یہ غلط منسوب ہے۔ یہ سنہ ۷۵ء میں لکھی گئی تھی۔ اور یہ صرف اُن قصّے کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اُس زمانہ میں لوگوں میں رائج تھے۔ یہ روم میں لکھی گئی تھی۔ اس کا لکھنے والا Barnabas کا چچا زاد بھائی نہیں ہے اور نہ اس میں PETER پطرس کے تاثرات ہیں۔

لوقا } محض اس لیئے کہ اس کتاب کی وقعت بڑھ جائے، اس کا نام لوقا (Luke) رکھ دیا۔ ورنہ دراصل یہ لوقا کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ لوقا اور رسولوں کے اعمال (Acts) ایک ہی شخص کی تالیف ہیں۔ اور یہ دونوں سنہ ۱۰۰ء میں ایک نامعلوم تعلیم یافتہ آدمی نے لکھی ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں میں تبدیلیاں، ترمیمات اور اضافے ہوتے گئے۔ یہ تبدیلیاں سنہ ۷۵ء سے سنہ ۱۵۰ء تک جاری رہیں اور سنہ ۱۵۰ء میں اس کو موجودہ شکل دی گئی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے قصۂ رجعت بعد موت میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔

متی کی انجیل } یہ مرقس اور Q پر مبنی ہے۔ سنہ ۹۵-۱۰۰ء میں لکھی گئی جبکہ لوقا کی انجیل مرتب ہوئی۔ یہ ملک شام اور فلسطین کے یونانی زبان بولنے والے باشندوں کے لیئے لکھی گئی تھی۔ جس طرح لوقا عام عیسائیوں کے لیئے لکھی گئی تھی۔ اس کے مؤلف کا نام نہیں معلوم۔ لہٰذا دوسری صدی عیسوی کے وسط تک اُس کا موجودہ نام نہیں تھا بلکہ کوئی بھی نام نہ تھا۔ لیکن دوسری صدی کے وسط کے بعد سے اُس کو متی کی طرف منسوب کرنے لگے، تاکہ وقعت بڑھ جائے۔

یوحنا کی انجیل } یہ انجیل بھی یوحنا John کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اس کو دوسری صدی عیسوی کے شروع میں ایک مذہبی معلم نے لکھا تھا۔ لیکن لکھنے والے کا نام نہیں معلوم۔ اس میں بہت سے فرضی قصّے درج کئے گئے ہیں۔ اور معجزات کی بھرمار ہے تاکہ لوگوں کے اعتقاد پختہ ہو جائیں۔

یہ چاروں انجیلیں مسودوں کی صورت میں لوگوں میں جاری رہیں۔ اور ان میں

Marfat.com

تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ انجیل کا کوئی نسخہ چوتھی صدی عیسوی کے پہلے کا لکھا ہوا دستیاب نہیں ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی تک جو تبدیلیاں تحریرات اور اعتقادات میں ہوتی ہیں وہ ان میں ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ دین عیسوی چوتھی صدی عیسوی میں تیار و مکمل ہوا۔ مندرجہ بالا واقعات کے لیئے دیکھو (۶۰)۔

مسٹر ٹوآئن بی (MR. TOYNBEE) نے ان امور پر بہت اچھی تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق کے بموجب ان انجیلوں کے مرتب ہونے کی تاریخیں یہ ہیں:-

انجیل مرقس ۵۶ء

انجیل متی اور انجیل لوقا ۶۰ تا ۷۵ء

انجیل یوحنا تقریباً ۱۰۰ء

تاریخوں میں تو زیادہ فرق نہیں ہے۔ لیکن مسٹر ٹوآئن بی نے جو اس تحقیق میں محنت اور جانفشانی کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ انہوں نے ان انجیلوں سے پہلے کی یونانی زبان میں لکھی ہوئی تاریخوں اور سوانح حیات کی کتابوں کا مقابلہ کر کے مندرجہ ذیل نتائج برآمد کیئے ہیں:-

(۱) 87 نظائر دے کر ثابت کیا ہے کہ بائیبل میں حضرت عیسٰیؑ کے متعلق جن خیالات اور صفات کا ذکر ہے، وہ یونانی رومی مصنفین و بڑے آدمیوں کے متعلق پہلے ہی بیان کیئے جا چکے تھے۔ وہاں ہی سے بائیبل لکھنے والوں نے اپنی انجیلوں میں نقل کر لیئے ہیں یہ مثالیں زیادہ تر (Diodorus) اور (Plutarch) کی (History) سے لی ہیں۔ (Diodorus) کی تاریخ انجیلوں سے تقریباً ۶۵ سال پہلے کی لکھی ہوئی تھی۔ اور (Plutarch) کی (Lives) اس وقت ہی لکھی گئی تھیں کہ جب متی اور لوقا مرتب ہوئی تھیں۔ یوحنا کی انجیل پلوٹارک کی Lives

(۶۰)
(60) The rise of Christianity, by William Barnes Chap. VII. Hitti's History of Syria, pp. 329, 549; The life of Jesus by Ernest Renan.

کے بعد لکھی گئی تھی۔

(۲) یونانی کفار کی کتابوں میں بہت سے الفاظ اور مثالیں اور جملے ان چاروں انجیلوں میں لیے گئے ہیں۔ اور قصوں میں بھی بہت مشابہت ہے۔ اس کی تیرہ مثالیں ہیں۔ ان میں بہت سی مثالیں (Proverbs) ایسی ہیں جن میں یونانی لکھنے والے نے اپنے ہیرو کو خدا کا بیٹا کہا تھا۔

(۳) حضرت عیسےٰ اور یونانی خدا کے بیٹے Herakles کے قصے جو یونان کے زمانہ الحاد میں مقبول تھے۔ وہ ہی ان انجیلوں کے لکھنے والوں نے اپنے عیسیٰ کے لیئے وہاں سے لے لیں۔

(۴) سقراط کی زندگی اور اس کے مقدمہ اور قتل کے واقعات حضرت عیسیٰ کے متعلق ان انجیلوں میں لے لیئے گئے ہیں۔ مسٹر ٹوآئن بی نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔

(۵) بہت سی پورانی یونانی زمانہ کی کہانیاں اور بہت سے جملے جو لوگوں کی افواہوں کی صورت میں جاری تھے۔ وہ ان انجیلوں میں لے لیئے گئے۔

ان امور کے لیئے دیکھو۔ Toynbee's Study of History, Vol. VI

For (1), pp. 377 to 413; For (2), pp. 414 to 417;
For (3), pp. 455 to 476; For (4), pp. 486 to 495;
For (5), pp. 501 to 508; Toynbee's Study of History.
Vol. I, p. 91; Vol. II, pp. 286, 287; Vol. V, pp. 366, 538;
Vol. VI, pp. 268n, 362, 456, 587

اب ہم ایک ایسا نقشہ یا جدول پیش کرتے ہیں جس میں الحاد کے وہ مذاہب درج ہیں جن سے مسیحیت میں اعتقادات لیئے گئے ہیں۔ اُن اعتقادات کو بھی اس میں بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نقشہ محض ایک خاکہ ہے۔ وہ تمام اعتقادات اس میں درج نہیں ہو سکے ہیں، جو مسیحیت نے اس طرح کفر سے راضی نامہ کر کے لیئے ہیں۔ اس کے لیئے تو ایک علیحدہ مستقل کتاب چاہیئے، اور وہ بھی اچھی خاصی ضخیم۔

Marfat.com

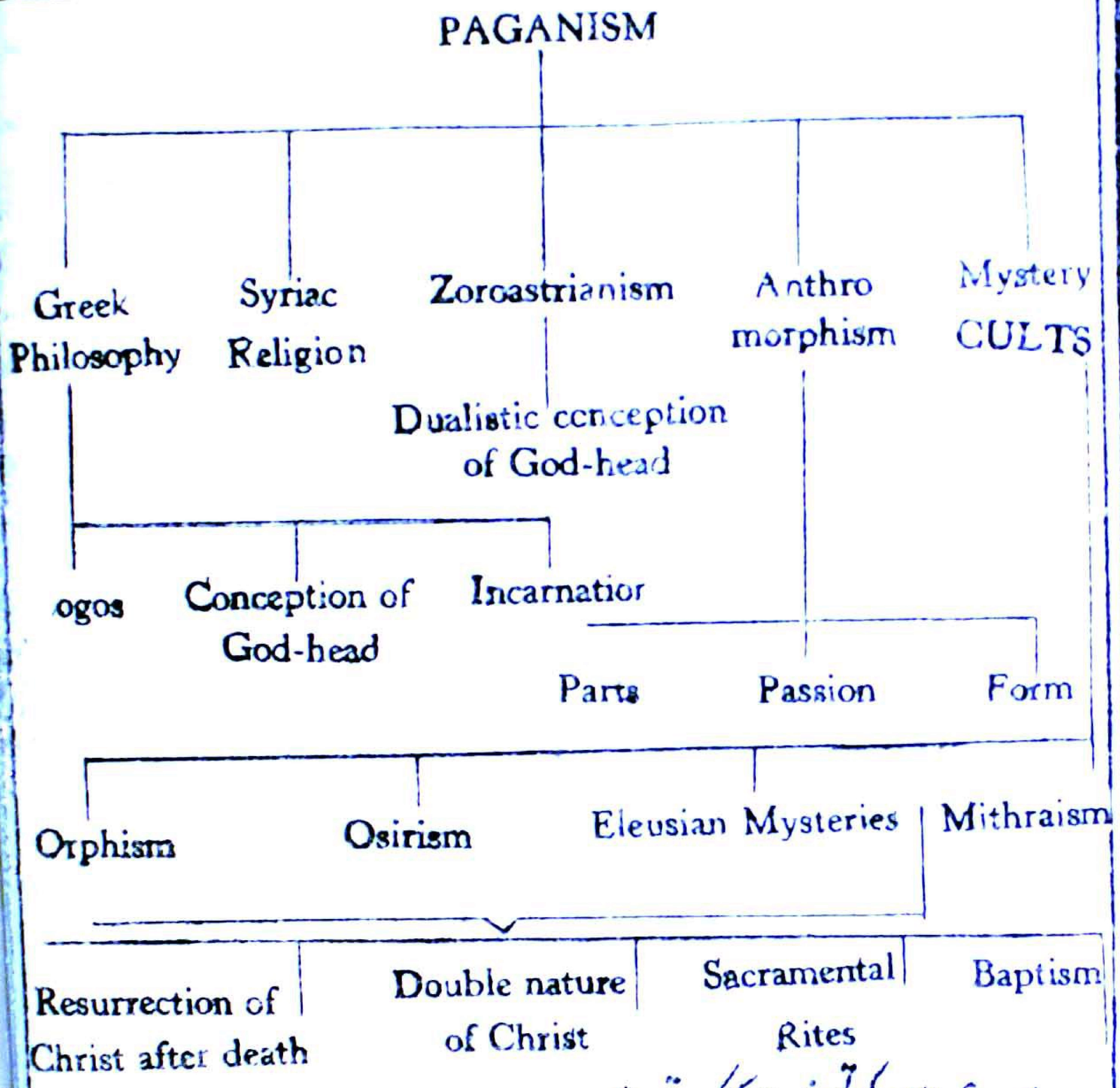

اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں:-

یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ مسیحیت کی انجیل یعنی عہد جدید میں یونانی فلسفہ کا عنصر غالب ہے۔ اور یونانی تخیلات کے زیرِ اثر یہ چاروں انجیلیں مرتب ہوئی ہیں۔ دیکھو:-

Toynbee's Study of History, Vol. VI.

For (1), pp. 377 to 413 For (2), pp. 414 to 417;
For (3), pp. 465 to 476; For (4), pp. 486 to 495;
For (5), pp. 501 to 508

مسٹر ہیٹی کہتے ہیں:-

ترجمہ (۱)۔ مسیحیت میں یونانی خیالات کی آمیزش کرکے انجیلوں کے لکھنے

Marfat.com

والوں نے مسیحیت کو تمام دنیا میں پھیلنے کے قابل بنا دیا۔ مسیحیت کو کبھی یونانی رومی قبول نہ کرتے، اگر اس میں یونانی عقائد شامل نہ کر لیئے جاتے۔ (۶۱) اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۱۔

الٰہیت کا تصوّر

مذہب کے یہی دو ارکان ہیں۔ خدا کا تصوّر اور انبیاء کا توسّل۔ یعنی خدا و رسول کی معرفت۔ اسی صحیح معرفت ہی پر انسان کی ساری زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس پر ہی اُس کے طرزِ عمل کا انحصار ہے۔ انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وُہ اپنی زندگی کو اپنے خدا اور رسول کی صفات و احکام کے مطابق بنائے۔ اسلام کا حکم ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ۔ قرآن شریف کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب۳۳:۲۱)

اگر انسان نے خیال کیا (جیسا کہ کئی مذاہب کا عقیدہ ہے) کہ خدا میں بھی ہماری طرح کے جذبات ہیں فرق یہ ہے کہ وُہ اعلےٰ پیمانہ پر ہیں، تو وُہ اپنی ساری کمزوریاں خدا کے اندر بھی تصوّر کرے گا۔ پھر اپنے میں سے اُن کمزوریوں کے دُور کرنے کے لیئے نہ اُس میں خواہش ہوگی، اور نہ کوشش ہوگی۔ اگر وُہ سمجھتا ہے کہ اُس کے رسول میں بھی مکر و فریب و سازش کی صفات و عادات ہیں، تو وہ ان صفات و عادات کو اپنے اندر مذہبی جوش کے ساتھ پیدا کرے گا۔ تمام مذاہب میں تنازعہ محض صفاتِ خداوندی کے متعلق ہے۔ مسیحیت کو عوام الناس کے لیئے خوش آیندہ اور قابل قبول بنانے کے لیئے ان ہی کا فرانہ تخیلات کو دیگر ملحدانہ مذاہب اور فلسفوں سے لیا گیا ہے۔ اختصار کے ساتھ ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔

مسیحیت کے اعتقادات کا ایک ماخذ یونانی فلسفہ کا تخیل Logos بھی ہے۔ چوتھی انجیل کا لکھنے والا ایشیائی کوچک کے ساحلی شہر (Ephesus) کا باشندہ تھا۔

(۶۱) (61) Hitti's History of Syria, Chapt. XXV, p. 331

Marfat.com

اور یہ وہی شہر تھا جہاں تقریباً ۵۰۰ ق م میں ہرقلاطیس Heracleitus; نے Logos کا نظریہ قائم کیا تھا، اور اس کی تشریح بھی کی تھی۔ دراصل ہرقلاطیس کے نزدیک LOGOS نیچر یا خدا ہے۔ اس کی تعلیم Logos نے x ۳۰۰ ق م میں دی تھی۔ ان کے خیال میں تمام عالم ہی خدا تھا۔ گویا نیچر ہی خدا تھی اور Logos اس میں جان پھونکنے والی روح تھی۔

مسٹر ولیم بارنز William Barnes لکھتے ہیں :- (یہ اُن کی انگریزی تحریر کا ترجمہ ہے)

"یہ اعتقاد کہ حضرت عیسٰیؑ Logos ہیں اور بوجہ Logos ہونے کے تمام نور و زندگی کے سرچشمہ ہیں، چوتھی انجیل میں بار بار دُھرایا گیا ہے۔ اس کے مصنف کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ میں LOGOS نے گوشت و پوست کا جسم اختیار کر لیا، اور ہمارے درمیان رہا۔ اور ہم نے اُس منور عظمت کا ملاحظہ کیا۔ وہ منور عظمت جو معلوم ہوتا تھا کہ ایک باپ کی اکلوتی پیدائش رحم و حق سے بھری ہوئی ہے۔" (۶۲)

ظاہر ہے کہ اس انجیل نے اپنے خدا کا تخئیل یونانی فلسفہ سے لیا۔ ابنیت عیسٰی کا ماخذ بھی یہ ہی تخئیل ہے۔

INCARNATION : (اوتار) خدا کا انسان کے جسم میں ظاہر ہونا یعنی انسان کا جسم اختیار کر لینا ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان، یونان اور مصر تمام اصنام پرست اقوام کا یہ ہی عقیدہ تھا۔ کہ بہت سے جانوروں میں اور انسانوں میں خدا حلول کئے ہوئے ہے۔ اور جب چاہتا ہے، کوئی سا جسم اپنی مرضی کے مطابق اختیار کر لیتا ہے۔ بہت سے جانوروں اور انسانوں کو خداؤں کا اوتار مانتے تھے۔

یونان کے مذہب Orphism کا یہی عقیدہ تھا۔ اسی سے (فیثا غورث) حکیم نے یہ تخئیل لیا۔ اور وہاں سے ہندوستان وغیرہ میں یہ عقیدہ گیا۔ یہ

(۶۲) The Rise of Christianity, p. 95

Marfat.com

چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے ۔ افلاطون کا یہ ہی عقیدہ تھا۔ (۶۳) انجیلوں کے مرتب کرنے والوں نے یہ ہی عقیدہ اختیار کر کے انجیلوں میں لکھ دیا۔ (۶۴) اس ہی عقیدہ کی اور شاخیں بھی مثلاً تناسخ ارواح Transmigration of Souls اور اشتراک جسم انسان و حیوان Therianthropism یہ عقائد عام تھے۔ اُوپر کا جسم حیوان کا ہوتا تھا، اور نیچے کا جسم انسان کا۔ ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ بھی اُس زمانہ میں عام تھا۔

DUALISTIC CONCEPTION OF GOD-HEAD; یعنی ثانویت

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ثانویت کی تعلیم زرتشت نے کی تھی، اور یہ اُن کے مذہب سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اُن کی تعلیم تو خالص وحدانیت کی تعلیم تھی اُن کی یہ تعلیم اُس زمانہ کے مذہبوں کے بالکل خلاف تھی۔ جو ایران اور اسیریا میں رائج تھے۔ اُن مذاہب میں ثانویت تھی۔ زرتشت کے بعد جب اُن کا مذہب بگڑا ہے، تو اُس بگڑے ہوئے مذہب میں ثانویت آگئی۔ بائیبل کا عقیدہ ہے کہ خدا بالکل نیکی ہے، اور چاہتا ہے کہ دنیا میں نیکی ہو جائے۔ لیکن وہ شیطان سے مجبور ہو گیا ہے جو نیکی کو پھیلنے نہیں دیتا۔ شیطان بدی کا خدا ہے۔ اور ان دونوں خداؤں کی سلطنت جُدا جُدا ہے۔ اور آپس میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ خدا کی طرف سے جبرائیل فرشتوں کی فوج لے کر شیطان سے لڑتے ہیں۔ یہ عقیدہ یونانی مذہب میں بھی تھا، اور اب مسیحیت نے لے لیا ہے۔ (دیکھو ۶۵)

(63) Guide to Philosophy by C.E.M. Joad, pp. 287, 288 A Critical History of Greek Philosophy by W.T. Stace, p. 17 Encyclopedia Brittanica, Vol. XVI. p. 936.

(64) Royston Pike : Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Incarnation. Toynbee's History, Vol. VI pp. 261-66.

(65) Toynbee's History, Vol. VI, p. 44, Foot Note 3.

Marfat.com

یہودیت نے بھی یہ عقیدہ اس ہی بگڑے ہوئے زرتشتی مذہب سے لیا ہے۔ (۶۶)

ANTHROMORPHISM یعنی خدا کو انسان کی شکل کا تصوّر کرنا

زمانہ ماضیہ بعیدہ میں یہ مذہب عام تھا۔ ہندوستان، یونان، مصر، غرض جہاں جہاں صنم پرستی تھی، وہاں یہ مذہب عام تھا۔ ان لوگوں میں جنہوں نے تعلیم انبیاء سے بغاوت کی تھی، خدا کا اور کوئی تصور ہی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ بھی انسان کا جسم و حلیہ رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ تخئیل عوام میں اس قدر رائج ہو گیا تھا، کہ یہودیت اور مسیحیت بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ دیکھو پیدائش (Genesis) اس میں کہا گیا ہے کہ انسانوں کی طرح خدا کے بھی ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا ہے۔ ان مذاہب میں خدا کو انسانی جسم کے ساتھ انسانی خواہشات و جذبات اور ضروریات سے بھی آراستہ کیا۔ اس مذہب کے متعلق ایک یونانی فلاسفر ZENOPHANES نے کہا ہے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے کہ انسان خیال کرتے ہیں کہ ان کے خدا ان کی طرح پیدا ہوتے ہیں، ان کا سا جسم رکھتے ہیں، ان کی طرح مر جاتے ہیں۔ چنانچہ حبشی اپنے خدا کو کالا رنگتے ہیں، اور یونانی اس کو سُرخ بال دیتے ہیں۔

امور مندرجہ بالا کے لیئے دیکھو (۶۷)

MYSTERY CULTS

(1) Orphism

یہ یونان کا ایک خفیہ مذہب تھا۔ جو چھٹی صدی قبل مسیح یونان میں رائج تھا۔ اس کا بانی Orpheus تھا۔ جو خدا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، اور بربط پر خوب گاتا تھا۔ جب اس کی بیوی جس سے اس کو عشق تھا، مر گئی تو یہ اس کی تلاش میں زمین کے

(66) Toynbee's History. Vol. VI, p. 34, Ft. n.5

(67) Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Anthromorphism.

نیچے وہاں چلا گیا، جہاں مُردوں کی ارواح رہتی ہیں۔ اُس نے اپنی بربط سے ارواح کے نگہبان خدا کو اتنا خوش کر لیا، کہ اُس نے اُس کی بیوی کو اس کے ساتھ آنے کی اجازت اس شرط پر دے دی کہ جب تک دُنیا میں نہ پہنچیں، Orpheus مُڑ کر اپنی بیوی کی طرف نہ دیکھے۔ سارا سفر تقریباً ختم ہو چکا، اُوپر کی دُنیا پر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ محبت نے جوش کیا، عقل میں اور محبت میں ہمیشہ سے بیر ہے۔ اُس نے اپنی بیوی کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ دیکھنا تھا کہ وُہ ہوا میں غائب ہو گئی۔ یہ دُنیا میں آیا، اور دُنیا کی لذات کو بالکل ترک کر دیا۔ عورتوں سے سارا تعلق چھوڑ دیا۔ لیکن عیش پسند . . . مردوں اور عورتوں نے مل کر اس کو قتل کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ قصّہ یونان کے ایک خدا Dionysius کی طرف منسوب ہونے لگا۔ Dionysius بڑے خدا ZEUS کا بیٹا تھا۔ Dionysius لفظ کے معنی ہی "خدا کا بیٹا" ہیں۔ اُن کے اس خدا کو Titans نے مار کر کھا لیا۔ Titans ایک دیو ہیکل مخلوق تھی جو دُنیا پر آدمیوں سے پہلے بستی تھی۔ Dionysius کا دل بچ رہا تھا جو اُس کے باپ ZEUS کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اُس نے غصّہ میں آن کر TITANS کو تو اپنی بجلی سے جلا دیا، اور Dionysius کو دوبارہ زندہ کر دیا TITANS کی راکھ سے انسان پیدا ہوئے۔ ان میں Zeus کے تعلق سے نصف ماہیت تو خدا کی ہے اور نصف ماہیت اپنی انسانوں کی ہے۔ اس مذہب کے پیروں کو Orphice کہتے ہیں ان کا اپنا مذہب اور فلسفہ علٰحدہ تھا۔ مندرجہ بالا قصّہ کی مناسبت سے اُنہوں نے عقیدہ قائم کیا کہ انسان آدھا خدا ہے اور آدھا انسان۔ وُہ لوگ جو اس مذہب کے عشائے ربانی اور رواجوں میں داخل ہوں گے، اور راز درون پردہ سے واقف کر دیئے جائیں گے اُن کا فرض ہے کہ دُنیا سے تعلق نہ رکھیں۔ دُنیا کی لذات اور عورتوں کو ترک کر دیں۔ اور دُنیا سے علٰحدہ خانقاہوں میں رہا کریں۔ روح ایک انسان کے مرنے کے بعد دُوسرے قالب میں چلی جاتی ہے۔ اور اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ تمام نجاستِ دنیوی انسان سے علٰحدہ ہو کر وُہ خدا میں مل جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ گوشت کھاتے تھے اور نہ شراب پیتے تھے۔

اس فرقہ کے اعتقاد کے بموجب DIONYSIUS دُنیا کی زندگی کا بھی خدا تھا اور

Marfat.com

مُردوں کی روحوں کا بھی خدا تھا ۔ رسوم راز کے دوران میں ایک جانور کی قربانی ہوتی تھی ۔ اور محرمانِ راز اُس کا خون اور گوشت کھاتے تھے ۔ اُس جانور کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے ۔ اور اُن کا خیال تھا کہ خدا اِس طرح مر گیا، اور اب دوبارہ زندہ ہوگا ۔ جو محرم راز بنائے جاتے تھے، وُہ اپنے تئیں اپنے خدا کے نام سے منسوب کرتے تھے ۔ یہ تخیلات بہت کچھ عیسائیوں نے اپنے مذہب میں لے لیئے اور وُہ بھی اپنے تئیں اپنے خدا Christ کی نسبت سے Christians کہتے ہیں۔ اِس مذہب کی بہت سی رسوم مسیحیت میں اختیار کر لی گئیں ۔ اور اُن کے عقائد نے بھی مسیحیت پر بہت اثر ڈالا ۔ اِن ہی عقائد کے اثر سے مسیحیت نے مندرجہ ذیل عقائد قائم کیئے :۔

(۱) Resurrection; یعنی صلیب دیئے جانے کے بعد جسم کو قبر میں ڈالا گیا لیکن وہاں زندہ ہو کر پھر نکل آئے ۔

(۲) Double Nature of Christ یعنی حضرت عیسےٰؑ خدا بھی ہیں اور انسان بھی ۔

(۳) انسان کے لیئے خدا تکلیف اُٹھاتا ہے یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے ۔

(۴) حضرت عیسےٰؑ خدا کے بیٹے ہیں ۔

ان امور کے لیئے دیکھو (۶۸)

(۲) Eleusian Mysteries (2)

یعنی الیوشن مذہب کے راز!

یہ مذہب بھی بالکل Orphism سے ملتا جُلتا ہے ۔ اُمیدوار کے لیئے خفیہ رسومات میں شامل ہونا ضروری تھا ۔ پہلے تو وُہ سمندر کے کنارے جا کر غسل کرتا تھا،

(68) The Cambridge Ancient History Vol. IV, pp. 513-32
Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Orphism
Encyclopedia Brittanica, Vol. XVI,

Marfat.com

سُور کا خون اُس کے اُوپر چھڑکا جاتا تھا۔ واپسی پر قربانی کرنی ضروری ہوتی تھی۔ خدا ZEUS کی شادی Demeter سے جسمانی تعلق کی سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم نکاح ادا کی جاتی تھی۔ جو تمام رسومات میں ایک اہم رسم سمجھی جاتی تھی۔ آخر میں پروہت آن کر اعلان کرتا تھا، کہ خدائنی کا بچہ پیدا ہوگیا۔

خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی بڑی مقدس رسم ہوا کرتی تھی یعنی وصل مقدس Holy Communion جس میں امیدوار وصل مقدس روٹی اور شراب کھاپی کر خدا کے ساتھ مل جاتا تھا۔ مذہب میں داخل ہونے والا اُس ہی پیالہ میں پانی یا شراب پیتا تھا، جس میں سے خدائنی Demeter نے پانی یا شراب پیا تھا۔ جب وہ اپنی لڑکی کی تلاش کے مصائب میں مبتلا تھی۔ اس کا تعلق عیسائیوں کی Holy Grail سے کیساعیاں ہے۔ یہ وہ مقدس رکابی تھی، جس میں حضرت عیسٰےؑ نے اپنا آخری رات کا کھانا صلیب سے پہلے کھایا تھا۔

اس مذہب کے ان رسومات کا کرنے والا پجاری نان مقدس کو توڑتا تھا اور پیالہ میں شراب ڈال کر مذہب میں داخل ہونے والے کو پلاتا تھا۔ ان رسومات میں بھی اور نیز orphic رسومات میں وہ جانور جس کی قربانی کی تھی اور جس کا گوشت و خون اہل مذہب کھاتے تھے، خدا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ گویا عقیدہ یہ تھا کہ خود خدا انسانوں کے لیئے مرتا تھا، اور پھر زندہ ہوتا تھا۔ اس مذہب والے بھی اپنے تئیں اپنے خدا کے نام پر موسوم کرتے تھے۔

orphism کے رسومات بہت کچھ ان رسومات سے ملتے جلتے ہیں جو بعد میں مسیحیت میں قائم ہوگئے۔ اور اس مذہب کے معتقدات پر یورپ کے اخلاقیات مبنی ہیں۔ (۶۹)

(۳) Osiris مصر قدیم کا سب سے بڑا خدا جس کو وہ شاہ ابد سلطان دوام بادشاہوں کا بادشاہ اور خداؤں کا خدا کہتے تھے، اُن کا اعتقاد تھا کہ اُس کی Double Nature ہے۔ یعنی خدا بھی ہے، اور انسان بھی ہے۔ اُس نے بھی

(۶۹) (69) Encyclopedia Brittanica Vol. XVI pp. 47, 49

موت کی تکلیف برداشت کی، قبر میں ڈالا گیا، پھر اُٹھ گیا، زندہ ہو گیا اور آسمان پر چلا گیا۔ جہاں وُہ اب تک بادشاہت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ بادشاہت کرے گا۔ (۷۰)
یہ ہی اعتقادات عیسائیوں نے حضرت عیسٰےؑ کے لیئے قائم کر لیئے۔

(۴) دینِ متھرا (4) Mithraism

دنیائے قدیم کا یہ ایک عالمگیر مذہب تھا۔ جس میں متھرا کی پرستش ہوتی تھی۔ ویدوں میں اسں کو آسمانی نور کا خدا کہا گیا ہے۔ زرتشتی مذہب کی کتاب اوستا میں جنگی خدا کے نام سے مشہور ہے۔ جو بڑے خدا ہرمز کی مدد کرتا ہے کیونکہ ہرمز تاریکی کے خدا سے ہمیشہ برسرپیکار رہتا ہے۔ اور یہ متھرا اُس جنگ میں ہرمز کی مدد کرتا ہے۔ قدیم ایرانی شہنشاہیت کے زوال پر یہ مذہب رومن افواج میں بہت ہر دلعزیز ہو گیا۔ اسں مذہب کے اعتقادات میں بھی متھرا کی (Double Nature) تھی۔ یعنی خدا بھی تھا، اور انسان بھی۔ خدا کا خاص مددگار ہے۔ اور اس حیثیت سے اُس نے آسمانی سانڈ کو قتل کیا تھا جس کے خون سے دُنیا ہر سبز ہوتی ہے۔ آخر کار بنی نوع انسان کی مدد کرنے کے بعد متھرا آسمان پر چلا گیا۔ اور وُہیں رہتا ہے۔ اب بھی وُہ بنی نوع انسان کو برکت پہنچاتا ہے۔ خیال تھا کہ یہ ایک غار میں پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کی پوجا غاروں میں ہوتی تھی۔ اب دوبارہ دنیا میں آن کر شر کے عناصر کو ہمیشہ کے لیئے مغلوب کرے گا۔

متھرائی بننے کے لیئے بہت سی رسومات کی ضرورت تھی۔ وُہ ہی رسومات عیسائیوں نے دینِ مسیحی میں اختیار کر لی ہیں۔ اس میں بپتسما بھی ہوتا تھا، روٹی اور شراب یا پانی کی رسم بھی ادا ہوتی تھی، قربانی ہوتی تھی، دعائیں مانگی جاتی تھیں، اور سانڈ یا بھیڑ کے خون سے بپتسما کیا جاتا تھا۔ یعنی یہ خون متھرائی کے اُوپر ڈالا جاتا تھا۔ متھرائی مذہب میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہوتا تھا۔ اور متھرا کی پیدائش کا دن

(۷۰) (70) Encyclopedia of Religion and Religions p. 285, Art. Osiris

۲۵ دسمبر تھا۔ یہ دونوں باتیں مسیحیت نے اختیار کر لیں۔ حالانکہ ۲۵ دسمبر نہ تو حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش کا دن تھا اور نہ اُن کی صلیب کا دن تھا، اور نہ دینِ مسیح میں اس تاریخ کو کوئی خاص اہمیت ہے۔ ان امور کے لیئے دیکھو (۷۱)

متھرا کا جو تخیل اور اُس کے متعلق جو عقیدہ تھا، وُہ بائیبل کے لکھنے والوں نے سب اپنی بائیبل میں لے لیا۔ ملاحظہ ہو حضرت عیسٰیؑ کی تصویر اور آسمان پر اُن کی حالت جو یوحنا کے مکاشفہ میں ہے۔ باب اوّل آیت ۱۵ تا ۱۸۔ باب دوم آیت ۱۸، باب ۱۲، آیت ۱ تا ۶۔ باب ۱۹، آیات ۱۱ تا ۱۶۔

یہ کیوں ایسا ہوُا۔ مسیحیت نے کیوں دینِ کفار سے اثر لیا؟ اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ اب ایک عیسائی مؤرخ اور محقق کی زبان سے سُن لیجیے۔ (۷۲)

ترجمہ:۔ رومن ایمپائر میں مسیحیت کو کبھی فتح حاصل نہ ہوتی اگر مسیحیت کے پیشوا پہلی چار یا پانچ صدیوں تک نہایت صبر و استقلال کے ساتھ عیسوی عقائد کو یونانی فلسفہ کے مطابق نہ بنا لیتے، اور مذہبی پیشواؤں کے نظامِ حکومت کو رومن ہیروس کے نمونے پر نہ بنا لیتے، اپنے عیسٰیؑ کے خدوخال کو آرفیوس Orpheus کی شکل پر نہ ڈھال لیتے، عیسوی رسومات کو اُن سابقہ مذاہب کے خفیہ رسوسات کے مطابق نہ کر لیتے، اگر کافرانہ عیدوں کو مسیحیت میں نہ لے لیتے، اور کفار کے بہادر اور مشہور لوگوں کی بجائے اپنے مذہب کے اولیاء نہ قائم کر لیتے۔ (ختم ہُوا ترجمہ)

اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۳۔

ایک اور جگہ زمانہ حال کا یہی زبردست مؤرخ لکھتا ہے۔ (۷۳)

ترجمہ:۔ دینِ متھرا جو رومن ایمپائر پر رُوحانی قبضہ کرنے میں دینِ مسیح کا ہمعصر اور اُس کا نہایت طاقتور رقیب تھا۔ خود خالص مذہب نہ تھا۔ وُہ تو یہودیت کا

---

(71) Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Mithraism, p. 257.

(72) Toynbee's History; Vol. V, p. 366

(73) Toynbee's History, Vol. II. p. 286n.

Marfat.com

نہیں بلکہ زرتشتی مذہب کا یونانی تخیلات اور عقائد سے ملا ہوا ایک مثنیٰ تھا" دیکھو ضمیمہ ۲ ختم ہوا (ترجمہ)

چونکہ مذہب مسیح کے تمام رسوم، اور بہت سے عقائد ادیانِ سابقہ سے لیئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ایسٹر کی رسومات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ عیسائیوں کی بہت بڑی عید ہے۔ اور حضرت عیسٰےؑ کے قبر میں سے اٹھ کر آنے (Resurrection;) کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ عزت مآب مسٹر بیڈ (Venerable Bede) کی تحقیق کے مطابق یہ لفظ Eoster سے ماخوذ ہے جو اینگلو سیکسن قوم کی موسم بہار کی خدا ئینی تھی۔ اور اسی وجہ سے یہ عید موسم بہار کے آغاز میں منائی جاتی ہے۔ اس عید کے لیئے ضروری ہے کہ اتوار کو ہو اور یہ اتوار (Sunday;) یادگار ہے اُس زمانہ کی جب سُورج (SUN) کی پرستش ہوتی تھی۔ دیکھو:۔

Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Easter

بہت اچھی طرح ثابت ہوگیا، اور خود عیسائی مؤرخین و محققین کی تحریرات سے ثابت ہوا کہ موجودہ دینِ مسیح وُہ اصلی و خالص دین نہیں ہے جو حضرت عیسٰےؑ لائے تھے۔ بلکہ سابقہ ادیانِ کفر و الحاد سے مرکب ایک دین محض سیاسی اغراض کے لیئے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اُن کی "اناجیل" وُہ اصلی الہامی کتاب نہیں ہے جو حضرت عیسٰےؑ پر اُتری تھی۔ بلکہ وُہ تو مفقود ہوگئی۔ موجودہ بائیبل حضرت عیسٰےؑ کے بعد آنے والے مذہبی آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ وُہ ہی دعویٰ ہے جو آج سے تیرہ صدی سے زیادہ سال پہلے ایک نبی اُمّیؐ اور اُس کی الہامی کتاب نے کیا تھا۔ اُس وقت یہ دعوٰے بذریعہ مباہلہ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے ثابت کیا، اور اب اُس دعوے کو اُن کے غلامانِ غلام خود عیسائی بیانات و تحریرات سے ثابت کر رہے ہیں،

فلحمد للہ علےٰ ذالک۔

یہ ہے اسلام اور مسیحیت کا فرق۔ مسیحیت نے اپنے تئیں کفر میں مدغم کر کے اور اپنے عقائد چھوڑ کر کفر کے عقائد اختیار کر کے فتح پائی۔ اسلام نے کفر کے ساتھ کسی قسم کا راضی نامہ نہ کیا، اور کفر کے ہر عقیدہ سے بریت ظاہر کی، اور پھر

Marfat.com

فتح پائی۔ عیسوی پیشواؤں نے دُنیا کی سلطنت اور کفر کے رسوخ سے ڈر کر اپنے مذہب کو مسخ کر دیا۔ اسلام کے پیشواؤں نے ہر قسم کی سختیاں اٹھائیں کفر کے ہر جارحانہ حملہ کو برداشت کیا، کربلا کے میدان میں جانیں دیں، بغداد کے قید خانوں کی سختیاں جھیلیں، لیکن اپنے اسلام کے چہرہ پر کوئی بدنما داغ نہ آنے دیا اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے کوئی اپنا اصلی جانشین نہ چھوڑا۔ اُن کے بعد جن لوگوں نے اُن کے مذہب کی خود پیشوائی اختیار کی، اپنے قیاس کو غلط طریقے سے استعمال کر کے مذہب کو مسخ کر دیا۔ جناب رسولؐ خدا نے اپنے اصلی جانشین اپنی آلؑ میں چھوڑے جنہوں نے اسلام کو اسیطرح سمجھا اور چلایا، جس طرح آنحضرتؐ نے سمجھا اور چلایا تھا۔ اسلام کو ایک مقدس امانت سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رہے، اور کفر کو اس پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔ ضرورت ہوئی کہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد دوسرا پیغمبر آئے کہ اب تک نہ سمجھے ہوئے اصولوں کو سمجھائے۔ جناب محمد مصطفےٰؐ کے بعد اُن کے جانشین آئمہ اہلبیت علیہم السلام نے تمام اصولِ اسلام اچھی طرح سمجھا دیئے، اور ان پر عمل کر کے دکھا دیا۔ کوئی اصول سمجھے جانے کے لیئے باقی نہ رہا۔ خدا کی حجت اپنے بندوں پر تمام ہو گئی۔ لہٰذا کسی اور پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔

عیسائی پیشواؤں نے اپنے مذہب کی بنیاد حق پر نہیں رکھی، بلکہ ووٹوں کی تعداد پر رکھی۔ اور ان ووٹوں کے حصول کے لیئے انہوں نے اپنے مذہب کو خوب مسخ کر لیا۔ محمدؐ اور اصلی جانشینانِ محمدؐ نے اسلام کی بنیاد محض حق پر رکھی، اور ووٹوں کی اکثریت سے یہ کہہ کر بیزاری ظاہر کی کہ:

"اکثرھم للحق کارھون"

دینِ مسیح اور دینِ اسلام میں ایک اور اہم فرق بھی ہے۔ دینِ مسیح کی کتاب اُس کے پیغمبر کی زبان میں نہیں ہے۔ "اناجیل" موجودہ کے الفاظ حضرت عیسےٰؑ یا رُوح القدس کی زبان پر کبھی جاری نہیں ہوئے۔ برعکس اس کے قرآن شریف کے الفاظ وُہ ہی ہیں جو بارگاہِ قدس سے لوحِ محفوظ میں اُترے،

Marfat.com

اور وہاں سے امانتِ خداوندی کی صورت میں جبرائیل امین کے پاس آئے، اُن کی زبان سے نکل کر پیغمبرِ اسلام کی زبان پر جاری ہوئے اور آلِ محمدؐ کی ورد میں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ایسے مقدس مقاموں اور زبانوں میں سے گزرنے میں خود الفاظ میں برکت آجاتی ہے۔ اس ہی بات کو حافظ نے شاعری کے انداز میں اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

نام من رفتست روزے برلب جانان بسہو
اہلِ دل را بوئے جان می آید از نامم ہنوز!

انجیل نے تو جادو اور اُس کے اثر کو بہت اہمیت دی ہے۔ (۷۴)

قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن معقولیت کے ساتھ۔ بہرصورت جادو کی اصلیت مسلّم ہے! لیکن جادو کیا ہے؟ محض الفاظ اور اُن کا اثر۔ یہ اثر کیوں ہے؟ اس لیئے کہ یہ الفاظ شیطان کی بارگاہ سے گزرے ہیں۔ چونکہ وہاں سے گزرے ہیں، لہذا ان میں شیطان کی طاقت شر بھری ہوئی ہے۔ شیطان میں یہ طاقت کیوں ہے؟ نصرانیت اور اسلام دونوں مانتے ہیں کہ خدا نے شیطان کو بہکانے کی مہلت دی۔ یعنی اُس کی بہکانے کی طاقت کو برقرار رکھا، سلب نہیں کیا اُس کے بہکانے کی طاقتوں میں سے ایک طاقت یہ بھی تھی کہ اُس کے الفاظ میں وہ اثر قائم رکھا، جو وہ چاہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ الفاظ میں اثر ہوتا ہے۔ جادو صرف الفاظ اور اُن کا اثر ہے۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ شیطان نے خدا کا مقابلہ کرنے کی مہلت مانگی، خدا نے مہلت دی۔ مقابلہ اُس وقت ہی ہو سکتا ہے کہ جب دونوں طرف لڑائی کی طاقت برابر کی ہو۔ اور اگر ایک فریق زیادہ طاقتور بھی ہے، تو وہ اپنی اُن طاقتوں کو مقابلہ میں استعمال نہ کرے جو دوسرے فریق میں نہیں ہیں۔ اگر ایک فریق کے پاس ایروپلین اور ہائیڈروجن بمب ہیں اور دوسرے کے پاس محض تلوار، تو اگر وہ ایروپلین اور ہائیڈروجن بمب بھی استعمال کرتا ہے،

(۷۴) (74) Hitti's History of Syria, Chapt. XXVII. p. 361

تو اُس کو مقابلہ کی لڑائی نہیں کہیں گے۔ اور جب خدا نے شیطان کو مقابلہ کی مہلت دے دی تو پھر وہ خدائی کی طاقت استعمال نہیں کرے گا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ خدا نظر نہیں آتا، شیطان بھی نظر نہیں آتا۔ خدا دل پر اثر کرتا ہے، شیطان بھی دل پر اثر کرتا ہے۔ خدا اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتا ہے، شیطان بھی اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتا ہے۔ خدا نے الفاظ میں طاقت دی، شیطان نے بھی الفاظ میں طاقت دی۔ اب شیطان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پوری مہلت نہیں ملی۔ اُسے سارا موقع دیا گیا۔ وہ شیطانی خصائل کے انسانوں کو تو بہکا سکا، لیکن خدا کے مخلص بندوں کو باوجود اپنی پوری طاقت کے نہ بہکا سکا، اگرچہ اُس کو پوری مہلت دی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُحد، صفین، کربلا میں خدا کے حکم سے دُشمنانِ خدا برباد ہو جاتے۔ لیکن اُس صورت میں شیطان کا عذر باقی رہ جاتا کہ خداوندا! امتحان پورا ہونے سے پہلے ہی تو نے نتیجہ نکال دیا۔ مجھے پوری مہلت نہ ملی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ جادو کی طاقت مسلّم۔ جادو کی طاقت محض الفاظ کی طاقت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ الفاظ میں طاقت ہوتی ہے رحمانی الفاظ میں برکت ہوتی ہے۔ چونکہ بائیبل کے الفاظ میں وہ اصلی الفاظ نہیں ہیں، لہٰذا اُن میں برکت نہیں۔ اور یہ بھی بات ہے کہ جو خوبی اور معانی اصل زبان میں ہوتے ہیں، وہ ترجمہ میں کہاں۔

یہودیت

(۱) تاریخ

یہودیوں کی تاریخ اُن کے مذہب کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا ہم بہت اختصار کے ساتھ پہلے ان کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ کے صرف دو ماخذ ہیں۔ ایک تو بائیبل کا وُہ حصّہ جو عہدِ عتیق کہلاتا ہے، اور دُوسرے اکتشافاتِ آثارِ قدیمہ۔ عہد عتیق کے متعلق محققین کی رائے ہے، کہ وُہ محض کہانیاں ہیں صحیح تاریخ اُن میں بہت کم ہی۔ اُن کے لکھنے والے وُہ لوگ ہیں جو اُن واقعات کے کئی صدیوں کے بعد ہوئے جن کو وُہ بیان کرتے ہیں۔ جس طرح اُنھوں نے لوگوں میں کہانیاں اور افواہیں پائیں، اُن کو

Marfat.com

اُسی طرح لکھ دیا۔ بہر صورت کچھ تو ہے۔ لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ تاریخیں اور سِن محض قیاس سے لکھے ہیں۔

بنو اسرائیل کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ تھے جو عراق کے مقام اُر (Ur) سے اُٹھ کر حران ہوتے ہوئے فلسطین میں آن کر آباد ہوئے۔ اُس وقت یہاں کنعانی آبادی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے لڑکوں میں سے اسحاق اور اسمٰعیل تھے۔ اسحاق کے لڑکے یعقوب ہوئے جن کو اسرائیل بھی کہتے تھے۔ یعقوب کے بارہ لڑکے ہوئے جن میں سے چھوٹے یوسف تھے۔ ان ناموں کے معنی معلوم کرنے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ابراھیم - باپ بلند ہے۔

یعقوب - خدا حفاظت کرے۔

اِسرائیل - اِل حکومت کرے۔

اِسماعیل - اِل سن لیئے۔

اسحاق - خدا مسکرائے یعنی راضی ہو۔

یوسف - خدا زیادہ دے۔

عبرانی میں اِل خدا کو کہتے تھے۔ اسرائیل، جبرائیل، میکائیل، عزرائیل، عزازیل یہ وُہی لفظ ہے جو عربی کا اللہ ہے۔ حضرت یوسفؑ کا واقعہ تو سب کو معلوم ہے۔ جدائی کے بعد پھر باپ بیٹے اور بارہ بھائی مصر میں رہنے لگے۔ حضرت یوسف مصر کے وزیرِ اعظم ہو گئے۔ مسٹر فلپ ہِٹی کی تحقیق کے بموجب یہ وُہ زمانہ تھا، جب مصر پر ہائک سوس (Hyksos) قابض تھے۔ اُنہوں نے مصر پر ۱۷۵۰ ق م میں قبضہ کیا تھا اور ۱۵۸۰ ق م تک قابض رہے۔ جب مصریوں نے اپنی قومیت کے جذبہ میں اُن کو نکال دیا۔ (۷۵) مسٹر ہِٹی کے خیال کی تائید کچھ قرآن شریف سے بھی ہوتی ہے۔ اِمۡرَاَۃُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰٮہَا۔ (۱۲-۳۰) ہائک سوس کے آخری مصری بادشاہ کا نام یورپین مؤرخین نے اسیس (Asis) لکھا ہے۔ مناسبتِ لفظی بتا رہی ہے، کہ وُہ "عزیز" ہی ہے جس کو بگاڑ کر اسیس بنا لیا ہے۔

(۷۵) (75) Hitti's History of Syria, Chapt. XI, p. 149

ہائک سوس (Hyksos) ہائک کے معنی "بادشاہ" اور سوس کے معنی اُس زمانہ کی زبان میں "چرواہے" کے ہیں۔ گویا چرواہوں کی قوم کے بادشاہ۔ ایک قدیمی مؤرخ کی رائے ہے کہ یہ عرب تھے (۷۶)۔ یہ (Josephus) ایک یہودی مؤرخ تھا۔ جس کا زمانہ غالباً ۳۷ئہ سے ۹۵ئہ تک تھا۔

بنی اسرائیل بھی مصر میں اجنبی تھے۔ ہائک سوس کے زمانہ میں حضرت یوسفؑ صاحبِ اقتدار تھے۔ دربار میں وزیرِ اعظم تھے۔ اجنبیوں سے جو منافرت تھی، اور جس نے ہائک سوس کو مصر سے نکالا تھا، وُہ ہی بنواسرائیل کے ساتھ ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے مصری بادشاہ یعنی فرعون کو خوف ہُوا کہ کہیں ہائک سوس کی طرح یہ بھی مصر پر قبضہ نہ کرلیں۔ فرعون کے اس خوف کا پتہ ہم کو قرآن شریف سے بھی ملتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور اُن کے بھائی ہارون سے لوگوں کو یہ کہہ کر ڈراتا ہے:-

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ۔ (۲۰:۶۳)

اس ہی خیال سے وُہ بنواسرائیل پر سختیاں کرتا تھا۔ تاکہ اُن کی آبادی اور طاقت نہ بڑھنے پائے۔ وُہ اُن کی اولادِ نرینہ کو قتل کرا دیتا تھا۔ جب بنواسرائیل پر سختیاں زیادہ ہوگئیں، تو حضرت موسیٰؑ کو خدا کا حکم ہُوا کہ بنواسرائیل کو مصر سے نکال لے جاؤ۔ مصر سے نکلنے کا زمانہ ۱۴۹۱ئہ ق م بیان کیا جاتا ہے۔ چالیس سال جنگل میں سرگرداں پھرنے کے بعد آخرکار ۱۴۵۱ئہ ق م میں وُہ کنعان پہنچے۔ حضرت ہارون انتقال کرچکے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے حکم سے اُن کے جنرل (یوشع Joshua) نے حملہ کیا۔ پہلا حملہ (Jericho) پر ہُوا۔ حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور یوشع شہر میں داخل ہوئے ۷ برس کے عرصہ میں پورا کنعان فتح ہُوا۔ حضرت یوشع نے حضرت موسیٰؑ کا قانون جاری کیا۔ اُس قانون کے مطابق ججوں کی حکومت شروع ہوئی جس کا ذکر بائیبل میں ہے حضرت یوشع کے انتقال کے بعد بنواسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے مذہب کو چھوڑ کر بُت پرستی اختیار کی۔ مصر میں اگرچہ یہ سختیوں میں رہے، لیکن پھر بھی مصر کی زرخیزی

(۷۶) (76) Josephus, Vol. VI, Book 1, Sec. 14

شادابی ہی کو یہ ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ اور مصریوں کے بتوں، خاص کر بچھڑے کو پوجتے رہے۔ ۱۰۹۵ء ق م بنو اسرائیل نے اپنے نبی Samuel سے درخواست کی کہ اُن کے لیئے بادشاہ مقرر کر دیں۔ چنانچہ Saul (طالوت) بادشاہ مقرر ہوا۔ آخر کار ۱۰۵۵ء قم میں اُس نے خودکشی کر لی، اور حضرت داؤدؑ بادشاہ ہوئے۔ ۱۰۱۵ء ق م میں ان کا بھی انتقال ہو گیا، تو اُن کے بیٹے حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین بادشاہ اور نبی ہوئے۔ ۹۷۵ء ق م میں ان کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کے ساتھ بنو اسرائیل کی متحدہ سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس متحدہ سلطنت میں بس یہی تین بادشاہ ہوئے۔ مسٹر ہٹی نے اُن واقعات کی مختلف تاریخیں لکھی ہیں۔ اُن کی تحقیق کے بموجب صحیح تاریخیں یہ ہیں:-

۱۲۹۰ء ق م ... ... حضرت موسیٰؑ بنو اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔

۱۲۵۰ء ق م ... ... حضرت موسیٰؑ نے کنعان فتح کیا۔

بارھویں صدی قبل مسیح کے آخری چوتھائی حصہ سے لے کر گیارھویں صدی قبل مسیح کی پہلی تین چوتھائی تک } ججوں کا زمانہ۔

۱۰۲۰ء ق م ... ... طالوت Saul بادشاہ ہوئے۔

۱۰۰۴ء ق م ... ... طالوت کی موت۔

۱۰۰۴ء تا ۹۶۰ء ق م ... ... حضرت داؤدؑ کا زمانہ۔

۹۶۰-۹۲۵ء ق م ... ... حضرت سلیمانؑ کا زمانہ۔

حضرت داؤدؑ نے یروشلم (بیت المقدس) کا شہر آباد کیا۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال پر سلطنت بنی اسرائیل کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شمالی ٹکڑے میں بنو اسرائیل کے دس قبیلے آباد تھے۔ اُس کا نام سلطنت اسرائیل تھا، اور اُس کا مستقل دارالسلطنت (Samaria) تھا۔ جس کو عمری بادشاہ اسرائیل (Omari) نے آباد کیا تھا۔ جنوبی سلطنت کو سلطنت جوڈا (Judah) کہتے تھے۔ اس میں بنو اسرائیل کے باقی دو قبیلوں Judah اور (Benjamin) کی اولاد رہتے تھے۔ اس کا دارالسلطنت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں جو بھائیوں ہی کی

اولاد کی تھیں۔ ہمیشہ آپس میں دشمنی اور لڑائیاں رہیں۔ غالباً یہ اُس ہی پشتینی عداوت کا سلسلہ تھا جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں نے حضرت یوسفؑ اور اُن کے حقیقی بھائی سے شروع کی تھی۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپس کا عناد و نفاق خداوند تعا کا عذاب تھا۔ جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں کے ظلم کی وجہ سے اُن پر نازل ہوا۔ آپس کی اس عداوت سے ہمسایہ سلطنت (سلطنتِ دمشق) نے ان کو آپس میں لڑا کر بہت فائدہ اُٹھایا۔ یہ آپس کی دُشمنی بڑی سیاسی غلطی تھی۔ یہ دونوں سلطنتیں تین بڑے دُشمنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف دمشق کے بادشاہ، دوسری طرف اشوری سلطنت اور تیسری طرف مصر۔ ان ہمسایوں کے مذہب کا اثر ان دونوں سلطنتوں پر پڑا، اور ان کی تلوار نے ان کے ملک کو برباد کر دیا۔ چونکہ اُنہوں نے خدائی اسرائیل کو چھوڑ دیا تھا، اُس نے بھی اُن کو سزا اُن کے اپنے ہی ہاتھوں سے دلائی۔ یہ سُنّتِ الٰہیہ ہے کہ گناہگار کو سزا اس دُنیا میں اُس کے اپنے ہی ہاتھ سے ملتی ہے۔ یہ عذاب خدا نہیں تو اور کیا تھا۔ کہ یہ ایسے اندھے ہو گئے کہ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہمارے سر پر تین دُشمن کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم آپس میں مل جائیں تو مضبوط ہو جائیں گے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کس گھڑی سے یُوسفؑ سے عداوت کی تھی کہ بھائیوں کی عداوت ہی نہ گئی۔ سلطنت کے تقسیم ہونے سے پہلے ان دونوں جماعتوں میں عداوت تھی، اور اس تقسیم کے بعد بھی یہ عداوت رہی۔ شمالی حصہ حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں کی اولاد نے لیا، اور جنوبی حصہ Judah اور Benjamin کی اولاد نے لیا۔ Judah ہی حضرت یوسفؑ کی طرح اپنے باپ کا لاڈلا بیٹا تھا اور Benjamim حضرت یوسفؑ کا ایک ہی ماں سے حقیقی بھائی تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ Benjamin کے معنی ابن دست راست ہیں۔ Ben تو وُہ ہی ہے جو عربی "ابن" "بن" ہے۔ اور عربی کا "یا" عبرانی کی "ج" سے بدلتی ہے۔ جیسے یعقوب سے Jacob اور یوسف سے Joseph اسی طرح (Jamin) دراصل یمین ہے۔ پورا نام "ابن یمین" ہوا۔ بائیبل میں یعقوبؑ کے بڑے بیٹے کا نام Ben Reu لکھا ہے۔ Ben۔ ابن۔ بیٹا، Reu راؤ یا رؤا۔ اُنہوں نے دیکھا یا دیکھو۔ معنی ہوئے: "بیٹے کو دیکھا"

Marfat.com

یعنی بیٹھا ہوا۔

یہ تو عبادت کا حال ہوا، اب بُت پرستی کو لو۔ سلطنتِ بنی اسرائیل تو تقریباً ہمیشہ ہی بُت پرست رہی۔ اس کے ۱۹ بادشاہ ہوئے۔ وُہ سب سوائے ایک بادشاہ Jehu کے بُت پرست تھے، اور اپنے انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ عمری تھا۔ جس نے ۸۸۵ قم سے ۸۷۴ قم تک سلطنت کی۔ اُس نے سماریہ Samaria کو آباد کیا تھا۔ جس کا موجودہ نام سباسطیہ ہے جو یونانی لفظ Sebostos کا معرب ہے۔ یہ نام Sebostos نے آگسٹس رومن شاہنشاہ کے زمانہ میں دیا تھا۔ Herod the Great Sebostos کے معنی صاحبِ جلالت و رفعت کے ہیں۔ اور یہ ہی معنی Augustus کے ہیں۔ عمری کا لڑکا Ahab (۸۵۲ - ۸۷۴ قم) بادشاہ ہوا۔ اُس نے بُت پرستی میں بہت ہی مبالغہ کیا۔ اس کی بیوی کے خوف سے ر (Elijah) نبی بھاگتے پھرتے تھے۔ اب (Elljah) اور (Elishah) انبیاء نے لوگوں کو خاندانِ عمری کے خلاف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۴۲ قم میں ایک شخص (Jehu) نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس سلطنت میں فقط یہ ہی ایک ایمان والا بادشاہ تھا۔ آخر کار اسیریا کے بادشاہ سرغون ثانی Sargon II نے ۷۲۲ قم میں سلطنتِ بنو اسرائیل کو برباد کر دیا۔ کم سے کم ۲۷۲۸۰ جوانانِ بنو اسرائیل کو جلاوطن کر کے Media میں لے گیا۔

سلطنتِ جوڈا کے بھی اُنیس۱۹ بادشاہ ہوئے۔ اُن میں سے صرف چھ۶ بادشاہ تو خدائے واحد کی پرستش کرنے والے تھے، باقی سب بُت پرست تھے ۶۱۲ قم میں نینوا، اور ۶۱۰ قم میں سلطنتِ اسیریا ختم ہو گئی۔ اب اُس کی جگہ نئی بابلی حکومت Neo-Babylonian نے لی۔ سلطنتِ جوڈا نے اُس کی اطاعت کی اور باجگذار بن گئی۔ پھر مصر کے ساتھ مل کر جوڈا نے اپنے مالکوں سے غداری کی، اور آخر کار نیو بابلی سلطنت کے شاہنشاہ (Nebchadnezzar;) (۵۶۱ - ۶۰۴ قم) نے ۵۸۶ قم جوڈا کے بادشاہ (Zebedkiah;) (۵۸۶ - ۵۹۷ قم) کے زمانہ میں یروشلم کو تاخت و تاراج کر کے سلطنت جوڈا کا

خاتمہ کردیا۔ جوڈا کا بادشاہ Zebedkiah جب فاتح بادشاہ کے سامنے پیش ہوا، تو Nebuchadnezzar نے اول تو اُس کے بچوں اور بیویوں کو اُس کے سامنے قتل کر ڈالا۔ اور پھر فوراً اُس کی آنکھیں نکلوا ڈالی گئیں۔ تاکہ بیویوں اور بچوں کے قتل کا نظارہ آخری سماں ہو جو اُس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اور وہاں وُہ محفوظ رہے۔ پھر جوڈا کے پچاس ہزار قیدیوں کو معہ اُس کے اندھے بادشاہ کے بابل میں لے گئے۔

اس کے بعد یہودیوں کی تاریخ وُہ ہی حقارت اور جلاوطنی کی تاریخ ہے۔ اب حال ہی میں اپنے اسلاف اور صلاح الدین ایوبی کے بدنام کرنے والے عربوں نے پھر بیت المقدس میں یہودیوں سے مغلوب ہو کر اُن کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن ابھی اس کا انجام کسی نے نہیں دیکھا۔ سلطنتوں کے انجام سالوں میں نہیں، بلکہ صدیوں میں نکلا کرتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ط

یہودیت

(۲) مذہب

جس قسم کے کافرانہ و ملحدانہ ماحول سے متاثر ہو کر مسیحیت نے اپنے تئیں مسخ کر لیا، ویسا ہی بلکہ اُس سے تیز و قوی تر کافرانہ ماحول یہودیت کا تھا۔ اور نتیجہ وُہ ہی ہوا جو نصرانیت کا ہوا تھا۔ بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے کافرانہ عقائد و ملحدانہ تخئیلات مسیحیت میں یہودیت سے ہو کر آئے ہیں۔ مصر میں صدیوں تک صنم اور فرعون پرست قوم کے ساتھ رہنے کا یہ اثر ہوا کہ یہودیت میں بہت سے مصری بُت آ گئے۔ جن کی پرستش باوجود انبیاء کی ممانعت کے بنواسرائیل میں رائج ہو گئی۔ پھر جب مصر سے نکلے اور کنعان فتح کیا، تو بہت سے کنعانیوں کے بُت اور رسومات بنواسرائیل نے اپنے میں لے لیئے۔ اور کنعانی لٹریچر اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر لیا۔ مسٹر ہیمی نے اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں

اُن کی تحقیق کے بموجب (کتاب ایوب؛ Book of Job) میں بہت کچھ کنعانیوں کے کافرانہ تصورات داخل ہیں۔ (۷۷)

خدا کا تصور:۔ یورو پین مؤرخین و محققین کی تحقیق سے پایا جاتا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام سے بغاوت کرکے اور اُن کی تعلیم سے انحراف کرکے یہودیوں نے اپنے خدا کا تصور ایران کے شاہانِ خاندان ہنجامنش کے زیرِ اثر مرتب کیا ہے اور اس خاندان کا اثر ان کے اس تخئیل میں نمایاں ہے۔ خداوند تعالےٰ کو شاہانِ ہنجامنش (Achaemenian Monarchy) کی طرح جسم والا صاحب شان و شوکت تصور کیا ہے۔ اور اس کا دربار اُن بادشاہوں کے دربار کی طرح خدم و چشم سے آراستہ تصور کرتے ہیں۔ دیکھو ذکریا باب سوم جو تقریباً ۵۱۹ ق م میں اور کتاب ایوبؑ جو تقریباً ۴۰۰ ق م میں لکھے گئے تھے۔ یہ ہی نقشہ کتاب دانیال باب ہفتم آیات ۹، ۱۰ میں خدا کا کھینچا گیا ہے۔ کتاب دانیال ۱۶۴-۱۶۶ ق م میں لکھی گئی تھی۔ یہ تصورات یہودیت نے زرتشتی مذہب کے ذریعہ سے لیئے ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو مزامیر داؤدؑ (Psalms;) باب ۸۲- آیات ۸، ۷، ۶، ۱ جس میں کئی خداؤں کا عقیدہ نمایاں ہے۔ یہ عقیدہ ادیانِ الحاد سے لیا گیا ہے۔ اور اتنا نمایاں ہے کہ محققین نے بائیبل کے مطالعہ سے نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کئی خداؤں کے ماننے والے تھے جن میں سے ایک خدا کو بڑا سمجھتے تھے۔ ان سب امور کے لیئے دیکھو (۷۸)

خدا کا صاحب جسم ہونا، اور اُس جسم کا مثل انسانی جسم کے ہونا، خدا کا انبیاء بنی اسرائیل کے سامنے انسانی شکل میں نمودار ہونا، دیگر خداؤں کی ہستیوں کو بھی ماننا یہ سب امور کتاب پیدائش، کتاب امثال، اور مزامیر داؤد سے عیاں ہیں۔ اور یہ عقائد کنعانی تصورات کی بناء پر قائم کیئے گئے۔ عبرانی والدین اپنے پہلے بچہ کا

---

(۷۷) (77) Hitti's History of Syria Part. II, Chapt. X pp. 114-16, 118

(۷۸) (78) Toynbee's History Vol. VI, pp. 34, 38, 39, 163n.

نام تو اپنے خدا (Jehovah) پر رکھتے تھے۔ اور بعد کی پیدائش کے بچوں کے نام کنعانی خدا بال (Baal) پر رکھتے تھے۔ بنواسرائیل نے اپنے خدا کا تخیل Cherub کے نمونہ پر بنایا ہے۔ اور Cherub; کو اسیریا کے خدا پرواز بچھڑے کی صورت پر پروار بنایا ہے۔ اور اپنے خدا کا تصور کیا ہے کہ وُہ ایک ایسے ہی پرواز بچھڑے پر بیٹھا ہُوا ہے آدھا عہد عتیق اس ہی نمونہ پر ہے۔ ان سب امور کے لیئے دیکھو (۷۹)

یہودیوں کے نام اکثر شمعون پر ہُوا کرتے ہیں۔ یہ شمعون شہر Sidon کا خدا تھا، یہودیوں نے اُس کو اپنا خدا بنالیا۔ دیکھو کتاب مندرجہ بالا صفحہ ۱۲۵، نوٹ ۱۰

حضرت ابراہیمؑ نے خالص وحدانیت کی تعلیم کی، اور حضرت موسےؑ تک وُہ ہی تعلیم رہی۔ لیکن جب بنواسرائیل مصر میں گئے اور وہاں کے کفر کے زیرِ اثر آئے اور پھر کنعان فتح کیا اور اُس کے کفر کے زیرِ اثر آئے، تو اُن کے مذہب یہودیت میں کفر اچھی طرح داخل ہوگیا۔ (۸۰)

اسیطرح زرتشت نے خالص وحدانیت کی تعلیم کی، لیکن اُن کے بعد کے لوگوں نے اُن کے جاری کردہ مذہب میں کفر کو راہ دی۔ دیکھو کتاب مندرجہ بالا۔ صفحہ ۴۳۔ نوٹ ۱۔

یہودیت اور زرتشتی مذہب نے ایک دُوسرے پر اثر کیا۔ انبیاء بنی اسرائیل کے معتقدات زرتشتی مذہب میں موجود ہیں۔ (۸۱)

یہودیت میں اپنے سے پہلے مذاہب کے کافرانہ وملحدانہ تخئیلات وتصوّرات موجود ہیں۔ دیکھو کتاب (۸۱) صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰۔

مسٹر ٹوآئن بی کہتے ہیں کہ غالباً مسیحیت نے اپنے ماحول کے کفر والحاد سے رشتہ جوڑنے، اور ان کے تخئیلات اپنے مذہب کے اندر لینے میں یہودیت کی نظیر بھی اپنے سامنے رکھی تھی۔ کیونکہ اُنہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل خالص

(79) Hitti's History of Syria, pp. 114, 115, 204-207
Toynbee's History, Vol. VI, p. 39n

(80) Toynbee's History, Vol. VI, p. 39n

(81) Toynbee's History, Vol. V, pp. 121, 369

وحدانیت کی تعلیم دیتے رہے۔ اور اُن کو اس طرح کفر کی طرف جانے سے روکتے رہے۔ دیکھو کتاب مندرجہ (۵۱) صفحہ ۵۳۵، ۵۳۶۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ یہودیت نے بھی ملحدانہ فلسفہ کے معتقدات اور تصورات کو اپنے اندر داخل کر لیا تاکہ اُس کے پھیلنے میں آسانی ہو۔ دیکھو کتاب مندرجہ (۵۱)، ص ۵۳۹، ۵۴۰۔

اہلِ کنعان کی پیروی دیگر امور میں

بنو اسرائیل نے اپنی تمام زندگی کو اہلِ کنعان کے معتقدات اور طرز کے مطابق کر لیا۔ اِن دونوں مذاہب میں رہبانیت تھی۔ اور وہ ان دونوں یعنی کنعان اور بنو اسرائیل نے یونان کے الحادی مذہب Orphism سے لی۔

اپنے معبدوں کی تعمیر و ہیئت، وہاں راگوں کا گانا، راگ کے آلات مثلاً: نے، بربط، بانسری، اور ناقوس یہ سب کنعانیوں سے لیے گئے ہیں۔

موجودہ زندگی اور موت کے بعد کے حالات، مُردوں کے دفن کرنے کا طریقہ قبر میں مُردوں کے ساتھ رکابیاں اور مرتبان رکھنا، لباس، زیورات، مٹی کے برتنوں کی شکل اور اُن کا استعمال یہ سب امور بنو اسرائیل نے اہلِ کنعان سے لیئے تھے۔ شام میں اب تک تنوروں کا استعمال ہوتا ہے جہاں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ بجلی کے آنے سے پہلے اب تک مٹی کے چراغ یا دھات کے فتیلہ سوز جلتے تھے۔ یہ سب کنعان کی نشانیاں ہیں۔ ہاتھ کی چکی جو ہندوستان میں عرصہ سے رائج ہے، وہ بھی کنعان سے لی گئی تھی۔

موجودہ زبور، تورات غرضکہ جملہ کُتب عہد عتیق کس طرح اور کس نے تصنیف کیں

بہت کچھ تو ہم نے اس کے متعلق اُوپر لکھا ہے، جو باقی رہ گیا ہے وہ یہاں تحریر کرتے ہیں۔ یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ ان کتابوں میں وقتاً فوقتاً ترمیم و تنسیخ، ایزادی و کمی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔

عہد عتیق کی کتابوں کے لکھنے میں بہت سے معلموں اور مؤرخین نے حصہ لیا تھا۔ یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ عہدِ عتیق کی پہلی پانچ کتابیں جن کو توراۃ کہا

جاتا ہے۔ اور جن کی نسبت یہ گمان تھا کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی تحریر کردہ ہیں۔ دراصل حضرت موسیٰؑ کی تحریر کردہ نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ تو تیرھویں صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ اور یہ کتابیں تو پانچویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی تھیں، اور ان کے لکھنے والے تمام یہودی علماء تھے۔ ان کتابوں میں مختلف اوقات میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے ہوتے گئے۔ یہ کتابیں یہودیوں کے بابل کی جلاوطنی کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں اور یہ جلاوطنی ۵۸۶ ق م میں ہوئی جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اُس کے بعد دو صدیوں تک ان میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے ہوا کئے۔ ان میں انبیاء سے منسوب جو کتابیں ہیں ان میں خالص وحدانیت کی تعلیم ہے۔ یہ کتابیں عہد عتیق کی کتابوں میں سب سے زیادہ پرانی ہیں۔ ان سب امور کے لیئے دیکھو (۸۲)

یہ ہی باتیں مسٹر ہٹی اپنی تاریخ شام میں کہتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف کتب انبیاء میں خالص وحدانیت کی تعلیم ہے۔ یعنی وُہ کتب جو انبیاء کے نام سے منسوب ہیں، اُن میں سے یہ ان چھ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) یسعیاہ Isaiah

(۲) یرمیاہ Jeremiah

(۳) عاموس Amos

(۴) ہوسیع Hosea

(۵) میکاہ Micah

(۶) حزقی ایل Ezekiel

مسٹر ولیم بارنز کا خیال ہے کہ Isaiah کو عرصہ ۱۵۰ سال کے درمیان میں کئی آدمیوں نے لکھا ہے۔ مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ تورات کو مختلف مؤرخین و معلمین اور کاہنوں نے لکھا ہے۔ قانون موسیٰ کی نسبت کہتے ہیں کہ اُس کے لکھنے والے کو حضرت موسیٰ سمجھا گیا ہے۔ لیکن حمورابی کا قانون جو حضرت موسیٰؑ سے ۳۰۰ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اور جس کو حمورابی نے اپنے خدا شمس کی طرف منسوب کیا تھا، حضرت

(۸۲) (82) The Rise of Christianity by William Barnes, pp. 16, 17

Marfat.com

موسیٰؑ کے قانون سے بہتر تھا (۸۳)۔ قرآن شریف اور بائیبل کی کتاب خروج اور انجیل متی کا دعویٰ ہے کہ جو قوانین یعنی الواح حضرت موسیٰؑ کو دیئے گئے تھے، وہ خدا نے دیئے تھے۔ دیکھو،

Matthew; Ex. 20: 19-22

ظاہر ہے کہ حمورابی کا قانون خدا کے دیئے ہوئے قانون سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ نکلا کہ موجودہ توریت وُہ نہیں ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ وہ تو گم ہوگئیں، اور لوگوں نے اُس کے بدلہ پر لکھ دیا۔

اُن کتابوں کی نسبت جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ انبیاء کی اپنی اصلی تحریرات تو بہت کچھ ضائع ہو چکی ہیں۔ انبیاء کا لٹریچر ۷۵۰ ق م تا ۵۵۰ ق م کے درمیان مرتب ہوا ہے۔ اہلِ بابل، اہلِ اسیریا، مصری اور یونانی ان سب کا مذہب Henotheism تھا۔ جس کے معنی ہیں کہ بہت سے خداؤں کے ساتھ ایک سب سے بڑے خدا کا اعتقاد رکھنا۔ لیکن یہ انبیاء خالص موحد تھے۔ ان کے حالات وُہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

۱۔ عاموس Amos اس کا زمانہ ۷۵۰ ق م تھا اور یہ شمالی سلطنت یعنی سلطنت اسرائیل Jeroboam II کے زمانہ میں تھا۔

۲۔ یسعیاہ Isaiah ان کا زمانہ ۷۳۸ ق م تھا۔ اور یہ سیاسی مصائب کے زمانہ میں رہے۔ اُنھوں نے سارغون Sargon کے ہاتھوں ۷۲۲ ق م میں Sawaria کی بربادی اور یروشلم کی بربادی ۷۰۱ ق م میں سناخرب کے ہاتھوں دیکھی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے حضرت مہدیؑ کے آئندہ کے امن وامان کے زمانہ کی پیشین گوئی کی تھی۔ دیکھو (۸۴)

۳۔ یرمیاہ Jeremiah ۶۲۶ ق م سے ۵۸۶ ق م تک اُنھوں نے Nebuchadnezzar کے ۵۹۷ ق م کے حملہ کو دیکھا۔ اور پھر یروشلم کی بربادی

(83) Hitti's History of Syria, Part II, Chap XV, p. 210 (۸۳)

(84) Is. 9:6-7; 2:2-4; 11:1-9 (۸۴)

Marfat.com

۵۸۶ قم میں دیکھی۔ ان کے نہایت اعلیٰ تخیلات ۳۰ سے ۳۳ تک کے ابواب میں ہیں۔ انہوں ہی نے شخصی ذمہ داری کا اصول قائم کیا۔ برعکس اس اصول کے کہ باپ کے گناہوں کا مؤاخذہ اُس کے بیٹوں سے ہوگا (۸۵) یہی خیال حزقی ایل میں ہے۔ (۸۶)

۴۔ ہوسیع Hosea ان کا زمانہ ۷۴۵ ق م تا ۷۳۵ ق م ہے۔ ان کو بدچلن بیوی ملی۔ لیکن انہوں نے اس کو بھی بہت اچھی طرح نبھایا۔

۵۔ میکاہ Micah ان کا زمانہ ۷۳۰ ق م تا ۷۲۲ ق م تھا۔ یہ بھی حضرت داؤد کے زمانہ مستقبل کے امن و چین کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ (۸۷)

۶۔ حزقی ایل Ezekiel یہ یرمیاہ نبی کے ہمعصر تھے۔ ان کی کتاب کا باب ۱۸ نہایت اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ ان کی اور یرمیاہ کی تعلیم کا اخلاق موجودہ زمانہ کی یورپ کی عیسائی سلطنتوں کی لڑائیوں میں نظر نہیں آتا۔

ان انبیاء کے حالات کے بیان کے لیے دیکھو (۸۸)

باب نہم

دہریت کے معتقدات اور اُن کی تردید

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ

الجاثیہ - ۴۵ : ۲۴

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ

(85) Jer. 31 : 29, 30; (86) Ezek. 18:2, 3, 4.

(87) Mic. 4 : 1-8

(88) Hitti's History of Syria, Part. II, Chap. XV, pp. 210, 216

Marfat.com

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ فاطر ۳۵: ۳

جو کچھ دہریئے بحث کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں اور جو کچھ اُن کو جواب دیا جا سکتا ہے وُہ سب ان آیات متذکرہ بالا میں آگیا ہے۔ ہم جو کچھ اس باب میں لکھیں گے وُہ ان آیات ہی کی تشریح ہوگی۔

دہریت اُس مذہب یا مجموعۂ اعتقادات کو کہتے ہیں کہ جس میں کائنات کے خالق اور رب کی ہستی اور قدرت سے انکار کیا جاتا ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم بلکہ تمام کائنات خود بخود زمانہ کے عمل سے اُس مادہ سے پیدا ہو گئے ہیں جو ازل سے موجود تھا اور ہے۔

ہر ایک دعوے کے لیئے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دعویٰ کے لیئے بھی ثبوت چاہیئے۔ وُہ اعتقاد جس کی اصلیت اور صداقت کا یقین نہیں، عبث ہے۔ بے اثر ہے۔ کچھ نہیں۔ یقین کی بناء علم ہے۔ بغیر علم کے جو یقین ہوگا، وہ مستحکم نہ ہوگا۔ علم حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔ یا تو ذاتی علم ہو خود دیکھا ہو علم ہو، یا ایسے لوگوں کی زبانی علم حاصل ہو جن کی علمیت و صداقت کا ہم کو یقین ہے۔ اس یقین کی شرط کے یہ معنی ہوئے کہ ہمیں ذاتی طور سے علم حاصل ہو کہ جو بات یہ کہہ رہا ہے، اُس کا حقیقی علم اس شخص کو ہے اور نیز یہ کہ وُہ صادق ہے۔ مجھے کراچی کا ذاتی علم ہے۔ لنڈن کا ذاتی علم نہیں۔ ایک شخص لنڈن کے حالات مجھے بتاتا ہے۔ ان واقعات پر یقین کرنے سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ شخص لنڈن گیا یا نہیں۔ اگر گیا تو ان حالات سے اس کو سابقہ پڑا یا نہیں کہ جن کو وُہ بتا رہا ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا، کہ وہ آدمی سچا ہے یا جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔

اس معیار کو مدِ نظر رکھ کر ہم دہریت پر بحث کرتے ہیں۔

کیا دہریوں کو اپنے معتقدات کا علم و یقین ہے؟ اگر نہیں، تو مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ اگر ہے، تو پھر اُس کا ثابت کرنا اُن کے ذمہ ہے۔ کیونکہ دعویٰ کا بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اغلب کیا ہے۔ خدا کا ہونا، یا خدا کا نہ ہونا۔ صرف بارِ ثبوت کا فیصلہ کرنے کے لیئے مندرجہ ذیل اُمور کافی ہیں:-

۱۔ دہریئے کہتے ہیں کہ مادہ ازل سے ہے۔ ایک بے جان، بے عقل شے کا ازل سے ہونا ثبوت چاہتا ہے۔

۲۔ دہریے کہتے ہیں کہ مادہ سے ہی خود بخود کائنات بن گئی ہے۔ غیر ذی رُوح بے جان، بے عقل شے سے اُس کے برعکس شے یعنی عقل، زندگی کا برآمد ہونا ثبوت چاہتا ہے۔ جو چیز اُس میں خود نہیں ہے، وُہ کیونکر پیدا کر دے گی۔

۳۔ ہم کائنات میں عظیم الشان نظام اور قانون اور تناسب پاتے ہیں۔ بے عقل اور بے جان شے کا نظام و قانون و مناسبت پیدا کرنا ثبوت چاہتا ہے۔

۴۔ تمام کائنات میں حرکت ہے، حرکت ہی سے قائم ہے۔ وہ حرکت اوّلین کس نے پیدا کی۔ اگر انسان اپنے پر غور کرے، تو فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس تمام نظام کا کوئی خالق اور مدبر ہے۔ لہٰذا دہریت کو ثابت کرنا چاہیئے کہ خدا نہیں ہے دہریئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ منفی کا ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ سائنس میں پہلے اکثر منفی ہی کو ثابت کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم ثابت کرنا چاہیں کہ ایک شے "ج" موجود نہیں ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ ایک وُہ شے (۱) جو موجود ہے اور جس کا وجود عینی ہے، وُہ نہ موجود ہوتی اگر شے "ج" موجود ہوتی۔ لہٰذا نتیجہ نکلا کہ شے "ج" موجود نہیں ہے۔ جرمنی کا مشہور حکیم شاعر گوئٹے Goete کہتا ہے کہ اس عالم میں دو چیزوں کی عظمت میرے دل پر بہت رُعب و دہشت طاری کرتی ہے۔ اُوپر تو ستاروں والا آسمان، اور نیچے انسان کے اندر کا ضابطہ اخلاق۔ اگر غور کیا جائے، تو واقعی ان دو باتوں سے خدا کی ہستی اور اس کی عظمت جلالت کا نمایاں ثبوت ملتا ہے۔ تمام عالم میں انسان کے اندر اور انسان کے باہر، زمین پر اور آسمان پر، ایک عقل کل اور ذہن کامل کارفرما نظر آتا ہے۔ محض نیچر یا مادہ اس قابل نہیں کہ خود بخود اپنے تئیں ایک نظام میں جکڑ لے۔ ایسا، کہ پھر اِدھر سے اُدھر نہ ہو سکے۔ اس نظام کو دیکھتے ہوئے، اپنے معاملات پر غور کرتے ہوئے، ایک اٹل قاعدہ کو کارفرما پاتے ہوئے ہر ایک شخص کہے گا کہ اندریں صورت بارِ ثبوت اُس شخص کے ذمے ہے جو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ بے جان بے حس، بے عقل مادہ نے پیدا کیا، اور یہ سب کچھ اتفاقاً پیدا ہو گیا۔ یعنی محض یہ اتفاق تھا

کہ ایسا نظام قائم ہو گیا۔

لہذا بارِ ثبوت دہریوں کے اوپر ہوا کہ وہ ثابت کریں کہ اُن کے معتقدات صحیح ہیں۔ اس کے لیئے اُن کو مندرجہ ذیل امور ثابت کرنے ہوں گے:۔

۱۔ مادہ ازل سے موجود ہے۔

۲۔ مادہ میں خود بخود زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

۳۔ کائنات میں حرکت کیونکر پیدا ہوئی۔

۴۔ ایک ہی قسم کے مادہ سے مختلف الانواع اشیاء خود بخود پیدا ہو سکتی ہیں۔

۵۔ غیر عقل اور غیر حس مادہ میں سے عقل و حس و جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

۶۔ کیا عمل ارتقاء سے کیچڑ کے کیڑے سے انسان بن سکتا ہے۔

۷۔ کیا Brain (جسم والا دماغ) اور Mind (ذہن، قوت استقراء و استنباط) ایک ہی شے ہیں۔

۸۔ اگر نہیں تو ذہن و عقل کا ارتقاء کیوں کر ہوا۔ یعنی یہ انسان میں کیونکر پیدا ہو گئے۔

ہر ایک دہریئے کو خود تو ان باتوں کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کے علم پر انحصار کرتا ہے۔ وہ دوسرے کیسے شخص ہوں۔ یہ اُس کو انتخاب کرنا ہو گا۔ جو شرائط ہم نے اوپر اہلِ علم کی درج کی ہیں اُن کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ یہ ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آج کل دہریا ہونا بھی فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اور مذہب سے انکار علامت علم و ترقی کی سمجھی جاتی ہے جس طرح کہ عورتوں کا بے پردہ ہونا فیشن میں داخل ہو گیا ہے کسی خاندان کی عورتوں کا بے پردہ ہو کر مردوں میں ملنا اُس خاندان کی علامت ترقی سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہ Advanced ہیں۔ مذہبی اور علمی گفتگو میں سطحی لوگوں سے پرہیز لازم ہے۔

کیا دہریوں کو ان امور کا علم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کو علم نہیں ہے۔ ان کے اہل سائنس خود کہتے ہیں کہ ہمیں علم نہیں ہے۔ پھر دہریت کی بنیاد کیا رہی۔

ہمارے اس مضمون کے یہ پانچ عنوان ہوں گے:۔ مادہ، حرکتِ اوّلین،

Marfat.com

زندگی، ارتقاء، عقل۔

مادہ اور مادّیت

دہریت ایک غلط نظریہ کائنات ہے، لہٰذا باطل ہے۔ لیکن دنیا میں یہ اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان میں سوچنے اور سمجھنے کی اہمیت ہوئی۔ اور اُس کے ساتھ ور غلائے جانے اور دھوکہ میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔ یہ اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان نے آنکھ کھولی، اور حضرت آدمؑ شیطان کے بہکانے میں آ گئے۔ دنیا میں آن کر اس کا مظاہرہ قابیل کی غلطی اور ہابیل کے قتل سے ہوا۔ حق و باطل کی آویزش شروع ہوئی، اور یہ ہمیشہ رہے گی جب تک بنی نوع انسان اس دنیا میں ہے۔

دہریت کے فلسفہ یا مذہب کی بنا اس پر ہے کہ مادہ قدیم ہے۔ ہندو فلسفہ کا یہ پہلا گُر ہے۔ یونانی فلسفہ بھی یہ ہی کہتا ہے کہ مادہ حقیقت اوّل کے ساتھ قدیم ہے پتے ٹوئیاں تو بہت سی ماری ہیں، لیکن دہریت کبھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی کہ مادہ کیونکر پیدا ہوا۔ کس طرح وجود میں آیا۔ چونکہ وہ بے عقل شے ہے لہٰذا اُس کی نسبت یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھوٹ سکتا کہ وہ قدیم ہے، بتانا ہوگا کہ وہ کیونکر وجود میں آیا۔ صحیح یا غلط کچھ تو نظریہ قائم کریں۔ لیکن دہریئے حضرات ادھر توجہ ہی نہیں دیتے۔ یہ پہلا نقص ہے جو اس مذہب میں ہے۔ دہریت نے سائنس کے ساتھ مل کر یہ نظریہ قائم کیا کہ حقیقی شے (Substantial) وہ ہی ہے جو ہمارے حواس خمسہ سے محسوس ہو سکے۔ اگر ایسی نہیں، تو وہ غیر حقیقی اور بے اصل ہے۔ اور اس کو ماننا حماقت ہے۔ خدا سے انکار کرنے کا یہ پہلا اصل موضوعہ ہے۔ سائنس نے یہ کہہ کر دہریت کو تقویت دی تھی کہ مادہ غیر فانی ہے۔ کیونکہ اس کے آخری ایٹم کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دہریت کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط ثانی سے شروع ہوا۔ لیکن یہ عروج صرف ۵۰ یا ۶۰ سال رہا۔ کیونکہ بیسویں صدی کے شروع ہی سے سائنس نے اپنا نظریہ بدل دیا۔ اور کہا کہ وہ ہماری تھیوری غلط تھی۔ مادہ کا آخری ایٹم بھی قابل تقسیم ہے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ یورپ والوں کا قبضہ اور اثر ہندوستان پر اُس زمانہ

ہیں ہوا کہ جب مادہ کے غیر فانی ہونے کی تھیوری کا عروج تھا۔ اہل یورپ ہندوستان پر غالب ہو چکے تھے۔ مسلمانوں پر اس تھیوری کا بہت اثر ہوا۔ دنیا کے ظاہری غلبہ والوں کے ساتھ ہو جانا تو مسلمانوں کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں حق اور دنیاوی غلبہ آپس میں مترادف ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں نے اس مسئلہ پر اسلام کی روشنی میں کبھی غور ہی نہیں کیا۔ اور جب کبھی ان کے چند پڑھے لکھے آدمیوں نے اس پر غور بھی کیا، تو یونانی فلسفے کے زیر اثر غور کیا۔ خالص اسلامی فلسفہ تو یہ سمجھے ہی نہیں سمجھتے تو کب سمجھتے۔ ابھی رسولؐ خدا دفن بھی نہیں ہوئے تھے کہ یہ دنیا کے حصول کی طرف دوڑ پڑے، اور پھر باہر بھیج دیئے گئے۔ وہاں انہیں صدیوں کے پختہ فلسفوں سے سابقہ پڑا۔ مقابلہ تو ہو نہیں سکتا تھا، تقلید شروع ہو گئی۔ اور مقابلہ کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ انہوں نے اپنے کفر کا عکس ایران و یونان و مصر و ہندوستان کے فلسفے میں دیکھا۔ کفر سے جو پرانا عشق ان کو تھا، وہ پھر تازہ ہو گیا۔ مانی و مزدک کا فلسفہ ایرانی زرتشتی مذہب اور یونانی افلاطون وارسطو کے خیالات کا مجموعہ تھا جس میں مسیحیت کا بھی رنگ آ گیا تھا۔ ۱۵۸ھ ہجری تک یہ ہوا کہ ۸۰ فیصدی دل سے مانوی اور زبان سے محمدی تھے۔ یہی حالت اب ہوئی کہ روس کے کمیونزم اور سائنس کے ناقص علم کے زیر اثر تقریباً ننانوے فیصدی مسلمان دل سے دہریئے اور زبان سے مسلم ہیں۔ ان کا ہر قول و فعل بتاتا ہے، کہ یہ حیات بعد ممات، حشر و نشر، سزا و جزا، حساب و میزان پر اعتقاد نہیں رکھتے اور خدا کی ہستی سے عملاً منکر ہیں۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ دہریت کا یہ عروج ۵۰ یا ۶۰ سال ہی رہا۔ سائنس نے آگے ترقی کی، تو معلوم ہوا کہ ایٹم بھی قابل تقسیم ہے۔ Radiation یعنی نور کا ذرہ جس کو Photon کہتے ہیں اگر مادہ کے ایٹم سے تصادم کرے، تو وہ مادہ کے ایٹم کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ایک کو Electron اور دوسرے کو Proton کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں محض بجلی کی لہریں ہیں۔ نہ تو نظر آئیں اور نہ ان میں Substance ہے۔ مادہ کی جو دو بڑی شرطیں تھیں وہ غائب ہو گئیں، اور مادہ محض بجلی کی لہر رہ گیا۔ گویا مادہ فنا ہو گیا۔ مادہ کا یہ فنا ہونا یعنی Annihilation زمانۂ حال کے سائنس کا نہایت اہم انکشاف ہے۔ اس انکشاف سے بہت سے دور رس نتائج نکلتے ہیں جو زمانۂ حال کے علم طبیعیات کا

Marfat.com

بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُس نے پُرانے نظریات کو بالکل بدل کر سائنس طبیعیات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اب یہ نظریہ قائم ہوگیا ہے کہ کسی شے کا اصل اور واقعی ہونا اس پر منحصر نہیں ہے کہ وُہ ہاتھ سے چھوئی جائے یا حواس خمسہ سے محسوس کی جائے۔ یہ ہی روحانیت کی ابتدائی ہے۔ دیکھو (۸۹)

مادہ فنا ہوگیا۔ نہ ہستی رہی، نہ قدامت رہی اور نہ مادیت رہی۔ کوہِ ہمالیہ، کوہِ اولمپس، بحر اوقیانوس، صحرائے اعظم، ہاتھی، انسان، نباتات، معدنیات، سونا، چاندی، جواہرات، سُورج، ستارے یہ سب کیا ہیں۔ یہ بالکل غیر مادی چیزیں ہیں۔ صرف لہریں ہیں جو آپس میں مل کر جم گئی ہیں یا جمادی گئی ہیں۔ مادہ کو ان لوگوں نے خدا کے مقابلہ میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مادہ کی ہستی ہی گئی۔ اس کی قدامت بھی گئی، اور مادیت بھی گئی۔ سائنس کا موجودہ نظریہ کس قدر نظریہ کُنْ فَیَکُوْن کے نزدیک آ گیا۔ ارادۂ الٰہی یا مشیتِ الٰہی سے برقی لہر پیدا ہوئی، اور اُس سے یہ تمام عالم بن گیا۔

ایک سائنسدان کہتا ہے:

(ترجمہ) میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ اب سائنس کسی شے کی حقیقی موجودگی کے لیئے ضروری نہیں سمجھتا کہ وُہ مادی ہو۔ عرصہ ہُوا کہ مادیت مرگئی۔

اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۲۔

چونکہ دھریت کی ساری بنیاد مادیت پر ہے اور اس کی ساری بحث کا دار و مدار مادہ کے قدیم اور غیر فانی ہونے پر ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند اقتباسات یورپ و امریکہ کے مصنفین کی تحریرات کے پیش کریں جن سے بغیر کسی شبہ کے ثابت ہو جائے کہ مادہ کچھ نہیں۔ صرف نور ہے، برقی لہر ہے۔ در اصل مادہ فنا ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ مادیت بھی گئی۔

مزید بیانات ملاحظہ ہوں۔ یہ ترجمے ہیں۔ اصل کے لیئے ضمیمہ ۱۰ دیکھو۔

(89) The Mysterious Universe, pp. 35 to 39, 61, 62, 65,67, 68, 102. 133. Sir Arthur Eddington : The Nature of the Physical World, Chap. I (The Downfall of Classical Physics) C.E.M.Joad : Guide to Modern Thought pp. 18-21

Marfat.com

ترجمہ

ا۔ زمانۂ حال کے علم ہیئت کے مطابق یہ عظیم الشان کائنات نور (روشنی) کی بنی ہوئی ہے نہ کہ مادہ یا جسمانی شئے کی...... آج کل اس امر کے یقین کرنے کی وجہ ہے کہ جس کو ہم مادہ کہتے ہیں وُہ دراصل منجمد یا محدود اور بند کیا ہُوا نُور ہے۔

ب:۔ زمانۂ حال کے علم طبیعیات کا رجحان یہ ھے کہ تمام مادہ والی کائنات کا اگر تجزیہ کیا جاوے، تو یہ محض ایک لہر ہے، اور کچھ نہیں سوائے لہروں کے۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو حدود کے اندر بند کی ہوئی لہریں جن کو ہم مادہ کہتے ہیں، اور دوسرے آزاد لہریں جن کو ہم روشنی (نور) یا شعاع افشانی کہتے ہیں۔ اگر ہم مادہ کو معدوم کرنا چاہیں تو صرف یہ طریقہ ہوگا کہ بند کی ہوئی یا حدود میں گھری ہوئی لہری طاقت کو آزاد کر دیں تاکہ وُہ فضا میں پھیل کر آزاد پھر سکے۔ ان نظریات کی رو سے تمام کائنات محض نور یا شعاع افشانی کی دنیا ہے۔ یا اندرون میں مضمر ہے یا بظاہر موجود ہے۔

ج:۔ کائنات کو اب مادی نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو محض ذہنی ارادہ ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کائنات کا تصور یہ ہُوا کہ وُہ محض (کسی کے) ارادہ کا مظہر ہے۔ اگرچہ یہ نامکمل اور ناکافی بیان ہے۔ محض ارادہ یا تخیئل تو ہے۔ لیکن کس کا ارادہ ہمیں صحیح لفظ نہیں ملتا۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ کسی ریاضی دان ارادہ کرنے والی ہستی کا ارادہ۔

د:۔ یہ امر واقعہ کہ زمان و مکان دونوں محدود ہیں۔ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم عملِ تخلیق کو محض ارادہ کا عمل سمجھیں۔

ہ:۔ اب سے تیس سال پہلے ہم (اہلِ سائنس) نے خیال کیا تھا یا محض فرض کر لیا تھا کہ بس اب ہم بہت جلد اصل حقیقت کو معلوم کر لیں گے جو محض ایک مشین کے قسم کی ہو گی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ حقیقت ایسے ایٹموں کا ایک اتفاقیہ اجتماع ہوگا، جو بغیر کسی ترتیب اور قاعدہ کے آپس میں مل گئے تھے۔ اور وُہ ایٹم کچھ عرصہ تک اندھی اور لا یعنی قوتوں کے زیرِ اثر اُچھل کُود کر پھر مُردہ ہو جائیں گے۔ اور دُنیا مُردہ بن جائے گی۔ اس بالکل مشینی دنیا میں ان ہی اندھی اور لا یعنی قوتوں کے زیر اثر کسی طرح اتفاقیہ طور سے حیات پیدا ہو گئی۔ اس کائنات کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں یا ایسے کئی گوشوں

میں یہ ایٹم اتفاقاً کسی وجہ سے صاحبِ احساس ہو گئے۔ اور آخرکار یہ ان کی اندھی اور عبث قوتوں کے زیر اثر مُردہ ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور ایک بغیر زندگی والی دُنیا رہ جائے گی۔ لیکن اب یہ نظریات متروک ہو گئے ہیں۔ اور آج تمام اہلِ سائنس کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اب ہماری معلومات ایک غیر مرئی اور غیر مادی حقیقت کی طرف جا رہی ہیں۔ اب ہماری تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ کائنات ایک عظیم الشان ارادہ یا خیال ہے۔ مشین نہیں ہے۔ نفسِ انسانی یا عقل محض اتفاقاً مادی دُنیا میں نہیں آگئی۔ بلکہ اب ہم کو خیال ہونے لگا ہے کہ ہم کو چاہیئے کہ اس نفس یا عقل (Mind) کو مادہ کا خالق اور حاکم سمجھیں۔ ہمارے انفرادی نفس یا عقل کو نہیں۔ بلکہ اُس محیط عالمیان عقل کو خالق اور حاکم سمجھیں۔ جس میں وُہ تمام اجزاء یا ایٹم ہیں۔ جن سے ہماری انفرادی عقل نکلی ہے۔

یہ جدید علم ہم کو جو حاصل ہُوا ہے وُہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے ان پہلے خیالات کی تصحیح اور نظرثانی کریں۔ جن کی رُو سے ہم سمجھتے تھے کہ ہم اتفاق ایک ایسی دنیا میں آگئے ہیں جو یا تو زندگی کی طرف ملتفت نہ تھی یا شاید اُس کے بالکل مخالف تھی۔ وُہ پرانا روح و مادہ کی ثانویت کا نظریہ جو اس دُنیا یا حیات کی دشمنی کے اعتقاد کا ذمّہ وار تھا، اب معدوم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مادہ پہلے کی نسبت زیادہ، غیر حقیقی ہو گیا ہے یا نفس مادہ کا ایک آلۂ کار ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خود مادہ عقل کا مخلوق و مظہر ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ نظام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اُس کو ترتیب دینے والی اور قابو میں رکھنے والی کوئی طاقت ہے جس میں کچھ مشابہت ہمارے نفس (Mind) کی سی پائی جاتی ہے۔ اور جہاں تک ہم معلوم کر سکے ہیں وہ طاقت جذبہ اخلاق عمل یا ذوق جمال نہیں ہے۔ بلکہ ایک طاقت ہے جس کو بیان کرنے کے لیئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملتا، کہ وُہ صحیح ریاضی کے طریقہ پر غور کرنے والی طاقت ہے۔

(آخر میں سائنس کی تحقیقات کے بیان کرنے کے بعد یہ سائنس دان کہتا ہے :-)

اب ہم اپنے بیان کو ختم کرتے وقت اتنا اور اضافہ کرتے ہیں جو پہلی تحریرات سے بھی اچھی طرح واضح ہے کہ ہر ایک سائنسی نظریہ محض مزید غور کے لیئے تذبذب کے ساتھ

پیش کیا گیا ہے اور وُہ محض قیاسی اور غیر یقینی ہے۔

اس کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۴ (ختم ہوئے تراجم)

اس مضمون پر سینکڑوں اقتباسات یوروپین اہلِ سائنس کے پیش کیئے جا سکتے ہیں ایک اور سائنسدان کہتا ہے:۔

تراجم

ف:۔ یہ خاص طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا علمِ طبیعیات روحانیت کی حمایت کرتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے۔ بلکہ واقعی مطالبہ کرتا ہے کہ تمام کائنات کو مذہبی رنگ سے دیکھنا چاہیئے۔

ز:۔ لہٰذا اب ان لوگوں کے لیئے جو علم طبیعیات کے نتائج کو قبول کرتے ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ وُہ اپنی فطرت کے اخلاقی اور رُوحانی جذبات کو ذاتی دھوکہ کہیں جیسا کہ وُہ پہلے کہا کرتے تھے۔ اور اُنیسویں صدی عیسوی میں جو مذہب اور سائنس کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی تھی، وُہ اب بھرتی جا رہی ہے۔

ح:۔ آج مادہ کا یہ تصور کہ وُہ سخت اور آنکھوں سے دیکھے جانے والی شئے ہے، بالکل جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادہ کی خاصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ایک برقی رو ہے یا ایک لہر ہے جس کی موجودگی ممکن تصور کر لی گئی ہے۔ اور وُہ چلتے چلتے آخر معدوم ہو جاتی ہے۔

اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۵ (ختم ہوئے ترجمے)

اقتباسات مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ سائنس کی صدیوں کی کاوش اور تحقیقات کے نتائج یہ ہیں:۔

۱۔ مادہ میں مادیت نہیں ہے۔ یہ نہ قدیم ہے اور نہ غیر فانی۔ بلکہ نور یا برقی لہر ہے۔

۲۔ کائنات خود بخود ذرات کے آپس میں ملنے سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ صاحب عقل و قدرت ہستی کے ایک عظیم الشان ارادہ کا نتیجہ ہے۔

۳۔ وُہ ذاتِ حق یا حقیقت جس نے دنیا کو پیدا کیا، مادی جسم والی نہیں ہے۔

Marfat.com

کسی خاص جگہ میں محدود نہیں۔ آنکھوں سے دیکھی نہیں جاسکتی۔ وہ ایک روحانی ذات ہے جو سب جگہ ہے، اور سب کو محیط کیئے ہوئے ہے۔

۴۔ وُہ ہی ساری کائنات کا انتظام کرتی ہے۔

۵۔ تمام کائنات اُس کی قدرت کے اندر ہے۔

۶۔ تمام کائنات ایک عظیم الشان ارادہ کا نتیجہ ہے۔

حرکتِ اوّلین

تخلیقِ کائنات کے متعلق علم الاصنام اور علم الاوثان میں بہت سی قیاس آرائیاں ہوئیں۔ ان کا ذکر ہم اُن کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ کسی نے کہا کہ خدا کے سر میں سے نکلی۔ کسی نے پیر میں سے نکالا۔ تعجب ہے کہ جہاں سے اُن لوگوں نے انسانوں کو اپنے سامنے نکلتے ہوئے دیکھا اپنے خدا کے اُس عضو میں سے کائنات کو نہ نکالا۔ فلسفہ نے بھی اس پر قیاس آرائی کی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ پہلے ذرات موجود تھے فضائے عالم ان ذرات سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے آپس کے ملنے اور علیحدہ ہونے سے یہ کائنات بنی ہے۔ لیکن وُہ فلسفہ یہ بتانے سے مطلقاً قاصر رہا کہ یہ حرکت جس نے وصل و فصل پیدا کیا، کہاں سے آئی۔ اس حرکتِ اوّلین کا باعث کیا تھا۔ زمانۂ حال کے سائنس نے بھی اس پر قیاس آرائی کی۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ تمام مادہ محض بجلی کی لہروں کے اجتماع اور انجماد کا نتیجہ ہے، تو اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ:۔

> پہلے ایک Primaeval Chaos تھا جب کہ تمام کائناتیں جواب تک معلوم ہوئی ہیں اور ابھی تک معلوم نہیں ہوئیں، ایک Gas کی صورت میں تھیں۔ پھر یہ گیس اپنی اندرونی حرکت کی وجہ سے جمنے لگی، اور بڑے بڑے گولے چکر لگانے لگے۔ اس چکر لگانے کو یہ لوگ Rotation کہتے ہیں۔ اور گولے اپنی اندرونی کشش ثقل کی وجہ سے جمنے لگے۔ اور اس انجماد کا نتیجہ متفرق ستارے اور سیارے ہیں جن میں ہماری دنیا شامل ہے۔ لیکن حرکت گولائی اُن میں باقی ہے اور باقی رہے گی۔ اور یہ ہی اُن کی حیات کا باعث ہے۔ اور آخر میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ محض اٹکل ہے۔ ممکن ہے ایسا

Marfat.com

ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ (۹۰)

دیکھئے وہی بات آگئی کہ ہم کو یقینی علم نہیں ہے"۔ دوسری بات جو وہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ چکری حرکت Rotation اُس وقت ہی ممکن ہو سکتی ہے کہ سب چکر لگانے والی شئے گیس ہو یا پانی۔ کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔ ناظرین اس بات کو ذہن میں رکھیں کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا خطبہ جو تخلیق کائنات کے متعلق ہے اور نہج البلاغۃ کا پہلا ہی خطبہ ہے، اُس کے سمجھنے میں یہ بات مدد دے گی۔

زمانہ حال کے سائنس میں کشش ثقل Gravitation کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ان تمام کائناتوں کے ستارے اور سیارے فضا میں اس کشش ہی کی وجہ سے اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ کشش نہ ہو تو درہم برہم ہو جائے۔ اس کشش کی رفتار ایک مقررہ راستہ پر اس وقت ہی قائم رہ سکتی ہے کہ اگر ایک دوسرے سے کشش کرنے والے اجسام ہمیشہ اُسی وزن کے رہیں جو اس رفتار کے وقت اُن کا وزن تھا۔ اگر وزن کم و بیش ہوا، تو کشش کے توازن میں فرق پڑ جائے گا۔ اور اگر کشش کے توازن میں فرق پڑا، تو اُن کا پہلا مقررہ راستہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ سب کچھ ان کے اجسام کے وزن یا Mass پر منحصر ہے۔ (۹۱)۔ اب اپنے نظامِ شمسی کو لو۔ یہ ثابت ہے کہ سورج کا جسم یا وزن یا Mass ہر سیکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن کم ہو رہا ہے۔ (۹۲)۔ زمین کی عمر تین ارب سال کم سے کم بیان کی جاتی ہے سورج کی عمر اس سے بہت زیادہ ہے۔ ایک سیکنڈ میں ۴۰ لاکھ ٹن سورج کا جسم کم ہوا۔ اور اتنے عرصہ سے کم ہو رہا ہے۔ اب تک تو کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو کچھ وزن کم ہو رہا ہے، بالکل اُتنا ہی ہر سکنڈ

(90) Sir James Jeans : The Universe Around Us Chapt. V, pp. 210-236

(91) The Universe Around Us, p. 39

(92) The Universe Around Us, p. 159.

میں بڑھ رہا ہے۔ وُہ کہاں سے بڑھ رہا ہے؟ یعنی یہ کمی کہاں سے پُوری ہو رہی ہے؟ اہل سائنس کہتے ہیں کہ کچھ سُورج کے اندر خزانہ ہو گا جس میں سے اُس کا وزن و جسم جو بشکل نور (Radiation) ختم ہو رہا ہے، پُورا ہو تا ہے۔ لیکن اہل سائنس کو نہیں معلوم کہ کہاں سے اور کس طرح یہ کمی پُوری ہو رہی ہے (۹۳) یہ تو ان لوگوں کے علم کی حالت ہے۔ اور دعوے اتنا کہ رموز کائنات ہم محض اپنی عقل سے معلوم کریں گے۔ بات وہی ہے: ما لھم بذالك من علم، ان ھم الا یظنون۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جو کمی ہر سیکنڈ میں ہو رہی ہے وہ اسیوقت پُوری ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ادھر وزن جسم میں کمی ہوئی، اُدھر نظام کشش بگڑا۔ اور ساری کائنات درہم ہوئی۔ ان کو تو خبر نہیں یہ کیونکر ہوتا ہے۔ کیا پھر بھی قرآن شریف کے اس دعوے کو نہ مانیں گے کہ:

"وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۸، ۴۰)

حیات

قرآن شریف میں موت وحیات کے خالق کا ذکر اس طرح ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ؗ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝ نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ ۴ (الملک ۶۷ : ۱ تا ۴)

ترجمہ: برکت والا ہے وہ خدا جس کے قبضہ میں تمام جہان کی

---

(۹۳) (93) The Universe Around Us, pp. 157-58

بادشاہت ہے۔ اور وُہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی، تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں بہتر ہے۔ اور وُہ ہی زبردست اور سب سے زیادہ بخشنے والا ہے جس نے سات آسمانوں کو اُوپر تلے پیدا کیا۔ تم خدائے رحمان کی آفرینش میں کوئی نقص نہ پاؤ گے۔ پھر نظر ڈال کر دیکھو آیا تم کوئی خلل دیکھتے ہو پھر بار بار نظر ڈالو۔ وُہ نظر تمہاری طرف تھک کر ذلیل ہو کر لوٹ آئے گی۔

اسلام نے بغیر کسی تذبذب اور شبہ کے بتا دیا کہ موت و حیات کو خداوند تعالےٰ نے پیدا کیا جن اسباب سے موت واقع ہوتی ہے اُنکو بھی خدا نے پیدا کیا اور جن اسباب سے حیات پیدا ہوتی ہے اُنکو بھی خدا نے ہی پیدا کیا۔ وُہ خدا ایسا قدرت والا ہے کہ تمام کائنات کی بادشاہت اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اور سب اسباب و واقعات اُس کے زیرِ حکم اور اُس کی اجازت سے کام کر رہے ہیں۔ اُس کی مخلوقات اور مصنوعات میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اپنی نظر چاروں طرف دوڑاؤ، خُوب غور کرو، کہیں نقص و فطور نہ پاؤ گے۔ یہ بہت بڑا دعوےٰ ہے اور دہریت کے لیئے قاطع جواب ہے۔ دہریت تو ابھی سمجھ ہی نہیں سکی ہے، نقص کیا نکالے گی۔ سائنس کی ساری کوشش قوانینِ قدرت کے معلوم کرنے کے لیئے ہوتی ہے۔ اور اُس میں بھی پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جب یہ حالت ہے تو وُہ نقص کیا نکالیں گے۔ اگر بے عقل اور بے حس مادہ کی لا یعنی حرکت کا نتیجہ ہوتا، تو ضرور اس میں نقص ہوتا۔ یہ سارا نظام جس میں نہ نقص ہے اور نہ کوئی بے جا معارضہ و اختلاف اس امر کا مقتضی ہے کہ وُہ کسی ایک ذات کے تابع ہو۔ اُس کی بادشاہت میں ہو۔ اُس کے کہنے پر اور اُس کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ ورنہ اگر کائنات کو کوئی قابو میں رکھنے والا نہیں ہوتا تو سارا شیرازہ فوراً درہم و برہم ہو جاتا۔ یہی مطلب تھا حضرت ابراہیمؑ کا جب اُنہوں نے کافر سے کہا تھا کہ میرا خدا سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تیرا تصرف ہے یا یہ بالکل اتفاق ہے، تو تُو اُسے کو مغرب سے نکال کر دکھا۔ یا اتفاق تو چاروں طرف کا ہو سکتا ہے، مشرق ہی سے کیوں نکلا کرے۔

منکرین خدا کہتے ہیں کہ ہم کو دھر ہی پیدا کرتا ہے اور دھر ہی مار ڈالتا ہے۔

اچھا۔ اب وُہ آئیں اور ہمیں بتائیں کہ دھر اُن کو کس طرح پیدا کرتا ہے۔ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بے عقل و بے حس شے کس طرح ایک با عقل صاحب جذبات ہستی کو پیدا کر دے گی۔ جو شے اُس میں خود نہیں ہے، وُہ دوسرے کو کس طرح دے دیگی۔

اہل سائنس ابتداء سے کوشش کر رہے ہیں کہ معلوم کر سکیں کہ کائنات میں حیات کیونکر آئی۔ لیکن وُہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اور اب اُنہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ وُہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اُنہوں نے کئی نظریات قائم کیئے۔ آخری نظریہ یہ تھا کہ ایک Molecule کے ایٹموں کی خاص تعداد اور تناسب میں Carbon کا Atom ملنے سے حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح پیدا ہوئی ہوگی۔ اُن کے اس گمان کی بُنیاد یہ تھی کہ Living Cell میں یہ ایٹم اسی طرح واقعہ ہیں۔ اس تھیوری کو اُنہوں نے اس طرح بیان کیا تھا:-

ترجمہ: (الف)۔ (کاربن والی تھیوری بیان کرنے کے بعد مصنف کہتا ہے کہ) اگر یہ اسی طرح ہے تو نتیجہ نکلا کہ کائنات میں حیات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کاربن کے ایٹم میں کچھ غیر معمولی خاصیتیں ہیں۔ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ کاربن ایک ایسی شے ہے جو دھات اور غیر دھات کے درمیان درمیان ہے۔ لیکن اب تک کاربن کے ایٹم میں کوئی ایسی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی ہے کہ جس سے اُس کی اس خاصیت کی توجیہ ہو سکے جو اس میں دوسرے ایٹموں کو باہم بندش میں رکھنے کی ہے۔ کاربن کے ایٹم میں چھ الیکٹرون ہوتے ہیں جو ایک درمیانی مرکز کے ارد گرد اسی طرح چکر لگاتے رہتے ہیں جس طرح چھ سیارے مرکزی سُورج کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے کیمیکل عناصر کی فہرست میں کاربن اپنے دو نزدیک ترین ہمسایوں، بورن اور نائیٹروجن سے صرف اتنا مختلف ہے کہ اس میں بورن سے ایک زیادہ الیکٹرون ہے اور نائیٹروجن سے ایک کم ہے اب اس ہی ذرا سے اختلاف سے حیات اور غیر حیات کا عظیم الشان فرق ثابت ہو جانا چاہیئے۔ بلاشبہ یہ وجہ کہ چھ الیکٹرون والے ایٹم میں یہ عجیب و غریب

Marfat.com

خاصیتیں کیوں ہیں۔ اسرار قدرت میں تلاش کرنی چاہیئے۔ ریاضی پر منحصر طبیعیات تو اب تک یہ وجہ نہیں معلوم کر سکی ہے۔

(ب) دوسرے الفاظ میں۔ کیا حیات (Life Cell) صرف معمولی ایٹموں کا غیر معمولی طریقہ سے مرتب کیا ہوا اجتماع ہے؟ یا کیا وہ اس سے کچھ اور زیادہ ہے؟ کیا وہ صرف ایٹم ہیں یا ایٹم جمع زندگی ہیں؟ یا بالفاظ دیگر کیا کوئی ہشیار کیمسٹ چند ایٹموں کو جمع کر کے زندگی پیدا کر سکتا ہے جس طرح کہ ایک لڑکا مکا سے مشین بنا کر اُسے چلا دیتا ہے۔ ہمیں ان سوالات کا جواب نہیں معلوم۔

(ختم ہوا ترجمہ) اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۷

اس ہی عدد ۶ کی اس طلسمی خاصیت کو ایک اور سائینسدان اس طرح بیان کرتا ہے:۔

ترجمہ:۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ حیاتیہ میں چھ کا عدد ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس امر واقعہ کو کس طرح واضح کیا جائے کہ کائنات میں حیات نہ ہوتی اگر قدرت نے ۶ کے عدد کو نظر انداز کر دیا ہوتا۔ (اصل ضمیمہ ۸)

لیکن یہ نظریہ بھی آخر کار غلط ثابت ہؤا۔ اب آخری فیصلہ اُن کا یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ دنیا میں حیات کس طرح نمودار ہوئی۔ دیکھو (۹۴) اور اب وہ اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ ہم اہل مذہب کے خدا کا انکار نہیں کر سکتے (۹۵)

ترجمہ:۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس بے جان دنیا میں حیات کیونکر شروع ہوئی۔ یہ تو کائنات کے بڑے لاینحل تعجبات میں سے ایک تعجب ہے کہ دُنیا جو ابتداء میں محض بے جان میدان تھی۔ کیونکر ایسی چہل پہل والی جگہ بن سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیات کس طرح شروع ہوئی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کہاں شروع ہوئی۔ وہ سمندر میں شروع ہوئی۔

(94) Mysterious Universe pp. 7, 8 The Universe Around Us, p. 283 The Golden Book of Knowledge Vol. 1, p. 22

(95) Sir Arthur Eddington : The Nature of the Physical World pp. 192, 272, 304, 310, 311, 320, 335 The Mysterious Universe, pp. 111, 137

Marfat.com

(اصل ضمیمہ ۹)

Science is not yet in contact with ultimate reality.

The Mysterious Universe p. 111

ترجمہ :- سائنس کو ابھی آخری و قطعی حقیقت نہیں معلوم۔

ارتقاء EVOLUTION

دہریت کی یہ بہت بڑی بحث ہے کہ کوئی مذہب الہامی نہیں ہے۔ بلکہ بنی نوع انسان بتدریج وحدانیت کے تخیل تک پہنچی ہے۔ اپنی بحث کی تائید میں وُہ ان ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو پیش کرتے ہیں جب پتھر، درخت، جانور کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ وُہ کہتے ہیں کہ مذہب کی ابتداء خوف سے ہوئی نہ کہ الہام سے۔ جس چیز سے ڈر لگا اُس ہی کو خدا سمجھنے لگے۔ جسمانی صورت میں بھی انسان اس شکل تک قانون ارتقاء سے پہنچا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد بندر تھے۔ اب بندروں کی تھیوری کو چھوڑ کر کہا جاتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بحری جانور تھے۔

اتنا تو ثابت ہے کہ کچھ قومیں ایسی گزری ہیں، جو اپنی تاریخ کے کسی دور میں ارواح خبیثہ کا اعتقاد رکھتی تھیں۔ اور اپنے خداؤں کو جانوروں کی سی شکلیں دیتی تھیں اور ایسی اقوام دُور اُفتادہ مقامات میں اب بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تو یقینی ہے۔ اس کے بعد جو ہے وُہ قیاس ہے۔ جس کی بناء پر آج کل کے لوگوں نے ازمنہ سابقہ کی اقوام کی تاریخیں لکھی ہیں۔ واقعات کو قیاسات سے ملا کر ایک مسلسل بیان بنا لیا ہے۔ تاریخ بنانی تو ضرور تھی۔ اور مواد کچھ زیادہ ملتا نہ تھا، لہٰذا قیاس ہی کو کام میں لانا پڑا۔ اس ہی اصول پر اُنھوں نے پرانے زمانے کے لوگوں کے واقعات کی تاریخ لکھی ہے، اور اس ہی اصول پر اُن کے مذہب کی تاریخ لکھی گئی۔ چونکہ کسی زمانہ میں ان لوگوں نے اُن کے خداؤں کو جانوروں کی شکل میں پایا، تو نتیجہ نکالا کہ ابتداء ان کی عبادت کی جانوروں سے ہوئی۔ یہ قیاس ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ نتیجہ غلط ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جانوروں کی صورت کی ابتداء اوتار کے تخیل سے ہو۔ جن اقوام میں جانوروں اور بتوں کی صورت میں خدا ملتے ہیں، اُن اقوام میں اوتا

Incarnation کا تخئیل بھی تو ساتھ ساتھ تھا۔ دریائے نیل وگنگا وجمنا کے متعلق بھی تو یہ ہی کہا جاتا ہے کہ پہلے وُہ دیویاں تھیں۔ اب ایک واقعہ کی وجہ سے جو بتایا جاتا ہے وُہ روتے روتے دریا بن گئیں۔ کسی ہمراغرساں نے کسی طرح رامچندرجی کو لنکا پہنچایا۔ ان کی سمجھ میں یہ تو نہ آیا کہ کس طرح پہنچایا تھا۔ سمجھنے لگے کہ وُہ ہنومان ہی تھے جنہوں نے اپنی دُم پر رام چندرجی اور اُن کے سارے لشکر کو پار اُتارا۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ اُن لوگوں نے ان جانوروں کو اپنا خدا نہیں سمجھا بلکہ اپنے خداؤں کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ اُنہوں نے ان جانوروں کا اوتار لیا ہے۔ کون ہے خواہ کتنا ہی وحشی کیوں نہ ہو، جس کے دل میں خدا کا تخئیل موجود ہے وُہ چُوہے، بلی، کتے، درخت، پتھر یا دریا کو اپنا خدا سمجھے گا۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہی ہے کہ اوتار یا حلول کے غلط تخئیل نے ان لوگوں کو اس جال میں پھنسادیا۔ دیکھئیے ویدوں میں تو اصلی اور واحد خدا کا تخئیل موجود ہے۔ زرتشت کی کتھا میں سوائے وحدانیت کے اور کچھ نہیں۔ لیکن مرورِ ایام سے ویدوں کے خداؤں کی جگہ بُت آگئے اور کتھا کے خدا کی جگہ آگ آگئی۔ یہ اگر ارتقاء تھا تو اُلٹا ارتقاء تھا۔ اور یہ ہو نہیں ہوسکتا۔ اوتار کا تخئیل اتنا فضا میں پھیلا ہوُا تھا، کہ مسیحیت جیسا الہامی مذہب بھی اُس تخئیل سے نہ بچ سکا۔ اور جب اپنی اصلی کتاب کی جگہ جو گُم ہو چکی تھی دوسری کتاب اپنے تخئیل سے لکھنے لگے تو اُس میں لکھ دیا کہ" عیسٰے انسان بھی ہیں اور خدا بھی۔

جب اوتار کے تخئیل سے وُہ لوگ نہ بچ سکے جو الہامی تعلیم کے نزدیک تھے تو وہ کیسے بچتے جو اُس سے بہت دور جا پڑے تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب خداوند تعالےٰ نے انسان کو زیورِ عقل سے آراستہ کرکے اس دنیا میں بھیجا تو عقل کو صحیح راستے پر رکھنے کے لیئے ساتھ ساتھ ہی اپنے پیغمبروں کو بھیج دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے ساتھ تمہارا سب سے بڑا دشمن شیطان لگا ہوُا ہے اس سے بچتے رہنا۔ بہت جلدی شیطان نے قابیل کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب دُنیا میں دو طاقتیں ساتھ ساتھ متوازی راستوں پر چلیں۔ قابیلی طاقت اور ہابیلی طاقت۔ جو انبیاء کی تعلیم کے علم کے نیچے رہے، وُہ ہابیلی قدرت کے زیرِ اثر موحد رہے۔ جو انبیاء کی تعلیم سے بھٹک گئے، وُہ قابیلی طاقت کے زیرِ اثر

Marfat.com

اوتار کو ماننے لگے۔ خدا کے وہ بھی قائل رہے، لیکن اُس کی صفات کے منکر ہو گئے۔

تعلیم انبیاء سے اعراض کرنے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک تو خود غرضی اور دوسرے قیاس۔ تعلیمِ انبیاء میں ہمیشہ آخرکار نتیجہ مدِ نظر رہا۔ اور آخری نتیجے کیلئے موجودہ راحت و فائدہ کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی۔ خود غرضی نے موجودہ راحت آسائش کو ترک کرنا حماقت سمجھا۔ اور قیاس نے اس کوتاہ نظری کی تائید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمِ انبیاء سے ہٹ کر اُنہوں نے اپنا ایک علیحدہ مذہب قائم کر لیا۔ یہ وہ علیحدہ مذہب ہے جس پر دہریت قانونِ ارتقاء حاوی کر رہی ہے۔ ہم فلسفۂ یونان اور مذاہب عالم کے بیانات میں ہر جگہ جتاتے رہے ہیں کہ کہاں کہاں اور کس کس اقوال میں تعلیمِ انبیاء کا اثر نمایاں ہے۔ بابلی مذاہب کے حمورابی اور مصری مذہب کے اخناطون کے حالات میں یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کی توحید کتنی اعلےٰ درجہ کی ہے۔ حضرت عیسےٰؑ سے سینکڑوں برس پہلے یہ توحید کا ارتقاء کیسا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں ساتویں صدی عیسوی میں تو بت پرستی کا یہ عروج، اور حضرت عیسےٰؑ سے کئی ہزار برس پہلے یہ توحید۔ یہ کیسا ارتقاء ہوا؟ اگر قانونِ ارتقاء ہوتا تو آنحضرتؐ کے زمانہ تک تو بُت پرستی اور شرک غائب ہو چکے ہوتے اور توحید بہت اعلےٰ و ارفع قسم کی ہو چکی ہوتی۔ اگر الہام نہیں اور ارتقاء ہی ارتقا ہے تو ارتقا ایک جگہ تو نہیں ٹھہرتا۔ توحید پر ان بہر کیوں ٹھہر گیا۔ کیا توحید سے اعلےٰ درجہ دہریت ہے؟ لیکن دہریت تو اتنی ہی پُرانی ہے جتنی توحید۔ قرآن شریف بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے ایک دھریئے اور نیچری ہی نے تو بحث کی تھی۔ علاوہ اس کے توحید مذہب ہے اور دہریت مذہب نہیں ہے، نوع ہی مختلف ہے۔ بہر صورت قانونِ ارتقاء یہاں بھی حاوی نہ ہوا۔ اور بات یہی ہے۔ ارتقاء یا Evolution میں رجعتِ قہقری نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ترقی کر کے پھر سابقہ حالت پر عُود کر جائے۔ اہلِ سائنس اس کو ممکن نہیں سمجھتے کہ مثلاً اُونٹ آگے ترقی کر کے پھر اژدہا بن جائے۔ اگر ایسا ہو، تو دنیا میں پھر اژدہوں اور رینگنے والے جانوروں کا راج ہو جائے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا میں جو حمورابی اور اخناطون، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ کی توحید تھی۔ اُس کے بعد دماغ انسانی بُت پرستی

Marfat.com

کی طرف رائع ہو گیا۔ رجعت قہقری انفرادی Acquisition میں ہو سکتی ہے۔ میں نے آج ایک علم حاصل کر لیا اور کل بھول گیا۔ آج نیک اور موحد بن گیا کل خیال آیا، کہ یہ تو فائدہ مند چیز نہیں۔ دو مہینہ کے بعد پھر صنم پرستی کی طرف چلا گیا۔ لیکن Evolution میں رجعت قہقری ناممکن ہے۔ ذہنی ارتقاء پر وُہ ہی اصول حاوی ہوں گے جو جسمانی ارتقاء پر۔ کیونکہ دہریت کے مطابق روح کوئی شئے نہیں ہے ذہنی ارتقاء یعنی Mind منحصر ہوا جسمانی ارتقاء یعنی Brain پر، اور Brain مادی جسم ہے۔ لہذا Mind ساتھ ساتھ چلے گا Brain کے۔ اور جب Brain درجہ توحید پر پہنچ گیا تو Mind بھی پہنچ گیا۔ اب Brain کے لیئے رجعتِ قہقری ممکن نہیں لہذا Mind کے لئے بھی رجعتِ قہقری نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ تخیل توحید بذریعہ ارتقاء نہیں پیدا ہوا بلکہ بذریعہ الہام حاصل ہوا۔

اب دہریت پلٹا کھاتی ہے۔ کہتی ہے کہ بروئے مذہب تو انسان کو دنیا پر آئے ہوئے تقریباً چھ ہزار سال ہوئے۔ اور انکشافاتِ ارضی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمین پر کروڑوں برس سے ہے۔ لہذا بروئے مذہب تعلیم انبیاء زمین پر چھ ہزار برس سے پہلے نہ تھی۔ اور انسان کروڑوں برس سے ہیں تو ان چھ ہزار برس پہلے کے آدمی بغیر تعلیم انبیاء کے رہے۔ خدا نے پہلے کیوں نہ انسان کی ھدایت کی۔

اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسیحیت ضرور انبیاء کی ابتداء کو اب سے چھ ہزار برس پہلے کی بتاتی ہے۔ لیکن قرآن یہ نہیں کہتا۔ اس میں نہ تو الہام کے زمانہ کی ابتداء کے سال بتائے گئے ہیں، اور نہ دُنیا پر انسان کی آبادی کو چھ ہزار سال میں بند کیا ہے۔ بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ بہت سے بشیر و نذیر و انبیاء گزرے ہیں جن کا ھم نے ذکر نہیں کیا، اور اُن کا نام نہیں بتایا۔ لہذا ہم اتنا ہی کہہ کر ختم کر سکتے ہیں کہ ہم کو اس چھ ہزار سال کی قید سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن جب بات نکل آئی، تو اُس کو پُورا ھی کر دیں۔

اہلِ بائیبل اپنی کتاب سے حضرت آدمؑ سے آج (۱۹۵۶ء) تک ۵۹۸۴ سال بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت آدمؑ کے دنیا میں آنے کے ۱۶۵۶ سال کے

بعد طوفان نوحؑ آیا۔ اور طوفان نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ کی بعثت تک ۷۲۴ سال ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۱۹۴۵ سال قبل مسیح تھا۔ اس طرح حضرت آدمؑ سے حضرت عیسٰیؑ تک ۴۰۲۸ سال ہوئے۔ دیکھو (۹۶)

اہلِ سائنس اور مورخین تہذیب کی ابتداء تو اب سے تقریباً چھ ہزار سال ہی پہلے بتاتے ہیں۔ اس سے پہلے اُن کے خیال میں آدمی تو تھے، لیکن وُہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ وُہ کہتے ہیں کہ دنیا کو بنے ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ سال ہوئے۔ دنیا میں زندگی کی ابتداء کو ۳۰۰۰۰۰۰۰۰ سال ہوئے۔ انسان کو دنیا میں پیدا ہوئے تین لاکھ سال ہوئے۔ اور تہذیب کو شروع ہوئے ۶۰۰۰ سال ہوئے۔ دیکھو (۹۷)

پادریوں اور اہلِ سائنس و تاریخ کا یہ اہم تنازعہ ہے۔ سائنس دانوں کے نظریہ کے متعلق اہلِ بائیبل یہ کہتے ہیں:۔

ترجمہ:۔ خداوند تعالٰے کے کلمۂ حق سے معلمینِ سائنس کی حماقت ظاہر ہے جو کہتے ہیں کہ انسان اس زمین پر اپنی اسی مکمل حالت میں لاکھوں برس سے ہے۔ لیکن اس زمانہ کی صحیح مقدار کے متعلق خود اہلِ سائنس کا آپس میں اتفاق نہیں ہے۔

اصل ضمیمہ ہذا (ترجمہ ختم ہوا)۔ (۹۸)

ڈارون کے اصولِ ارتقاء پر اعتماد کرکے بعض اہلِ سائنس یہ کہتے ہیں کہ بندر کا جسمانی اور دماغی ارتقاء بتدریج ہو کر انسان بنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ مذہب جو کہتے ہیں کہ انسان اپنی موجودہ صورت اور حالت ہی میں زمین پر ڈالا گیا ہے، غلط ہے۔ لیکن سائنس کا یہ نظریہ ثبوت کے اُس درجہ تک نہیں پہنچا جس سے یقین پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی تھیوری کی بنا صرف یہ ہے کہ پُرانے ڈھانچے، کھوپڑی اور جسم کے جو پائے گئے

(96) The Truth shall make you Free, published by Watch Tower Bible and Tract Society, pp. 150-52.

(97) The Universe Around Us, p. 13, Toynbee's History, Vol. I, pp. 173-4

(98) The Truth Shall Make You Free, p. 146

ہیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ آدمی کے ہیں۔ اور فلاں فلاں علامات سے یہ پایا جاتا ہے کہ وُہ اتنے سال کے ہیں۔ لیکن ان ڈھانچوں سے موجودہ بنی نوع انسان کی قدامت کا نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وُہ ایسی مخلوق کے ہوں جن کے جسم آدمیوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ مثلاً اگر آج کے ہرن اور بکری کے ڈھانچے اب سے دس ہزار سال بعد ملیں تو اُن سے نتیجہ نکالنا کہ یہ دونوں بکرے کے ہیں یا ہرن کے ہیں، غلط ہوگا۔ ڈارون کی یہ تھیوری خود اہلِ سائنس میں شک کی نظر سے دیکھی جا رہی ہے۔ اور ان میں ایک جماعت ہے جس کا اتفاق اس نظریہ سے نہیں ہے۔ Mr. Ouspensky لکھتے ہیں (۹۹):-

ترجمہ:- انسان کی ابتداء، اور اُس کے گذشتہ ارتقاء کی نسبت جو زمانۂ حال کے نظریات ہیں میں بغیر کسی ہچکچاہٹ ورکاوٹ کے کہتا ہوں کہ وُہ قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم کو انسان کی ابتداء کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ اور ہمارے پاس انسان کے جسمانی اور دماغی ارتقاء کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

برعکس اس کے اگر ہم تاریخی زمانہ کے بنی نوع انسان کو لیں یعنی اَب سے دس یا پندرہ ہزار برس پہلے کے بنی نوع انسان، تو ہم کو بلا شک و شبہ موجودہ انسانوں سے کہیں بہتر انسانوں کے نشانات ملتے ہیں۔ جن کی موجودگی ایسے آثار و یادگاروں کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے جو نہ تو موجودہ بنی نوع انسان بنا سکتے ہیں، اور نہ اُن کی نقل کر سکتے ہیں۔

تاریخی زمانہ سے پہلے کے انسان یا مخلوقات ظاہری طور سے انسان کے مشابہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وُہ انسانوں سے بہت مختلف تھے۔ ان کی ہڈیاں برفانی دور یا اس سے پہلے کی تہہ نشین طبقات میں ملتی ہیں۔ ان کے متعلق ہمارا یہ نظریہ صحیح ہے کہ یہ ہڈیاں ایسی مخلوقات کی ہیں، جو بالکل انسان سے مختلف تھے اور جو عرصہ ہوا کہ نابود ہو چکے ہیں۔

(99) P.D. Ouspensky : The Psychology of Man's Possible Evolution, PP. 10, 11.

Marfat.com

ہمارا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسان جس کو ہم جانتے ہیں یہ مکمل انسان نہیں ہے قدرت اس کی نشوونما ایک حد تک کرتی ہے اور پھر اس کو وہیں چھوڑ دیتی ہے۔ اب اس کے بعد یا تو وہ خود اپنی کوشش اور ترکیبوں سے آگے ترقی کرے یا ایسا ہی زندہ رہے اور مر جائے جیسا کہ وہ پیدا ہوا تھا یا اس سے بھی نیچے گر جائے اور ترقی کرنے کی اہلیت ہی کھو بیٹھے۔

اس صورت میں انسان کے ارتقاء کے معنی ہوں گے "چند اندرونی طاقتوں اور حالتوں کا نشوونما" جو عام طور سے بغیر نمو کے رہتی ہیں اور خود بخود ترقی نہیں کر سکتیں۔

تجربہ و مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی یا نشوونما صرف چند محدود حالتوں ہی میں ممکن ہے وہ بھی محض انسان کی خود اپنی خاص قسم کی کوششوں کے ذریعہ سے، جس کے ساتھ کافی مدد اُن لوگوں کی بھی ہونی چاہیئے، جو پہلے ایسی کوشش کر چکے ہیں اور اب وہ نشوونما یا ترقی کر کے ایک خاص درجہ پر پہنچ گئے ہیں، یا کم سے کم اُن کو اس نشوونما کے طریقے معلوم ہو گئے ہیں۔

لہذا ہم کو اس نظریہ سے آغاز کرنا چاہیئے کہ دو شرطوں کے بغیر ارتقاء ناممکن ہے ایک تو یہ کہ انسان خود کوشش کرے، اور دوسرے یہ کہ اس درجہ کو حاصل کیئے ہوئے لوگوں کی مدد اُس کو ملے۔

اس کے بعد ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نشوونما سے انسان بالکل مختلف ہستی ہو جائے گا اور ہم کو معلوم ہونا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ کن معانی میں اور کس رُخ کی طرف انسان ایک مختلف ہستی ہو جائے گا، یعنی مختلف ہستی کے کیا معنی ہیں۔

پھر ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر ایک آدمی یہ نشوونما حاصل نہیں کر سکتا اور تمام بنی نوع انسان کو زیرِ نظر رکھ کر یہ بہت شاذ و نادر استثناء ہے۔ یہ بات اگرچہ عجیب معلوم ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ یہ نشوونما شاذ و نادر رہے۔ بلکہ جُوں جُوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ زیادہ شاذ و نادر ہو رہا ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ اصل ضمیمہ ۱۱)۔

مسٹر اوس پنسکی روسی محقق ہیں۔ اہلِ روس کے قلم سے ایسی باتوں کا نکلنا حق کے ہمیشہ غالب رہنے کا ثبوت ہے۔ اس محقق نے نہایت قوی اور معقول دلائل سے

ثابت کیا ہے کہ ڈاردن اور اُس کے متبعین کی ارتقائی تھیوری غلط ہے۔ وُہ ہڈیاں اور ڈھانچے جو پُرانے ہیں اور اب زمین سے برآمد ہوئے ہیں وُہ ایسی مخلوق کی ہیں جو ساخت میں کچھ انسان کے مطابق تھے، لیکن در اصل انسان نہ تھے۔

بڑے غور کی ضرورت ہے۔ Ouspensky کی تحریر سے انبیاء کے آنے کی ضرورت بھی ثابت ہوتی ہے' اور اُن کی بعثت کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ قدرت انسان کو نشوونما کے ایک درجہ پر لا کر چھوڑ دیتی ہے۔ اُس کے بعد اُس کے اندرونی قوائے کا نشوونما نہیں ہو سکتا۔ اس حد کے بعد ذہنی و اخلاقی نشوونما ہونے کے لیئے دو شرطوں کے اجتماع کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ انسان نشوونما کے لیئے خود اپنی ترکیبوں سے کوشش کرے' اور دُوسرے یہ کہ اُن آدمیوں کی مدد بھی اُس کو حاصل ہو جائے جو اس سے پہلے اس منزل سے گزر چکے۔ مسٹر Ouspensky رُوسی ہیں۔ اور رُوس آج کل دہریت کا دارالقرار ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد یہ ہی روس دہریت کا دارالفرار ہوگا۔ یہ محقق انبیاء و مرسلین کا لفظ تو نہیں استعمال کر سکتا تھا کیونکہ وُہ پکا رُوسی ہے۔ لیکن اگر غور کرو' تو ان کی ہی بحث سے انبیاء کی ضرورت اور بعثت کی تصدیق ہوتی ہے۔

وُہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندرونی قوائے روحانی کے نشوونما کے لیئے دُو شرطیں ہیں۔ ایک تو انسان کی اپنی کوشش' اور دوسرے ایسے شخص کی مدد جو یہ ترقی کر چکا ہو۔ اور ان قوائے سے اُس کے قوائے اعلےٰ و ارفع ہوں یا اُس کو اس ترقی کے طریقے معلوم ہوں۔ اب سے کئی نسلوں پیچھے تک چلو۔ ایسے آدمی ملتے جائیں گے کیونکہ موجودہ اُٹھتی ہوئی نسل کی تعلیم کے لیئے اُن سے زیادہ عمر والے لوگ جنہوں نے پہلی نسل دیکھی ہو' موجود ہوتے ہیں۔ لیکن آخر میں چل کر ایسی بھی تو منزل آجائے گی جہاں یہ اُونچی روحانی طاقتوں والا آدمی نہ ہوگا۔ وہاں سے یہ سلسلہ کیوں کر چل کر ہم تک آیا۔ ظاہر ہے کہ آخر میں ایک ایسا آدمی ہوگا جو خود اس بیرونی مدد کا محتاج ہوگا۔ یہ اصول تو Mr. Ouspensky قائم ہی کر چکے ہیں کہ بیرونی مدد کے بغیر قوائے اندرونی کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ اُس آدمی کو کَون تعلیم و مدد دینے والا تھا۔ یہ بھی وُہ کہتے ہیں کہ یا یہ خود ان منازل سے گزر چکا ہو' یا اُس کو اس نشوونما کے طریقے معلوم ہوں۔ طریقے بتانے

Marfat.com

والا کون ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اُس آدمی کو اُس ذات سے تعلیم و مدد و علم اسباب ترقی ملے ہوں گے۔ جو ہمیشہ سے ہے۔ ایسے تعلیم یافتہ آدمی ہی کو ہم حامل علم لدنی کہتے ہیں وہ ہی انبیاء و مرسلین تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ذات ایسی ازل سے ہے جو بنی نوع انسان کو مدد دیتی رہی ہے۔ کیونکہ بغیر اُس کی مدد کے یہ ترقی و نشوونمائی قوائے اندرونی نہ ہوتے۔ ایک دہریئے کی تحریر سے خداوند تعالیٰ کی ہستی ثابت ہو رہی ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے۔ جب لوگ ایک نبی کی تعلیم تقریباً بھول گئے تو دوسرا نبی آگیا۔ اور یہ ترقی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ آخر میں ایک ایسا زمانہ آگیا کہ آخری نبی کی تعلیم محو نہ ہوئی۔ بلکہ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور اس کی تعلیم کو آگے چلانے کے لیئے رہنے لگا۔ یہ آخری نبی جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم تھے۔ آخری تعلیم اسلام کی صورت میں باقی رہی۔ اور اس تعلیم کو اُس کی اصلی حالت میں قائم رکھنے والے آئمہ اہلِ بیت رسالت تھے مسلمانوں کی تاریخ کو غور سے مطالعہ کرنے والا اس ہی نتیجہ پر پہنچے گا۔ اس کی تفصیل تو بعد میں کریں گے، اتنا یہاں بتائے دیتے ہیں کہ وُہ لوگ حکومت کے تخت یا امارت مسند پر بیٹھنے والے نہ تھے۔ وُہ یا تو مسجد میں سوکھی روٹی کھا کر درس دینے والے تھے یا حضرتِ یوسفؑ کی طرح قید خانہ میں رہ کر اس تعلیم کو پھیلانے والے تھے۔ اور جب شیطان نے اُن کی ہستی میں اپنی موت دیکھی، تو اپنے مریدوں اور اولیاؤں کو حکم دیا کہ اب ان کو زندہ نہ چھوڑو۔ اور جب ان بزرگواروں نے یہ دیکھا، تو اصحاب کہف کی طرح نظروں سے غائب ہو گئے۔ اور وہیں سے اُن کا فیض اُن لوگوں کو پہنچ رہا ہے جو اُس کے طالب ہیں۔ – Mr. Ouspensky یہ بھی کہتے ہیں کہ بغیر اس مدد اور اس تعلیم کے انسان مکمل نہیں ہوتا۔ جو آدمی یہ مدد اور تعلیم دیتا ہے، وُہ انسان کامل ہونا چاہیئے۔ اس رُوسی مصنف نے ان کامل انسانوں کے نام نہیں بتائے۔ ورنہ ہم اُن کے سوانح حیات سے اُن کی استعداد اور کمال کا اندازہ کرتے۔ بہر صُورت وُہ لوگ جن کو اُستادِ ازل نے تعلیم دے کر بھیجا ہے اور تعلیم کے لیئے مقرر کیا ہے، وُہ تو کامل انسان ہونے چاہئیں۔ واقعی وُہ کامل تھے۔ ہم اُن کے نام بھی بتائیں گے اور اُن کی تعلیم بھی پیش کریں گے تاکہ اس تعلیم اور اُن کے سوانح حیات سے ناظرین خود اُن کے کامل ہونے کو دیکھ لیں۔

Marfat.com

Mr. Ouspensky یہ بھی کہتے ہیں کہ اس تعلیم کی وجہ سے آدمی عام انسانوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اور ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ وُہ کمال ہی ایسا اعلےٰ درجہ کا ہوتا ہے کہ کامل انسان عام آدمیوں سے بالکل مختلف اور ممیز ہو جاتا ہے۔ وُہ کمال کیا ہے۔ وُہ کمال احتراز از گناہ ہے۔ سائیکلوجی اور فزیولوجی (Psychology of Physiology کا علم جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ کا گناہ عمر بھر کے لیئے اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ فقہ اسلام میں گناہ سے توبۂ صحیح کرنے کے بعد خداوند تعالےٰ مغفرت کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ توبہ ان شروط کے ساتھ کی جائے جو قرآن شریف میں درج ہیں۔ "یغفر الذنوب" کا فقرہ استعمال ہوُا ہے۔ خداوند تعالےٰ غفور الرّحیم ہے۔ مغفرت کر دے گا۔ ان الفاظ کا مادہ ہے۔ غ۔ ف۔ ر۔ یعنی غفر۔ جس کے معنی ہیں ڈھک لینا۔ گناہ ڈھک لیا گیا۔ لیکن اگرچہ خدا نے معاف کر دیا۔ مگر Brain Paths پر اُس کا اثر رہا اور رہے گا۔ ایک گناہ نے اتنے اثرات پیدا کیے تھے کہ وہ گناہ کرنے والے پر اثر انداز ہوئے۔ گناہ معاف ہو گیا۔ لیکن کمال میں فرق آ گیا۔ کامل انسان وہ ہے جو صاحب عصمت ہو یعنی اُس نے ایک گناہ بھی نہ کیا ہو۔ معصوم ہو۔ اِس ہی وجہ سے بروئے اعتقادِ اسلامیہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام معصوم تھے۔ کیونکہ وُہ کامل انسان تھے۔ قانونِ فطرت، قانونِ الٰہی، سُنّتِ الٰہیہ، یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ انبیاء اور آئمۂ علیہم السّلام کے سوانح حیات دُنیا کے سامنے ہیں۔ کہیں گناہ کا شائبہ تک نہیں۔ لیکن سوانح حیات سچّے ہونے چاہئیں۔ وُہ نہیں۔ جو موجودہ انجیل میں ہیں۔ ان کی رُو سے تو معاذاللہ حضرت داؤدؑ زانی ہوں گے اور حضرت لوطؑ نے شراب پی کر اپنی لڑکیوں سے زنا کیا ہوگا۔ (۱۰۰) یہ موجودہ انجیل کا ذکر ہے۔ اصلی توریت، زبور اور انجیل تو قرآن کی طرح الہامی کتابیں ہیں اور ان لغویات سے بری ہیں۔ قیامت کے نزدیک تو یہ سب اصلی کتابیں جو حضرت علیؑ کے مرتب کردہ قرآن کے لوگوں کے سامنے آ جائیں گی۔ اور قیامت کے دن خداوند تعالیٰ اُن امور کا فیصلہ کر دے گا جن میں یہ سب لوگ اختلاف کرتے تھے۔ اُس دن

(۱۰۰) (100 Ge: 19:31-36

Marfat.com

معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق سے چمٹ رہا تھا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۔ (السجدہ ۲۵:۳۲)

نیز ملاحظہ ہوں (۱۰۱)

اسی روسی عالم کی تحریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب انسان جسمانی اور ذہنی قوتوں میں ترقی نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ پہلے لوگوں نے جو عظیم الشان کام کیئے ہیں ان کو اب یہ انسان دوبارہ نہیں کر سکتا، بلکہ ان کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔ اور یہ بالکل درست ہے۔ جسمانی طاقت، ذہنی لیاقت اور اخلاقی جرأت میں موجودہ انسان اپنے ازمنہ سابقہ کے آباؤ اجداد سے بہت گرا ہوا ہے۔ جسمانی طاقت اور ذہنی لیاقت کو لو۔ اہرام مصری، اشوری نہریں، پُل اور قصور اور ازمنہ وسطیٰ کے تعمیری کارنامے موجودہ انسان کی طاقت اور لیاقت سے قطعاً باہر ہیں۔ جرأت کو لیجیئے۔ دُور سے بیٹھا ہوا توپ، گولے اور بم چلاتا رہتا ہے، موت کے سامنے کبھی نہیں آتا۔ اخلاقی ھمت میں کربلا کے میدان اور بغداد کے قید خانے تو اس کے دماغ ہی میں نہیں آسکتے اور نہ اب تک آئے ہیں۔ اپنے ہی مکر و فریب و دغا کے رنگ میں ان کارناموں کو رنگتا رہتا ہے جو اس کے خیالاتِ خود غرضی و ہوس پرستی اور نفس پرستی کی رو سے اس کو ناممکن نظر آتے ہیں۔ لیکن ہاں! چونکہ رومیوں اور یونانیوں کی گود میں پلا ہے۔ ہوریشیس اور ہینی بال کے کارناموں کے گیت گا کر ناچ کود لیتا ہے۔ ان کی پیروی کرنے کی پھر بھی ھمت نہیں ہوتی۔ یہ ہے "ارتقاء شدہ" انسان جس پر آپ کو فخر ہے۔ ہاں! حسد، خود غرضی اور نفس پرستی میں گوئے سبقت لے گیا ہے۔ ان جذباتِ رذیلہ نے جب اس کو تازیانہ لگایا، تو اس نے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، اور خبر نہیں کیا کیا خاک دھول جراثیم مہلکہ سے بھرے ہوئے، بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کے لیئے تیار کر لیے ہیں۔ اس پر اگر کسی کو فخر کرنا ہے تو کرلے۔ خدا ان مجرموں کو ان کے ہی ہاتھوں سے سزا دلاتا ہے، اور یہ اس سزا کو اپنی ترقی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ سُوْءُ

(۱۰۱) (101) Ge: 113:2, 93:10, 124:16, 46:39, 45:17

Marfat.com

اَعمَالہم - یہ ترقی کیا ہے - خودغرضی کا بدترین ارتقاء - ایک دُوسرے سے عداوت ، جان کے دُشمن - دُوسروں کی ترقی میں اپنا زوال دیکھنا - بیگانوں کو ہم سے لڑاکر اپنی تجارت کے لیے میدان پیدا کرنے - ہر وقت خوف کی حالت میں زندگی گزارنا - کبھی چین سے خود نہ بیٹھنا اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دینا - دُنیا کے اس کنارے سے دُوسرے کنارے تک بے چینی ، بدامنی ، ہر قسم کا ظلم ، کمزوروں کو ظاہرا مارنا ، طاقتوروں کو سازش سے گرانا ، نہ خود پنپنا نہ دوسرے کو پنپنے دینا - دُنیا سے راحت و چین و آرام ، اطمینان کو معدوم کر دیا ، اور اُس کو ظلم و فساد سے بھر دیا - یہ ہیں اُس سائنس کی ترقی کے کارنامے جن کو اپنی اعلےٰ تہذیب کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے - اور ان کے غلام اس تہذیب کی تقلید کرنا اپنی زندگی ، اور اپنی سیاستدانی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں -

یہ بھی تو سوچو - اگر بنی نوع انسان بذات خود ایک علحدہ نوع نہیں ہے تو مچھلی سے تو بندر بنا اور بندر سے انسان - اور اس انسانی ہیئت میں بقولِ مؤرخین اس کو اس زمین پر تین لاکھ سال ہو گئے ہیں - یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے - ارتقا کی رفتار اب کیوں بند ہو گئی ، اور وُہ انسانی منزل سے آگے کیوں نہ بڑھا - انسان کو اُڑنے کا بہت شوق ہے اور ہمیشہ سے خیالی اُڑن کھٹولے میں اُڑتا رہتا ہے - اس سلسلہ ارتقاء میں اس کے پر ہی لگ جاتے - یہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی عضو کو زیادہ استعمال کرنے سے وہ عضو اس استعمال کے بموجب شکل اختیار کر لیتا ہے - اُونٹ کے اونچے درختوں سے پتیاں کھانی تھیں ، تو اُس کی گردن اُونچی اور لمبی ہو گئی - ہرن کو صیاد سے بچنے کے لیئے دوڑنے کی ضرورت ہوئی ، تو اُس کی ٹانگیں اس مقصد کے مطابق بن گئیں - شتر مُرغ بھی اپنے ماحول کے مطابق ہو گیا وغیرہ وغیرہ انسان کو اپنی آنکھوں سے بہت کام کرنا پڑا ہے - وحشیانہ حالت میں دشمنوں سے بچنے کے لیئے ، اور شکار کو دُور سے دیکھ لینے کے لیئے اس نے اپنی آنکھوں پر بہت زور ڈالا ہے - اس کی آنکھیں کیوں نہ تیز ہو گئیں - آنکھیں تیز ہونے کی بجائے وُہ تو اب اندھا ہوتا جا رہا ہے - آنکھوں میں طاقت نہ رہی - صدیوں سے

عینک لگانے پر مجبور ہے، یہ کیسا ارتقاء ہوا۔ اور وُہ اصول استعمال کہاں گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دُوربین و خوردبین ایجاد کرنے کی وجہ سے اس کو اپنی قدرتی آنکھوں پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ رہی، تو یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ دو باتیں صدیوں کی باتیں ہیں۔ اور انسان تو زمین پر تین لاکھ سال سے بیان کیا جاتا ہے۔ ترقی اگر ہونی تھی تو اس سے پہلے ہی ہو جانی چاہیئے تھی، اور اس کو دُوربین و خوردبین کے ایجاد کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ ہاتھی کے اتنے بڑے جسم پر اتنی چھوٹی آنکھیں۔ یہاں ارتقاء اپنا راستہ کیوں بھول گیا۔ پودنا اور بیا تو ایسے عجیب اور عمدہ گھر بنا سکیں، اور چیلیں اور کوّے یُوں ہی دھوپ اور بارش میں مارے مارے پھریں۔ ان کو تو چاہیئے تھا کہ لکڑیاں رکھ کر گھونسلے بناتے اور بندر پتھر اور لکڑیوں کا گھر بناتا۔ وُہ تو ارتقاء کی اُس اُونچی منزل تک پہنچ گیا تھا، کہ اب انسان بننے والا تھا۔ لیکن ان صدیوں کے تجربات نے اُسے معمولی گھر بنانا بھی نہ سکھایا۔

سال گذشتہ بین الاقوامی شہرت کے حامل دو سائنسدان کراچی میں آئے تھے اور اُن دونوں نے ڈاروِن کی بندر والی تھیوری پر لکچر دیئے تھے۔ اُن میں سے ایک تو اس تھیوری کا حامی تھا، اور دوسرا سخت مخالف تھا۔ اس سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ڈاروِن کا نظریہ متفقہ طور سے مسلّم نہیں ہے، اور اب اُس کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے۔

قرآن شریف کی یہ آیت ملاحظہ ہو:- اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۲ اس میں دو الفاظ قابلِ غور ہیں: الارض اور خلیفة۔ الارض سے ظاہر ہے کہ تخلیقِ آدمؑ سے پہلے زمین موجود تھی۔ خلیفة کے مفسرین نے پانچ معنی لیئے ہیں اور وُہ پانچوں اس پر حاوی ہیں۔ بلاغت کی یہ نادر مثال ہے کہ ایک لفظ سے پانچ حالتیں بیان کر دی گئیں۔ وہ یہ ہیں:-

۱- نیابت الٰہیہ در زمین برائے انتظام و تدبیر۔

۲- زمین کی پہلی مخلوقات میں سے آخر، اور سب سے اشرف مخلوق۔

۳- جانشینِ ملائکہ۔

۴- جانشینِ جنّ۔ ۵- حاکم منصوص من اللہ۔

ہم کو یہاں تفسیرِ قرآن مطلوب نہیں ۔ ہم دوسرے معانی لیتے ہیں یعنی آخرو اشرف خلقت ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمؑ کے زمین پر آنے سے پہلے بہت سی مخلوق آباد تھی ۔ ملائکہ ہوں ، جن ہوں ، اُن میں سے کوئی ایسی بھی مخلوق ہو جیسی P.D. Ouspensky کہتے ہیں کہ انسان سے مشابہ تھی ، لیکن انسان نہ تھی ۔

اس روسی سائنس دان ھی پر کیا منحصر ہے ، دیگر اہل علم بھی ڈارون کے اُس مشینی اور بے عقل والے نظریہ ارتقاء سے منحرف ہو چکے ہیں اور جو اس ذھنی اور جسمانی ارتقار کو مانتے ہیں ۔ وُہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ مشین کی طرح کا ارتقار نہیں ہے بلکہ اس ارتقار میں ایک بہت بڑے ذہن کا مقصد کارکن ہے ۔ یہ محض بے عقل قونوں کا نتیجہ نہیں ہے ۔ چنانچہ ایک زبردست سائنسدان کہتا ہے ۔

ترجمہ :- (ارتقار کا) مشینی نظریہ جس نے اعلان کیا تھا کہ زندگی محض غیر جاندار عملوں کی ایک ضمنی پیداوار اور نفس محض دماغ کی ایک شاخ ہے ۔ اب علم الحیات میں روز بروز غیر اطمینان بخش ثابت ہوتا جا رہا ہے ۔ اور بہت سی شہادت ہر طرف سے جمع ہو رہی ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ جُرم کا طریقۂ عمل مشین کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے ۔ اور اس کی توجیہہ کسی صورت میں مشینی اصول پر نہیں کی جا سکتی ۔ حیات دراصل ایک نہایت اہم اصلیت ہے اور اس کے علاوہ اُس میں تخلیقی قوت موجود ہے ۔ اور وُہ زندہ اجرام کو بطور اپنے آلۂ کار کے استعمال کرتی ہے اور ان کی تشکیل کرتی ہے ۔ تاکہ اُن سے اُس کے مقصد کی تکمیل ہو ۔ اس سے تخلیقی ارتقاء کے نظریات مستنبط ہوتے ہیں جو ارتقار کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں کہ ارتقار ایک مقصد رکھنے والی قوت یا سُنت ہے جو زندہ اجرام میں ظاہر ہو کر اس کوشش میں رہتی ہے کہ حیات کی اعلےٰ صفات پیدا ہو کر اُس کے آخری مقصد کو پورا کریں ۔ ابھی تو ہم اُس مقصد کا نہایت دھندلا سا قیاس کر سکتے ہیں ۔ دُوسرے الفاظ میں ارتقار کو اَب سمجھا جاتا ہے ، کہ وُہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ھمیشہ ایک بالکل نئی شئے پیدا کرنے میں مشغول رہتا ہے ۔ ہر ایک لحظہ کائنات میں ایک نئی افزائش ہو رھی ہے ۔ جو اس سے قبل کے لحظہ میں نہیں تھی ۔ مستقبل کی نسبت کچھ پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی ۔ اور انسان اپنے عمل و ارادہ میں چند حدُود کے اندر

آزاد ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۲

زمانہ حال کے نہایت مشہور فلاسفر اور سائنس دان مسٹر برگوسان نے ایک مستقل رسالہ اس تخلیقی ارتقاء پر لکھا ہے جس کا نام Creative Evolution ہے۔ یہ وُہ ہی برگوسان ہے جس کے فلسفہ کا تتبع علامہ اقبال نے بہت حد تک کیا ہے۔ اور اُس کے ہی اصولوں پر علامہ اقبال نے اپنے مجموعۂ تقاریر کو مبنی کیا ہے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اس کا نام Reconstruction of Islamic Thought ہے۔

عقل } اکثر دہریت کا یہ طعنہ سُننے میں آیا ہے کہ مذہب کو عقل سے دُشمنی ہے جہاں عقل کی روشنی پہنچتی ہے، وہاں سے مذہب چلتا بنتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بغیر غور کیئے ہوئے اپنی روزمرہ کی عقل کو اپنے گرد کے مذاہب پر آزما کر اس نتیجے پر یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ مغربی تہذیب جس کے دامن عاطفت میں دھریت نے پناہ لی ہے، اپنے یہاں کے دو ہی مذاہب سے تو واقف تھی: یونان کی صنم پرستی، اور باقی یورپ کی مسیح پرستی۔ یہودی تو یورپ میں مفروروں کی طرح آئے اور چوروں کی طرح رہے۔ یہودیت کی جو تعلیم بائیبل میں تھی اور جس طرح یہ دونوں الہامی مذاہب، یہودیت اور مسیحیت، الحاد کے زیر اثر آن کر مسخ ہوئے ہیں، اُن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مسیحیت کا اصول کفارۂ گناہاں ممکن ہے کہ دہریت کے لیئے باعثِ مضحکہ ہو۔ لیکن اسلام تو کہتا ہے کہ لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ۔ ان دونوں بلکہ ان تینوں مذاہب میں کئی اور ایسے ہی خلافِ عقلِ سلیم نظریئے قائم کیئے گئے ہیں۔ یہاں اُن کے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مثلاً جادوگرنیوں پر ظلم اور خدا کو جسم اور اعضاء عطا کرنے وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہہ کر کہ جادوگرنیاں اپنے حکم سے طوفان اور طاعون پیدا کرتی ہیں، ان مذاہب نے سائنس کو اپنے اُوپر ھنسایا۔ سولھویں صدی عیسوی تک مذہب کے نام پر کروڑہا بے گُناہ عورتوں کو اس جرم میں نہایت بے رحمی سے قتل کیا اور جلایا، کہ وُہ شیطان سے مواصلت رکھتی ہیں اور دُنیا میں بیماریاں اور طوفان پھیلاتی ہیں۔ اور اس کے لیئے اپنی بائیبل کو سَند ٹھہرایا۔ معجزات کی اتنی بھرمار کر دی، کہ ہر مسیحی پادری ولی ہوگیا۔ اور اُس کے جوتوں چادروں اور بالوں وغیرہ سے سینکڑوں معجزے نکال دیئے۔ اہلِ سائنس کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بَل پڑ گئے، اور انسانیت انگشت بدندان ہو کر رہ گئی۔

Marfat.com

یہ حماقتیں اتنی عام تھیں، کہ عقل نے پھونک پھونک قدم رکھا۔ اُس کی اس احتیاط اور سستی رفتار کی بھی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اُس کا نام ہے: History of the Rise and Influence of the spirit of Rationalism in Europe اور اُس کا مصنف W.E.H. Lecky ہے۔ ان کو دیکھ کر دہریت نے یہ نظریہ قائم کر لیا، کہ مذہب اور عقل ایک دُوسرے کے متضاد ہیں۔ ورنہ اسلام میں تو عقل کو بہت اعلےٰ درجہ دیا گیا ہے۔ اور جب کوئی پیغمبر دل کی بات نہیں سمجھتا، تو عقل کی طرف اسلام اپیل کرتا ہے۔ قرآن شریف میں جا بجا "اَفَلَا تَعْقِلُوْن" ہے۔

اگر مذہب اور عقل کا مقابلہ کرنا ہے، تو عقل کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا۔ حق کی صفت یہ ہے کہ مستقل ہوتا ہے۔ اُس میں تغیر نہیں ہوتا۔ ساری دُنیا بدل جائے لیکن وہ نہیں بدلتا۔ اگر عقل کے ذریعہ سے حق معلوم کرنا ہے تو عقل میں بھی یہی صفات ہونی چاہئیں۔ اُس کا علم اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ اُس کے آگے علم کا کوئی اور اونچا درجہ نہ ہو۔ اس عقل میں استقلال اور استحکام ہونا چاہیئے، تغیر مطلق نہ ہونا چاہیئے کہ آج کچھ اور کل کچھ۔ آج بھی تذبذب ہے، اور کل بھی تذبذب ہی رہے گا۔ بلکہ علم اور یقین اتنا کامل ہو کہ پھر آج کے بعد کل کے تغیر کا کوئی امکان نہیں عقل کو اس درجہ کا ثابت کرنے کے بعد پھر اُس کا مقابلہ مذہب سے کرنا چاہیئے۔ الہامی مذہب ہمیشہ علمِ کامل اور حق کامل کا دعوےٰ کرتا ہے۔ تو عقل کو اوّل علمِ کامل اور حق خالص حاصل کر لینا چاہیئے۔ بغیر اس کے دعوٰی کی تردید نہیں ہو سکتی۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا سائنس کی عقل کو یہ درجۂ کمال حاصل ہو گیا ہے۔ جن ناظرین نے ہمارا ساتھ یہاں تک دیا ہے، اُن پر سائنس کی جہالت اور بے بسی ظاہر ہو گئی ہوگی۔ اور اُس کا تذبذب ایسا عیاں ہو گیا ہو گا کہ جس میں شک و شبہ کا امکان نہیں رہے۔

سائنس کی لاعلمی و جہالت اور اُس کے نظریات کا تغیر و تبدل اور غیر یقینی ہونا

ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ اُن کو نہیں معلوم، کہ دُنیا میں حیات کیونکر آئی۔

انسان کی قدامت کا بھی یقین نہیں۔ ارتقاء کے بہت سے مسائل غیر یقینی ہیں۔ کاربن ایٹم کے چھ الیکٹرون میں وہ خاصیتِ زندگی کیوں ہے جو اُن میں ہے۔ مقناطیس کی بہت سی خاصیتوں کا علم نہیں ہے۔ ہپناٹزم میں اور مسمریزم میں یہ اثرات کیوں ہیں۔ روشنی کیا ہے۔ برق کی نفی و اثبات میں آپس میں مل کر یہ اثرات کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ علم الادویہ سارا اسی لاینحل "کیوں" کا مجموعہ ہے۔ تجربہ سے ہر ایک دوا کا اثر معلوم کر لیا ہے۔ اور وہ بھی بعض دفعہ غلط ہو جاتا ہے۔ جس کو مولانا رومؒ نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود — روغنِ بادام خشکی مے نمود!
از ھلیلہ قبض شد اطلاق رفت — آب آتش را مدد شد ھمچو نفت
شربت و ادویہ و اسباب او — از طبیبان ریخت یکسر آبرو

بہر صورت یہ تو مسلمہ ہے کہ کسی طبیب کو خواہ یونانی حکیم ہو یا انگریزی ڈاکٹر کسی دوا کی نسبت یہ نہیں معلوم کہ اُس دوا میں جو اثر ہے وہ کیوں ہے۔ پوٹیشیم برومائڈ دماغ میں کیوں اضمحلال پیدا کرتی ہے، اور عناب مصفّیٔ خون کیوں ہے۔ روزانہ استعمال کی ادویہ کی "کیوں" تو معلوم نہیں، خدا سے پوچھتے ہیں کہ تُو نے دنیا میں شر کو کیوں مہلت دی ہوئی ہے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں تو شر کی موجودگی نہیں آتی۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہماری عقل سے باہر ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ تمہاری سمجھ میں آیا کیا ہے جو شر تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ اور تمہاری عقل کی وسعت کیا ہے کہ امکانِ حیات بعد ممات اس میں نہیں سماتا؟ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر ایک شے کی ماہیت انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ تمام سائنس اب تک کچھ نہیں سمجھا ہے۔ اور نہ آئندہ سمجھے گا۔ ایک شے کی بھی ماہیت نہیں سمجھا۔ ریڈیو کا معجزہ ہو یا ہوائی جہاز کی ہوابازی ہو یا ستارہ بازی، یہ سب کچھ تجربہ پر مبنی ہے۔ ہوا کی ایک خاصیت تجربہ سے ثابت ہو گئی۔ ریڈیو اور ہوائی جہاز بنا لیئے۔ یہ تو ان سے پوچھیئے کہ ہوا میں یہ خاصیت کیوں ہے Short Wave اور Long Wave میں یہ فرق کیوں ہے۔ گرمی کے درجۂ حرارت سے رنگ میں فرق کیوں آ جاتا ہے۔ اُن کی شعاعوں کے رنگ کی وجہ سے ستاروں کا درجہ حرارت تو معلوم ہو گیا۔

یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ فرق کیوں ہے۔ ایک درجہ حرارت سُرخ رنگ کی شعاع کیوں پیدا کرتا ہے؟ اور دوسرا درجہ حرارت زرد یا نیلے رنگ کی شعاع کیوں پیدا کرتا ہے؟ کہتے ہیں کہ تمام فلکی نظام قوت کشش پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے کی کشش و رفتار سے ستارے و سیارے اپنے اپنے راستوں پر چل رہے ہیں۔ یہ قوت نہ ہو تو رات دن نہ ہوں، یا کشش نہ ہو۔ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اور اگر ان سے پوچھو کہ یہ قوت کشش کیوں ہے، تو کچھ نہ بتا سکیں گے۔ یہ تو جہالت محض ہوئی۔ جہل مرکب یہ ہوا کہ اس جہالت کے باوجود کہتے ہیں کہ چونکہ اس ظاہری موت کے بعد پھر زندہ ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، لہٰذا ہم اس کو بعید از عقل سمجھ کر نہیں مانتے۔ یہ تو ان کو معلوم نہیں کہ حیات کیا ہے، موت کو کیا سمجھیں گے موت سے جسم ظاہری کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور اس کے ذرات فضاء میں پھیل جاتے ہیں، لیکن باقی رہتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جسم ظاہری مرگیا، لیکن ذرے تو نہیں مری جس کی نسبت فرمایا گیا ہے: "نفخت فیہ من رُوحی" وہ اس جسم سے نکل گئی۔ اگر کوئی وقت ایسا آئے اور ایسے اسباب پیدا ہوں کہ وہ ہی قوت و طاقت کشش کے لیے ہیں اور جو اجرام فلکی کو سنبھالے ہوئے ہے ان ہمارے جسموں کے ذرات پر عمل کرنے لگے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے ہڈیوں کے اجزاء جو فضاء میں پھیلے ہوئے تھے پھر آپس میں اپنے ہی ان ذرات سے مل جائیں جن سے پہلے ملے ہوئے تھے۔ اور ہمارا جسم پورا موجود ہو جائے۔ دیکھئے! میری ہڈیوں اور میرے جوڑوں کے اجزاء پیدائش سے بلکہ ماں کے پیٹ سے آپس میں ملے ہوئے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ چند اسباب نے اُن کو الگ الگ کر دیا۔ تمام کائنات ذروں میں تبدیل ہو گئی۔ اب دوسرے اسباب پیدا ہوئے۔ خاص قسم کی بجلی کی رو آئی۔ اس نے ان تمام ذروں کو ملا دیا جو پہلے ملے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ تو ہر نوع کی فطرت کا قاعدہ ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش

لہٰذا میری ہڈیوں کے ذرے آپس میں مل گئے اور میری ہڈیاں بن گئیں۔ ان پر گوشت پیدا ہونا تو آسان ہے۔ پورا میرا جسم بن گیا۔ پھر وہ ہی رُوح جس کو میرے

جسم سے اُلفت تھی، اُس جسم میں بحکمِ خداوندی داخل ہوگئی۔ تو کیا چیز نئی ہوئی جو پہلے نہیں ہو چکی تھی۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۝ (یٰس ۳۶: ۷۷ تا ۸۰)

ان آیات میں اس اعتراض کا مکمل اور تسلی بخش جواب دے دیا گیا ہے۔ ہڈیوں کا گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا عجیب تو ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن انسان کی پہلی تخلیق اعجب تھی۔ یہ محض نطفہ کا ایک قطرہ ہی تو تھا، جن ہڈیوں کا دوبارہ زندہ ہونا اُس کو عجب معلوم ہوتا ہے۔ اُس وقت نطفہ میں تو اُن ہڈیوں کا نشان بھی نہ تھا۔ جس دماغ سے اب یہ اُلٹی سیدھی بحث کر رہا ہے۔ اُس وقت تو اُس کا پتہ بھی نہ تھا۔ آنکھیں، ہاتھ، پیر، دل، جگر وغیرہ کہاں تھے؟ اب جو یہ انسان ایسا بن گیا جیسا کہ اب ہے، تو یہ کیوں کر ہوا؟ اس پر غور کیوں نہیں کرتا؟ جس طرح خداوند تعالےٰ نے اسباب پیدا کر کے اُس گندے پانی کے قطرہ سے انسان بنا دیا، اُسی طرح اسباب پیدا کر کے انسان کی ان ہی ہڈیوں سے دوبارہ اُس کو بنا دے گا۔ کیوں کہ وُہ تدبیر و ترکیبِ خلق سے واقف ہے، ماہیت اشیا سے واقف ہے۔ کسی چیز کا عجیب ہونا اُس کے ناممکن ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ غور تو کرو۔ دنیا میں بہت سی چیزیں عجیب و عجیب تر پاؤ گے۔ کیا محض بجلی کی لہروں سے اس عظیم الشان کائنات کا بننا عجیب نہ تھا۔ یہ تو سائنس والوں کے سمجھنے کی بات ہے۔ اُن جاہل عربوں کا سمجھانا مقصود تھا۔ وُہ ہرے لہراتے ہوئے درختوں کو دیکھتے تھے کہ آپس میں رگڑ کھائی، اور آگ پیدا ہوگئی۔ آگ اور پانی کی کتنی دُشمنی ہے۔ لیکن وہاں پانی نے آگ کو پیدا کر دیا۔ اگر اس سے زیادہ کہا جاتا، تو وُہ نہ سمجھتے۔ جہلاء کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے اُسی وقت کیوں نہ سائنس کے وُہ اصول بتا دیئے جو آج کل بہت مشکل سے دریافت

Marfat.com

ہو رہے ہیں۔ لیکن اُن کو سمجھتا کون۔ اور اگر کوئی نہ سمجھتا، تو ایمان کون لاتا۔ اور اگر وہ اوّل کے لوگ ایمان نہ لاتے، تو آج مسلمان نہ ہوتے اور نہ قرآن ہوتا۔ سمجھانا تو اُن کو مطلوب تھا۔ اس طرح سمجھایا کہ وہ بھی سمجھیں، اور آئندہ کی "ترقی یافتہ" نسلوں کے لیئے بھی سب کچھ اُس میں رکھ دیا۔ راسخون فی العلم سے پوچھنے کی شرط لگا دی۔

ہاں تو ہم انسان کی کمی عقل اور اُس کی جہالت کا ذکر کر رہے تھے۔ چونکہ دہریت کا ابھی تک یہ ہی خیال ہے کہ اگر اُسے کہیں ٹھکانا مل سکتا ہے تو اھلِ سائنس ہی کے پہلو میں ملے گا۔ اہل سائنس کی لاعلمی تو ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں، اب تھوڑی سی اُن کی اپنی زبانی بھی سُن لیں۔

ترجمے :- (۱) اب ہم کو معلوم ہوگیا ہے کہ یہ جو توجیہہ (کائنات و واقعات کی) کی جاتی ہے۔ وہ تو ظاہر ہے کہ بالکل ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے۔ وہ تو دُنیا کے سادے سے سادے واقعہ کی ماہیت نہیں بتا سکتی۔ مثلاً سورج کی شعاعوں کا تمام کائنات میں پھیل جانا، نور کی ماہیت، سیب کا درخت پر سے گرنا (قانونِ کشش)۔ یا ایک ایٹم میں اُس کے الکٹرون کا چکر لگانا۔

(۲) اسی کائنات کے عمل کا سائنٹیفک طور سے مطالعہ کرنے سے جو ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کے بیان کرنے کے لیئے ہمارے پاس غیر تسلی بخش اور بھونڈے الفاظ ہیں (کیونکہ انسان کے پاس کوئی اور الفاظ سوائے اُن کے نہیں ہیں جو اُس نے دُنیا سے حاصل کیئے ہوئے تجربات و تخیلات کی بناء پر اختراع کر لیے ہیں) وہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات کسی بہت بڑے ریاضی دان کی تجویز شدہ ہے۔

(۳) نیچر کی اٹل اور ناقابلِ تعبیر یکسانیت خلق کرنے والے ذہن (خالق) کی وحدت استقامت پر دلالت کرتی ہے۔

(۴) خلاصہ یہ ہے کہ ریاضی کے گُر سے کسی شَے کی ماہیت نہیں معلوم ہو سکتی اُس سے تو صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی شَے کا اثر کرنے کا طریقہ کیا ہے یعنی

Marfat.com

اُس سے کسی شے کے اثر ہی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ اثرات روزانہ زندگی کی خورد ترین شئے کے بھی اصل خاصیت کے مطابق نہیں ہوتے۔

(۵) یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سائنس مادی دُنیا کے اجزاء کی صحیح ماہیت معلوم کرنے کی کبھی اُمید بھی نہیں رکھ سکتا۔ اشیاء کی اُفتاد ہی بتا رہی ہے کہ یہ بات (صحیح علمِ ماہیتِ اشیاء) ہمارے دائرۂ علم سے بالکل باہر ہے' اور باہر رہے گی۔

(ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۳

سائنس کی غیر یقینی اور مذبذب حالت کو خود یہ لوگ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ جو ہم نے "مادیت" اور حیاتیات کے عنوانات کے نیچے نقل کیئے ہیں۔ ان کو وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل امور اچھی طرح ثابت ہیں:۔

(۱) اہلِ سائنس کو اصلی ماہیت اشیاء اور کنۂ اسباب و علل نہ معلوم ہے' اور نہ کبھی معلوم ہو گی۔ یہ ہی وُہ ماہیت اشیاء و کنۂ اسباب تھی جو فرشتوں کو بھی نہ معلوم ہوئی۔ یہ ہی وُہ ماہیت اشیاء و کنۂ اسباب تھی جو فرشتوں کو نہ معلوم تھی اور خدا نے اپنے نبی حضرت آدمؑ کو بتا دی۔ اور پھر اُن کی نسل کے سلسلۂ انبیاء کو یہ علم بطور وراثت و وصیت کے منتقل ہوتا رہا۔ ان آیات پر غور کیجئے۔ جب فرشتوں نے عرض کی بار الٰہا! تو ایسے نوع کو خلافت دے رہا ہے کہ جو دُنیا میں فساد برپا کرے گی۔ تو خدا نے اپنے خلفاء کی فوقیت ملائکہ پر اس طرح ظاہر کی:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (البقرہ۔ ۲: ۳۱، ۳۲)

ان آیات کا ترجمہ مولوی فرمان علی صاحب نے اس طرح کیا ہے:۔

(اور آدمؑ کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم (اپنے دعوٰی میں کہ ہم مستحق خلافت ہیں) سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ تب فرشتوں نے (عاجزی سے) عرض کی' تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے۔ ہم تو جو کچھ تُو نے بتایا اُس کے

Marfat.com

سوا کچھ نہیں جانتے۔ تو بڑا جاننے والا مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے"۔

یہ ہی ماہیت اشیاء و کنہ اسباب تھی جو بتائی گئی تھی۔ کنہ اسباب کا جملہ قابل غور ہے۔ اس میں ہدایت کے اسباب اور نجات کے ذرائع آ گئے۔ اور یہ انبیاء اور پنجتن پاک تھے جو سب صلب آدمؑ میں سے تھے جن کی تعظیم فرشتوں پر لازم کی گئی تھی۔ اور یہ وہی وصیت تھی جس کا ذکر مسعودی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے کہ ایک نبی اپنے جانشین کے پاس منتقل کرتا رہا ہے۔ دیکھو مروج الذہب الجزء الاوّل صد ۲۸ ۔ مطبوعہ مصر۔

جب تک ہم کو کائنات کی اشیاء کی ماہیت کا حقیقی اور صحیح علم نہیں ہوتا اُس وقت تک ہم کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ عدم کیا ہے، عاقبت کیا ہے، حیات کس کو کہتے ہیں، موت کیا ہے، ہم کیا ہیں اور یہ دُنیا کیا ہے۔ جناب رسولِ خدا کی یہ دُعا کتنی اہم اور معنی خیز ہے: "اَللّٰھُمَّ اَرِنی الاشیاء کما ھی"۔ خداوندا مجھے اشیاء کی اصلی ماہیت دکھا دے۔ اس سے افلاطون کے اس نظریہ کی کس طرح حرف بحرف تائید ہوتی ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ دُنیا اور اُس کی اشیاء کی ہم کو اصلی ماہیت نہیں معلوم۔ ہماری تو یہ حالت ہے کہ جیسے ہم کسی بڑے غار میں ہیں، اور اُس کے کناروں پر جو سوار اور آدمی گزر رہے ہیں ہم محض اُن کے اُس سایہ کو دیکھ رہے ہیں جو غار کی دیواروں پر پڑتا ہے۔ اصلی سوار اور آدمی ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ ہمیں تو فقط اُن کے سائے نظر آ رہے ہیں۔ ہم کو اشیاء کی اصلی ماہیت نہیں معلوم۔ قرآن شریف کہتا ہے: وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ دنیا کی زندگی تو محض دھوکہ ہے۔ اصلی ماہیت کا صحیح علم کب ہوتا ہے؟ جب آنکھوں پر سے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ پردے کب اُٹھتے ہیں؟ جب ہم کو موت آتی ہے۔ اُس وقت ہماری آنکھ کھلتی ہے۔ جب ہی قرآن شریف میں موت کو یقین سے مترادف کیا ہے حتی یاتیک الیقین"۔ لیکن انبیاء و مرسلین کی آنکھوں سے پردے اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ جس کی نظر خود پردوں سے رُکی ہوئی ہے، وُہ کیا دوسروں کو ہدایت کرے گا۔ یہ ہی شرط امامت کی ہے۔ جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد قابلِ غور ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ پُوچھ لو جو

Marfat.com

مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو قبل اس کے کہ تم مجھ کو نہ پاؤ۔ اس کو ہم تفصیل سے عنوان امامت کے تحت میں لکھیں گے۔

(۲) دوسری بات جو ان اقتباسات سے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ کائنات میں اٹل، مستقل، کبھی تبدیل و متغیر نہ ہونے والا قانون جاری ہے، اور سب پر حاوی ہے۔ ان کے پاس صحیح حق ظاہر کرنے کے قابل زبان نہیں ہے۔ اور نہ الفاظ ملتے ہیں جو ظاہر کریں کہ وہ خالق کیسا ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ جو بھی خالق ہو وہ بڑا ریاضی داں ہے۔ ریاضی دان اس وجہ سے کہا کہ اس کی صنعت میں ریاضی کی طرح کا اٹل اور صحیح اندازہ ہے۔ اب قرآن شریف کی یہ آیت تو ملاحظہ ہو:۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۔ (۳۳: ۶۲)

(۳) سائنس کبھی حقیقت اور صحیح ماہیت کائنات نہیں معلوم کر سکتا۔

(۴) مصنوعات کائنات سے وحدت خالق عیاں ہے۔

(۵) اہل سائنس کبھی اشیاء کی ماہیت نہیں معلوم کر سکتے۔ وہ صرف اُن کے اثرات سے اُن کی تخصیص کرتے ہیں۔

قرآن شریف کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:۔

(الف) وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۵

(ب) هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ آل عمران ۳: ۶۶

(ج) قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

(البقرہ ۲: ۲۵۸)

(د) لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ الانبیاء ۲۱: ۲۲

ترجمہ

(الف) تم کو بہت کم علم دیا گیا ہے۔

(ب) اے لوگو! تم وہی تو ہو جو ابھی تو اس بارے میں جھگڑتے تھے جس کا تمہیں علم ہے۔ پھر اُس کے بارے میں کیوں جھگڑنے لگے جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

Marfat.com

یہ لوگ سائنس کی اُن باتوں میں بھی جھگڑتے ہیں اور آپس میں اتفاق نہیں کرتے جن کا کچھ علم تو اُن کے پاس ہے۔ اب اُس سے آگے بڑھ کر روح و عاقبت کی باتوں میں جھگڑا کرنے لگے، جن کا ان کو کچھ بھی علم نہیں۔

(ج) ابراہیمؑ نے کہا کہ خدا سُورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے تو اُس کو مغرب کی طرف سے نکال لا۔ اس پر وُہ کافر مبہوت ہو گیا۔ اور اللہ ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا۔

یعنی تُو اگر خدا ہے تو اب اس کا اُلٹا کر کے دکھا دے۔ نظام بدل دے اور سُورج کو مغرب سے نکال دے۔ منکرینِ خدا کو بھی یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا نہیں ہے اور یہ اندھا نظام بادلوں کی طرح سے چل رہا ہے تو اس میں تبدیلی و تغیر کیوں نہیں؟ آج مشرق سے سورج نکلا، کل مغرب سے نکل آئے۔

(د) اگر (بفرضِ محال) زمین و آسمان میں خدا کے سوا چند معبود ہوتے، تو دونوں (یعنی زمین و آسمان) کبھی کے برباد ہو گئے ہوتے۔

یہ توحید کے لئے بہترین دلیل ہے۔ اگر سب امور میں سب خدا ایک ہی سا حکم دیتے، تو اتنے خداؤں کا ہونا بے کار تھا۔ اور اگر دو یا کئی خدا ہوتے تو ایک کا حکم دوسرا روک سکتا یا نہیں۔ اگر روک دیتا تو پہلا خدا عاجز و مجبور، اور اگر نہ روک سکتا تو یہ دوسرا خدا عاجز و مجبور کہلاتا۔

دھریت کیا ہے؟ یہ خود دھریوں کی زبانی سنئے:۔

ترجمہ:۔ دھریت کے یہ معنی ہیں کہ کسی طرح کے خدا میں اعتقاد نہ ہو۔ خدا کی کوئی بھی صفت سمجھی جائے۔ گویا دھریت تو صرف ایسی بدنظمی کا اعتقاد ہے۔ اگر اُس کو اعتقاد کہہ سکتے ہیں کہ جس میں انسان کو اندھے اتفاق کا کھلونا سمجھا جائے۔

(۱۰۲)۔ اصل ضمیمہ (۱۴)

کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی مختلف لوگوں نے مختلف صفات بیان کی

(102) R.G. Gordon: The Philosophy of a Scientist p. 80

Marfat.com

ہیں۔ یہاں تک کہ بُت پرستی میں بھی خدا کا تخیل تو ضرور ہے۔ دہریئے یا ملحد وُہ ہیں کہ جن کو ان میں سے کسی صفت کے خدا پر اعتقاد نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ان کے تصوّرات پر غور کیا جائے تو اُن کی رُو سے دُنیا ایک ایسی بدنظمی اور فساد کی جگہ ہو گی کہ جہاں انسان محض اتفاق کی رو میں بہتے ہوئے نظر آئیں گے۔

آج کل یہ بھی ایک فیشن ہو گئی ہے کہ تذبذب کی زندگی کو نہایت دانشمندانہ خیال کرتے ہیں۔ یعنی ہم کو خبر نہیں کہ خدا ہے یا نہیں ہے۔ خدا ہو بھی سکتا ہے اور خدا نہیں بھی ہو سکتا۔ اس حماقت کا نام عالمانہ عقلمندی رکھا گیا ہے اور AGNOSTICISM یعنی لا ادریت کا لقب دے کر فلسفہ کا ایک حصہ ان بنا لیا ہے۔ وُہ زندگی حیوانوں کی زندگی ہے۔ جس میں کوئی راسخ الاعتقادی و نہ وہ جس کے مطابق انسان اپنی زندگی کو مرتّب کرے۔ اس نہ اللذی نہ اولذی کی زندگی کو تو خسر الدنیا والآخرہ کہتے ہیں۔ نہ اس دنیا کے مزے اُٹھائے کہ شاید خدا ہو اور نہ آخرۃ کی تیاری کی کہ اگر خدا نہیں ہے تو یہ تکلیف کیوں اُٹھائیں۔ ایسی تذبذب کی زندگی انسان کے فعل و کردار پر عمل نہیں کر سکتی۔ وُہ مذہب جو انسان کے فعل پر اثر انداز نہ ہو، بے سُود ہے۔

قرآن شریف میں ان لوگوں کی نوعیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۔ ۴ : ۱۴۳

دہریوں کی ایک جماعت جناب رسول خدا صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان کے دلائل اور جناب رسولؐ خدا کے جوابات سُننے کے قابل ہیں۔ تفسیر جناب امام حسن عسکریؑ میں اس بحث کو کچھ تفصیل سے لکھا ہے:۔

احتج رسول الله صلعم فقال ما الذی دعاکم الی القول بان
الاشیاء لا بدأ لها وهی دائمة لم تزل ولا تزال فقالوا لانا لا نحکم
الا بما شاهدنا ولم نجد لها انقضاء وفناء فحکمنا بانها لا تزال فقال
رسول الله صلعم افوجدتم لها قدما او وجدتم لها بقاء
ابدا فان قلتم انکم وجدتم ذلک اثبتم لانفسکم لم تزالوا

تلک هیئتکم و عقولکم بلا نهایة ولا تزالون کذالک ولئن قلتم هذا دفعتم العیان وکذبکم العالمون الذین یشاهدونکم قالوا لم نشاهد لها قدما ولا بقاء ابد الآبدین قال رسول الله صلعم فلم صرتم بان تحکموا بالبقاء والقدم دائما لانکم لم تشاهدوا لحدوثها وانقضاءها اولی من تارک التمیز لها مثلکم فیحکم لها بالحدوث والانقضاء لانه لم یشاهد لها قدما ولا بقاء ابد الابد اولستم تشاهدون اللیل والنهار واحدهما بعد الآخر فقالوا نعم فقال اترونهما لم یزالا ولا یزالان فقالوا نعم فقال افیجوز عندکم اجتماع اللیل والنهار فقالوا لا فقال فاذن ینقطع احدهما عن الآخر فیسبق احدهما ویکون الثانی جاریا بعده قالوا کذلک هو فقال قد حکمتم بحدوث ما تقدم من لیل و نهار ولم تشاهدوهما فلا تنکروا الله قدرة ثم قال اتقولون ما قبلکم من اللیل والنهار متناه ام غیر متناه فان قلتم غیر متناه فقد وصل الیکم آخر بلا نهایة لاوله ان قلتم انه متناه فقد کان ولا شئ منهما قالوا نعم۔ قال لهم اقلتم ان العالم قدیم لیس بمحدث وانتم عارفون لمعنی ما اقررتم به وبمعنی ما جحدتموه قالوا انتم قال رسول الله صلعم فهذا الذی نشاهده من الاشیاء بعضها الی بعض یفتقر لانه لا قوام للبعض الا بما یتصل الیه کما تری البناء محتاجا بعض اجزائه الی بعض والا لم یتق و لم یستحکم وکذلک سائر ما ترون قال فان کان هذا المحتاج بعضه الی بعض ولقوته وتمامه هو القدیم فاخبرونی ان لو کان محدثا کیف کان یکون وکیف اذا کان تکون صفته یصفونه بها الا وهی موجودة فی هذا الذی زعموا انه قدیم فرجموا و قالوا استنظر فی امرنا۔

(منقول از ابطال مادیت تالیف علامہ سید محمد رضی زنگی پوری اعلی اللہ مقامہٗ)

ترجمہ: جناب رسولؐ خدا نے اُن دھریوں کی بحث کے جواب میں جو آپؐ کے

پاس بغرضِ مباحثہ آئے تھے، فرمایا کہ آخر کس بناء پر تم کہتے ہو کہ کائنات کی کوئی ابتداء نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ انہوں نے جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اس ہی چیز پر حکم لگاتے ہیں جس کو ہم نے دیکھا ہے۔ اور ہمارا فیصلہ فقط مشاہدہ پر مبنی ہے۔ ہم نے دیکھا تو اشیاءِ عالم کے لیئے حدوث نہ پایا (یعنی اُس کو ہمیشہ ایسا ہی پایا) اُس کو عدم سے وجود میں آتے ہوئے نہیں دیکھا) اور نہ اُس کو فنا ہوتے ہوئے دیکھا۔ لہٰذا ہم نے نتیجہ نکالا کہ وہ ازلی ہیں۔ اور ابدی ہیں۔ جناب رسولِ خدا نے سوال کیا کہ کیا تم نے ان کا ازلی ہونا دیکھا ہے؟ یا ان کے بقاء و دوام کا تم نے مشاہدہ کیا ہے؟ اگر تم کہو گے کہ ہاں ہم نے اُن کی ابتدا اور دوام کا مشاہدہ کیا ہے تو تمہارا یہ دعوٰے ہوا کہ تمہارے اجسام اور تمہارے عقول کے لیئے بھی کوئی نہایت نہیں۔ اور تم ہمیشہ اسی طرح رہو گے۔ اور اگر تم یہ کہو گے، تو عیان و ظاہر کی تم نے مخالفت کی۔ اور جو تم کو جانتے ہیں وہ تمہاری تردید کریں گے (یعنی جن کے سامنے تمہاری زندگی شروع ہوئی ہے اور جنہوں نے تمہاری حالت میں تغیر دیکھا ہے، وہ تمہارے اپنے لیئے دعوٰی قدم و بقاء کی تردید کریں گے)۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ ہم نے خود تو اُن اشیاء کی ابتداء اور انتہا (قدم و بقا) کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ تو جناب رسولِ خدا نے فرمایا کہ پھر تم کیوں اُن کے لیئے قدم و بقاء تجویز کرتے ہو؟ جب خود تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ (اور تم کہتے ہو کہ ہم اُسی چیز ہی کو تجویز کرتے ہیں جس کو ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے) بلکہ تمہارے اس حق تجویز سے اُس شخص کا حق فیصلہ زیادہ ہے جو تمہاری ہی طرح مشاہدہ کو اپنے حکم و تجویز کے لیئے ضروری سمجھتا ہوا یہ کہتا ہے کہ اشیاءِ عالم حادث اور فانی اور متغیر ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اُن میں قدم و بقاء نہیں دیکھا۔ کیا تم رات اور دن کو اور اُن کو یکے بعد دیگرے ہوتا نہیں دیکھتے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہاں: ہم دیکھتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا تمہاری رائے یہ ہے، کہ یہ رات دن اسیطرح ہوتے آئے ہیں اور اسی طرح ہوتے رہیں گے؟ اُنہوں نے کہا ہاں! آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر یہ ہے، تو تم نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے رات و دن پر یہ حکم کیونکر لگایا کہ وُہ حادث تھے۔ حالانکہ تم نے

اُن کا مشاہدہ نہیں کیا۔ (جب تُم یہ حکم بدون مشاہدہ محض عقل کی بناء پر لگا سکتے ہو تو) خدا کی اُس قدرت کا انکار نہ کرو کہ اُس نے اشیاء کو عدم سے پیدا کیا۔ جو رات و دن تم سے پہلے گزر چکے ہیں اُن کے متعلق کیا کہتے ہو۔ وہ متناہی تھی، یا غیر متناہی۔ اگر غیر متناہی کہو گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے پاس ایک ایسا آخر پہنچ گیا ہے جن کے اول کی کوئی انتہا نہیں ہے (اور یہ محال ہے) اور اگر یہ کہو گے کہ وُہ متناہی ہیں تو پھر تم اس بات کے قائل ہو گئے کہ خدا تھا۔ اور ان دونوں میں سے کوئی نہ تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کیا تم یہ کہتے ہو کہ عالم قدیم ہے۔ حادث نہیں ہے۔ اور تم اس قدم وحدوث کے معانی بھی جانتے ہو جس کا تم اقرار اور انکار کر رہے ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جن اشیاء عالم کو ہم دیکھ رہے ہیں اُن کی حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ ایک کو بغیر دوسرے کے قوام و استحکام نہیں ہے۔ جس طرح ایک عمارت کے کچھ ارکان دُوسرے ارکان کے محتاج ہوتے ہیں۔ بغیر اُن کے نہ نظم و ترتیب پا سکتے ہیں اور نہ مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح تمام اشیاء عالم کی حالت ہے جن کو تم دیکھتے ہو۔ اگر وہ چیزیں قدیم ہیں جو اپنے قوت اور کمال کے لیئے دُوسروں کی محتاج ہیں تو مجھے بتاؤ کہ اگر یہ چیزیں حادث ہوتیں تو کیسی ہوتیں۔ اس وقت اُن کی حالت کیا ہوتی۔ اس سوال پر وُہ لوگ حیران ہو گئے اور اُنہوں نے معلوم کر لیا کہ جو اوصاف حادث میں ہو سکتے ہیں، وُہ سب وُہ لوگ ان اشیاء میں موجود پائے ہیں جن کی بابت اُن کا دعوٰی ہے کہ وُہ قدیم ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ حادث میں وُہ کوئی اور اوصاف نہیں پاتے۔ لہٰذا خاموش ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم اپنے امر میں پھر نظر کریں گے۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اس سے بہتر بحث مادہ کے حادث و فانی ہونے کی نہیں ہو سکتی۔ اور جناب رسولؐ خدا نے ساتویں صدی عیسوی میں وہ ثابت کر دیا جواب بیسویں صدی میں سائنس نے معلوم کرنا شروع کیا ہے۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے وجوہ و اقسام کفر کے سلسلہ میں دہریت کو اس طرح بیان فرمایا ہے :-

فاما کفر الجحود بالربوبیة وھو قول من یقول لا رب ولا جنة ولا نار وھو قول صنف من الزنادقة یقال لھم الدھریہ وھم الذین یقولون وما یھلکنا الا الدھر وھو دین وضعوہ لانفسھم بالاستحسان منھم علٰے غیر تثبت منھم ولا تحقیق لشیٔ مما یقولون قال اللہ عزوجل "اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ"۔

ترجمہ:۔ کفر جحود وُہ ہے جس میں خدا کی ربوبیت ہی سے انکار کیا جاتا ہے اور یہ زنادقہ کی ایک جماعت کا قول ہے جن کو دھریہ کہتے ہیں۔ اور یہ وُہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم کو سوائے دھر کے اور کوئی نہیں مارتا۔ یہ اُن کا اپنا خودساختہ دین ہے جسے اُنہوں نے بغیر یقین اور تحقیق کے لیئے اپنے لیئے ایک خود ساختہ دین بنا لیا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت اُن کے پاس نہیں ہے۔ جو کچُھ وہ کہتے ہیں اُس کی تحقیق نہیں ہے۔ ان کے لیئے خداوند تعالےٰ فرماتا ہے: "ان ھم الا یظنون" یہ لوگ فقط اٹکل پچو باتیں کہتے ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے دھریوں اور زنادقہ کے خلاف بہت بڑا جہاد کیا ہے۔ احتجاج طبرسی میں یہ مفصّل درج ہے۔ ہم نے اُس میں کی ایک بحث کا اُردو ترجمہ اپنی کتاب نور المشرقین میں حیاۃ الصادقین میں نقل کیا ہے۔ دیکھو اُس کتاب کے صفحات ۲۹ لغایت ۴۵۔ یہاں اُس کو دوبارہ نقل کرنا بے جا طوالت کا باعث ہو گا۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کی دُو کتابیں دہریوں اور زنادقہ کے ردّ میں بہت مشہور ہیں۔ ایک کا نام توحید مفضل ہے اور دوسری کو کتاب اہلیلجیہ کہتے ہیں۔ توحید مفضل وُہ رسالہ ہے جو دھریوں کی تردید میں حضرت امامؑ موصوف نے اپنے خاص شاگرد مفضل بن عمر کو لکھوایا تھا۔ یہ کتاب مصر و استنبول میں شایع ہو چکی ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ ملا محمدؐ صالح قزوینی نے ۱۰۸۰ھ میں کیا تھا۔ اور ۱۳۲۵ھ میں اس کا اردو ترجمہ جناب مولوی سید محمدؐ ہارون صاحب اعلی اللہ مقامہٗ نے "توحید الائمہ" کے نام سے کیا۔ اس کو تمام وکمال علامہ مجلسی علیہ الرحمتہ نے بحار الانوار جلد دوم میں نقل کیا ہے۔ وہاں وُہ اس کتاب کے صفحات ۵۷ لغایت ۱۹۹ پر ہے۔

Marfat.com

کتاب اہلیلجیہ بھی جناب امامؑ موصوف کا وہ مراسلہ ہے جو دہریت کی تردید میں مفضل بن عمر کے خط کے جواب میں لکھ کر اُن کے پاس بھیجا تھا۔ یہ بھی علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ کی بحار الانوار جلد ثانی کے صفحات ۱۹۹ لغایت ۲۵۹ پر ہے۔ شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے بھی ان دونوں رسالوں کو اپنی کتاب التوحید میں نقل کیا ہے۔

ہر ایک شیعہ جو اپنے امام کے علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ ان دونوں کتابوں کو بہت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔

بولشوزم Bolshevism

دہریت کو اپنے بولشوزم پر بڑا فخر ہے۔ اور روس کی "کامیابی" کو مثال میں پیش کرتی ہے۔ نظام بولشوزم اس کلیہ پر مبنی ہے کہ انسان کا محرک عمل ہمیشہ اُس کا پیٹ رہا ہے۔ لہذا حکومت کا مقصد اولین اقتصادی اصلاح ہونا چاہیئے۔ لیکن غور تو کرو اس قانون جنگل میں جو دہریت پیش کرتی ہے، اصلاح اقتصادیات ممکن بھی ہے یا نہیں کوئی اصلاح بھی ممکن نہیں۔ اس میں تو خود غرضی اور طاقت ہی کی عملداری ہے۔

کہتے ہیں کہ روس نے اپنے یہاں کے نظام اقتصادیات کی اصلاح کر لی ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ روس کی حکومت صرف زبردستی و ظلم پر مبنی ہے۔ کے آمدی وکے بیر شدی۔ ابھی وہ نظام کتنے دن زیر عمل رہا ہے۔ پورے پچاس سال بھی نہیں ہوئے۔ وہ کوئی نظام نہیں ہے۔ مغربی یورپ کی دولت اور خود غرضی کے خلاف ردعمل ہے۔ اور دوسرے سرے پر چلا گیا ہے۔ انگریزی کی مثل صادق آئی کہ Extremes Meet ایک مخالف طریقے کی انتہا دوسرے کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہ ہی ہوا۔ وہ ہی خود غرضی رونما ہو گئی جس کے خلاف ردعمل تھا یہ تو دراصل ایک سیاسی طعمہ ہے جو جہلاء کے لیئے تیار کیا گیا ہے۔ اگر یہ محض اقتصادی نظام ہے کہ جس میں ہر ایک کو قوتِ لایموت مہیا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، تو اس کو ایک مذہب بنا کر سیاسی بلاک کیوں قائم کیئے گئے۔ چونکہ غریب طبقہ ہر ایک ملک میں ہوتا ہے اور اس کی کثرت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہی انسان کا پورا دشمن خود غرضی، غریبوں کو زیادہ غریب اور زیادہ مجبور رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہے

لہٰذا اہلِ روس کا محض یہ وعدہ کرنا کہ ہم سب کو روٹی دیں گے، لوگوں کو ان کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ یہ وعدہ نہ کبھی پورا ہوا ہے اور نہ پورا ہو سکتا ہے۔ یہ تو محض وُہ نمونہ ہے جس کا نقشہ مسلمانوں نے کھینچا ہے۔ کہ آخری زمانہ میں ایک شخص یا ایک قوم آئے گی، جس کا نام دجال ہو گا۔ اور وُہ لوگوں کو ایک ایسی دراصل غلیظ اور نظاہرا میٹھی شے پیش کرے گی کہ لوگ بھوک کے مارے اُس کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ دجال صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی بہت دھوکہ دینے والے کے ہیں۔ اور بولشوزم محض دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ دراصل یہ سیاسی تحریک ہے اور وسعت و استحکامِ حکومت اس کا مدّعا ہے۔ اپنے مُلک کے لوگوں کو سبز باغ دکھا اور بے شمار سیاسی اغراض کے کارخانوں میں اُنہیں مشغول کر کے اُن سے کام لیتے ہیں۔ کہتے یہ ہیں کہ ہمارے یہاں بے روزگاری نہیں ہے۔ سب کو روزی ملتی ہے۔ یہ بہلا پھسلا کر کہ تم اپنے ہی مُلک کا کام کر رہے ہو، اُن سے محنت لیتے ہیں۔ اُجرت محض اُتنی ہی دیتے ہیں کہ جتنی اُن کی زندگی کے لیئے کافی ہے اور اُن کی محنت کا سارا فائدہ اپنے خزانے میں رکھتے ہیں۔ نتیجہ وہ ہی ہے جو Capitalism کا ہوتا ہے نام بدلا ہوا ہے، شکل بدلی ہوئی ہے، بات وہ ہی ہے۔ صرف فرق اتنا ہے، کہ وہاں Capitalist (سرمایہ دار) افراد تھے، یہاں حکومت ہے۔ یہ کہنا کہ انسان کا محرک عمل ہمیشہ اسی کا پیٹ رہا ہے عام آدمیوں پر حاوی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ :-

چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

لیکن عموماً اگر اس کو حاوی کرنا چاہو گے اور خاص و عام کی کوئی تخصیص نہ ہو گی، تو قطعاً اور یقیناً یہ وُہ تاریخی غلطی ہو گی جو ایک احمق ہی کر سکتا ہے۔ ہر ملک میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے محض حق کی خاطر اپنی عزیز ترین شے کو قربان کر دیا ہے نہ تلواروں سے ڈرے اور نہ قید خانوں سے اور نہ ہسپانیہ کی Inquisition سے۔ اگر عیسائیوں تک کربلا کے میدان اور بغداد کے قید خانوں کی خبریں نہیں پہنچیں تو حضرت عیسیٰؑ اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال اور دیگر عاشقانِ مسیحیت کی خبریں تو ضرور پہنچی ہوں گی۔ کیا وُہ سب پیٹ کی خاطر تھا۔ کہتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے

Marfat.com

دنیا میں بہت کشت وخون ہوا ہے۔ اس میں بھی ذرا غور وفکر و تمیز کرنے کی ضرورت ہے اگر تاریخ عالم کا مطالعہ صحیح طریقہ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کے نام پر لڑنے والے اکثر وہ تھے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں اپنی ہوس ملک گیری کو پورا کرنا چاہا تھا۔ اور اس میں مسیحیت اور اسلام میں کچھ فرق نہیں ہے۔ لیکن کشت وخون دنیا میں کب نہیں ہوا۔ مذہب کے پہلے بھی یہ کشت وخون جاری تھا اور اب کہ جب مذہب کی طاقت بالکل دنیا سے معدوم ہو گئی ہے، اب بھی جاری ہے اور بڑے اعلےٰ پیمانہ پر، اور صریح ظلموں کے ساتھ۔

اقتصادی نظام جو بولشوزم نے ایجاد کیا ہے، محض دھوکہ ہے۔ اور ایک ہنگامی کامیاب دھوکہ سے زیادہ اس کی زندگی نہیں ہوگی۔ اب ہی سے اس کے گرنے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ یہ مضمون ایک مستقل اور ضخیم رسالہ چاہتا ہے اور یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ہاں اس سلسلہ میں مناسب مقام پر ہم اسلام کا اقتصادی نظام ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

دہریت کی دیگر وجوہات:- دہریت کی مندرجہ بالا بحث محض سائنسی اور سیاسی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہیں۔ جو ان دہریوں کے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ اپنی دہریت پر قائم ہیں۔ وہ چار ہیں:-

(۱) اسباب وعلل کے پردے۔

(۲) دنیا میں شر کی موجودگی اور بسا اوقات اُس کی ظاہری کامیابی۔

(۳) دنیا میں ظلم کی فراوانی اور کوتاہ بین نظروں میں ظالم کا بسا اوقات پھولنا پھلنا۔

(۴) یورپ میں مسیحیت سے سائنس کی آویزش اور اس مذہب کی کمزوری۔

ان میں سے ۴ پر ہم بحث کر چکے ہیں اور نمبر ۱، ۲، ۳ کی بحث کی مناسب جگہ فلسفۂ اسلام کے عنوان کے نیچے ہے۔ جو اس کتاب کا حصہ دوم ہے۔ ان امور پر ہم اس جگہ قرآن اور اقوالِ آئمہ علیہم السلام سے بحث کریں گے۔ لیکن یہاں بھی اختصار کے ساتھ اس کی توجیہ کرتے ہیں۔

نظامِ عالم کے علاوہ دنیا میں دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان خدا کی ہستی اور عقبےٰ کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک تو مجبوری جس کا سب سے بڑا مظاہرہ

Marfat.com

موت ہے۔ اور دوسرے ظلم۔ دُنیا کے کسی گوشہ میں کسی ملک میں انسان کو ان دو باتوں سے چھٹکارا نہیں۔ موت بسا اوقات ایسی بے وقت آتی ہے کہ اس کے سبب گھر کے گھر دریائے غم میں ڈوب جاتے ہیں۔ ظلم تو دنیا کی ہوا میں بس گیا ہے۔ اگر مظلوم کی داد رسی نہیں اور ظالم سے انتقام نہیں لیا جاتا اور موت نے جو خاندان برباد کئے تھے اس کا معاوضہ نہیں، تو پھر دنیا کا ایک لمحہ بھی قائم رہنا بے سود ہے۔ اور عقلمندوں کے لئے سوائے خودکشی کرنے کے چارہ نہیں۔ اب یہ غور کرنا چاہئیے کہ انسان کے اندر جو موت کو ہر ممکن طریقے سے دُور رکھنے اور زندگی کو ہر ممکن طریقے سے قائم رکھنے کا جذبہ ہے، وُہ کیوں ہے؟ یا تو وُہ جذبہ غلطی سے فطرت انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یا دنیا میں نہ ظلم ہے، نہ موت ہے، نہ مجبوری ہے۔ انسان اس لئے جینا چاہتا ہے ایک شخص ہر قسم کے مصائب سے دوچار ہے۔ لیکن پھر بھی وُہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ایک شخص ہر قسم کے امراض میں گھرا ہوا ہے۔ پھر بھی وُہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ انسان کی زندگی کا ناقابلِ برداشت ہو جانا۔ لیکن پھر بھی اُس کی خواہش زندگی کا قائم رہنا ایسی دو متضاد باتیں ہیں کہ جب تک اس کی توجیہ نہ کی جائے معمہ حل نہیں ہوتا جیسا ہم اُوپر ثابت کر چکے ہیں۔ دہریت اور سائنس کو یہ معلوم ہی نہیں کہ دنیا میں زندگی کیونکر آئی، تو پھر وُہ کیونکر بتا سکیں گے کہ ایک ایسا جذبہ یعنی خواہش زندگی کیوں فطرت انسانی میں آن کر راسخ ہو گیا۔ جس جذبہ کی موجودگی کا اس کا ماحول کسی صورت میں متقاضی نہیں ہے۔ یا تو جذبہ نہ ہوتا، یا یہ ماحول ایسا نہ ہوتا کہ جیسا ہے۔ یہ دونوں متضاد چیزیں کیوں ایک ساتھ ہیں۔ دہریت اس کی توجیہ نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس کی توجیہ ایسی عمدگی سے کی ہے کہ اُس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ جذبہ (خواہش زندگی) خداوند تعالےٰ نے کائنات کی فطرت میں اس وجہ سے داخل کیا ہے کہ وُہ اس کے قیام کے لیئے ضروری تھا۔ اور کائنات کو قائم رکھنا خداوند تعالےٰ کی مشیت میں تھا۔ دُوسری اور سب سے بڑی وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہوتی۔ اس کا سلسلہ عاقبت کی زندگی سے ملا ہوا ہے اور عاقبت کی زندگی پر دُنیا کی زندگی کا اثر پڑتا ہے۔ مصائب برداشت کرکے انسان کے مدارج عاقبت میں بڑھ جائیں یا اس دُنیا کے سیئات اور گناہاں کا اتنا کفارہ ہو جائے کہ مرتے

وقت وہ شخص ہلاک مرے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ خدا رحمان بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اصلی زندگی عاقبت کی زندگی ہے جو دیر پا ہوگی۔ اس دنیا کی زندگی محض خیال ہی خیال ہے، اور بہت قلیل ہے۔ کتنا زمانہ ہم سے پہلے گزر گیا۔ کتنا زمانہ ہمارے بعد آئے گا۔ اس کے مقابلہ میں ہماری زندگی کیا ہے۔ کچھ نہیں۔ شاعر نے سچ کہا ہے کہ ؎

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا   چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

غالب نے بہت نکتہ کی بات کہی ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس لیئے خداوند تعالےٰ انسان کو دائمی راحت و آرام کے لیئے مستحق بنا رہا ہے اور یہ استحقاق اور امتحانِ ایمان محض صبر و برداشت و رضا بقضاء الٰہی ہوتا ہے۔ اس کے لیئے ابتلاؤ مصائب سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ جواب ہو گیا دہریت کے اس اعتراض کا بھی کہ "دنیا میں شر و ظلم کیوں ہے۔" نیکی کی قدر کیا تھی اگر شر نہ ہوتی، اور عدل کی قیمت کیا تھی اگر ظلم نہ ہوتا؟ اور پھر انسان کو عافیت کی راحت کا استحقاق کہاں سے ہوتا۔ قرآن شریف کہتا ہے:-

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ـ (۴۵:۲۲)

خداوند تعالےٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اور تاکہ ہر ایک نفس کو اس کی جزا ملے جو اُس نے کیا ہے۔ اور اُن پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے:

۱- مادہ فانی ہے اور غیر مرئی ہے۔

۲- تمام عالم برق کی ایک لہر ہے جو روحانیتِ محض ہے۔ اور مادیت سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

۳- انسانی روح بھی ایک برقی لہر ہے جس کو جسم میں آنے کی وجہ سے ایک شکل و صورت مل گئی۔

۴- تمام کائنات ایک وحدت کا پرتو ہوا۔ اس میں دوئی کو جگہ نہیں۔

۵۔ تمام حیوانات بلکہ نباتات بھی جن میں نشوونما ہے، اس ہی وحدت کے اصول پر بنائے گئے ہیں۔ سب کی ترکیب و ساخت و زندگی کے اصول ایک ہی ہیں۔ غذا کھانا، فضلہ نکلنا، خون بننا، خون سے تمام جسم کی آبیاری ہونی۔ جزئیات میں اختلاف ہے اصول پیدائش و نشوونما ایک ہی ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے اندرونی اعضاء بھی ایک ہی اصول پر مبنی کیئے گئے ہیں۔ دل، دماغ، جگر، معدہ وغیرہ اور جریان خون سب میں پائے جاتے ہیں۔ جب ہی تو یہ ممکن ہوا ہے کہ اطباء نے جانوروں پر تجربے کر کے آدمیوں کے لیئے ادویہ مرتب کی ہیں۔ یہاں تک کہ اجرام فلکی کی گردشیں بھی کائنات (جمادات، نباتات، حیوانات) کے ہر ذرہ میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ہر ایک ایٹم میں Electrons اسی طرح Proton کے گرد گردش کرتے ہیں جس طرح سبعہ سیارہ آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اور آفتاب کی طرح Proton بھی متحرک ہے۔ گویا انسان کے ہر ذرہ میں تمام اجرام فلکی کا نمونہ موجود ہے۔ اور خود انسان ہی تمام کائنات کا نقشہ ہے۔ وہ ہی دریا، وہ ہی پہاڑ و پتھر ہڈیوں کی شکل میں، وہ ہی نور روح کی شکل میں وہ ہی ایک حاکم اور اُس کے متفرق کارکنان، یعنی دماغ و جوارح۔ یہ حکومت کا نمونہ ہوا۔ اس کے اعضاء کی خون سے آبیاری ہوتی ہے۔ تمام کائنات کا ایک خالق ہے اُس ہی خدا کا ایک نمونہ یا نائب رُوح انسان میں ہے۔ جب ہی تو فرمایا گیا کہ نفخت فیہ من روحی۔

۶۔ مخلوق کی یہ زبردست وحدانیت خالق کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

۷۔ وہ برقی لہر جو تمام کائنات کی بنیاد ہے، خود مخلوق ہے کیونکہ برق کے لیئے ایک برق پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے۔

۸۔ جب مادہ فانی ہوا تو مادیت نہ رہی۔ چونکہ برقی لہر ایک قسم کی نور ہے جو ہستیٔ اعظم کے کُن کہنے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

۹۔ اندریں صورت رُوحانیت نے فلسفۂ انسانی میں مادیت کی جگہ لے لی۔

۱۰۔ اہلِ سائنس نہیں جانتے کہ زندگی کیونکر پیدا ہوئی۔

۱۱۔ اہلِ سائنس کو یہ بھی نہیں معلوم، نہ معلوم ہو سکتا ہے کہ باوجود سورج کے ہر سیکنڈ میں کروڑوں ٹن وزن و جسم خرچ کرنے کے کس طرح اور کہاں سے یہ کمی پوری ہوتی ہے

Marfat.com

اور بہت سی باتیں ہیں جو سائنس کو نہیں معلوم ہیں اور نہ معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور اس کا اقرار یہ بار بار کر چکے ہیں۔

۱۱۔ جب دہریت کائنات کی توجیہ نہیں کر سکتی، تو یہ کیونکر کہہ سکتی ہے کہ خدا نہیں ہے حالانکہ اس دعوے کے ثابت کرنے کا بارِ ثبوت دہریت پر ہے۔

۱۲۔ اسلام کائنات کی توجیہ کرتا ہے، اس کے ہر نظام کی جزئیات کو بتاتا ہے۔

۱۴۔ اہل دہریت کے ضابطہ میں انسان اور اس کی زندگی کی کچھ قدر نہیں۔ ان کے نزدیک انسان اور ایک گوبر کا کیڑا برابر ہے، اور یہ صریحاً غلط ہے۔

۱۵۔ دہریت میں عدل اور جزائے صبر کی کوئی جگہ نہیں اور نہ انتقام ظلم ہے۔ اس کا اعتقاد فقط طاقت کی حکومت پر ہے۔

۱۶۔ اہل دہریت کے عقائد فتنہ و فساد پر منتج ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب ظلم و جور و زیادتی کے لیے کوئی سزا نہیں اور نہ مظلوم کے لیئے کوئی جزا، تو پھر کیوں نہ لوگ ظلم اور استعمال طاقت کے ذریعہ سے کمزوروں کو دبا کر اپنا فائدہ کریں۔ اور یہ کشمکش فتنہ و فساد کی طرف لے جائے گی۔ یہ جواب کافی نہیں ہے کہ ظلموں کی سزا کے لیئے حکومت مقرر ہے، کیونکہ ظلموں کی اکثریت حکومت کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اور جو ظلم و جرائم اُس کی نظر میں آ بھی جاتے ہیں تو حکام کی نااہلی اور رشوت ستانی اور طرفداری بے جا اور مجرم کا رسوخ و دولت مجرم کو سزا سے بچا دیتی ہیں۔ علاوہ اس کے ہر ایک ظلم کی نوعیت مجموعہ ضابطہ تعزیرات میں نہیں ہے اور نہ آ سکتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مجرم کو سزا دے دی۔ مظلوم کی صحیح دادرسی تو نہ ہوئی۔ اور اگر حکومت ان جرائم کا معاوضہ مستحقین کو دینے لگے تو اس کے لیئے روپیہ کہاں سے لائے۔

اب ہم جناب امیر علیہ السلام کے چند خطبے نقل کرتے ہیں۔ ان کو بہت غور و فکر سے مطالعہ کیجیے۔ ان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کے بعد کوئی شخص دہریہ نہیں رہ سکتا۔ اور اب بھی اگر وہ دہریت پر ضد کرتا ہے تو اس کی ضد وہی شیطان کی ضد ہے کہ آدمؑ کو سجدہ نہ کیا اور دائمی لعنت اور عذاب قبول کر لیا۔

دہریوں کی حالت ایسی ہوتی ہے:۔ وَهُوَ فِي مُهْلَةٍ مِنَ اللّٰهِ يَهْوِي مَعَ الْغَافِلِينَ وَيَغْدُو مَعَ الْمُذْنِبِينَ، بِلَا سَبِيلٍ قَاصِدٍ وَلَا إِمَامٍ قَائِدٍ،

Marfat.com

حَتّٰی اِذَا کَشَفَ لَهُمْ عَنْ جَزَاءِ مَعْصِيَتِهِمْ، وَاسْتَخْرَجَهُمْ مِنْ جَلَابِيبِ غَفْلَتِهِمْ، اسْتَقْبَلُوا مُدْبِرًا، وَاسْتَدْبَرُوا مُقْبِلًا فَلَمْ يَنْتَفِعُوا بِمَا اَدْرَكُوا مِنْ طَلِبَتِهِمْ، وَلَا بِمَا قَضَوْا مِنْ وَطَرِهِمْ!

"نہج البلاغہ محمد عبدہ الجزء الثانی صد ۵۵"

ترجمہ۔ خداوند تعالیٰ اس گمراہ شخص کو (بذریعہ تاخیر اجل) مُہلت دیتا ہے کہ وُہ اپنے جیسے غافلوں کی راہ چلے اور گنہگاروں کے ساتھ اپنے دن گزارے بغیر مقصد کے اور بغیر کسی ہادی کے راہ چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب خداوند تعالیٰ ان کے معصیت کے نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی غفلت کے پردوں میں سے اُن کو نکالتا ہے (یعنی جب اُن کو موت آتی ہے)، تو وُہ اُس کی طرف جو اُن کو سامنے نظر آتا ہے، مُنہ موڑ کر جاتے ہیں (یعنی وُہ اُن کو بُرا لگتا ہے) اور جس کو پیچھے چھوڑتے ہیں (یعنی دُنیا) اُس کو (حسرت د) رغبت سے مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے ہیں۔

(اس کا یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے:-)

[تو اُنہوں نے آخرت کی طرف رُخ کیا۔ حالانکہ (دُنیا میں) اُس کی طرف پُشت کیئے ہوئے تھے۔ اور دُنیا کی اُن دولتوں کی طرف سے پیٹھ پھرالی جن کی طرف دُنیا میں مُنہ کیئے تھے] پس اُس سے جو دُنیا میں لذت وخوشی حاصل کی تھی فائدہ نہ حاصل کر سکے۔ اور اپنی حاجتوں کے موافق جو کچھ بھی پیدا کیا اُس سے کچھ بھی اُنہیں نفع نہ پہنچا۔ (ختم ہوا ترجمہ)

ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں:-

فَاِنَّ الْغَايَةَ اَمَامَكُمْ وَاِنَّ وَرَاءَكُمُ السَّاعَةَ تَحْدُوكُمْ تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا فَاِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِاَوَّلِكُمْ اٰخِرُكُمْ۔ (خطبہ ۲۱ الجزء الاول شرح محمد عبدہ)

سید رضیؒ جامع نہج البلاغہ کہتے ہیں کہ انسان کا کلام ایسا مختصر اور ایسا بلیغ کبھی سُننے میں نہیں آیا۔ کلام اللہ اور کلام رسولؐ کے بعد بلیغ ترین کلام ہے۔

ترجمہ:- تمہاری زندگی کی غایت و ماحصل آگے ہے۔ اور تمہیں پیچھے سے قیامت ہنکاتی ہوئی لا رہی ہے۔ (اس سفر عجلت میں اپنے تئیں گناہوں سے) ہلکا رکھو۔ تاکہ اُن لوگوں سے تم مل جاؤ جو تم سے پہلے جا چکے ہیں اور اعمالِ

Marfat.com

نیک کا عوض پا چکے ہیں۔ قیامت انتظار کر رہی ہے تمہارے اول جانے والے سے لے کر تمہارے آخر تک کا۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اس خطبہ کے پڑھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں:۔

فَاِنَّکُمْ لَوْ عَایَنْتُمْ مَا قَدْ عَایَنَ مَنْ مَّاتَ مِنْکُمْ لَجَزِعْتُمْ وَوَهِلْتُمْ وَ سَمِعْتُمْ وَاَطَعْتُمْ وَلٰكِنْ مَحْجُوْبٌ عَنْكُمْ مَا قَدْ عَایَنُوْا، وَقَرِیْبٌ مَا یُطْرَحُ الْحِجَابُ وَلَقَدْ بُصِّرْتُمْ اِنْ اَبْصَرْتُمْ، وَاُسْمِعْتُمْ اِنْ سَمِعْتُمْ وَ هُدِیْتُمْ اِنِ اهْتَدَیْتُمْ، بِحَقٍّ اَقُوْلُ لَكُمْ لَقَدْ جَاهَرَتْكُمُ الْعِبَرُ وَزُجِرْتُمْ بِمَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ وَمَا یُبَلِّغُ عَنِ اللّٰهِ بَعْدَ رُسُلِ السَّمَآءِ اِلَّا الْبَشَرُ۔

(نہج البلاغۃ شرح محمد عبدہ خطبہ ۱۹ حصہ اول)

ترجمہ:۔ اگر تم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو انہوں نے بچشم خود دیکھا جو تم میں سے پہلے مر چکے ہیں تو یقیناً تم جزع و زاری کرتے اور اوامر و نواہی خداوند تعالیٰ کو سنتے، اور اُن کی اطاعت کرتے۔ لیکن جو کچھ ان مرنے والوں نے دیکھا ہے وہ تمہاری آنکھوں سے پنہاں ہے۔ اور نزدیک ہے کہ (اب تمہاری آنکھوں پر سے بھی) پردے اُٹھائے جائیں اور بتحقیق اب بھی تمہیں دکھا دیا گیا ہے، اگر تم دیکھو۔ تمہیں سُنا دیا گیا ہے، اگر تم سُنو۔ تمہیں ہدایت کی گئی ہے، اگر تم ہدایت پاؤ۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ دُنیا کی عبرتوں نے (حالِ رفتگان تم پر) آشکارا کر دیا ہے۔ تمہیں زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ اور تم اس چیز سے منع کر دیئے گئے جس سے منع کر دیا جانا ضروری تھا۔ پروردگار کی جانب سے رسولانِ آسمان (یعنی ملائکہ) کے بعد انسان کے سوائے کسی اور نے تبلیغِ رسالت نہیں کی (ختم ہوا ترجمہ)

ایک اور خطبہ میں آپ فرماتے ہیں:۔

فَاِنَّهٗ وَاللّٰهِ الْجِدُّ لَا اللَّعِبُ، وَالْحَقُّ لَا الْكَذِبُ، وَمَا هُوَ اِلَّا الْمَوْتُ قَدْ اَسْمَعَ دَاعِیْهِ وَاَعْجَلَ حَادِیْهِ فَلَا یَغُرَّنَّكَ سَوَادُ النَّاسِ مِنْ نَفْسِكَ فَقَدْ رَاَیْتَ مَنْ كَانَ قَبْلَكَ مِمَّنْ جَمَعَ الْمَالَ، وَحَذِرَ الْاِقْلَالَ وَاَمِنَ الْعَوَاقِبَ طُوْلَ اَمَلٍ وَاسْتِبْعَادَ اَجَلٍ، كَیْفَ نَزَلَ بِهِ الْمَوْتُ فَاَزْعَجَهٗ عَنْ وَطَنِهٖ وَاَخَذَهٗ مِنْ مَّاْمَنِهٖ مَحْمُوْلًا عَلٰى اَعْوَادِ الْمَنَایَا، یَتَعَاطٰى بِهِ الرِّجَالُ الرِّجَالَ حَمْلًا عَلَى الْمَنَاكِبِ، وَاِمْسَاكًا بِالْاَنَامِلِ اَمَا رَاَیْتُمْ

اَلَّذِيْنَ يَأْمُلُوْنَ بَعِيْدًا، وَيَبْنُوْنَ مَشِيْدًا، وَيَجْمَعُوْنَ كَثِيْرًا، كَيْفَ اَصْبَحَتْ بُيُوْتُهُمْ قُبُوْرًا، وَمَا جَمَعُوْا بُوْرًا، وَصَارَتْ اَمْوَالُهُمْ لِلْوَارِثِيْنَ، وَاَزْوَاجُهُمْ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَا فِيْ حَسَنَةٍ يَزِيْدُوْنَ، وَلَا مِنْ سَيِّئَةٍ يَسْتَعْتِبُوْنَ؟ فَمَنْ اَشْعَرَ التَّقْوٰى قَلْبَهٗ بَرَّزَ مَهَلَهٗ وَفَازَ عَمَلُهٗ، فَاهْتَبِلُوْا هَبَلَهَا وَاعْمَلُوْا لِلْجَنَّةِ عَمَلَهَا فَاِنَّ الدُّنْيَا لَمْ تُخْلَقْ لَكُمْ دَارَ مُقَامٍ، بَلْ خُلِقَتْ لَكُمْ مَجَازًا لِتَزَوَّدُوْا مِنْهَا الْاَعْمَالَ اِلٰى دَارِ الْقَرَارِ۔ فَكُوْنُوْا مِنْهَا عَلٰى اَوْفَازٍ وَقَرِّبُوا الظُّهُوْرَ لِلزِّيَالِ۔

(نہج البلاغۃ۔ خطبہ ۱۲۸)

ترجمہ:۔ قسم بخدا یہ (موت) بہت اہم و بزرگ شے ہے۔ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ حق ہے، جھوٹ نہیں۔ جس کو یہ پکارتا ہے اُسے سُننا پڑتا ہے۔ جس کو یہ ہنکاتا ہے اُسے جلدی کرنی پڑتی ہے۔ پس لوگوں کی تیرے لیئے اطاعت تجھ کو مغرور نہ کرے یعنی دھوکہ میں نہ ڈالے۔ تو نہیں دیکھتا کہ تجھ سے پہلے کتنے لوگ جنہوں نے مال وافر جمع کیا تھا فقر و مفلسی سے دُور بھاگتے تھے۔ مآلِ کار کو بھولے ہوئے لمبی چوڑی آرزوئیں لیئے بیٹھے تھے اور موت کو بہت دُور سمجھتے تھے، کس طرح موت نے اُن کو آدبوچا اور اُن کو اُن کے وطن سے نکال باہر کیا۔ اور اُن کی جائے امن میں جا کر اُن کو پکڑ لیا۔ اب وہ بانس کی کھپچیوں کے تابوت میں لوگوں کے کندھوں پر اُٹھائے جاتے ہیں اور اُٹھانے والے کندھا بدلتے جاتے ہیں۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا کہ کثرت خواہشات رکھتے تھے، مضبوط گھر بناتے تھے، مال جمع کرتے تھے اور حکومت کرتے تھے۔ کس طرح وہ قبریں ڈال دیئے گئے اور جو اُنہوں نے جمع کیا تھا وہ برباد ہوگیا۔ اُن کا مال اُن کے وارثوں کے پاس چلا گیا۔ اُن کی بیویوں پر دوسروں نے قبضہ کر لیا۔ وہ نیکی میں زیادتی نہیں کرتے، بدی سے پرہیز نہیں کرتے۔ جس نے تقوٰی و پرہیزگاری اختیار کی، خیر و نیکی میں دوسروں سے بڑھ گئے وہ ہی رستگار ہوئے۔ پس غنیمت جانو اس مہلت کو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ اور وہ کام کرو، جن سے بہشت تمہیں نصیب ہو۔ کیونکہ یہ دنیا تمہاری اقامت اور ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ بلکہ یہ تو گزرگاہ ہے کہ یہاں سے توشہ لے کر

Marfat.com

دائمی قرار گاہ کی طرف چلو۔ پس کوچ کرنے کے لیئے جلدی کرو، اور سفر کے لیئے اپنے مرکبوں کو تیار رکھو۔ (ختم ہوا ترجمہ)

ایک خطبہ میں یوم حساب سے ڈراتے ہیں، اور قبر کی وحشت و تاریکی کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عِبَادَ اللّٰہِ اِنَّ الدَّھْرَ یَجْرِیْ بِالْبَاقِیْنَ کَجَرْیِہٖ بِالْمَاضِیْنَ، لَا یَعُوْدُ مَا قَدْ وَلّٰی مِنْہُ، وَلَا یَبْقٰی سَرْمَدًا مَا فِیْہِ، اٰخِرُ فَعَالِہٖ کَاَوَّلِہٖ، مُتَسَابِقَۃٌ اُمُوْرُہٗ، مُتَظَاھِرَۃٌ اَعْلَامُہٗ فَکَاَنَّکُمْ بِالسَّاعَۃِ تَحْدُوْکُمْ حَدْوَ الزَّاجِرِ بِشَوْلِہٖ فَمَنْ شَغَلَ نَفْسَہٗ بِغَیْرِ نَفْسِہٖ تَحَیَّرَ فِی الظُّلُمَاتِ، وَارْتَبَکَ فِی الْھَلَکَاتِ وَمَدَّتْ بِہٖ شَیَاطِیْنُہٗ فِیْ طُغْیَانِہٖ، وَزَیَّنَتْ لَہٗ سَیِّئَ اَعْمَالِہٖ، فَالْجَنَّۃُ غَایَۃُ السَّابِقِیْنَ، وَالنَّارُ غَایَۃُ الْمُفَرِّطِیْنَ۔

اِعْلَمُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اَنَّ التَّقْوٰی دَارُ حِصْنٍ عَزِیْزٍ، وَالْفُجُوْرَ دَارُ حِصْنٍ ذَلِیْلٍ۔ لَا یَمْنَعُ اَھْلَہٗ، وَلَا یُحْرِزُ مَنْ لَجَاَ اِلَیْہِ۔ اَلَا وَبِالتَّقْوٰی تُقْطَعُ حُمَۃُ الْخَطَایَا، وَبِالْیَقِیْنِ تُدْرَکُ الْغَایَۃُ الْقُصْوٰی۔

عِبَادَ اللّٰہِ اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَعَزِّ الْاَنْفُسِ عَلَیْکُمْ، وَاَحَبِّھَا اِلَیْکُمْ، فَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَوْضَحَ لَکُمْ سَبِیْلَ الْحَقِّ وَاَنَارَ طُرُقَہٗ فَشِقْوَۃٌ لَازِمَۃٌ اَوْ سَعَادَۃٌ دَائِمَۃٌ۔ فَتَزَوَّدُوْا فِیْ اَیَّامِ الْفَنَاءِ لِاَیَّامِ الْبَقَاءِ، فَقَدْ دُلِلْتُمْ عَلَی الزَّادِ۔ وَاُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَحُثِثْتُمْ عَلَی السَّیْرِ۔ فَاِنَّمَا اَنْتُمْ کَرَکْبٍ وُقُوْفٍ لَا تَدْرُوْنَ مَتٰی تُؤْمَرُوْنَ بِالسَّیْرِ۔

اَلَا فَمَا یَصْنَعُ بِالدُّنْیَا مَنْ خُلِقَ لِلْاٰخِرَۃِ؟ وَمَا یَصْنَعُ بِالْمَالِ مَنْ عَمَّا قَلِیْلٍ یُسْلَبُہٗ وَتَبْقٰی عَلَیْہِ تَبِعَتُہٗ وَحِسَابُہٗ؟

عِبَادَ اللّٰہِ! اِنَّہٗ لَیْسَ لِمَا وَعَدَ اللّٰہُ مِنَ الْخَیْرِ مَتْرَکٌ، وَلَا فِیْمَا نَھٰی عَنْہُ مِنَ الشَّرِّ مَرْغَبٌ! عِبَادَ اللّٰہِ، اِحْذَرُوْا یَوْمًا تُفْحَصُ فِیْہِ الْاَعْمَالُ وَیَکْثُرُ فِیْہِ الزِّلْزَالُ، وَتَشِیْبُ فِیْہِ الْاَطْفَالُ۔

اِعْلَمُوْا عِبَادَ اللّٰہِ! اَنَّ عَلَیْکُمْ رَصَدًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ، وَعُیُوْنًا مِّنْ جَوَارِحِکُمْ وَحُفَّاظَ صِدْقٍ یَحْفَظُوْنَ اَعْمَالَکُمْ وَعَدَدَ اَنْفَاسِکُمْ لَا

Marfat.com

تَسْتُرُکُمْ مِنْهُمْ ظُلْمَةُ لَیْلٍ دَاجٍ وَلَا یُکِنُّکُمْ مِنْهُمْ بَابٌ ذُوْ رِتَاجٍ وَاِنَّ غَدًا مِنَ الْیَوْمِ قَرِیْبٌ۔

یَذْهَبُ الْیَوْمُ بِمَا فِیْهِ، وَیَجِیْءُ الْغَدُ لَاحِقًا بِهٖ، فَکَاَنَّ کُلَّ امْرِیٍٔ مِنْکُمْ قَدْ بَلَغَ مِنَ الْاَرْضِ مَنْزِلَ وَحْدَتِهٖ۔ وَمَخَطَّ حُفْرَتِهٖ فَیَالَهٗ مِنْ بَیْتِ وَحْدَةٍ، وَمَنْزِلِ وَحْشَةٍ، وَمُفْرَدِ غُرْبَةٍ! وَکَاَنَّ الصَّیْحَةَ قَدْ اَتَتْکُمْ، وَالسَّاعَةَ قَدْ غَشِیَتْکُمْ وَبَرَزْتُمْ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ قَدْ زَاحَتْ عَنْکُمُ الْاَبَاطِیْلُ وَاضْمَحَلَّتْ عَنْکُمُ الْعِلَلُ وَاسْتَحَقَّتْ بِکُمُ الْحَقَائِقُ وَصَدَرَتْ بِکُمُ الْاُمُوْرُ مَصَادِرَهَا، فَاتَّعِظُوْا بِالْعِبَرِ، وَاعْتَبِرُوْا بِالْغِیَرِ وَانْتَفِعُوْا بِالنُّذُرِ۔ (نہج البلاغۃ شرح محمد عبدہ خطبہ ۱۵۳)

ترجمہ:۔ اے خدا کے بندو! دُنیا کی روش باقی رہنے والوں کے ساتھ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اُس کی روش گزر جانے والوں کے ساتھ تھی۔ زندگی کا جو حصہ یا جو وقت گزر گیا، پھر وُہ واپس نہیں آتا۔ اور جو آب ہے وُہ ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے (یعنی اس کی خوشی و رنج ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں) آنے والوں کے ساتھ دنیا کی رفتار ویسی ہی ہے جو اس سے پہلے گزرنے والوں کے ساتھ تھی۔ اس کے مصائب مسلسل ہیں، اور اس کے حوادث ایک دوسرے کے معین و مددگار ہیں۔ مفتی الاسلام نے ان دو جملوں کے یہ معنی لیئے ہیں: کارہائے آں زدو نابود میگردد، لیکن خردمند از گردشِ روزگار عبرت گرفتہ بآں دل نہ بندد۔) پس سمجھ لو کہ تم قیامت میں حاضر ہو کیونکہ زمانہ تم کو اس طرح ہنکا رہا ہے جس طرح ہنکانے والا ماندنیوں کو ہنکاتا ہے جن کا دودھ سوکھ چکا ہو۔ پس جس نے اپنے تئیں ماسوا (دنیا کی آرائشوں) میں مشغول کر لیا، وہ بدبختی کی تاریکی میں سرگرداں ہو گیا۔ اور ہلاکت میں پھنس گیا۔ اس کے گمراہ کرنے والے شیطانوں نے اُسے سرکشی پہ آمادہ کر دیا، اور اس کے کردارِ بد کو اس کی نگاہوں میں خوشگوار بنا دیا۔ پس جنّت انجام ہے اُن کا جنہوں نے تقویٰ میں سبقت کی، اور دوزخ انجام ہے تقصیر کرنے والوں کا۔

بندگانِ خدا! جان لو کہ تقویٰ عزت و ارجمندی کا مضبوط قلعہ ہے۔ اور فسق و فجور ذلّت و رسوائی کا ایسا مضبوط گھر ہے، کہ جو اپنے ساکن کو بلا و سختی سے محفوظ

نہیں کر سکتا۔ اور جو اُس کی طرف پناہ لے جاتا ہے اُس کو بچا نہیں سکتا۔ اچھی طرح جان لو کہ تقوے کے ذریعے سے گناہوں کے زہریلے خاروں کو دور کیا جاسکتا ہے اور یقین (یعنی خدا اور رسول خدا و آئمۂ پر ایمان) کے ذریعہ سے پایانِ بلند مرتبہ (بہشتِ جاوید) حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بندگانِ خدا! خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو۔ اپنے نفس کے معاملہ میں جو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ خداوند تعالےٰ نے تمہارے لیئے دینِ حق کو آشکار کر دیا۔ اور اس کے راستوں کو روشن کر دیا۔ بس اب یا تو ابدی شقاوت و بدبختی ہے یا دائمی سعادت و خوش بختی۔ اس عالم باقی کے لیئے توشہ مہیا کرو۔ تمہیں توشہ بتا دیا گیا ہے اور کوچ کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور سفر کے لیئے آمادہ کر لیا گیا ہے۔ پس تم اس کاروان کی طرح ہو جس نے (چند لمحوں کے لیئے) کمر کھولی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کب تمہیں کوچ و کمر بندی کا حکم دے دیا جائے۔

خبردار! دُنیا سے اس شخص کو کیا مطلب جو آخرت کے لیئے پیدا کیا گیا ہے اور مال سے اُسے کیا واسطہ جو جلد ہی چھین لیا جائے گا۔ اور صرف اس کا حساب کتاب ہی باقی رہ جائے گا۔

بندگانِ خدا! خدا نے جو خیر کا وعدہ کیا ہے اُس میں ترک کی گنجائش نہیں۔ اور جس عذاب سے منع کیا ہے اس میں لیت و لال کی گنجائش نہیں۔ خدا کے بندو! اُس دن سے ڈرو جس دن اعمال کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ زلزلوں کی کثرت ہو گی۔ اور بچوں پر (دہشت کے مارے) بڑھاپا طاری ہو جائے گا۔

بندگانِ خدا! تمہارے نفوس تمہاری گھات میں ہیں۔ تمہارے اعضاء تمہارے جاسوس ہیں۔ اور بہت سچے نگہبان (فرشتے) ہیں۔ جو تمہارے اعمال و افعال کے عدد کو محفوظ رکھتے ہیں۔ رات کی تاریکی تمہیں اُن سے چھپا نہیں سکتی۔ اور نہ کوئی بند دروازہ تم کو اُن سے مخفی رکھ سکتا ہے۔ بلاشبہ آنے والا فردا آج کے دن (امروز) سے قریب ہے۔

آج کا دن اُن تمام باتوں کے ساتھ جو اُس میں ہیں گزر جائے گا اور کل کا دن تیزی کے ساتھ نمودار ہو جائے گا۔ گویا تم میں سے ہر کوئی زمین کے نیچے تنہا مکان

Marfat.com

اور کنج لحد میں پہنچ چکا ہے۔ کتنا ہولناک ہے وہ تنہائی کا گھر وہ منزل وحشت اور مسافرت کا تنہا مقام۔ گویا حشر کی گونج تم تک پہنچ چکی، قیامت تم پر طاری ہو گئی اور تم فیصلہ اعمال کے لیئے نکل آئے۔ باطل تم سے دور ہو چکا، علتیں منفصل ہو گئیں حقائق تم پر ثابت ہو گئے۔ امور قضا نے تم کو اپنے مصادر تک پہنچا دیا۔ بس عبرتوں سے نصیحت حاصل کرو۔ اور انقلاب روزگار سے اعتبار کا سبق لو۔ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی چیزوں سے نفع حاصل کرو۔ (ختم ہوا ترجمہ)

یہ ہیں وہ کلمات جن کو سنکر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور چون چرا کی ساری بحث دماغ سے نکل جاتی ہے۔ کیا خلفائے رسول میں سے کوئی ایسا خلیفہ تھا جس نے دین کو اور دنیا کو اس طرح سمجھا ہو جس طرح علیؑ نے سمجھا تھا، اور جس نے اپنی رعایا کی ہدایت کے لیئے اتنی کوشش کی ہو۔ اگر اب بھی کوئی مسلمان ایسا ہے کہ جسے اصلی امام وہادی اور نقلی امام وہادی کی پہچان نہیں ہوئی، تو پھر اس کو دہریت کا یہ قول ماننا پڑے گا کہ "انسان کی زندگی میں اور کیچڑ کے کیڑے کی زندگی میں کچھ فرق نہیں ہے۔

باب دہم

آیات فطرت دلیل ہستی فاطر!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ

Marfat.com

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ البقرہ ۲: ۱۶۳، ۱۶۴

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۔ الجاثیہ ۔ ۴۵ : ۶

ترجمہ:- اور تمہارا خدا خدائے واحد ہے ۔ سوائے اُس رحمان و رحیم کے اور کوئی معبود نہیں ہے ۔ بالتحقیق آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے اولنے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں چھلے چلتی ہیں جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور اُس پانی میں جسے خدا نے آسمان سے اُتارا اور جس کے ذریعہ سے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد پھر زندہ کر دیا اور ہر قسم کا چلنے والا اُس میں بکثرت پھیلا دیا، اور ہواؤں کے چلنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے مابین معلق ہیں سمجھنے والے کے لیئے بہت سی نشانیاں ہیں"

یہ خدا کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک (ٹھیک) تمہارے سامنے پڑھتے ہیں ۔ تو خدا اور اُس کی آیتوں کے بعد کون سی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے ۔

خداوند تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت کائنات کے ذرّہ ذرّہ سے نمایاں ہے اور اُس کی قدرت و حکمت پر خود انسان اور اُس کا نظامِ حیات شاہد ہے ۔ وُہ کور چشم اور کور باطن ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نظر نہیں آتا ۔ خدا اُسی طرح آنکھوں کے سامنے عیاں ہے جس طرح ایک جسم نہ رکھنے والی ہستی نمایاں ہو سکتی ہے ۔ وُہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا عیاں نہیں ہے، دراصل خود اُن میں سے چشمِ باطن سے دیکھنے کی اہلیت زائل ہو چکی ہے اُن پر مادیت نے اتنا غلبہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی جسمانی آنکھ کو ہی معیارِ ہست و نیست سمجھنے لگے ہیں اس کے آگے انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا ۔ والد مرحوم فرماتے ہیں ؎

نمایاں اُس کی حکمت ہے شجر میں ‌ ‌ ‌ بن و شاخ و گل و برگ و ثمر میں
ہیں اُس کی ہستی کی دیتے گواہی ‌ ‌ ‌ زمیں سے آسماں تک مرغ و ماہی

ان چیزوں کی عظمت کچھ کم نہیں ۔ لیکن چونکہ انسان ان کو روزمرہ دیکھتا رہتا ہے لہٰذا باستثنائے صاحبانِ غور و فکر عوام النّاس ان سے وُہ سبق نہیں لیتے جو ان کو لینا چاہیئے ۔ اس غرض کے لیئے فضاء آسمانی اور ستاروں کا علم جس کو علمِ ہیئت کہتے ہیں بہت موزوں ہے ۔ ہم کو یقین ہے کہ جب شیطانِ دہریت اُس طرف رُخ کرتا ہو گا،

Marfat.com

تو ضرور اُسے اپنی بے بسی اور مردودیت کا احساس ہوتا ہوگا۔ ارشادِ خداوندی پر غور کیجیے:۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝ الملک ۶۷: ۵

یعنی: ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا آلہ بنایا اور ہم نے ان کے لیئے دھکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہم آگے چل کر معلوم کریں گے کہ کئی کائنات ہیں اور کئی افلاک ہیں۔ اور یہ ستارے جو نظر آتے ہیں یہ سب آگ کے دھکتے ہوئے کُرّے ہیں۔ جہاں تک علمِ ہیئت ان کے حالات معلوم کر سکا ہے اُس کے مطالعہ سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جہنّم کی جو حالت قرآن شریف نے بیان کی ہے وُہ نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ان آیات پر بھی غور کرنا چاہیئے:۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ۝ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ط الصّٰفّٰت (۳۷: ۶ تا ۱۱)

ترجمہ:۔ یقیناً ہم نے اس آسمانِ اوّل کو ستاروں کی زینت سے مزیّن کیا ہے۔ اور ہر سرکش شیطان کے لیئے اُن کو نگہبان بنایا ہے۔ اب وہ ملا اعلیٰ کی کنسوئیاں نہیں لے سکتے۔ اور ہر طرف سے اُن کے بھگانے کے لیئے مار پڑتی ہے۔ اور یہ ان کے لیئے پائیدار عذاب ہے سوائے اس کے کہ کوئی اُڑتی ہوئی بات لے بھاگا سو ایک ستارہ ٹوٹ کر اس کا بھی پیچھا لیتا ہے۔ اب اُن سے پوچھو کہ از روئے پیدائش یہ زیادہ مضبوط ہیں یا وہ (مذکورہ) چیزیں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ:۔

(۱) فضاء میں بہت دُور ملاءِ اعلےٰ ہے۔

(۲) وہاں شیطانوں کا گزر نہیں ہوتا۔

Marfat.com

(۳) شیاطین ایک مخلوق ہے جو انسان کو نظر نہیں آتی۔
(۴) شیاطین ملاءِ اعلےٰ تک پہنچنے اور وہاں کی خبریں سننے کے لیئے کوشش کرتے ہیں
(۵) لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور وہاں جو فرشتے ہیں وہ اُنکو مار بھگاتے ہیں۔
(۶) شہاب ثاقب اُن کا تعاقب کرتے ہیں۔

علم ہیئت نے بھی وہاں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بہت کم معلوم ہو سکا ہے۔ جتنا معلوم ہوا ہے وہ بھی ہمارے مقصد کے لیئے کافی ہے۔

اہل سائنس کو یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے اور نہ کبھی معلوم ہو گا کہ دنیا کی ابتداء کیا ہے اور یہ کیونکر بنی۔ صرف قیاس کیا جاتا ہے کہ تمام کائنات پہلے ایک بڑے دخانی گولے کی صورت میں تھی۔ اور وہ بگولہ کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ سائنس کو یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ اور نہ کبھی یہ معلوم ہو گا کہ بگولہ کو حرکت کس نے دی۔ اس میں حرکت کیوں کر پیدا ہوئی۔ اُس میں سے سورج اور دیگر ستارے نکلے۔ اور سورج میں سے زمین نکلی۔ جب ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی تو وہ پانی کی صورت میں ہو گئی۔ گویا زمین ایک پانی کا کرہ بن گیا۔ اُس میں مزید سردی آنے کی وجہ سے وہ منجمد حالت میں ہوتی گئی۔ (A - ۱۰۲)

ایک مشہور عالم علم ہیئت اور طبیعیات کی رائے ملاحظہ ہو:- (۱۰۳)

ترجمہ:- (۱) ہمارا قیاس ہے کہ کائنات کی فضا میں پہلے ہوائی مادہ (گیس) بھرا ہوا تھا۔ اور جب وہ گیس ذرا انجماد کے درجہ پر آئی تو ستارے بن گئے اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ سکڑے اور پھر سیال پانی کی صورت میں ہو گئے۔ اور درجۂ انجماد بڑھا تو منجمد ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے موجودہ صورت وحالت اختیار کی۔

فضا میں ہمارا گھر (ہماری زمین) ابتداء میں ہوائی مادہ کی صورت میں تھا۔ اس کے بعد پہلے تو وہ سب پانی پانی ہو گیا۔ پھر کسی حد تک نرم منجمد۔ آخرکار اُس کا اُوپر کا چھلکا یعنی اُوپر کی تہہ بالکل منجمد ہو گئی۔ اور چٹانیں، پہاڑ وغیرہ اُسی طرح منجمد ہو گئے جیسے

(102a) The Universe Around Us, pp. 10, 248, 250, 258

(103) The Universe Around Us, p, 258

Marfat.com

وہ پہلے نرم و گداز حالت میں تھے۔ رفتہ رفتہ زمین کی ایسی حالت ہو گئی جس میں زندگی ہو سکتی تھی۔ آخرکار زندگی بھی پیدا ہو گئی۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کیونکر ہوئی کہاں سے آئی اور کس طرح آئی۔ (۱۰۴) اصل ضمیمہ ۱۵

علم ہیئت کے یہ انکشافات اس آخری صدی کے ہیں۔ اس سے پہلے تو عجیب عجیب جاہلانہ نظریات تھے جواب ترک کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ آخری نظریہ صحیح ہی ہو گا۔ کیونکہ اب سے تقریباً ۱۳۰۰ برس پہلے جناب علی مرتضیٰؑ نے جو تخلیق عالم کی حالت بتائی ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَهُ فَتْقَ الْاَجْوَاءِ، وَ شَقَّ الْاَرْجَاءِ، وَ سَكَائِكَ الْهَوَاءِ فَاَجْرٰى فِيْهَا مَاءً مُتَلَاطِمًا تَيَّارُهُ، مُتَرَاكِمًا زَخَّارُهُ حَمَلَهُ عَلٰى مَتْنِ الرِّيْحِ الْعَاصِفَةِ وَ الزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ وَ اَمَرَهَا بِرَدِّهِ وَ سَلَّطَهَا عَلٰى شَدِّهِ، وَ قَرَنَهَا اِلٰى حَدِّهِ الْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقٌ۔ وَ الْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقٌ ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيْحًا اِعْتَقَمَ مَهَبَّهَا، وَ اَدَامَ مُرَبَّهَا، وَ اَعْصَفَ مَجْرَاهَا، وَ اَبْعَدَ مَنْشَاَهَا بِتَصْفِيْقِ الْمَاءِ الزَّخَّارِ، وَ اِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ، فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَاءِ وَ عَصَفَتْ بِهٖ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ تَرُدُّ اَوَّلَهُ اِلٰى اٰخِرِهٖ، وَ سَاجِيَهُ اِلٰى مَائِرِهٖ۔ حَتّٰى عَبَّ عُبَابُهُ وَ رَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ فَرَفَعَهُ فِيْ هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ، وَ جَوٍّ مُنْفَهِقٍ، فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَكْفُوْفًا، وَ عُلْيَاهُنَّ سَقْفًا مَحْفُوْظًا وَ سَمْكًا مَرْفُوْعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا، وَ لَا دِسَارٍ يَنْظِمُهَا، ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ وَ ضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ، وَ اَجْرٰى فِيْهَا سِرَاجًا مُسْتَطِيْرًا وَ قَمَرًا مُنِيْرًا، فِيْ فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سَائِرٍ، وَ رَقِيْمٍ مَائِرٍ۔

ترجمہ:۔ پھر خداوند تعالےٰ نے پیدا شدہ فضا میں شگاف دیا۔ اور کنارے نکالے۔ اور ہوائے عالیہ کو پیدا کیا۔ اور اُن میں نہایت شدید امواج والا پانی چلایا جس کی موجیں عظیم اور تہ بہ تہ تھیں۔ اور وہ پانی تیز و تند ہوا کے اوپر تھا۔ پھر ہوا کو حکم دیا کہ

(104) The Truth Shall Make You Free, published by Watch Tower Bible and Tract Society, pp. 150.52

اس پانی کو قائم رکھے۔ اور اُس کے کناروں پر اُس ہوا کو مسلط کر دیا۔ اور اس ہی ہوا نے پانی کی حد بندی کر دی۔ اُس پانی کے نیچے ہوا پھیلی ہوئی تھی۔ اور اُس کے اُوپر پانی اُچھل رہا تھا۔ پھر خداوند تعالےٰ نے ایسی ہوا چلائی جو عقیم تھی۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اُس عقیم ہوا کو حکم دیا کہ پانی کو حرکت دیتی رہے اور موجوں کو اُبھار کر اُوپر کی طرف پھینک دے۔ پس اس ہوا نے اس پانی کو اس طرح چھلکایا جس طرح دہی کو بلوتے ہیں۔ یہ ہوا فضا میں بڑی تیزی کے ساتھ رواں ہو گئی۔ اور پانی کے نچلے حصّہ کو اُوپر کی طرف پلٹانے لگی۔ اور ساکن کو متحرک سے پیوستہ کرنے لگی یہاں تک کہ پانی کی چوٹی بلند ہو گئی، اور تہ بر تہ پانی پر جھاگ آئے۔ پھر اُس پانی کو شگاف دی ہوئی اور وسیع فضا میں بلند کیا۔ جس سے سات آسمان بنائے۔ آسمان زیرین کو ایک جمی ہوئی اور رُکی ہوئی موج قرار دیا، اور آسمان بالا کو ایک محفوظ چھت اور بناء مرفوع قرار دیا۔ آسمان (اجرام فلکی) کو بغیر کسی ستون کے روکے رکھا۔ بغیر میخ کے اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ پھر خدائے بزرگ و برتر نے اُس آسمان کو چمکتے ہوئے ستاروں اور دمکتے ہوئے ستاروں سے مزین کیا۔ اور اس میں چراغ نور افشاں (سُورج) اور ماہِ درخشاں کو رواں دواں کیا۔ اور یہ ساری چیزیں گھُومتے ہوئے آسمان، رواں چھت اور لوحِ متحرک میں تھیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

یہ تو لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اکثر مترجمین نے اس کا صحیح ترجمہ نہیں کیا مثلاً شروع کے جُملہ کا ترجمہ سید رئیس احمد صاحب جعفری نے اپنی حال کی طبع شدہ کتاب میں اس طرح کیا ہے "پھر خدائے بزرگ و برتر نے زمین و آسمان کے درمیان شگاف دیا اور جو (فضا) پیدا کی حالانکہ ابھی زمین و سماوات کی تخلیق کا ذکر نہیں ہوا۔ یہ اُس پہلے کی بات ہے۔ کس طرح زمین و آسمان پیدا ہوئے۔ یہ اُس کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں آگے چل کر بھی چند ایسے ہی الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں جو جناب امیر علیہ السلام کے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے۔ صفحہ ۹۲ کے نوٹ میں فاضل مترجم فرماتے ہیں کہ "پانی کو گرنے سے روکے رہنے کا ہوا کو حکم دیا۔ اس لیئے کہ پانی ثقیل ہے، اور ثقیل چیز بغیر ٹھہراؤ کے ہمیشہ نیچے گرتی ہے۔" حالانکہ فضا میں بوجہ ثقل کے اُوپر سے نیچے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناب امیر کا

Marfat.com

مفہوم ہے کہ پانی کو فضا میں پھیل کر منتشر ہو جانے سے روکے رہے۔ یہ ترجمہ اس جملہ کا ہے "فامرھا بردھا" جس کے معنی اُوپر سے نیچے گرنے کے لیئے گئے ہیں۔ ردّ کے معنی منتہی الارب میں اس طرح لکھتے ہیں: بالفتح وگرفتگی زبان یقال فی لسانہ ردّ و جلسۃ" جس کے معنی رُکنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہی ہے کہ پھیلنے نہ دے۔ علم طبیعیات و ہیئت کا یہ بڑا مسئلہ ہے کہ سُورج یا دیگر ستاروں کے کنارے کیوں کر رُکے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُن کا پھیل کر ہوا میں منتشر ہو جانا اغلب تھا۔ ان اجرام کا جسم ہوائی یعنی Gaseous بیان کیا جاتا ہے۔ اور گیس کا خاصہ پھیلنا ہے۔ جناب امیرؑ کا اس کے بعد ہی کا جملہ ان معانی کو صاف کر دیتا ہے۔ وسلطھا علے شدہ یعنی پانی کے کناروں پر اُس ہوا کو مسلط کر دیا۔

اس خطبہ کو اگر سائنس کی زبان میں بیان کریں گے، تو اس طرح کہیں گے: ہوائی فضا پھٹنی شروع ہوئی اور اُس میں متلاطم پانی جاری ہو گیا (Gae) کی حالت سے liquify ہونا شروع ہوا، اور نہایت تیز و تند و زبردست ہوا چلی۔ جس نے اس پانی کو فضا میں پھیلنے سے روکا۔ اور اس کی حدوں کو قائم رکھا۔ اس کے بعد پھر سخت ہوا چلی۔ جس نے پانی کو نیچے اُوپر تہہ و بالا کرنا شروع کر دیا اور وہ پانی مکھن کی طرح بلویا گیا۔ اس سے بہت بڑے بڑے جھاگ پیدا ہوئے۔ اور وُہ منجمد ہوتے گئے اور زمین و اجرام فلکی اپنی موجودہ صورت میں آنے لگے۔

اب وہ انگریزی کی عبارت ملاحظہ ہو جو ہم نے اُوپر نقل کی ہے کس طرح ایک دوسرے میں مطابقت ہے۔ بلکہ جو انگریزی کی عبارت میں کمی ہے اُس کو جناب امیرؑ کا خطبہ پورا کرتا ہے۔ انگریزی کی عبارت میں یہ تو درج ہے کہ پہلے گیس تھی، پھر وہ رقیق یعنی Liquified ہوئی اور پھر منجمد یعنی Solidified ہوئی۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ جب وُہ رقیق تھی، اُس وقت کس چیز نے اُس پانی کو فضا میں پھیلنے سے روکا۔ حالانکہ یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ جناب امیرؑ نے بتایا کہ تیز و تند ہواؤں نے اُس کے کناروں کو روکے رکھا۔ اہل سائنس کی تحقیقات اس امر پر ابھی صاف نہیں ہے۔ ان کو ابھی یہ یقین نہیں کہ اُس فضا میں ہوا تھی۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ہوا تھی۔ اور یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہوا نہیں تھی، لہٰذا خاموش ہیں۔ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ ہوا تھی تو اور مشکلات ہیں

Marfat.com

چلیں جائیں۔ یہ ہوا کہاں سے آئی، کیونکر پیدا ہوئی، کس نے چلائی۔ ان سوالات کا وہ جواب نہیں دے سکتے۔ لہذا خاموش ہیں۔

کیا تخلیق ارض و سماوات کا بیان امام کی زبان سے ساتویں صدی عیسوی میں معجزہ نہیں ہے۔

یہ تو بات میں بات نکل آئی ہم عجائبات سموات کا ذکر کر رہے تھے۔ جیسا ہمارا عالم ہے ایسے ایک کے بعد ایک کئی عالم ہیں۔ جن کا کوئی ستارا کسی دوربین سے کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کی موجودگی کا علم فقط اُن نور کی شعاعوں یا لہروں Radio Rays سے ہوتا ہے جن کا اثر آلہ مقیاس الشعاع پر ہوتا ہے۔ ہمارے عالم کو انگریزی میں علم ہیئت میں Galaxy کہتے ہیں۔ یہ جو آسمان پر کہکشاں Milky Way نظر آتا ہے یہ اُس عالم کا محض ایک کنارہ ہے۔ اس کہکشاں میں ہمارے اس سورج کی طرح جو نظر آتا ہے، ایسے ۴۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سورج ہیں۔ اور ہمارا یہ عالم ایک گاڑی کے پہیئے کی طرح گردش کر رہا ہے اس پہیئے کا قطر ۱۰۰,۰۰۰ روشنی کے سالوں کی مسافت کے برابر ہے روشنی ایک سیکنڈ میں ۱۸۶,۰۰۰ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے چلتی ہے۔ ایک گھنٹے میں کتنے سکنڈ ہوئے۔ اُن سب کو ۱۸۶,۰۰۰ میں ضرب دو۔ جو حاصل ضرب ہو گا وہ ہی روشنی کے ایک سال کی مسافت ہے۔ وہ ریاضی دانوں نے معلوم کی ہے۔ وہ ۵,۸۸۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ میل ہے۔ اس پہیئے کے دھرے میں سورج ۱۵۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے چکر لگا رہا ہے یا یوں سمجھو کہ ایک دن میں ۱۳,۰۰۰,۰۰۰ میل سفر طے کر لیتا ہے۔ لیکن پورا چکر طے کرنے میں اس کو ۲۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سال لگتے ہیں۔ اس کو ایک Cosmic year کہتے ہیں۔ اس فضا کی وسعت کو تو دیکھو۔ یہ پورا پہیہ جس میں ۴۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سورج ہیں سب مل کر پوری فضا کا صرف اس قدر حصہ گھیرتے ہیں جتنا ہماری زمین سے چاند اپنی ہلالی صورت میں نظر آتا ہے۔ ایک بالشت بھر یا کچھ زیادہ۔ تو وہ فضا کتنی وسیع ہوئی۔ صرف ہمارے عالم کی وسعت اتنی ہے کہ روشنی کی شعاع جو زمین سے چل کر اس عالم کے گرد چکر لگائے تو اُسے چکر لگانے میں ۳۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سال لگیں گے۔ ایک سال میں روشنی کی شعاع ۵,۸۸۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ میل طے کرتی ہے، تو ان تین کھرب سالوں

Marfat.com

ہیں وُہ کتنے میل چلے گی ۔

ہمارے اِس عالم (Galactic System) کے علاوہ بہت سے عالم ہیں جن کی موجودگی کا علم ہو چکا ہے، اور اُن کے آگے اور عالم ہوں گے جن کا علم نہیں ہوا۔ (۱۰۵)

ہمارے عالم سے نزدیک ترین عالم یہاں سے ۰۰۰ء۷۵ روشنی کے سالوں کی مسافت پر ہے۔ ہم سے نزدیک ترین ستارہ ہمارے ہی عالم میں اِس دُنیا سے ۴ ۱/۲ روشنی کے سالوں کی مسافت پر ہے۔ معمولی جسم کا ستارہ ہماری زمین سے ۰۰۰۰۰۰ ۱ گنا زیادہ بڑا ہے اور پھر یہ تو محض اوسط درجے کے ستاروں کا حال ہے۔ بہت سے ستارے ایسے ہیں جو ان سے بھی ۰۰۰،۰۰۰ گنے زیادہ بڑے ہیں۔ سب سے طاقتور دُور بین سے جو ۱۰۰ انچ قطر کا کیلی فورنیا میں (Mount Wilson) پر ہے ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ۱۵ ستاروں کا فوٹوگراف لیا جا چکا ہے۔ اب ۲۰۰ انچ قطر کا دُور بین بنایا جا رہا ہے۔ اُس سے اور زیادہ ستارے شمار ہو سکیں گے۔ اور یہ تو ہمارے عالم کی حالت ہے اور عالموں کے اور ستارے ہیں۔

بہت سے ستارے ایسے ہیں جن کے حجم و وزن، روشنی و گرمی کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ وُہ Giants اور Super Giants کہلاتے ہیں۔ ان بڑے ستاروں میں سے ایک ستارہ Alpha ہے جو روشنی میں بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کا قطر ۰۰۰۰۰۰ ۷ میل ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے جیسے ۰۰۰۰۰۰ ہم سُورج اُس میں آسانی سے سما سکتے ہیں اور پھر جگہ خالی رہے۔ اور بعض بہت چھوٹے ستارے ہیں۔ ایک ستارہ Sdoradus بہت زیادہ روشنی والا ستارہ ہے۔ اُس کی گرمی اور روشنی ہمارے سورج کی گرمی اور روشنی سے ۰۰۰،۰۰۰ ہ گنی زیادہ ہے۔ اگر یہ ہماری زمین اُس کے نزدیک اتنی آجائے جتنی وُہ سورج کے نزدیک ہے، تو صرف آنکھ جھپکنے میں ہم سب معہ زمین کے جل کر خاکستر ہو جائیں۔ سُورج ہماری زمین سے ۰۰۰،۰۰۰ ۹ میل دُور ہے۔

ان ستاروں کی روشنی کے رنگوں سے ان کی گرمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ گرم وُہ ہیں جن کی روشنی نیلی VIOLET رنگ کی ہے۔ اُس سے کم

(105) J Robinson: The Universe pp. 45, 46

Marfat.com

بعد سفید رنگ کی روشنی والے گرمی میں تیز ہیں۔ اُن کے بعد زرد رنگ کی روشنی والے ہیں جیسا ہمارا سورج ہے۔ پھر نارنگی رنگ والے۔ اور سب سے آخر میں سرخ رنگ کی روشنی والے ستارے ہیں۔

ان میں ایسے بھی ستارے ہیں جو یک لخت روشنی میں تیز ہو جاتے ہیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد مدھم ہو جاتے ہیں۔ ان کو Novae کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک Nova دیکھا گیا کہ یک لخت چند دنوں میں اُس کی روشنی ۸۰۰۰۰ گنی ہو گئی۔ آلۂ مقیاس الالوان (Spectroscope) سے دیکھا گیا کہ اس میں سے جلتی ہوئی ہائیڈروجن کے گولے یا بمب ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہماری زمین تک آ رہے ہیں۔ معمولی NOVA سورج کی روشنی اور گرمی سے ۵۰۰۰۰ گنی زیادہ روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ بعض اُن سے بھی بڑے ہیں۔ جن کی روشنی ان سے بھی ۱۰۰۰ گنی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ایسے NOVAE غالباً صرف ۱۴۰ ہی ہیں۔ یہ تو آسمان کے ایٹم بمب ہیں۔ عالمانِ علم ہیئت کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس وجہ سے یہ فوراً تیز ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جلانے والا ایندھن کہاں سے آتا ہے۔

ایک اور قسم کے ستارے ہیں جن کو (Nebulae) کہتے ہیں۔ یہ لاطینی لفظ ہے۔ اور Nebula کے معنی بادل یا دخان کے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اُوپر سے تو یہ بہت روشن اور گرم ہیں، لیکن اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں ان کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ سات ہزار روشنی کے سالوں کی مسافت سے نظر آ جاتی ہے۔ ان کے اندر کی حالت دوزخ کا نمونہ ہے۔ جوزا کے جھمکے (Opion) (Constellation) میں ایک Nebula ہے۔ جس کا قطر روشنی کے ۱۴ سالوں کی مسافت کے برابر ہے۔ اور ہم سے ۱۰۰۰ روشنی کے سالوں کی مسافت سے دُور ہے۔ اُس کے اندر کی حالت یہ بیان کی گئی ہے۔ اُس کا منہ ایک بہت بڑا غار ہے۔ جس میں ہر قسم کے رنگوں کی روشنی نظر آتی ہے۔ اس کے اندر آگ کے ستون، دیواریں، عمود، اندر کے درجوں کا چہرہ یا رُخ، فصیلیں، چھتوں سے پیپ کی شکل کے رسنے والے لٹکتے ہوئے عمود عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔

Marfat.com

جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے عالم Galaxy کے علاوہ اور بہت سے عالم ہیں۔ اور پھر کئی عالموں کے مجموعے بھی ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

ترجمہ:۔ ان سب مختلف قسم کے عظیم الجثہ دخانی اجرام کو کہکشانی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے ستاروں کے کہکشانی نظام کے اندر ہیں۔ لیکن اب ہم بڑے چکر دار عظیم الجثہ دخانی اجرام کا ذکر کرتے ہیں۔ جو کئی وجوہات سے ایک ہی قسم کے ہیں۔ یہ کائناتوں کے جزائر ہیں۔ یہ ہماری طرح کی کئی کہکشانیں ہیں۔ لیکن ہماری کہکشاں سے باہر اور اُس سے بالکل علٰحدہ۔ لیکن بہت دور ہماری کہکشاں سے بھی اور ایک دوسرے سے بھی۔ ان میں سے جو ہم سے نزدیک ترین ہے وُہ بھی ہم سے تقریباً دس لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت سے دُور ہے۔ اور ان کا آپس کا بعد اوسط تقریباً بیس لاکھ سالوں کی مسافت ہے۔ علم ہیئت نے یہ تو عرصہ سے بتا دیا تھا کہ ہماری زمین کی طرح اور بھی دُنیائیں ہیں۔ لیکن اب تقریباً پچیس سال ہوئے کہ یک صد انچ کی دُوربین نے ہمیں یہ عجیب و غریب لیکن یقینی خبر دے کر کہ ہماری کائنات کے علاوہ اور بھی کئی کائناتیں ہیں۔ ایک نہایت ہنگامہ خیز زمانہ کی ابتدا کی ہے۔ ستاروں کے یہ گول جھرمٹ۔ جو سورج سے کروڑوں گنی زیادہ گرمی اور روشنی دے رہے ہیں کارخانۂ قدرت کے عجائبات ہیں جیسا ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ لیکن یہ تو ان کائناتوں کے جُھرمٹوں کے آگے کچھ بھی نہیں جن کی موجودگی اب معلوم ہوئی ہے۔ اُن میں سے چند تو ایسے ہیں کہ جن میں ہزاروں ایسے ستاروں کے گول جھرمٹ ہیں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا یہ عظیم الشان کہکشانی نظام بھی ایسے کہکشانی جھرمٹ کے نظاموں یا سلسلوں میں سے ایک نظام ہے۔ غالباً یہ ہمارا کہکشانی نظام سنبلہ جھمکے میں ہے۔ اس کی وسعت ستر لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کائناتوں کا جھرمٹ ستر لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت کے برابر طویل ہے ذرا خیال تو کرو۔ ایک ایک کائنات ایک دوسرے سے دس لاکھ یا زیادہ روشنی کے سالوں کی مسافت پر دُور ہیں۔ اور پھر ایک ہی جماعت کے ممبر ہیں۔ اس سے تمہیں ذرا آسمانوں (فضا) کی وسعت اور عظمت کا اندازہ ہوگا جو خداوند تعالےٰ کی جلالت و

Marfat.com

حکمت اور قدرت کی گواہی دے رہے ہیں۔ صرف ستارے ہی نہیں بلکہ یہ ستاروں کی دُنیا میں ایک دُوسرے کے پیچھے چلی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ نظر کی پہنچ سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اور ابھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک چکردار نظام دوسرے اور اور بڑے چکردار نظام کا حصہ ہو اور پھر وُہ خود بھی کسی اور بڑے نظام کا حصّہ اور اسی طرح یہ لاتناہی سلسلہ جاری ہو۔ (ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۶

خداوند تعالےٰ کی جلالت، عظمت، قدرت اور حکمت کا اندازہ کیا؟ اہلِ سائنس بھی قائل ہوگئے اور خدا خدا کرنے لگے۔

سُورج کی روشنی اور گرمی کا ذکر آیا ہے۔ سُورج کے اندر کی گرمی ۴۰،۰۰۰،۰۰۰ یعنی چار کروڑ فیرن ہائٹ تھرمامیٹر کی ڈگری کے برابر ہوتی ہے۔ گویا اُبلتے ہوئے پانی سے ایک لاکھ اسی ہزار گنا زیادہ۔

سُورج زمین سے تین لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ بوجھل ہے۔ وُہ ساری روشنی جو سُورج سے نکلتی ہے، زمین کو اُس میں سے صرف $\frac{1}{2,000,000,000}$ حصہ ملتا ہے۔ اور اس میں سے بھی آدھی بغیر اپنا اثر کیے ہوئے واپس فضا میں چلی جاتی ہے۔ ایک سائنس دان نے کہا ہے کہ اگر تمام دُنیا کا سارا کوئلہ ایک ایک ٹکڑا کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے اور پھر جلا کر روشن کیا جائے، تو وہ ساری گرمی صرف سُورج کی اُس گرمی کا دسواں حصہ ہوگی جو وُہ ایک سیکنڈ میں خارج کرتا ہے۔

سُورج کی اندرونی حالت بھی سُنیئے۔ اس کے اندر کی آگ کے بھڑکنے کے دھماکے ہر وقت ہوتے رہتے ہیں۔ اور اندر کی جلتی ہوئی گیس کو اتنا اونچا پھینک دیتے ہیں جتنا کہ چاند کا فاصلہ زمین سے ہے۔ اور فی سکنڈ ۱۰۰ میل کی رفتار سے اُٹھتے ہیں۔ ایک دفعہ ہائیڈروجن کا جلتا ہوا ستون ستر ہزار میل اُونچا دیکھا گیا ہے۔ اس کی قیامت خیز ہولناک آواز سے ہم کو خدا نے اس طرح بچایا ہوا ہے، کہ درمیانی فضا میں ہوا نہیں ہے۔ اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے آواز ہم تک نہیں آسکتی۔ اہلِ سائنس کو یقیناً نہیں معلوم کہ ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن چونکہ وہاں کی آواز نہیں آتی، لہٰذا اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ ہوا نہیں ہے۔ لیکن روشنی بھی تو ہوا ہی کی مدد سے چلتی ہے۔ اور روشنی وہاں سے آتی ہے۔ تو روشنی کا وسیلہ ہوا کے علاوہ کچھ اور ہوگا۔ ایتھر

Marfat.com

Ether کا نظریہ تو اب غلط ثابت ہو گیا ہے۔

چند امور اور غور طلب ہیں۔ سورج کے ایندھن کا خرچ ہر منٹ میں ۲۵۰۰۰۰۰۰۰ (پچیس کروڑ) ٹن ہے۔ اور یہ ایندھن اندر ہی سے آتا ہے باہر سے نہیں آتا۔ غور تو کرو یہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ اندر اس کی فیکٹری ہو سکتی ہے۔ سورج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کھربوں کھربوں سال سے ہے۔ اتنے سال فی منٹ پچیس کروڑ ٹن کے حساب سے یہ ایندھن خرچ ہو رہا ہے۔ اندر سے کیونکر پیدا ہوتا ہے، اہلِ سائنس کو اس کا علم نہیں ہے۔

روشن گرم جسم سکڑتا رہتا ہے کیونکہ اُس میں سے گرمی اور روشنی نکلتی رہتی ہے۔ اب سائنس کی دریافت یہ ہے کہ روشنی اور گرمی میں بھی وزن ہوتا ہے۔ سورج کا جسم ہر منٹ پچیس کروڑ ٹن کے حساب سے سکڑ رہا ہے یہ کمی کیوں کر پوری ہو رہی ہے۔ پوری ہو بھی رہی ہے یا نہیں۔ اہلِ سائنس نہیں جانتے صرف قیاسات کرتے ہیں (106a)

یہ آسمانی آگ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، مختلف ہے اُس آگ سے جو ہم دُنیا میں جلاتے ہیں۔ آسمانی آگ تو ایسی ہے کہ جس سے زندگی کو مدد ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ جب سائنس آگے ترقی کرے تو جہنم کی اُس خاصیت کا قائل ہو جائے کہ: لا یموت فیہا ولا یحییٰ۔

سائنس کی زمانۂ حال کی دریافت یہ ہے کہ تمام عالمین صرف روشنی یا نور ہیں۔ مادہ کیا ہے؟ صرف منجمد ٹھوس کی ہوئی روشنی ہے۔ اب فقرہ نور السمٰوٰت والارض کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔

ایک بہت بڑا سائنس دان لکھتا ہے (یہ اُس کی انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے):۔

"سُورج اور ستارے محض نارۂ طوفان اور دھماکوں کے دوزخ بڑے دہکا نہر ہیں۔ بیسویں صدی کے بڑے انکشافات میں سے یہ انکشاف ہے کہ عالم کے مادی حصّہ کا نوّے فی صدی ایک کروڑ سے زیادہ درجے کا گرم ہے۔ دوسرے بڑی دریافت یہ کہ یہ مادی حصّہ تمام عالم سے صرف ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔ باقی تمام خلا ہے۔

(106a) The Universe Around Us, pp. 157, 159, 160

The Universe pp. 102, 103

Marfat.com

تیسری دریافت یہ ہے کہ ہمارے سورج کی طرح کے نظام شمسی کائنات میں شاذ و نادر ہی ہیں (۱۰۷)
یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ تمام کائنات اور کائناتوں میں صرف ہماری زمین ہی ایسی ہے کہ جس پر زندگی ہے اور انسان جیسی آبادی ہے، اور کہیں زندگی نہیں پائی جاتی۔ اب تو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت مل گیا (۱۰۸)

تمام کائنات میں ایک ہی قسم کے Materials ہیں یعنی سونا، چاندی، ہلیم، لوہا، تانبا، جست وغیرہ۔ (۱۰۹)۔ تمام ستاروں و سیاروں کی ایک ہی رفتار ہے (۱۱۰) ایک ہی قانون کشش سب پر حاوی ہے۔ نظام شمسی کتنا بڑا ہے۔ بالکل ویسا ہی نظام ہم کو ایٹم میں ملتا ہے۔ ایک ہی قسم کے قوانین زندگی پر حاوی ہیں۔ آخر کار اہلِ سائنس یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تمام کائناتوں کا بنانے والا ایک ہی ہے۔ (۱۱۱) اب بھی خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت میں کچھ شک رہا؟ اہلِ دہریت کہاں ہیں۔ ہم اُن سے پوچھیں کہ کیا یہ سب کچھ خود بخود اندھا دھند پیدا ہوا ہے؟ اب تو اہلِ سائنس خدا کی قدرت کے آگے اپنی بے بسی کے مقر ہو گئے ہیں۔ (۱۱۲)

جب سے نظام شمسی وجود میں آیا ہے جس کو کروڑہا سال ہو گئے اب تک وہ تقریباً بیالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے چل رہا ہے۔ اتنی کائناتیں، اتنے ستارے اتنے سیارے۔ لیکن پھر آپس میں تصادم نہیں ہوتا۔ فضا جس میں یہ چل رہے ہیں، اور جس فاصلے سے چل رہے ہیں اُس سے یہ تصادم ناممکن ہے۔ (۱۱۳)

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔ اس پھیلاؤ کی رفتار ۱۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ تمام کائنات ۔۔۔۔۔۔ ۴۰۰ ۱۹۳ سالوں میں ڈبل ہو جائے گی۔ اور ۔۔۔۔۔۔ ۳۰۰ سالوں میں آٹھ گنی ہو جائے گی۔ (۱۱۴) کہتے ہیں کہ کائنات کی زندگی کا تو کوئی

(107) The Universe, pp. 106-7 (108) The Universe p. 108

(109) The Universe, p. 47; The Universe Around Us. pp. 31,103

(110) The Universe, Around Us p. 31

(106a) The Universe Around Us, pp. 157, 159, 160.
The Universe pp.102, 103.

(111) The Universe Around Us. p. 219

Marfat.com

اندازہ ہی نہیں۔ کھربوں سال سے ہے۔ پہلے کتنی چھوٹی اور گنجان ہوگی جو اتنے
سالوں میں رفتار مندرجہ بالا کی شرح سے پھیلتے پھیلتے اب اتنی ہو گئی ہے۔
خدا کی قدرت کا کچھ ٹھکانا ہے۔ اتنے سے ایٹم سے ساری کائنات بنائی ہے۔
اور ایٹم میں وہ ہی نظام رکھا ہے جو ساری کائنات کا ہے۔ اور پھر دہریوں اور شیطان
نے یہ کہنے پر آمادہ کر دیا ہے کہ خدا نہیں ہے۔

ان تمام ستاروں سے جو بڑے سے بڑے دُوربین سے نظر نہیں آتے اور جن کی محض
روشنی پہنچتی ہے ہماری زمین پر Radiation اور Cosmic Rays کا اثر
پڑ رہا ہے۔ جس اثر کی وجہ سے ضمنی دھاتیں بنتی ہیں، اور اُس ہی اثر کی وجہ سے ایک
دھات دوسری دھات میں منتقل ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان ان کے خاص
اثر میں خاص وقت پر خاص زاویہ سے آجاوے، تو اُس کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے
مرد سے عورت اور عورت سے مرد بن جاتا ہے۔ اور آج کل اس طرح کی تبدیلیِ جنس
کے نظائر سامنے آ رہے ہیں۔ دیکھو (۱۱۵)

زمین اپنی ساری ہوا کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ اس کی ہوا تمام فضا میں کیوں
نہیں پھیل جاتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ زمین کی کشش اُس کو اپنی طرف روکے رکھتی
ہے۔ اہلِ سائنس کہتے ہیں کہ یہ تمام نظام قانون کششِ ثقل پر مبنی ہے۔ اگر یہ کشش نہ رہے تو
تمام عالم درہم برہم ہو جائے۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس
کشش کا یہ اصول ہے کہ اُس کی طاقت یعنی رفتار ان اجرام کے حجم وزن اور درمیانی
فاصلہ پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی فاصلہ کم ہے۔ تو کشش کی قوت زیادہ ہوگی۔ اور جسم وزن
جس جرم کا زیادہ ہوگا، اُس میں کشش کی طاقت زیادہ ہوگی۔ یہ امر بھی مسلمہ ہے،
کہ سب ستارے و سیارے و نظام شمسی اپنے اپنے مقررہ راستوں پر چل
رہے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ سُورج
و ستاروں و زمین کا جسم ہر لحظہ کم ہو رہا ہے۔ ستارے بھی کم نہیں کروڑوں ہیں
ایک دُوسرے کی کشش اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ ان
سب کی رفتار ایک سی ہے۔ اندریں حالات رفتار کی یکساں شرح قائم رہنا اور
پھر ہمیشہ مقررہ راستوں پر چلنا، اِدھر سے اُدھر نہ ہونا، صرف کششِ ثقل اُس کا

Marfat.com

موجب نہیں معلوم ہوتا۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ صرف حکم خدا ہی پر یہ سب امور مبنی ہیں۔ بہر صورت کشش ثقل کی توضیح کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ اس کے لیے علٰحدہ رسالہ چاہیئے۔ اگر کشش ثقل بھی اس کا موجب ہے تو ان اجرام فلکی میں کشش ثقل کی خاصیت پیدا کرنا اور پھر ان کشش ثقل کو اس طرح ترتیب دینا محض مادہ کا اپنا کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ذہن و عقل، حکمت و قدرت چاہیئے جو بے جان مادہ میں نہیں ہے۔

جن لوگوں کو علم طبیعیات اور علم ہیئت کے عجائبات معلوم کرنے کا شوق ہے، اُن کو ہم صلاح دیتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کریں:۔

Sir James Jeans : The Universe Around Us.
The Mysterious Universe The New Backg.ound of Science;
Sir Arthur Eddington: The Nature of the Physical World
Science and the Unseen World;

J. Robinson: The Universe H Macpherson: The Romance of Modern Astronomy. Scientific Thought in the Twentieth Century
New Handbook of the Heavens; The Golden book of Knowledge

ہمارے ناظرین یہ تو معلوم کر چکے ہیں کہ یہ اجرام فلکی ایک دوسرے سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی روشنی آپس میں پہنچتی رہتی ہے، اگرچہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں ہزاروں اور کروڑوں (بعض حالات میں اربوں) سال کا عرصہ لیتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ دُنیا کی ابتداء کے حالات و واقعات۔ ایران و یونان کی لڑائیاں، روم اور فینقیا کی جنگیں، جنگ ہائے بدر، اُحد، احزاب، خیبر، جمل و صفین اور کربلا، واقعات سقیفہ و شوریٰ، اسیران کربلا کا سفر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام واقعات کی خبریں لے کر شعاعین نور کی چل رہی ہیں۔ کوئی کوئی قاصد اپنی منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ بہت سے قاصد ایسے ہیں کہ

(115) The Universe Around Us, pp. 124-33
The Universe, pp. 149, 156, 158,

ابھی راستے ہی میں ہیں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ جہاں قیامت واقع ہو تو وہاں قیامت کے میدان پر قیامت کے دن وہ فاصلہ پہنچیں۔ پھر انہیں دیکھ کر شرمانے والے شرمائیں، اور خوش ہونے والے خوش ہوں۔ اور ان آیات کی توضیح اُس دن اچھی طرح ہو جائے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝
۹۹: ۶، ۷، ۸۔

اس دلچسپ مضمون کے لیے دیکھو (۱۱۶)

اب ایسی آیات کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے کہ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح خداوند تعالےٰ نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اُوپر بنایا ہے۔ عربی میں کثرت کے لیے سات کا لفظ اکثر بولا جاتا ہے۔ اور جب بہت کثیر تعداد کا اظہار مطلوب ہو، تو "سات" کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں ہر روز ربّ العالمین کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اب کچھ عالمین کی عظمت اور حقیقت معلوم ہوئی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن شریف کی گفتار میں تکلم الناس علےٰ قدر عقولھم کے اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ خداوند تعالیٰ کو ہر ایک سرِ غیب کا علم ہے۔ لیکن اگر قرآن شریف میں ایسے اسرار کا ذکر کر دیا جاتا جو لوگوں کے مشاہدے ہی میں نہیں آئے تھے اور جو اس زمانہ کے لوگوں کی عقلوں سے بالاتر تھے تو کفار تو ایسا بہانہ ہی ڈھونڈتے رہتے تھے اور پہلے ہی سے جنون جنون پکارتے تھے فوراً کہہ دیتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) محمدؐ تو مجنون ہے یہ بلا عقل کی باتیں ہیں جو وہ کہہ رہا ہے۔ سب لوگ ان امور کو جنوں کی شکل دے کر مذاق میں اڑا دیتے کسی انسانی دماغ کے لیے یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ وہ ایسی ہی تکبیہ یا انتی تحریر

---

(116) The Universe Around Us. P. 32.

The Universe pp. 27, 28

لکھے جو اُس زمانہ کی عقل کے بھی مطابق ہو اور آیندہ آنے والی عقلوں کے لیئے بھی راہ نما ہو۔ یہ قرآن ہی کا معجزہ ہے کہ اس کی تحریر میں ہر زمانہ کی عقل کے لیئے باعث تسکین ہیں اور اصلیت بیان بھی کر دی گئی ہے۔ یہ آیات ملاحظہ ہوں:-

(۱) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ۔ المومنون - ۲۳ : ۱۷

بہ تحقیق ہم نے پیدا کیئے تمہارے اُوپر سات طبق (تہ بتہہ) راستوں والے۔

(۲) اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ الملک - ۶۷ : ۳

وُہ جس نے پیدا کیا سات آسمانوں کو اُوپر تلے۔

(۳) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔ الذاریات - ۵۱ : ۷

قسم ہے راستوں والے آسمان کی

(۴) وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ یٰس - ۳۶ : ۴۰

اور سب ستارے بیچ آسمان کے چلتے ہیں۔

(۵) وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ الرعد - ۱۳ : ۲

اور مسخر کیا سورج کو اور چاند کو، ہر ایک چلتا ہے مدت معینہ تک کے لیئے۔

(۶) وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ یٰس ۳۶ : ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰

ترجمہ:- اور (میری قدرت کی) ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو کھینچ کر نکال لیتے (زائل کر دیتے) ہیں۔ تو اُس وقت یہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ اور (ایک نشانی) آفتاب ہے جو اپنے ایک ٹھکانے پر چل رہا ہے۔ یہ (سب سے) غالب و واقف کار (خدا) کا (باندھا ہوا) اندازہ ہے۔ اور ہم نے چاند کے لیئے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہانتک کہ ہر پھر کے (آخر ماہ میں) کھجور کی پرانی ٹہنی کا سا (پتلا ٹیڑھا) ہو جاتا ہے۔ نہ تو آفتاب ہی سے یہ بن پڑتا ہے کہ وُہ ماہتاب کو جالے اور نہ رات ہی دن سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ (چاند، سورج، ستارے) ہر ایک آسمان میں چکر لگا رہے ہیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

Marfat.com

فی فلک یسبحون. آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ اُس وقت کہا گیا ہے کہ جب تمام دنیا بشمول اہل سائنس یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ آسمان ایک ٹھوس سخت شئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ اور وُہ فلک ان ستاروں کو لے کر گردش کرتا رہتا ہے۔ وُہ لوگ کہتے تھے کہ یہ فلک مغرب سے مشرق کی طرف گردش کر رہا ہے کوئی تو کہتا تھا کہ یہ گردش ۲۴۵۰۰ سال میں پوری ہوتی ہے۔ کسی کا خیال تھا ۳۶۰۰۰ سال میں اور کسی کی رائے میں یہ گردش ۲۵۰۰۰ سال میں پوری ہوتی تھی۔ انگریزی کا لفظ Firmament جس کے معنی آسمان کے ہیں یہ ہی بتاتا ہے کہ وُہ لوگ آسمان کو ٹھوس شئے سمجھتے تھے۔ یہ لاطینی لفظ Firmamentum سے ہے جس کے معنی ٹھوس، مضبوط، پشتہ و سہارا کے ہیں انگریزی کا لفظ :Firm بھی اس ہی سے ہے اور یہ ہی معنی رکھتا ہے۔ علم ہیئت حال میں جس کا زمانہ مشکل سے ۱۳۰۰ئہ سے شروع ہوتا ہے۔ فلک کو صرف ستاروں کی گردش کرنے کا راستہ قرار دیا ہے۔ وُہ کوئی شے نہیں۔ اس ہی کو قرآن شریف نے ساتویں صدی عیسوی میں بتا دیا تھا۔ امور متذکرہ بالا کے لیئے دیکھو (۱۱۷)

اگرچہ خداوند تعالےٰ کی ہستی کی دلیل دُنیا کی ہر شے میں پائی جاتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن چند صنعتیں تو ایسی ہیں کہ ہر ایک شخص کو غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اور جب غور کیا تو خداوند تعالےٰ کی ہستی بالکل عیاں ہو جاتی ہے: (۱) دُنیا میں حیات کی ابتداء (۲) انسان اور دیگر جانوروں کی ترکیب و ساخت (۳) وسعت فضاء اور نظام سماوی۔ انسان خود ہی خدا کی ہستی و قدرت و حکمت کی بہت بڑی دلیل ہے جسمانی حیثیت سے بھی، اور روحانی حیثیت اور تصوری ماہیت سے بھی۔ آج کل مشینوں کا زمانہ ہے۔ مشینوں کی مثال سے دیکھو۔ دنیا کی کوئی مشین نہیں جو خود بخود چلے۔ خدا نے انسان کو ایسی مشین بنایا ہے جو خود بخود چلتی ہے۔ اس مشین کی ترکیب و

(117) Encyclopedia Brittanica & Encyclopedia Americanna, Art. Astronomy

ساخت ایسی ہے کہ اگر بیرونی حالات بھی موافق ہوں تو اس کے بیکار ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ اگر ہمیشہ نہیں تو صدیوں تو چلتی رہے۔ لیکن چونکہ اس طولِ حیات میں خدا کو بھول جانے کا اندیشہ تھا لہٰذا ایسے حالات بیرونی بھی پیدا کر دیئے گئے کہ وہ اس کے جسم کو بہت جلد فنا کر دیتے ہیں۔ یہ مشین صرف ایک ذریعہ سے خود چل رہی ہے اور وہ ذریعہ بھوک ہے۔ بھوک کا اعلیٰ نظام اور پھر غیر ضروری مادہ کا اخراج یہ نظام ہر ایک جاندار میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ جو محض نیچر یا دھر کے لیئے ناممکن تھا۔ جذبات و حسیات جو کم و بیش ہر جاندار میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے علاوہ انسان میں جو عقل و فہم و ذہن عطا کر دیئے گئے ہیں وہ سب بتا رہے ہیں کہ ان کا بنانے والا خود صاحب عقل و ذکا ہے۔ دھریا نیچر محض بے عقل، بے حس، گونگی، بہری ہے۔ بے عقل صانع سے صاحب عقل مصنوع نہیں پیدا ہو سکتا۔ عجیب لطیفہ ہے۔ عقل و ذہن و فہم جو پیدا ہوئے وہ تو ایسے اعلیٰ اور حیرت انگیز ہیں اور صانع جو بیان کیا جاتا ہے یعنی دھریا نیچر وہ ایسا بے عقل، گونگا، بہرا محض پتھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ قرآن شریف میں اس کی تردید کیسی عمدہ طرح سے کر دی گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو بحث اپنے دعوئے خدائی کرنے والے بادشاہ سے کی، وہ قابلِ غور ہے۔ نظامِ عالم ایک ایسی دلیل ہے کہ خود بخود خدا کی ہستی اُس سے ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر تو خدا ہے، تو نظامِ عالم کو بدل دے۔ اس کا جواب وہ کچھ نہ دے سکا۔ سائنس نے بڑا زور لگایا تو معلوم کر لیا کہ اشیاء کیا کام کر رہی ہیں۔ کشش سے ستارے رُکے ہوئے ہیں۔ روشنی کی رفتار کیا ہے۔ آواز کیوں کر سُنائی دیتی ہے۔ ستارے کتنے بڑے یا چھوٹے ہیں۔ اُن کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ تجربہ سے معلوم کیا کہ کس دوا کا کیا اثر ہے۔ جیسا دیکھا یا دیکھ سکے وہ صحیح یا غلط بتا دیا۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تجربہ، کوئی سائنس نہ یہ بتا سکا ہے، اور نہ بتا سکے گا کہ ایسا کیوں ہے۔ کشش کیوں ہے۔ ادویہ میں یہ اثر کیوں ہے۔ کسی شے یا کسی جاندار کی ماہیت کیوں ایسی ہے کہ جیسی وہ ہے۔ یہ ہی مطلب تھا امام جعفر صادق علیہ السلام کا جب آپ نے اُس دھریہ کو جس نے کیچڑ کو سڑا کر اُس میں کیڑے دیکھے تھے اور کہا تھا کہ دیکھئے میں نے جاندار چیزیں پیدا کر دیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اچھا بتا اس

کتنے مادہ ہیں اور کتنے نر ہیں۔ اگر وُہ خالق تھا، تو اُس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ کسی شے میں کیوں وُہ خاصیت ہے جو اُس میں ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

ایسے ہی چند اور اسرارِ قدرت ملاحظہ کیجئے:۔

یہ تو امر قطعی طور سے ثابت ہے کہ تمام کائنات ایٹم کی بنی ہوئی ہے۔ اگر روح کچھ شے نہیں ہے اور حیات کی بنا بھی مادی ہے، تو یہ بھی کسی قسم کے ایٹموں کی بنی ہوئی ہونی چاہیئے۔ اس پر تجربات کیئے گئے۔ اہل سائنس کہتے ہیں کہ زندگی والے جسم کے اجزا ہائیڈروجن، نائیٹروجن، کاربن، آکسیجن اور ایسے ہی چند اور عناصر ہیں۔ دنیا میں حیات پیدا ہونے کا نظریہ اہل سائنس نے یہ قائم کیا کہ جب دُنیا اپنی موجودہ حالت میں ہوئی تو اس پر یہ سب عناصر موجود تھے۔ اور یہ سب ایٹم آپس میں اس طرح ملے کہ زندگی پیدا ہو گئی۔ لیکن ہائیڈروجن، آکسیجن، نائیٹروجن وغیرہ کے ایٹم آپس میں ملتے ہیں تو اور چیزیں بن جاتی ہیں، زندگی نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن اگر ان میں کاربن کا ایٹم مل جائے، تو زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف کاربن کے ایٹم میں خدا نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ باقی عناصر کے ایٹموں کو ملا کر زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ کاربن کے ایٹم میں چھ الکٹرون Electrons ہیں۔ اُس میں یہ خاصیت صرف اس چھ کی تعداد نے پیدا کی ہے۔ کیمیائی عناصر کی فہرست میں کاربن کے نزدیک کاربن کی دو اور بہنیں ہیں۔ ان کو Boron اور Nitrogen کہتے ہیں۔ مقدم الذکر میں پانچ اور مؤخر الذکر کے ایٹم میں سات الکٹرون Electrons ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت نہیں۔ صرف ایک الکٹرون کے فرق سے ہستی اور نیستی میں فرق ہو گیا۔ انسان اور تمام جاندار چیزوں کی زندگی کا انحصار بقول ان سائنس دانوں کے صرف کاربن کے ایٹم میں چھ الکٹرون ہونے پر ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ یہ لوگ نہیں جانتے۔ اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی تو ہر ایک سائنس دان کی Laboratory (معمل) میں زندگی پیدا ہو سکتی۔ لیکن کوئی سائنس دان زندگی نہیں پیدا کر سکا، لہذا اُنہوں نے نتیجہ نکالا کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ زندگی کس طرح پیدا ہوئی۔

اب مقناطیس کو لو مقناطیسی صفت سب سے زیادہ لوہے میں اور پھر

نکل اور Cobalt میں ہے جو نکل ہی سے مشابہ ہوتی ہے۔ ان عناصر کے ایٹموں میں علے الترتیب ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸۔ الیکٹرون ہوتے ہیں۔ اہلِ سائنس کو نہیں معلوم کہ مقناطیسی قوت کا انحصار کیوں ۲۶ ، ۲۷ اور ۲۸ الیکٹرون پر ہے۔

Radio Activity بھی ایک ایسا ہی معمہ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی ڈکشنری میں اس لفظ کا ترجمہ "شعاع زنی" کیا ہے۔ اس کا انحصار بھی ان ہی ایٹموں پر ہے جن میں ۸۳ سے ۹۲ تک الیکٹرون ہوتے ہیں۔ اہلِ سائنس کو نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے۔

اس بحث کے لیئے دیکھو (۱۱۸)

یہ Radio Activity یا شعاع زنی بھی قدرت کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ ہر ایک ایٹم کا ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے جس کو نواۃ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے گرد ہی الکٹرون چکر لگاتے ہیں۔ یہ مرکزی حصہ جس کو انگریزی میں Neucleus کہتے ہیں پروٹون Proton اور ایک اور ذرہ کا جس کو Neotron کہتے ہیں مرکب ہوتا ہے۔ یعنی Neucleus میں Proton اور Neutron ہوتے ہیں۔ اس مرکزی حصہ اور الیکٹرون کی تعداد پر کسی چیز کی ماہیت منحصر ہوتی ہے۔ اور دھاتوں میں اور اشیاء میں جو آپس میں اختلاف ہوتا ہے وہ اس ہی پر منحصر ہے۔ اکثر دھاتیں Radio Active ہوئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا Neucleus خود بخود بہت عرصہ کے بعد پھٹ جاتا ہے۔ اور یہ دھات دوسری دھات میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مثلاً Uranium کچھ عرصہ کے بعد Radium میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ریڈیم Radium کچھ عرصہ کے بعد جست (LEAD) میں تبدیل ہوجاتی ہے ان کے زیر اثر جو دھاتیں یا جو اشیاء آتی ہیں، اُن میں یہ خاصیت پیدا ہوجاتی ہے پہلے زمانہ میں جو ہوس معمولی دھاتوں کو قیمتی دھاتوں میں تبدیل کرتے تھے یا کرنا چاہتے تھے، ان کے خوابوں کی تعبیر آج پوری ہوئی۔ لیکن یہ نہیں کہ معمولی دھاتیں سونا بنیں، نہیں۔ بلکہ قیمتی دھاتیں معمولی دھاتوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ پھر بھی اہلِ سائنس کو

(118) The Mysterious Universe, pp, 6, 7. 8

یہ نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ عجائبات قدرت میں سے ہے۔ (دیکھو ۱۱۹)

Cosmic Rays ایک اور معجزہ اور عجیب مشاہدہ ہے۔ یہ وہ شعاعیں ہیں جو ہر ایک چیز اور جاندار کے اندر گھس کر اس کا قلع و قمع کر دیتی ہیں۔ ہر وقت آ رہی ہیں دن کو بھی رات کو بھی۔ گویا یہ آسمانی بم ہیں۔ اہل سائنس کہتے ہیں کہ ان کا اثر یہ ہے کہ ہم سب فوراً مر جائیں۔ لیکن نہیں مرتے۔ تعجب ہے کہ کیوں نہیں مرتے۔ ان کی وجہ سے مرد عورت اور عورت مرد بن جاتے ہیں۔ اہل سائنس کو نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے آتی ہیں اور ان کا یہ اثر کیوں ہے۔ یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ سورج اور ستاروں سے یہ نہیں آتیں۔ ممکن ہے کہ دوسری کائناتوں سے آتی ہوں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا اثر دنیا اور دنیا کی اشیاء کے ارتقاء اور نشو و نما پر بہت ہوا ہے۔ یہ ابتدائی عالم ہی سے فضا میں سفر کر رہی ہیں۔ (دیکھو ۱۲۰)

یہ وہ امور ہیں جن سے خداوند تعالےٰ کی قدرت و حکمت کا اندازہ ہوتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

ایسے ہی بہت سے عجائبات ہیں۔ ہمارا مدعا علم ہیئت اور علم طبیعیات کی کتاب لکھنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو انسان کا عجز اور خداوند تعالےٰ کی قدرت و حکمت کا دکھانا ہے۔ تاکہ دھریت کا بے جا دعوےٰ لوگوں کی نظروں میں بے حقیقت اور غلط معلوم ہو۔

قرآن شریف میں شہد کی مکھی (نحل) اور چیونٹی (نمل) جیسی بظاہر ناچیز اور حقیر اور کمزور جانوں کا بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک ایک سورۃ ان کے نام پر ہے۔ لہٰذا ہم ذرا ان پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔ کہ ان کمزور ہستیوں سے کس طرح خداوند تعالےٰ کی شان و حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

خداوند تعالےٰ کا قرآن شریف میں ارشاد ہے:۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ط

(119) The Universe, pp 146-158
(120) The Universe, pp. 158-161;
The Universe Around Us, pp. 124-28

Marfat.com

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾ سورۃ النحل ۱۶ : ۶۸ ، ۶۹

ترجمہ: اے رسول، تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی (اس کے دل میں یہ بات ڈال دی) کہ تو پہاڑوں، درختوں میں اور جو اونچی اونچی ٹٹیاں لوگ بناتے ہیں ان میں اپنے چھتے بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں (کے عرق) کو چوس۔ پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی چل۔ ان مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے۔ (شہد) جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں (کی بیماریوں) کی شفا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیئے (خدا کی) بڑی نشانی ہے۔

اگر انسان خود اپنے معاملات پر نظر ڈالے اور اپنے ہوش سنبھالنے سے بڑھاپے تک کے زمانہ پر غور کرے اور ضد کو درمیان میں نہ لائے، تو جو واقعات اس کو پیش آتے رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے واقعات کو ترتیب دینے والی کوئی ہستی ہے جس پر اس کا اختیار نہیں ہے۔ اس ہی امر واقعہ کو جناب امیر المومنینؑ نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ بڑے سے بڑے عقلمند آدمیوں کے سوانح حیات کو دیکھ لو۔ سیزر، نپولین، ہینی بال، نادر شاہ، ہٹلر وغیرہ۔ یہ لوگ ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اپنی تجاویز مرتب کرنے میں نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی شئے پیدا ہو جاتی تھی، کہ اُن کی تجاویز کو درہم و برہم کر دیتی تھی۔ اور ان تمام بڑے جنرلوں میں یہ بات مشترک پاتے ہیں، کہ وہ خداوند تعالٰی کی ہستی سے انکار نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ تو بڑے آدمی تھے جن کے سوانح حیات ہم کو معلوم ہیں ہر ایک انسان اگر اپنے حالات پر غور کرے تو یہ بات نہایت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ آیات بھی غور کے قابل ہیں:۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۔ بنی اسرائیل ۔ ۱۷ : ۴۴

ترجمہ۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن میں ہیں، وُہ (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (سارے جہانوں میں) کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ وُہ بڑا بُردبار بخشنے والا ہے۔"

تسبیح کرنے والوں میں بے جان اور بے زبانوں کے علاوہ کافر بھی تو آگئے۔ جو خدا کی ہستی ہی سے انکار کرتے ہیں۔ وُہ زبان سے کچھ ہی کہیں لیکن اُن کا ذرہ ذرہ اُن کے اس انکار کے باوجود خدا کی تسبیح و حمد و ثناء کرتا ہے۔ ایک تو اُن کی موجودگی اور اُن کی ترکیب و ساخت ہی خدا کی حمد و ثنا ہے، دوسرے اب سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہر ذرہ میں آواز ہے۔ گویا وُہ آواز کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ناظرین معلوم کر چکے ہیں کہ مادہ کا آخری جزو جس کو ایٹم کہتے ہیں، اب وُہ بھی تقسیم ہو سکا ہے۔ اُس کے دو اجزا ہیں۔ ایک کو الیکٹرون اور دوسرے کو پروٹون کہتے ہیں۔ اس ایٹم کے اندر کا نظام ایسا ہی ہے کہ جیسا ہمارا نظام شمسی ہے، یعنی سُورج کے گرد چند سیارے گردش کر رہے ہیں۔ اور ان کے درمیان میں فضاء یعنی خلا ہے۔ یہی حالت ایٹم کی ہے۔ ایٹم کے Electron اُس کے Proton کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اور ان کا ایک مقرر راستہ ہوتا ہے جس کو Orbit کہہ سکتے ہیں۔ اور درمیان میں خلا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حرکت میں طاقت یا Energy ہوتی ہے۔ اور یہ طاقت دو چیزوں میں مبتدل ہو جاتی ہے۔ ایک تو گرمی، اور دوسرے آواز میں۔ یعنی ہر ایک حرکت میں گرمی اور آواز ہوتی ہے۔ ایٹم میں حرکت ہے۔ لہٰذا ایٹم میں گرمی بھی ہوئی اور آواز بھی۔ لیکن چونکہ وُہ بہت چھوٹی شے ہے نہ تو اُس کی گرمی محسوس ہو اور نہ اُس کی آواز سنائی دے۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایٹم سے مرکب ہے۔ لہٰذا ہر شے میں گرمی بھی ہے، اور آواز بھی۔ پتھر میں کہیں آواز یا گرمی معلوم ہوتی ہے؟ لیکن اس کے ٹھوس انجماد کو بھٹی میں آگ کے ذریعہ سے چونے میں تبدیل کر دو۔ اب چونے پر پانی ڈالو۔ گرمی بھی نکلے گی، اور آواز بھی۔ ہماری اس بحث کی تائید کیجئے

Marfat.com

دیکھو (۱۲۱)

بہر صورت کچھ ہی ہو۔ جو لوگ قرآن شریف کو کلام الہٰی مانتے ہیں۔ اور عربی زبان سے واقف ہیں۔ وُہ ان آیات کے یہ ہی معنی لیں گے کہ ہر شئے آواز کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ دہریوں کی زبان کچھ ہی کہے اُن کے جسم کا ذرہ ذرہ خداوند تعالےٰ کی تسبیح آواز کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن وُہ آواز ہم نہیں سُن سکتے اور نہ اُس کے معنی سمجھ سکیں۔ اگر صرف یہ ہی معنی ہوتے کہ اُن کی ہستی خداوند تعالےٰ کی حکمت و قدرت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اور یہ ہی اُن کی تسبیح ہوئی، تو یہ بات تو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ پھر اِس کہنے کی کیا ضرورت ہوئی: ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔ آگے چلیئے! سورۃ النمل میں ہم وُہ آیات پاتے ہیں، جن کا ترجمہ یہ ھے:۔

یہاں تک کہ جب وُہ چیونٹیوں کے میدان سے گزرے، تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُن کا لشکر تم کو کچل ڈالے اور اُن کو خبر بھی نہ ہو۔ سورۃ النمل ۲۷ : ۲۸ - ۱۹

یہاں ہم یہ ہی کہیں گے کہ اُس خدا کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں جس کی حکمت و قدرت کی مثالیں ابھی ابھی ہم کو سائنس بتا چکا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی بھی آپس میں گفتگو ہوتی ہے جس کو وہ خود بخوبی طرح سمجھتے ہیں، جنہوں نے جانور پالے ہیں وُہ ہماری اِس بات کو اچھی طرح سمجھیں گے۔ علاوہ اِس کے یہ بھی تو دیکھو کہ طائران ہوا ایک جنس میں ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ طوطا، مینا، کبوتر، کوّا، چڑیاں، لال وغیرہ وغیرہ۔ یہ صرف گفتگو ہی سے تو اپنے جوڑے کو پہچانتے ہیں۔ اور تو کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو اپنے قیاس سے چیونٹیوں کے معنی غریب اور کمزور انسانوں کے طبقے کے لیتے ہیں جیسا کہ علامہ یُوسف علی نے اپنے انگریزی کے ترجمہ قرآن میں کیا ہے،

(121) Eddington: The Nature of the Physical World pp. 13-16, 281 Jeans: The Mysterious Universe pp. 43, 44, 46

تو وُہ دراصل زمانۂ حال کے نیچریوں اور دہریوں سے شرماتے ہیں اور اس طرح اپنے قیاس کو عمل میں لاتے ہیں۔ اس واقعہ سے محض اس وجہ سے انکار کرنا کہ ہم چیونٹیوں کی آواز نہ سُن سکیں اور نہ سمجھ سکیں، غلط ہے۔ یہ اُس وقت صحیح ہوتا جب ہم دیکھتے کہ ہماری قوائے مدرکہ یعنی قوت حاسہ، قوت لامسہ، قوت شامہ و فہم لامحدود ہیں۔ ان کی کوئی حد ہی نہیں۔ ان سے زیادہ قوت ہو ہی نہیں سکتی۔ حالت تو یہ ہے کہ بہاڑ سے نیچے زمین پر گرا ہوا دانہ یا بُوٹی انسان نہیں دیکھ سکتا لیکن کبوتر، چیل اور عقاب اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ بلی رات کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ انسان اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کو دیکھنے کے لیئے مائیکروسکوپ اور مسافت طے کرنے کے لیئے گاڑی، موٹر اور ایروپلین چاہئیں۔ یہ سب امور اچھی طرح ثابت کر رہے ہیں کہ انسان کی قوتیں کامل نہیں۔ جب یہ حالت ہے تو یہ دعوٰے کیا حقیقت رکھتا ہے کہ جس کو ہم سُن نہ سکیں، دیکھ نہ سکیں، سمجھ نہ سکیں تو وُہ موجود ہی نہیں۔ وہ ناممکن ہے۔ لندن کی آواز کراچی میں نہیں سنائی دیتی۔ لیکن ریڈیو کے ذریعہ سے سُن لیتے ہیں۔ یہ آواز تو چیونٹی کی آواز سے بھی کراچی میں خفیف ہوئی۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی سُنی جا سکتی ہے۔ فرق تو صرف اتنا ہی ہُوا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ریڈیو نہ تھا۔ لیکن نبی کا ریڈیو اور قسم کا ہوتا ہے۔ اور وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اب آخری یہ اعتراض رہ گیا کہ زبان کا سمجھنا الفاظ پر منحصر ہے۔ اور الفاظ آپس کے معاہدہ اور قواعد سے مرتب کیئے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں میں الفاظ کو معانی دینے اور الفاظ کے لیئے قواعد مرتب کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ گویا ایک طریقہ تو آواز سمجھنے کا یہ ہوا کہ الفاظ منتخب کیئے جائیں اور ان کو معانی دیئے جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آواز کے سمجھنے کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جب مُرغی، کبوتر اور دیگر جانور ڈرتے ہیں تو خاص قسم کی آواز نکالتے ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے تو گھوڑے کی آواز اور طرح کی ہوتی ہے۔ کُتے کی آوازیں کتنے قسم کی ہوتی ہیں۔ دشمن کو دیکھ کر اور طرح سے بھونکتا ہے۔ اپنے آقا کو دیکھ کر اور طرح کی آواز نکالتا ہے۔ تنہائی میں اس طرح بولتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کُتا رو رہا ہے۔ ہاتھی کی ڈر کے وقت اور آواز ہے۔ اپنی مادہ کو بلانے کی اور آواز ہے۔ بلی لڑتے وقت خاص آواز

نکالتی ہے۔ مالک کو پیار کرتے وقت اور طرح سے بولتی ہے۔ ایک ہی نوع کے جانور کی مختلف حالات میں مختلف قسم کی آوازوں کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ہر ایک آواز کے علٰحدہ معنی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آواز کے سمجھنے کے لیئے لفظ ہوں۔ اور لفظ کے سمجھنے کے لیئے معنی ہوں۔ اور اگر ایک مساوی الاضلاع مسدس بنانا چاہیں تو اس کے لیے پرکار و پیمانہ کی ضرورت ہے۔ لیکن شہد کی مکھی تو بغیر اس مدد کے نہایت عمدہ مساوی الاضلاع مسدس بنالیتی ہے۔ بیا اپنا گھر کس خوبصورتی سے بناتا ہے۔ اور پھر اس کو روشن کرتا ہے۔ یہ تو موٹی موٹی مثالیں روزمرہ کے مشاہدہ کی ہم نے بیان کی ہیں۔ بہت سی کتابیں جو جانوروں کی عادات، افعال، اطوار، رہائش کے متعلق ہیں ان کو پڑھیئے اور خدا کی قدرت کے قائل ہو جائیے۔ قرآن شریف میں ان عادات و اطوار کا منبع وحیٔ الٰہی کو بتایا ہے۔ دہریئے Instinct کہہ دیتے ہیں۔

یہ بہت ممکن بلکہ اغلب کہا یقینی ہے کہ بعض انسان خداوند تعالےٰ ایسے منتخب کر لیتا ہے کہ جو اُس کی وحی و رسالت کے حامل ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں اور پھر اُن میں ان قوتوں کو بہت اعلےٰ درجہ میں عطا کرتا ہے۔ اُن کے لیئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بغیر ریڈیو کے خفیف اور دُور کی آواز نہ سُن سکیں۔ بغیر دُور بین کے دُور سے نہ دیکھ سکیں، یا بغیر Television کے اُن کی آنکھوں کے سامنے دور کی اشیاء نہ آسکیں۔ انسان میں ایک روحانی قوتِ فہم و تمیز یعنی Mind کی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک سائنس دان لکھتا ہے۔

ترجمہ:۔ اگرچہ اب تک تو ہم کو صرف اشارات، گفتگو، اور تحریر ہی ایسے ذرائع معلوم ہیں جن سے ایک شخص دوسرے سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور اپنے خیالات اُس تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان ذرایع سے کوئی اور زیادہ لطیف اور دقیق ذریعہ نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں ہم غیر واضح اور غیر یقینی طور سے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ چند منتخب اشخاص کو ان ذرائع سے لطیف تر ذریعہ بطور امداد (غیبی) دیا گیا ہو اور وہ وائرلیس کی طرح کام کرتا ہو۔ جس طرح وائرلیس خاص ٹرانسمیٹر کے ذریعہ سے خاص رسیور کو پیغام پہنچا دیتا ہے۔ (۱۲۲) (ختم ہوا ترجمہ)

دیکھو اصل انگریزی کا ضمیمہ نمبر ۱۷

Marfat.com

(دیکھو اصل .... ضمیمہ نمبر ۱۷)

ہمارا دعوٰی ثابت ہوا کہ یہ منتخب اشخاص حضرت سلیمانؑ کی طرح خاص انبیاء ہیں اور وہ جانوروں کے خیالات کو سمجھ سکتے ہیں۔

انسان کی کمزوری کی تو یہ حالت ہے اور اس پر اتنا غرور کہ خدا کی کنہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس ناجائز و ناموزوں غرور و پندار کو نہایت عمدہ الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

مَا لِابْنِ اٰدَمَ وَالْفَخْرُ۔ اَوَّلُہٗ نُطْفَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ جِیْفَۃٌ وَّلَا یَرْزُقُ نَفْسَہٗ وَلَا یَدْفَعُ حَتْفَہٗ۔

یعنی:۔ ابن آدمؑ کو فخر سے کیا کام۔ اس کی ابتدا نطفہ سے ہے اور اس کی انتہا ایک مُردار گوشت کا لوتھڑا ہے۔ خود اپنے نفس کو رزق نہیں پہنچا سکتا اور نہ اپنی موت کو دُور کر سکے۔

ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا:۔

مِسْکِیْنٌ ابْنُ اٰدَمَ! مَکْتُوْمُ الْاَجَلِ مَکْنُوْنُ الْعِلَلِ، مَحْفُوْظُ الْعَمَلِ، تُؤْلِمُہُ الْبَقَّۃُ وَتَقْتُلُہُ الشَّرْقَۃُ وَتُنْتِنُہُ الْعَرْقَۃُ۔

یعنی:۔ انسان کیسا مسکین و غریب ہے۔ اس کی اجل کا وقت اس سے پنہاں ہے۔ بیماریوں کا اس کو علم نہیں۔ عمل محدود ہے۔ ایک مچھر اس کو تکلیف دے سکتا ہے۔ غم و غصہ اس کو مارے ڈالتا ہے۔ اس کا اپنا ہی پسینہ اس کو گندہ اور بدبودار کر دیتا ہے۔

انسان کی اس ذلیل ابتدا اور اس کے بے جا و بدنما غرور و پندار کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَہٗ ۔ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ ۝

یٰس ۔ ۳۶ : ۷۷، ۷۸

ترجمہ:۔ کیا آدمی نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو ایک (ذلیل شے) نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ یکایک (ہمارا ہی) کھلم کھلا مقابل بنتا ہے اور

ہماری نسبت باتیں بنانے لگا۔ اور اپنی خلقت (کی حالت) بھول گیا۔ (اور) کہنے لگا کہ بھلا جب یہ ہڈیاں (سڑ گل کر) خاک ہو جائیں گی، تو (پھر) کون (دوبارہ) زندہ کر سکتا ہے۔

عجائبات قدرت کون بیان کر سکتا ہے۔ ہم صرف شہد کی مکھی اور چیونٹی کا حال بیان کرتے ہیں کیوں کہ یہ بہت ہی کمزور جانور ہیں۔ اور ان کے کام بڑے سے بڑے جانوروں سے بہتر ہیں۔ چیونٹیوں کی آپس کی گفتگو کا بھی ثبوت مل جائے گا۔

شہد کی مکھیاں ٹولیاں اور جماعتیں بنا کر رہتی ہیں۔ ایک جماعت کے لیئے ایک چھتہ ہوتا ہے۔ ہر ایک چھتہ میں صرف ایک مادہ ہوتی ہے جس کو ملکہ کہتے ہیں۔ اور وہ ہی ساری جماعت پر حکومت کرتی ہے۔ یہ جماعت تین حصّوں میں تقسیم ہوتی ہے ملکہ، نکھٹو اور کمی یعنی کام کرنے والے۔ ایک چھتے میں سینکڑوں نکھٹو ہوتے ہیں۔ یہ نر ہوتے ہیں۔ کام کچھ نہیں کرتے۔ ایک چھتہ کی جماعت کا سب سے بڑا رُکن یہ کام کرنے والی مکھیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہی شہد لاتی ہیں اور جمع کرتی ہیں۔ موم بناتی ہیں خانے بناتی ہیں اور بچوّں کی پرورش کرتی ہیں۔ اُڑنے میں یہ مکھیاں بڑی مضبوط ہوتی ہیں، اور اُن کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ جب یہ اپنے چھتے میں آنا چاہتی ہیں، تو اوپر سیدھی اُڑجاتی ہیں۔ وہاں سے اپنے چھتے کو دیکھتی ہیں اور آجاتی ہیں اور سیدھے خط پر آتی ہیں جو سب سے کم فاصلہ پر ہوتا ہے۔

نکھٹو کے ڈنک نہیں ہوتا۔ لیکن ملکہ اور کام کرنے والیوں کا ڈنگ پیچھے ہوتا ہے جب ملکہ اُن نر نکھٹوؤں میں سے ایک سے جُفتی کھاتی ہے، تو پھر انڈے دینے چھتے کے اُن خانوں میں چلی جاتی ہے جو اس غرض سے بنائے جاتے ہیں۔ دو اور تین ہزار انڈے صرف ایک دن میں دے دیتی ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو پہلے تو وہ ایسے انڈے دیتی ہے جس میں سے صرف کام کرنے والیاں نکلتی ہیں۔ اُن کے لیئے چھتے میں علیحدہ جگہ ہوتی ہے۔ پھر دوسری لائن کے خانوں میں وہ انڈے دیتی ہے جس میں نکھٹو نر نکلیں گے۔ اگر چھتہ بڑا ہے اور ملکہ کا خیال ہوتا ہے کہ دوسری ملکہ ہونی چاہیئے، تو وہ ملکہ والے انڈے تیسری لائن میں دیتی ہے۔ تین دن میں کیڑے بچے نکل آتے ہیں اور فوڑا کام کرنے والیاں اُن کو سنبھال لیتی ہیں، اور پرورش

کرتی ہیں۔ اس کے پانچ اور چھ دن بعد یہ کیڑے اپنے اُوپر ایک خول سا تنتے ہیں۔ جس میں کام کرنے والیاں نکلتی ہیں اور بیس دن میں پوری مکھیاں ہو جاتی ہیں۔ نکھٹو ۲۴ دن میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ اور ان خولوں میں سے ملکہ ۱۶ دن میں نکل آتی ہیں۔ اگر چھتہ چھوٹا ہے تو پُرانی ملکہ اُن نئی ملکاؤں کو خانوں کے اندر ہی مار ڈالتی ہے۔ لیکن اگر چھتہ بڑا ہوتا ہے تو صرف ایک نئی ملکہ چھوڑ دی جاتی ہے اور وُہ پرانی ملکہ اپنے ساتھ اس جماعت کا کچھ حصّہ لے کر نکل جاتی ہے۔ اور دوسری جگہ چھتہ بن جاتا ہے۔

مکھیوں کے دو معدے ہوتے ہیں۔ ایک میں تو شہد بنتا ہے جس کو ضرورت کے وقت نکال کر چھتے کے خانوں میں جمع کر دیتی ہیں۔ دوسرا معدہ اپنے کھانے کا ہوتا ہے۔ موم فقط کام کرنے والی مکھیوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے پیچھے ایک پوٹلی ہوتی ہے۔ یہ موم اُس میں سے نکلتا ہے۔ تو وُہ ہی مکھی یا دوسری مکھیاں مل کر خانے بناتی ہیں۔ یہ خانے ہمیشہ مسدّس بناتی ہیں۔ اور وہ مساوی الاضلاع ہوتے ہیں۔ اس طرح سارا چھتہ بھر جاتا ہے اور کوئی جگہ خالی نہیں رہتی۔ اس میں دو سٹ ہوتے ہیں۔ جن کی پُشت آپس میں ملی ہوتی ہے۔ ہر ایک چھتہ میں دونوں حصوں کے درمیان تقریباً ایک انچ راستہ چھٹا ہوُا ہوتا ہے۔ جس میں سے یہ مکھیاں آتی جاتی ہیں۔ جب وُہ بھر جاتا ہے تو پھر موم سے بند کر دیتی ہیں تاکہ جاڑے میں بیٹھ کر کھائیں۔

چیونٹیوں کی کہانی بھی سُننے کے قابل ہے۔ ان کی بھی علیحدہ علیحدہ جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جماعت میں کئی ہزار ہوتی ہیں۔ ان میں بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ مادہ جو سب سے بڑی ہوتی ہیں، نر جو اُن سے چھوٹے ہوتے ہیں اور کام کرنے والیاں جو سب سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ مادہ اور نر کے پَر ہوتے ہیں۔ لیکن کام کرنے والیوں کے پَر نہیں ہوتے۔ جب یہ نر مادہ سے جُفتی کھا لیتے ہیں تو پھر جماعت سے نکل جاتے ہیں۔ اور پھر واپس نہیں آتے۔ دو چار دن میں یہ مر جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ڈنک نہیں ہوتا۔ اور خود غذا نہیں مہیا کر سکتے ہیں۔ مادہ چیونٹیاں چھوٹے چھوٹے انڈے دیتی ہیں۔ بغیر خورد بین کے نظر نہیں آتے۔ کام کرنے والیاں اُن کو جمع کر

Marfat.com

لیتی ہیں۔ دن کو لے جا کر دھوپ میں رکھتی ہیں۔ اور رات کو گرم جگہ لے آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے بغیر پیر کے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بھی اپنے اوپر خول تن لیتے ہیں۔ ان خولوں کو کام کرنے والیاں دن کو تو دھوپ میں اور رات کو سایہ میں لے جاتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ کام کرنے والیاں ان خولوں کو کاٹ دیتی ہیں، اور پوری چیونٹیاں برآمد ہو جاتی ہیں۔

ان کے گھر بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کام کرنے والیاں ہی گھر بناتی ہیں، اور عام جماعت کے لیئے غذا بھی مہیا کر کے لاتی ہیں۔ ان گھروں میں یہ گلی کوچے بھی بناتی ہیں گھروں میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔ اور گھر بھی کئی منزلوں کا ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے گیلری سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ کئی قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک قسم Mining یعنی کانوں کی بنانے والی چیونٹیاں کہلاتی ہیں۔ یہ مٹی میں گھر بناتی ہیں۔ ستون بھی بناتی ہیں جن پر گھاس سے لپائی کرتی ہیں۔ بڑھئی چیونٹیاں اپنا گھر درختوں میں بناتی ہیں اور اپنے لیئے بہت گہرے خانے اُن درختوں میں بنا لیتی ہیں اور درمیان میں دیوارین رکھتی ہیں۔

چیونٹیاں آدمیوں کو مشقت اور صبر اور کوشش کا سبق پڑھاتی ہیں۔ اپنے سے دس بارہ گنا زیادہ وزن ایک چیونٹی اُٹھا لیتی ہے۔ تمام دن کام کرتی رہتی ہیں۔ اور ضرورت ہو، تو رات کو بھی کام کرتی ہیں۔

ایک قسم کی جوں ہوتی ہے۔ اُس میں سے میٹھا سا عرق نکلتا ہے۔ جس کو چیونٹیاں بہت پسند کرتی ہیں۔ جب کوئی جوں مل جاتی ہے تو چیونٹی اُس کی پیٹھ کو ٹھونکتی ہے۔ اُس سے عرق نکلتا ہے وُہ یہ پی جاتی ہے۔ اور بسا اوقات ان جوؤں کو لاکر اپنے گھروں میں رکھتی ہیں اور پالتی ہیں۔ پرورش کرتی ہیں۔ جس طرح گائے کو رکھتے ہیں اور اُس کا دودھ پیتے ہیں، یہ بھی اُس کا دُودھ پیتی ہیں۔

بعض چیونٹیاں ایسی ہیں جو دُوسری قسم کی چیونٹیوں سے جنگ کرتی ہیں اور جنگ میں اُن کو قید کر کے لے آتی ہیں تاکہ اُن کو غلام بنائیں، اور اُن سے کام لیں۔ چنانچہ وُہ قیدی اُن کے نوکروں کا کام کرتے ہیں۔ یہ لڑنے والی چیونٹیاں وُہ ہوتی ہیں جو خود عقل نہیں رکھتیں اور نہ کام کر سکیں۔ اس لیئے دوسروں کو غلام بنا کر اُن سے

کام لیتی ہیں۔ یہ عام طور سے سُرخ ہوتی ہیں۔ یہ اُن چیونٹیوں سے جنگ کرتی ہیں جو مکان بنا کر رہنے والی کام کرنے والی ہوتی ہیں۔ جب اُن سُرخ چیونٹیوں کو ایسی بستی مل جاتی ہے تو یہ جا کر اپنی آبادی کی چیونٹیوں سے کہہ دیتی ہیں کہ چلو ہمیں ایسی بستی مل گئی۔ پھر وہ سب مل کر آتی ہیں، جنگ کرتی ہیں اور قیدی بنا کر لے جاتی ہیں۔ ان چیونٹیوں کی آپس کی گفتگو کا ذکر ایک انگریزی مصنف اس طرح کرتا ہے:۔ (۱۲۳)

ترجمہ:۔ جن چیونٹیوں پر چڑھائی کرتی ہیں وہ چھوٹی کالے رنگ کی محنتی اور پھرتیلی ہوتی ہیں جو لپٹے بنے ہوئے گھروں میں رہتی ہیں۔ اور جو نہایت محنتی اور مستعد ہوتی ہیں۔ جب کچھ سُرخ چیونٹیاں ایسی کالی چیونٹیوں کی آبادی دیکھتی ہیں تو وہ اپنے مقام پر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہتی ہیں کہ ہم نے یہ آبادیاں دیکھی ہیں۔ پھر سُرخ چیونٹیوں کی فوج اُن چیونٹیوں کے قلعہ پر چڑھائی کرتی ہیں۔ جب کالی چیونٹیوں کے سنتری ان سُرخ چیونٹیوں کی فوج کو آتا دیکھتے ہیں تو فوراً اندر جا کر خبر کرتے ہیں اور پھر فوراً باہر آجاتے ہیں۔ اور اُن کے پیچھے کالی چیونٹیوں کی فوج ہوتی ہے۔ وہ نہایت بہادری سے اپنے دُشمنوں سے لڑتی ہیں، لیکن پسپا ہوتی ہیں۔ کیونکہ سُرخ چیونٹیاں اچھے سپاہی ہوتے ہیں۔ یہ سُرخ چیونٹیاں کالی چیونٹیوں کو پسپا کر کے اُن کے قلعہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔ کالی چیونٹیاں چاروں طرف بھاگ جاتی ہیں اور پھر جلدی سے لال چیونٹیاں منہ میں کالی چیونٹیوں کے انڈے، اور فوراً پیدا ہوئے بچے لے کر نکل آتی ہیں۔ ان کو لیے ہوئے وہ اپنے گھر کو واپس مارچ کر جاتی ہیں۔ اور وہاں اپنے قیدیوں کی پرورش اسی طرح کرتی ہیں جیسی اپنے بچوں کی کرتی ہیں۔ یہ بڑی چیونٹیوں کو نہیں لے جاتے۔ جب کالی چیونٹیوں کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں، تو وہ سارا گھر کا کام کرتے ہیں۔ اور اپنے آقاؤں کی بہت اچھی طرح خدمت کرتی ہیں۔ اُن کو چاٹتے ہیں، اُن کی مٹی جھاڑتے ہیں اور ان کو اپنی پیٹھ پر لیے پھرتی ہیں۔ اُن کے آقا جو سوائے لڑنے کے اور کچھ نہیں جانتے اس طرح خدمت کرانے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے یہ نوکر جاتے رہیں، تو یہ احمق باوجود ہر قسم کی آسائش کے مرجائیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

دیکھو اصل انگریزی کا ضمیمہ نمبر ۱۸

Marfat.com

اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ نمبر ۸

کیسا عمدہ نظام ہے۔ کتنی سمجھ ہے۔ اب تو خداوند تعالٰے کی قدرت کا اندازہ ہوا۔ بے جان بے عقل مادّہ یہ سب کچھ نہیں پیدا کر سکتا۔ اور اگر کہا جائے کہ ارتقاء کے ذریعہ سے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے، تو عادت پیدا ہوئے اتنی دیر لگتی ہے کہ ابھی وُہ منزل نہ پہنچے اور اُس سے پہلے یہ نیست و نابود ہو جائیں۔ یہ مُنکرین خدا قرآن شریف کے الفاظ کو تو نہیں مانتے تھے کہ چیونٹیاں کیونکر بات چیت کر سکتی ہیں، اب اُن کے اُستاد نے کہہ دیا، اب تو مانے بغیر چارہ ہی نہیں رہا۔

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝

باب یازدہم

فلسفۂ اسلام اور اس کی خصوصیات

اب تک جو ہم نے بیان کیا ہے وُہ فلسفۂ اسلام کا مقدمہ تھا۔ کسی شے یا نظریہ کی ماہیت، حقیقت اور عظمت مقابلہ ہی سے اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے۔ لہذا اس ہی نوع کی دیگر اشیاء یا نظریات کی واقفیت ضروری ہے تاکہ دونوں کے مقابلہ سے عقل یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کونسی شے یا کونسا نظریہ صحیح ہے۔ قرآن شریف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے یہاں ہم ایک بات بتاتے چلیں۔ قرآن شریف میں ہر فلسفہ اور ہر قسم کے کفر و شرک کی تردید کی گئی ہے۔ جوں جوں ہم اپنے بیان میں آگے چلیں گے یہ امر واضح ہوتا جائے گا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں جو نمرود کا زمانہ تھا اور حضرت ابراہیمؑ کے ملک میں جو دجلہ و فرات کے درمیان اور اُن کے اردگرد کی وادی تھی ستارہ پرستی، چاند پرستی اور سُورج پرستی عام تھی۔ ایسی عام، کہ دنیا میں رائج ہو گئی تھی۔ چنانچہ مصر کی سُورج پرستی کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور کواکب و قمر و شمس پرستی ملک یونان و ایشیائی

Marfat.com

کوچک میں بھی رائج تھی۔ یونان کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خدا اکثر اپنے تئیں ستاروں میں تبدیل کرتے رہتے تھے۔ اور پھر اُن ستاروں کی پرستش اُن کو خدا سمجھ کر ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ زیادہ تر اس مذہب کی تردید کرتے تھے چنانچہ سورۃ الانعام کی آیات ۷۶، ۷۸، ۷۹ میں حضرت ابراہیمؑ کا طریقۂ تعلیم درج ہے۔ اُن کے غروب ہونے کی طرف توجہ دلا کر کیسی عمدگی سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر واضح کر دیا کہ یہ خدا نہیں ہو سکتے جو کہ اپنے بندوں سے چھپ جائیں۔ وُہ ان کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اور جب حالات سے واقف نہیں ہو سکتے، تو وُہ خدائی کیا کریں گے۔ غروب ہونے کے معنی نیستی و تغیّر کے بھی ہیں۔ جو خدا نیست ہو جائے یا اُس میں تغیر آجائے تو وُہ خدا صاحب قدرت نہیں ہو سکتا۔ عالم الغیب و الشہادۃ نہیں ہو سکتا۔ سمیع و بصیر نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر ان صفات کے خدا خدائی نہیں کر سکتا۔ اس ہی وجہ سے قرآن شریف میں خدا کی ان صفات پر بہت زور دیا گیا۔ اور بار بار دُہرایا گیا ہے!۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا طریقۂ بحث یہ تھا کہ پہلے تو ان مزعومہ خداؤں کی ماہیت اور صفات سے لوگوں کو آگاہ کیا اور پھر بتایا کہ ایسی خاصیتیں رکھنے والے اشیاء خدا نہیں ہو سکتے۔ کلمۂ اسلام بھی جھوٹے خداؤں کی نفی سے شروع ہوتا ہے۔ ان جھوٹے خداؤں کی غیر خدایانہ خصائل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کیا گیا ہے۔ انکار و اقرار، تبرّا و تولّا یہ وہ لازم و ملزوم امور ہیں کہ جن کے بغیر حق نہیں معلوم ہو سکتا۔ فلسفۂ اسلام کی برتری لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے یہ ہی طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے۔ پہلے غلط مذاہب اور غلط فلسفوں کی حقیقت و ماہیت بتائی ہے، اور اُن کی مضحکہ خیز اصول و نظریات کی طرف توجہ دلا کر اب ہم فلسفۂ اسلام کی صداقت ظاہر کرتے ہیں۔

اس ضمن میں فلسفۂ اسلام کی وُہ خصوصیات ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں جو فلسفۂ اسلام کو دیگر مذاہب اور فلسفوں سے ممیز کرتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محض چند خصوصیات ہیں۔ دراصل سارا فلسفہ اور شریعت اسلام ہی دیگر مذاہب اور نظریات فلسفہ سے ممیز ہیں۔ اور یہ ہی اسلام کی خوبی ہے کہ اُس نے مروجہ عقائد اور نظریات میں سے وُہ ہی لیئے ہیں جو انبیاء سابقہ کی تعلیم کی وجہ سے دُنیا میں

Marfat.com

پھیلے ہوئے تھے۔ اور چونکہ مرورِ ایام اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے وہ بُت پرستی کے عقائد سے مخلوط ہو گئے تھے۔ لہٰذا اسلام نے اس کا فرانہ اضافہ کو دور کر کے اصلی ابراہیمی عقائد کو اپنے میں لیا ہے۔ اس باب کے تذکرۂ خصوصیات کو تو محض آنے والے حصۂ دوم کی تمہید تصور کرنا چاہیئے۔

(۱) "اسلام" میں نجات کو ایمان و عمل دونوں پر مبنی کیا ہے۔ بغیر ایمان کے عمل خواہ کتنا ہی نیک ہو، نجات کے لیئے کافی نہیں۔ اسی طرح ایمان کیسا ہی ہو اگر اس کے مطابق عمل نہیں، تو وہ نجات کے لیئے کافی نہیں۔ اس کے علاوہ باقی جتنے فلسفے یا مذہب ہیں، اُنہوں نے نجات کا انحصار ان دونوں میں سے فقط ایک پر رکھا ہے دیکھو بُدھ مذہب و جین مت میں کرم یا عمل پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ لیکن اعتقاد و ایمان کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہودیت و مسیحیت نے عمل کی مطلقاً پرواہ نہ کی۔ یہاں تک کہ پاپائے اعظم کو اختیار دے دیا گیا، کہ وہ روپیہ لے کر عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

(۲) اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی انسان کی صحیح فطرت کے مطابق ہے۔ برعکس اس کے دیگر مذاہب فطرت انسان کے بالکل خلاف ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں دورانِ بحث میں گزرتی رہیں گی۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

(ا) رُھبانیت:۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ کسی دین میں خدا نے رُہبانیت کی اجازت نہیں دی۔ یہ اُن لوگوں نے خود ہی ایجاد کر لی تھی، اور اُس کو بھی نہ نبھا سکے۔ سورۃ الحدید ۵۷: ۲۷۔ اس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

(ب) اپنے جسم کو بیفائدہ تکلیف میں ڈالنا۔ مذہب ہندو، یہودیت و مسیحیت اور دیگر ادیانِ کفر میں یہ خیال رائج ہو گیا تھا، کہ جتنا اپنے جسم کو تکلیف دو گے، اُتنی ہی تمہاری رُوح میں رفعت و صفائی پیدا ہو گی۔ اسلام نے محض نفسِ امارہ بالسوء کی مخالفت کا حکم دیا ہے۔ جو خواہشات تم کو بدی کی طرف لے جائیں، اُن کی مخالفت کرو۔ علاوہ اس کے دنیا میں جو خدا نے تم کو نعمتیں دی ہیں، اُن سے جائز طریقے سے متمتع ہوتے رہو۔

(ج) ترکِ دُنیا اور لذاتِ دُنیا:- ان مذاہب نے یہ تعلیم دی کہ ترکِ دُنیا و لذاتِ دُنیا ضروری ہے۔ اسلام انہماک فی الدنیا کو معیوب قرار دیتا ہے، ترکِ دنیا کی اجازت نہیں دیتا۔ خداوند تعالےٰ نے دنیا اور لذاتِ دُنیا کو انسان کے لیئے پیدا کیا ہے کہ وہ جائز طریقے سے اور حدودِ عدل کے اندر اُن سے مستفید ہوتا رہے، نہ کہ اُن کو بالکل چھوڑ دے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(د) عدل:- کسی فلسفہ یا مذہب نے عدل پر اس طرح اور ان معانی میں زور نہیں دیا جس طرح اور جن معانی میں اسلام نے اس کی تعلیم کی ہے۔ اُنہوں نے اگر بہت ترقی کی تو یہ کہہ دیا کہ انسان کو چاہیئے کہ آپس میں اور اپنے تعلقات میں عدل کرے۔ اسلام نے ان امور کے علاوہ انسان کی گفتگو میں بھی اور اُس کے خصائل میں بھی عدل کو بہت اہمیت دی ہے۔ اچھی خصائل بھی جب حدودِ معینہ و مقررہ سے آگے نکل جاتی ہیں، تو وہ معیوب ہو جاتی ہے۔ شر کیا ہے؟ خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ خدا نے تو خیر ہی کو پیدا کیا ہے۔ لیکن جب خیر اپنی حدودِ معینہ سے نکل جاتی ہے، تو وہ شر ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آگے آئے گی۔ یہاں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس تہدید و تنبیہہ کے ساتھ اسلام نے عدل کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے اور ظلم سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی ہے، اس طرح کسی اور مذہب و فلسفہ میں نہیں ہے عدل کی خواہش اور ظلم سے نفرت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ بڑا اہم مضمون ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اسلام کا ہر حکم، ہر ہدایت، ہر امر، ہر نہی عدل پر مبنی ہے اگر نیکی کا بدلہ بدی سے دیا، تو وہ بھی ظلم ہو گیا۔ ۱۲: ۲۲

اسیطرح اور بہت سی مثالیں ہیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہوگا۔ تقیہ، قوانینِ قرض و سود، نکاح، مُتعہ، طلاق، حقوق و فرائض زوجین، قانونِ وراثت وغیرہ وغیرہ۔ سب میں فطرتِ انسانی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

ان سب قوانین کا اصلی جزو عدل ہے۔ خداوند تعالےٰ اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ الروم ۳۰ : ۳۰

فطرت اللہ کے کیا معنی ہیں؟ "خدا کی پیدا کی ہوئی، مقرر کی ہوئی خلقت"۔ یہی معنی سب مفسرین نے لیئے ہیں۔ علامہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ میں Nature Framed اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مسٹر پکتھال نے Handiwork of God کیا ہے۔ مسٹر سل نے اس کا ترجمہ Institution of God of Allah کیا ہے بہرصورت سب کے معنی ایک ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے انسان کو اس خلقت پر پیدا کیا ہے۔ اس خلقت کا جزوِ خاص "عدل" ہے۔ خدا کی خلقت میں ظلم نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۔(۴ : ۴۰)۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ (۱۰ : ۴۴) یہ کہہ کر کہ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔

چونکہ دنیا میں ظلم عام ہے، لہٰذا ہم لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف خاص طور سے دلاتے ہیں کہ اسلام عدل پر مبنی ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ خدا کی مقرر کی ہوئی خلقت میں کوئی بھی برائی نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو نہایت اچھی خلقت پر پیدا کیا۔ نیکی ہی نیکی کو پیدا کیا۔ بدی کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ نیک صفت کا بُرا استعمال اُس کو بدی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان نیک صفت کو عدل کے اصول کے مطابق عمل میں نہیں لاتا، وُہ ہی بدی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ذرا سا اختیار جو انسان کو دے دیا گیا ہے، دنیا کا سارا ظلم اس کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے بھی ضد کر کے حکومت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیکھو خلافت یعنی نیابت رسول کی کیا شکلیں بنی ہیں۔ رسول کی نیابت تو نہ رہی، اور ہی کی نیابت ہوگئی۔

Marfat.com

(۳) دینِ اسلام میں تبدیلی ناممکن ہے :- اُوپر کی آیت ملاحظہ ہو۔ اسلام کو دین القیم کہا گیا ہے۔ خلقت خدا پر مبنی ہے۔ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اپنے الفاروق میں جو مولوی شبلی مرحوم نے بعض جگہ صاف طور سے اور بعض جگہ صریح اشاروں سے کہا ہے کہ اسلام میں مختلف زمانوں کی ترقیات کے ساتھ ساتھ چلنے کی اہلیت نہ تھی۔ حضرت عمر فاروق نے اس میں ترمیم و تنسیخ کر کے اس میں ترقی کی اہلیت عطا کی۔ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تفصیل کے لیئے دیکھو ہماری کتاب التفریق و التحریف فی الاسلام"۔ اسلام کے علاوہ اور مذاہب جو ہیں ان سب میں پروہتوں کی ایک جماعت Clergy ہوا کرتی ہے۔ جس کو اپنے دین میں موقعہ اور وقت کے مطابق ترمیم و تنسیخ کا حق ہوتا ہے۔ اور وہ اکثر اس حق کو استعمال کرتی رہتی ہے عیسائی پادریوں نے اس حق کو ایسا استعمال کیا کہ مذہب ہی کو مسخ کر دیا۔

(۴) الاعمال بالنیات :- اسلام میں یہ بھی بہت بڑا اصول ہے اور جو محض اسلام ہی کے ساتھ مختص ہے۔ دیگر مذاہب میں رسومات پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کو جزوِ مذہب بنا کر یہ اعتقاد قائم کیا کہ مذہب محض ان رسومات پر مبنی ہے۔ جو یہ رسوم ادا نہ کرے گا وہ نجات نہ حاصل کر سکے گا۔ اور ان رسومات کو ایسا پیچیدہ اور ناقابلِ فہم بنا دیا کہ صرف پیشہ ور پروہت ہی ان کو عوام الناس کے لیئے ادا کر سکیں۔ پروہتوں اور Clergy نے عوام الناس پر فوقیت قائم رکھنے اور اُن سے ممیز ہونے کا یہ ذریعہ پیدا کر لیا۔ برعکس اس کے اسلام نے ثواب و نجات کا مدار محض نیت پر رکھا۔ جو کام کیا جائے، وہ محض خدا کے لیے کیا جائے ورنہ بے کار ہے۔ اور بسا اوقات جیسے نماز ریائی باعثِ عذاب ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (۱۶ : ۱۰۶)

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۞ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۞ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۞ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۞ (۱۰۷ : ۴، ۵، ۶)

بغیر نیت کے نماز نہیں، بغیر نیت کے روزہ نہیں، بغیر نیت کے قربانی نہیں۔ غرض کہ کوئی عمل، کوئی فعل منتج بہ ثواب نہیں ہوتا جب تک نیت نہ ہو۔ اور اگر نیت خیر کی ہے۔ لیکن وہ کام پورا نہ ہوا، تب بھی پورے کام کا ثواب ملے گا مثلاً اگر حج یا زیاراتِ آئمہ علیہم السّلام کے لیئے کوئی شخص روانہ ہوا لیکن راستہ میں مر گیا، یا قدرتی طور سے ایسی رکاوٹ حائل ہو گئی جس پر اُس کا اختیار نہیں تو اُس کو پورا ثواب اُس عمل کا ملے گا جس کا اُس نے ارادہ کیا تھا۔ کسی دیگر مذہب میں یہ بات نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ اگر رسومات صحیح و مکمل طور سے نہ ہوئیں تو کوئی ثواب ہی نہیں۔ جیسا ہم پہلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ اسلام کے علاوہ سب MYSTERY CULTS ہیں۔ مسیحیت نے خواہ مخواہ دین متھرا کی نقل کر کے اپنے تئیں Mystery Cult بنا لیا ہے۔ اسلام میں ثواب عمل کے لیئے محض نیت درکار ہے۔ دیگر مذاہب میں محض رسوم درکار ہیں۔

اب چند احادیث و روایات ملاحظہ ہوں:۔

جناب رسول خدا فرماتے ہیں:۔ لِیَکُنْ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ نِیَّةٌ حَتّٰی فِی الْاَکْلِ وَالنَّوْمِ تمہارے ہر کام میں نیت (رضائے خدا) ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ خواب و خور میں بھی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یقبل عملاً فیہ مثقال ذرۃ من ریاء۔ یعنی خداوند تعالےٰ کوئی عمل قبول نہیں کرتا اگر اُس میں ایک ذرہ کے برابر بھی ریا ہے۔

۱۔ جناب علی ابن الحسین علیہما السلام فرماتے ہیں:۔ لا عمل الا بنیتہ۔ کوئی عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہے۔

۲۔ جناب رسول خدا فرماتے ہیں:۔ نیۃ المؤمن خیر من عملہ و نیۃ الکافر شر من عملہ وکل عامل یعمل علےٰ نیتہ۔ یعنی مومن کی نیت اُس کے عمل سے بہتر ہے۔ اور کافر کی نیت اُس کے فعل سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ اور ہر ایک عمل کرنے والا اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۳۔ جناب امام جعفر الصادق علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندۂ مومن جو نادار

Marfat.com

نے یہ کہتا ہے کہ اگر خدا مجھے وسعتِ رزق دے، تو میں یہ اور یہ نیک کام کروں گا؛ تو خداوند تعالٰے اُس کی صدقِ نیت کو دیکھ کر اُن کاموں کا ایسا ہی اجر اُس کو دیتا ہے کہ جیسے اُس نے وُہ کام کیئے ہوں۔ کیونکہ خدا بہت کریم ہے۔ (جلّ شانہٗ و سلطانہٗ)

۴۔ ابو بصیرؒ سے روایت ہے کہ میں نے جناب امام جعفر الصّادقؑ سے پوچھا کہ عبادت کے لیئے کیا شرط ہے کہ کوئی شخص کرے اور اُس کو ثواب ملے؟ آپ نے فرمایا کہ حسن النیۃ بالطاعۃ۔

۵۔ لاونیت کے رہنمایان اکثر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کتنی تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اُس میں اگر ساری عمر بھی کفر کیا یا بدی کی تو اس کا عذاب اتنا ہمیشگی والا کیوں ہو، اور اگر نیکی کی تو اس کا اجر اتنا طویل کیوں ہو۔ جناب امام جعفر الصادقؑ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔ انما خلد اهل النار فی النار لان نیاتهم کانت فی الدنیا ان لو خلدوا فیها ان یعصوا اللّٰہ ابدا و انما خلد اهل الجنة فی الجنة لان نیاتهم کانت فی الدنیا ان لو بقوا فیها ان یطیعوا اللّٰہ ابدا فبالنیات خلد هؤلاء و هؤلاء ثم تلا قوله قل کل یعمل علی شاکلته قال علی نیته۔ یعنی اہلِ نار جہنم میں اس وجہ سے ہمیشہ رہیں گے کہ اُن کی نیتیں یہ تھیں کہ اگر وُہ دنیا میں ہمیشہ رہتے تو ہمیشہ نافرمانی خدا کی کرتے رہتے۔ اور اہلِ جنت جنت میں اس وجہ سے ہمیشہ رہیں گے کہ اُن کی نیتیں دُنیا میں یہ تھیں کہ اگر وہ دنیا میں ہمیشہ رہیں، تو ہمیشہ خدا کی اطاعت ہی کرتے رہیں گے۔ پس اپنی نیتوں کی وجہ سے یہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ اپنے مقام پر رہیں گے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ۔ (۱۷: ۸۴) شاکلتہ کے معنی یہاں نیتہ کے ہیں۔

قرآن شریف کی دیگر آیات سے بھی یہی نتیجے نکلتے ہیں۔ قرآن شریف ہم کو خبر دیتا ہے کہ حشر و میزان کو دیکھ کر کفار کہیں گے کہ اگر ہم کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے، تو ہم عمل نیک کریں گے کفر نہ کریں گے۔ لیکن خداوند تعالٰی فرماتا ہے: کہ بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔ (۶: ۲۸)

Marfat.com

اگر ان کو دُنیا میں واپس بھیجا جائے، تب بھی وہ ایسے ہی اعمال بد کریں گے۔ ممکن ہے کہ کوئی فلسفہ کا دلدادہ کہے کہ پہلے ہی سے کہہ دیا۔ بھیج کر دیکھا تو ہوتا۔ گویا ساری دُنیا کو از سرِ نو واپس بھیج دینا چاہیئے تھا۔ سب یہ ہی کہتے۔ جن کے درجات میں کمی تھی وُہ بھی یہ کہتے کہ ہم کو بھیج کر دیکھو۔ ہم دوبارہ جا کر بہتر کام کریں گے۔ خدا کے عالم الغیب ہونے کا تو کچھ فائدہ نہ ہُوا۔ خدا کیا ہُوا جمہوری امریکہ کا پریزیڈنٹ ہوگیا۔

خیرات بھی ریاء کی وجہ سے بے کار ہے۔ ۲ : ۲۶۴

کیا وجہ ہے کہ اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب یا فلسفہ نے اس سختی کے ساتھ نیت پر زور نہیں دیا؟ وجہ یہ ہے کہ اسلام میں خدا کا تخئیل یہ ہے، کہ وُہ انسان کی نیت اور دل کے ارادوں سے واقف ہے۔ عالم الغیب ہے۔ ان اللہ یحول بین المرء و قلبہ۔ اور کسی مذہب میں یہ تخئیل نہیں ہے۔ یہودیت و مسیحیت میں بھی یہ ہی تخئیل تھا۔ لیکن جب وہ دونوں مذہب مسخ ہوگئے تو یہودیوں میں احبار نے، اور عیسائیوں میں پوپ نے اس امر میں خدا کی جگہ لے لی۔ اور نذرانہ لے کر مغفرت اور جنت کے پروانے جاری کرنے لگے۔

(۵) حُبِّ خدا:۔ قرآن شریف میں حُبِّ خدا پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خدا سے محبت کرنے کے کیا معنی۔ خدا سے کس طرح محبت کریں۔ مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اس کے معنی عجب لیئے ہیں۔ خدا کے تخئیل میں زلف و عارض، خالِ مشکیں، لب و لعل و اندازِ معشوقانہ کو شامل کرتے ہیں۔ پھر جام مئے کے اندر عکسِ رُخِ یار دیکھتے ہیں۔ خراباتِ پیرِ مغاں میں نورِ عجیب دیکھتے ہیں۔ رازِ درونِ پردہ ان کو رندانِ مست سے ملتے ہیں۔ ذرا ان اشعار کو تو ملاحظہ فرمایئے:

بنیادم از تمنائے لبت کام مم ہنوز	بر امید جام لعلت دردی آشنا مم ہنوز
روز اوّل رفتہ دینم در سر زلفینِ تو	تا چہ خواہد شد دریں سودا سرانجام مم ہنوز
در ازل داد دست مارا ساقیٔ لعلِ لبت	جرعۂ جامی کہ من سرگرم آنجا مم ہنوز

Marfat.com

غور تو کیجیے۔ یہ خدا کا کیا تخئیل ہوا۔ کیا خدا سے محبت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک نہایت حسین، نوعمر معشوق کا خیال معہ اس کے زلف و عارض و خال ہمہ کے کیا جائے کیا یہ محبت و عشق ساغر و مے و خرابات، رندان مست کے ہی خیالات میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ ان الفاظ سے تو ڈر لگتا ہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ اپنے دل میں خدا کا کیا اور کس شکل میں تصور کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اور معلوم نہیں "وصل" سے کیا مراد لیتے ہیں۔ لیکن قرآن شریف بھی خدا سے محبت کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ - ۳ : ۳۱

"کہہ دے اے رسولؐ کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت و پیروی کرو۔ خدا بھی تم کو دوست رکھے گا۔ اور تم کو تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" گویا خدا سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اور خدا کا محبت کرنا یہ ہے کہ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ کیسی سیدھی سی بات ہے جس کو محفل قوالی کے قال "حال" میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جو طریقہ قرآن شریف نے بتایا ہے وہ دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ جب خدا کا لفظ تو مسیحیت میں ملتا ہے، لیکن "کس طرح محبت کی جائے" نہیں بتایا گیا۔

(۶) اطاعتِ رسولؐ:۔ چونکہ تصفیۂ قلب و تزکیۂ نفس اطاعتِ رسولؐ پر مبنی ہے، لہٰذا قرآن شریف میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ - ۳ : ۳۲

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ - ۴ : ۸۰

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں اطاعتِ رسولؐ پر زور دیا گیا ہے۔

اطاعتِ رسولؐ کے کیا معنی ہیں، اور اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ یہ ہم آگے چل کر عنوان نبوت کے تحت میں بیان کریں گے۔

(۷) دینِ یسر:۔ فقۂ اسلام کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ یہ مطابق فطرتِ انسانی ہے، لہٰذا سہل ہے:۔ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ - ۲ : ۱۸۵

Marfat.com

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر انسان اپنی سہولت و ضرورت کے مطابق اپنے قیاس سے اوامر و نواہی خداوندی کی تاویل کرتا رہے۔ اور جو اُس کی خواہش کے مطابق ہو اُس کی پیروی کرے، اور جو اُس کی خواہش کے خلاف ہو اُس کو نظر انداز کر دیا کرے۔ حدود و قیود تو ہر ایک نظام میں ہوتے ہیں اور اسی طرح اسلام میں ہیں۔ مثلاً کوئی شخص نماز دن اور روزوں کی تعداد میں اپنی سہولت کے مطابق کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ دنیا میں کسی جاندار کی زندگی حیوانی ہو یا انسانی، بغیر حدود و قیود کے نہیں ہے۔ اُس انسان و حیوان کو پاگل سمجھا جاتا ہے جو ان حدود و قیود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ انسانی عقل اور حیوانی عقل دونوں میں حدود و قیود ہیں۔ اسلام کو دینِ یسر یعنی آسان دین کہتے ہیں، دینِ بے قیود نہیں کہتے۔

(۸) **شفاعت**:۔ اسلام کی شفاعت میں اور دیگر ادیان کے تخیل شفاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کفارِ عرب کا تو عقیدہ تھا کہ ہمارے لیئے ہماری خواتین خدا یعنی لات و منات و عزیٰ کافی ہیں۔ خواہ ہمارے اعمال ہی خراب کیوں نہ ہوں، وہ ہماری شفاعت خدائے اعظم سے کریں گی۔ اور اُس خدائے اعظم کا فرض ہو گا کہ اُن کی شفاعت قبول کرے۔ یونانیوں کے علم الاصنام میں تو یہ شفاعت جبر کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ خدائے اعظم ZEUS کو باقی خدا اتنا مجبور کرتے تھے کہ وُہ اُن کی شفاعت کو جو در اصل حکم ہوا کرتی تھی ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مسیحیت میں خدا کی اس مجبوری کا اظہار دوسری طرح کیا گیا ہے۔ جب خدا نے شیطان کی زیادتیاں دیکھیں اور دنیا میں گناہ کی کثرت کا ملاحظہ کیا تو اُسے بہت رنج ہوا۔ لہٰذا اُس نے اپنے بیٹے حضرت عیسےٰ کو بنی نوع انسان پر قربان کیا اور صلیب کیلئے پیش کیا۔ تمام بنی نوع انسان (یا یوں کہو کہ دنیائے مسیحیت) کے گناہوں کو اپنے اوپر لے کر حضرت عیسےٰ تو صلیب پر چڑھ گئے۔ اور اب بنی نوع انسان جو مسیحیت میں داخل ہو گئے، اپنے گناہوں سے پاک ہو گئے اور بخشے جائیں گے اس کو Atonement کہتے ہیں۔ جب حضرت عیسےٰ کی خلافت پاپائے اعظم تک پہنچی تو اُنہوں نے بھی اُس حقِ شفاعت میں سے کچھ حصہ لیا اور پروانہ نجات (Papal Dispensations) گناہگاروں کو دے کر اور نذرانے لے کر اُن کی نجات کے ضامن بن گئے۔

لیکن اسلام میں شفاعت کا تصور بالکل مختلف ہے۔ کوئی شخص خدا سے سفارش

Marfat.com

شفاعت ہی نہیں کر سکتا جب تک کہ خداوند تعالےٰ اُس کو شفاعت کرنے کی اجازت نہ دے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ۔ دُوسری شرط یہ ہے کہ اگر اجازت بھی مل گئی تو وُہ اُس شخص ہی کی شفاعت کر سکتا ہے جس کی شفاعت کی خدا اجازت دے۔ کیسے لوگ سفارش کر سکتے ہیں یعنی کیسے لوگوں کو شفاعت کرنے کی اجازت ملے گی؟ اس کو بھی خداوند تعالےٰ نے بتا دیا ہے:۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ ۙ لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ ۲۱: ۲۶، ۲۷، ۲۸-

ترجمہ:۔ اور (اہلِ مکہ) کہتے ہیں کہ خدا نے (فرشتوں کو) اپنی اولاد (بیٹیاں) بنا رکھا ہے۔ (حالانکہ) وُہ اس سے پاک (و پاکیزہ) ہے بلکہ (وُہ فرشتے) خدا کے معزز بندے ہیں۔ یہ لوگ اس کے سامنے بڑھ کر بول نہیں سکتے۔ اور یہ لوگ اسی کے حکم پر چلتے ہیں۔ وُہ (خدا) جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے اور یہ لوگ اس شخص کے سوا جس سے خدا راضی ہو کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے اور یہ لوگ خود اُس کے خوف سے (ہر وقت) ڈرتے رہتے ہیں۔

اگرچہ یہ آیات فرشتوں کے متعلق ہیں اہلِ مکہ کے اس قول کی تردید میں ہیں کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور ہماری سفارش اور شفاعت کرتی ہیں لیکن وما حصل ان میں "مکرموں" کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ خدا کے بندوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مکرموں کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان کی صفات میں سے ایک یہ صفت بھی ہے کہ وُہ شفاعت کر سکتے ہیں۔ چونکہ وُہ ہر وقت خدا کے حکم پر چلتے رہتے ہیں اور اُس کی رضا کے شناسا ہیں لہٰذا وُہ سفارش اور شفاعت بھی اُن لوگوں کی کرتے ہیں جن سے خدا راضی ہے۔

صلحاء و شہداء و صدیقین کا طبقہ مکرموں کا ہے۔ یہ ہم کو اس آیت سے معلوم ہوا:۔ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ۝ ۳۶: ۲۶، ۲۷

جب حبیب نجار کو اُن کی قوم نے بوجہ اُن کے ایمان لانے کے قتل کر دیا

اور موت کے بعد جو عزت خدا نے اُن کو دی اُس کو دیکھ کر اُنہوں نے کہا:۔
ترجمہ:۔ میرے پروردگار نے جو مجھ کو بخش دیا اور مجھے معزز لوگوں کی جماعت میں شامل کر دیا۔ کاش میری قوم کے لوگ اُس کو جانتے"۔

ہمارا یقین کامل ہے کہ جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے آئمۂ اہلبیت علیہم السلام کو خداوند تعالےٰ نے شفاعت کی عام اجازت دے رکھی ہے۔ جس شخص کی وہ چاہیں سفارش و شفاعت کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کو خطاب کر کے ہمیں خبر دی گئی ہے کہ: وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ۔ ۷۶ : ۳۰

(۹) شکر:۔ ہر ایک نعمت جو انسان کو ملے، اس کے لیئے خدا کا شکر ادا کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔ ۱۴ : ۷۔ اگر شکر کیا، تو نعمت زیادہ ہوگی۔ اگر کفرانِ نعمت کیا، تو خدا کا عذاب نازل ہوگا۔

نَّجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۙ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ۔ ۵۴ : ۳۴، ۳۵
ہم اسی طرح شکر کرنے والوں پر اپنا فضل و کرم کرتے ہیں۔

اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ ۳۴ : ۱۳۔
ترجمہ:۔ اے آلِ داؤدؑ تم شکر کرو۔ میرے بندوں میں سے بہت کم شکر کرنے والے ہیں۔

جناب امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "توراۃ میں لکھا ہے کہ تم شکر کرو اُس کا جو تم کو کوئی نعمت دے۔ اور نعمت دو اُس کو جو تمہارا شکر ادا کرے۔ کیونکہ اگر تم نے شکر ادا کر دیا، تو پھر نعمتوں کے لیئے زوال نہیں ہے۔ اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا، تو پھر اُن کے لیئے بقاء نہیں ہے۔

جناب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی امر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ دُعاء مصیبت کے وقت، استغفار گناہ کے وقت اور شکر نعمت کے وقت۔

شکر کے ادا کرنے کا طریقہ آپ بتاتے ہیں:۔ شکر النعمة اجتناب المحارم و تمام الشکر قول الرجل "الحمد للہ رب العالمین"۔ یعنی شکر اس طرح ادا

ہوتا ہے کہ حرام امور سے پرہیز کیا جائے۔ اور تمام شکر ہے کہ انسان کہے: "الحمد للہ رب العالمین"
شکر قول و فعل و دل سے ادا ہوتا ہے۔ افبنعمۃ ربك فحدث۔ اور ارشاد ہوتا ہے اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ۔ ۲۸ : ۷۷
(۱۰) صبر۔ قرآن شریف میں صبر کی بہت تاکید ہے۔ اور صابر کا بہت اعلیٰ درجہ ہے۔ تمام آیات کا یہاں نقل کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ آئمۂ حق کی خاص شناخت صبر سے ہوتی ہے۔ اور کسی دین میں صبر کو یہ درجہ نہیں دیا۔ مصائب دنیا و آلام زندگی کی تشریح ہی بہت حد تک صبر اور امتحان کے تصورات سے ہوتی ہے۔ جناب امام جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔ الصبر من الایمان بمنزلۃ الراس من الجسد فاذا ذھب الراس ذھب الجسد کذالك اذا ذھب الصبر ذھب الایمان۔
ترجمہ:۔ صبر کو ایمان سے وُہ ہی نسبت ہے، کہ جو سر کو جسم سے ہے۔ جب سر چلا جاتا ہے تو جسد بھی مردہ ہو جاتا ہے، اسی طرح جب صبر چلا جاتا ہے تو ایمان بھی گم ہو جاتا ہے۔
جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔
الصبر صبران صبر عند المصیبۃ حسن جمیل و احسن من ذالك الصبر عند ما حرم اللہ عزّ وجلّ علیك والذکر ذکران ذکر اللہ عزوجل عند المصیبۃ و افضل من ذالك ذکر اللہ عند ما حرم اللہ علیك فیکون حاجزا۔
ترجمہ:۔ صبر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو صبر مصیبت کے وقت، یہ بھی بہت اچھا صبر ہے۔ لیکن اس سے بھی بہتر صبر وہ ہے جو اُن چیزوں سے کیا جائے جو خدا نے تم پر حرام کر دی ہیں۔ اسی طرح ذکر بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو ذکرِ خدا مصیبت کے وقت، اور اس سے بھی افضل ذکرِ خدا وُہ ہے جو محرمات سے بچنے کے وقت کیا جائے۔
جناب امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔ الجنۃ محفوفۃ بالمکارۃ

Marfat.com

والصبر فمن صبر علی المکارہ فی الدنیا دخل الجنۃ وجھنم محفوفۃ بالذات والشھوات فمن اعطی نفسہ لذتھا وشھوتھا دخل النار۔

ترجمہ: جنّت مصائب دُنیا اور صبر کے درمیان ہے۔ جس نے دنیا کے مصائب و آلام پر صبر کیا وُہ جنّت میں داخل ہُوا۔ اور جہنم لذات و خواہشات کے درمیان ہے۔ جس نے اپنے نفس کی لذات و خواہشات کو پُورا کیا، وُہ دوزخ میں داخل ہُوا۔

(۱۱) اتفاقات: اسلام میں اتفاق Chance کوئی شئے نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر آدمی کا پیر پھسل کر وُہ گر جاتا ہے یا تیز موٹر کار کی زد میں آجاتا ہے تو اس کو بھی اتفاق نہیں کہا جائے گا۔ جس طرح نپولین کی رائے میں ناممکن کا لفظ لغت سے نکال دینا چاہیئے اسی طرح اسلامی ڈکشنری سے اتفاق کا لفظ نکال دینا چاہیئے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم و ارادہ و اجازت سے ہوتا ہے یا اس کے نہ روکنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسا قرآن شریف میں درج ہے۔ اگر خدا چاہے، تو کوئی کفر ہی نہ کرے، اور اگر خدا روک دے تو شیطان بدی ہی نہ کر سکے۔

(۱۲) حقیقت دُنیا اور مقصد حیاتِ انسان:۔ صحیح فلسفہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وُہ دنیا کی حقیقت کو معلوم کرے اور بتائے کہ اس دنیا میں انسان کا مقصد حیات کیا ہے۔ اور اس کو وُہ کس طرح پورا کر سکتا ہے۔ تمام فلسفے اور سب غیر الہامی مذاہب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حیاتِ انسان کا مقصد اس دنیا ہی میں پُورا ہو جاتا ہے یا ہو جاتا چاہیئے۔ اگر انہوں نے اپنے طریقہ سے کسی مافوق الطبیعیات طاقت کو مانا تو فقط اس لیئے کہ وُہ انہیں اس دنیا کی لذات سے بہرہ اندوز کرے اولاد عطا کرے۔ مویشیوں میں کثرت ہو۔ فصلیں اچھی اور وافر ہوں۔ تجارت میں فائدہ ہو۔ اگر یہ ہو گیا تو بس اُن کا مقصد حیات پُورا ہو گیا۔ اور اس ہی مقصد کے حصول کے لیئے وہ اپنے خود ساختہ خداؤں سے التجا کرتے تھے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحیح مقصد حیات انسان ہے۔ اگر اس دنیا میں انسان کو مکمل خوشی حاصل ہو جاتی ہے یا ہو سکتی ہے اور جو جسمانی اور روحانی قوائے عملیہ و عقلیہ اس کو دیئے

Marfat.com

گئے ہیں اُن کا پُورا پُورا ارتقاء اور نشوونما اس دنیا کی زندگی میں ہو جاتا ہے اور جو طاقتیں یا ترقی کے امکانات انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں وُہ خاطر خواہ پورے ہو جاتے ہیں اور انسان کو پوری پوری تسکین اور خاطر جمعی حاصل ہو جاتی ہے تو ہم نتیجہ نکالیں گے کہ ان حکماء کا مقرر کردہ مقصدِ حیات صحیح ہے۔ اور ہماری ساری کوششیں اس دنیا کی زندگی کے لیے ہونی چاہئیں۔ لیکن معاملہ برعکس ہے اور ہماری قوائے جسمانیہ اور روحانیہ کی پوری تکمیل کیلئے یہ زندگی کافی نہیں ہے۔ آخری عمر میں جب ہم موت کے نزدیک ہوتے ہیں اور گزری ہوئی زندگی کو مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قوائے جسمانیہ اور روحانیہ کے ارتقاء کے لیئے تو ابھی بہت وسیع میدان اور عظیم الشان امکان باقی ہے۔ یہ گزری ہوئی زندگی تو محض ایک خواب پریشان معلوم ہوتی ہے جس کی ابھی تعبیر بھی نہیں نکلی۔ شوق و خواہش پرواز بہت، لیکن فضائے پرواز کچھ بھی نہیں ہم نے اس زندگی سے پایا کیا؟ کچھ نا اُمیدیاں، کچھ غم و الم، کچھ حسرتیں۔ یہ ہیں وہ ساتھی، جن کو اپنے ساتھ لے کر ہر ایک انسان قبر میں جاتا ہے۔ خواہ بادشاہ ہو خواہ فقیر۔ دنیا کی ساخت ہی ایسی ہے، کہ انسان کے لیئے اس میں خوشی ناپید ہے۔ جن راحتوں کو ہم نے بہت تکلیف اُٹھا کر حاصل کیا تھا، وُہ راحتیں حاصل ہوتے ہی فکر میں مبدل ہو گئیں۔ جس حسن پر ہم جان دیتے تھے وُہ کہاں گیا؟ جس عشق پر ہم کو ناز تھا، وُہ تو محض حماقت ثابت ہوا۔ جوانی میں بہت اچھے اچھے خواب دیکھا کرتے تھے، وہ خوابوں کی رات بھی چشم زدن میں گزر گئی۔ اصلی خوشی نہ بچپن میں تھی اور نہ جوانی میں۔ بڑھاپے میں تو خوشی کا لفظ بھی زبان پر آنا ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی راحت بھی کوئی راحت ہے۔ ابوالعتاھیہ نے کیا اچھا کہا ہے ؎

حَلَاوَتُهَا مَمْزُوجَةٌ بِمَرَارَةٍ وَرَاحَتُهَا مَمْزُوجَةٌ بِعَنَاءِ

"دنیا کی مٹھاس میں کڑواہٹ ملی ہوئی ہے، اور اُس کی راحتوں میں تکلیفیں شامل ہیں۔" غالب کہتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

شیخ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ "آنچہ پایندگی ندارد دلبستگی را نشاید"۔ دُنیا کی کسی شئے کو کسی حالت کو ثبات نہیں۔ دوام نہیں۔ ہماری زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہے جس کا ہر قطرہ گزرنے کی حالت میں متحرک ہے۔

چنانچہ کہنے والا کہتا ہے ؎

دگرگوں مے شود احوال عالم بہر ساعت بہر لحظہ بہر دم!

ایسی حالت میں خوشی و راحت کی تلاش بے سُود ہے۔ انسان کی زندگی محض ایک خیال ہے۔ انسان ماضی کی یاد میں اور مستقبل کی اُمید میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ دونوں خیالی حالتیں ہیں۔ حال تو ایسی تیزی سے گزر رہا ہے کہ گویا ہے ہی نہیں جو لمحہ آیا وُہ فوراً ماضی میں تبدیل ہو گیا، اور جو نہیں آیا وُہ مستقبل میں ہے۔ اس خیالی زندگی کی بھی کوئی حقیقت ہوئی؟ گزرے ہوئے عیش کی یاد، آنے والے عیش کی امید۔ اس ہی امید و بیم میں انسان کی زندگی گزرتی ہے۔ دُنیا کی اگر کسی بات پر یقین ہو سکتا ہے، تو وُہ تین ہیں: ظلم، دنیا کی بے ثباتی، اور موت۔

جب حالت یہ ہے تو مذہب کی ضرورت ظاہر ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب ہوئے ہیں، اور اب اس لادینی کی حالت میں بھی ہیں، جن کو خدا سے انکار ہے۔ انہوں نے بھی اپنا کوئی خدا مقرر کر لیا ہے۔ مذہب کا نام بدل کر Ideology رکھ لیا ہے اور اُس پر عمل پیرا ہونا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور اُس کے لیئے جان دیتے ہیں۔ صرف خدا والے مذہب کو بدنام کرتے ہیں اور غیر خدا کے مذہب پر جان دیتے ہیں۔ غرضکہ کسی نہ کسی مذہب کا اختیار کرنا ضروری ہوا۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسا مذہب اختیار کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ وُہ مذہب اختیار کیا جائے جو حیاتِ انسان کی ضروریات کو بااحسن وجوہ پورا کرتا ہے۔ اور جو سوالات و مشکلات پیدا ہوتی ہیں، اُن کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ وُہ ضروریات و مسائل مشکلہ یہ ہیں:۔

مسائل برائے حل:۔

۱۔ ہماری زندگی مخالف عناصر، مخالف ماحول اور مخالف آفات سے گھری ہوئی ہے۔ ان سب کو قابو میں رکھنے اور مغلوب کرنے کے لیئے کوئی طاقت ہی،

Marfat.com

یا نہیں۔

۲۔ اتنا بڑا نظام کائنات ہے لیکن باوجود اس کے اُس میں ضبط و نظم و نسق ایسا ہے کہ ہر ایک شے اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آیا ان سب کا کوئی خالق و منتظم و مدبر ہے یا نہیں ہے۔ اگر ہے تو کون ہے' اُس کی صفات کیا ہیں۔

۳۔ حادثات زمانہ کے سامنے ہم بے بس نظر آتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف بے ایمانی، عیاری، مکروفریب و دغابازی ہے۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ظلم و زیادتی ہے۔ آیا ہمیں دیکھنے والا' اور ہمارے حالات پر نظر رکھنے والا کوئی ہے یا نہیں۔ اس ظلم کی داد رسی کہیں ہوگی یا نہیں۔

۴۔ کیا ہماری زندگی یہیں ختم ہو جاتی ہے اور ہم کیڑے مکوڑوں کی طرح پیدا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہماری طاقتوں اور ہماری خواہشوں کے لیئے وسعت زمان و مکان کچھ بھی نہیں۔ موت کیا ہے۔ ہمارا مقصدِ زندگی کیا ہے۔

۵۔ اس دنیا کے بنانے والے اور اس نظام کے ترتیب دینے والے نے دنیا کو ایسا کیوں نہ بنایا جس میں راحت و آرام' اور عدل و اطمینان اور امن و امان ہوتے۔ دُنیا سے خوشی کیوں مفقود ہے۔

۶۔ اندریں صورت دنیا کے علائق سے وابستہ رہنا اچھا ہے یا دنیا سے علٰحدہ ہو کر رہبانیت اختیار کرنی چاہیئے۔

۷۔ جب خوشی مفقود ہے' رنج و غم کے دائرہ میں ہم پھنسے ہوئے ہیں' موت ایک نہ ایک دن آنی ضرور ہے' تو آج ہی خود کشی کر کے کیوں نہ اس سارے جھگڑے ہی کو ختم کروں۔

یہ تو ہم نے دیکھ لیا کہ دیگر مذاہب اور فلسفے ان سوالات کو کس طرح حل کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام ان کو کس طرح حل کرتا ہے۔ اسلام کا فلسفہ اور اُس کی تعلیم یہ ہے کہ خالق و مدبّرِ کون و مکاں صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے دو ہوتے تو عالم میں فساد پیدا ہو جاتا' اور یہ اتحاد اور یک رنگی نہ ہوتی۔ اُس کے قبضۂ اقتدار میں تمام کون (Being) اور مکان (Space) ہیں۔ اس کے علم میں عالم کی چھوٹی سے چھوٹی شے ہے۔ اگر پتہ گرتا ہے' تو اس کو علم ہے۔ اگر ایک چڑیا مرجاتی ہے

Marfat.com

تو اُس کا علم اُس کو ہے۔ ہمارے افعال، ہمارے اعمال، ہمارے دل کے راز، ہماری زبان کے الفاظ سب سے اُس کو واقفیت ہے۔ ہمارے حالات کو جانتا ہے۔ جو رنج ہم کو پہنچتا ہے، اُس سے واقف ہے۔ جو راحت ہم کو ملتی ہے، اُس کو جانتا ہے۔ ہماری تمام مشکلات سے واقف ہے۔ ہماری کمزوریوں اور مجبوریوں سے آگاہ ہے۔ رحمان بھی ہے، رحیم بھی ہے۔ اور اگر کوئی گناہ میں جان بوجھ کر اُس کی عمداً نافرمانی کر کے اصرار کرتا ہے، تو قہار و جبار بھی ہے۔ ہمارے دل کے اصرار اور ہماری نیت و ارادے سے وُہ واقف ہے۔

دنیا میں جو واقعہ ہوا ہے، ہو رہا ہے اور آیندہ ہوگا اُس سب کا علم اس کو خلقت دنیا و ما فیہا سے پہلے تھا۔ اور وُہ سب اُس کی اجازت سے ہوتا ہے۔ دنیا میں خیر بھی ہے، شر بھی ہے، ظلم بھی ہے۔ طغیان بھی ہے۔ خدا سے بغاوت و نافرمانی بھی ہے۔ خدا کے نیک بندے بھی ہیں جو اُس کی عبادت و اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور حتے المقدور اُس کے ادامر و نواہی کی پابندی کرتے ہیں یہ سب کچھ خدا کی اجازت سے ہے۔ اگر خدا چاہتا، تو قضا و قدر صادر کرتا اور پھر کوئی اُس کی نافرمانی نہ کر سکتا۔ گناہ نہ کرتا۔ ہم نے اجازت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان کی زبان محدود ہے۔ اور اُس میں اجازت کے علاوہ کسی اور لفظ سے یہ مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ خداوند تعالےٰ نے انسان کو ایک حد تک صاحب اختیار بنایا ہے۔ اور یہ ظلم و شر و بغاوت اس ہی اختیار کی وجہ سے پیدا ہوئے ورنہ دُنیا کی خلقت اور اُس کا نظام اور انسان کی فطرت بُری نہیں ہیں۔ انسان کو خیر و شر کا علم دے کر صاحب اختیار بنا دیا گیا ہے۔ اور ساری خرابیاں اُس کے اختیار و قیاس سے پیدا ہوئیں۔ اس اختیار نے انسان کو شیطان کے دھوکہ میں آنے کا امکان پیدا کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ اختیار کیوں دیا گیا، اور شیطان کو اس کے بہکانے کے لیئے مہلت کیوں دی گئی؟ جہاں تک ہم نے اس پر غور کیا، دو وجہات نظر آتی ہیں۔ انسان کو اختیار کیوں دیا گیا؟ اس وجہ سے کہ اُس نے خود ضد کر کے

خدا سے اُسے حاصل کیا۔ خدا نے تو حکم دے دیا تھا کہ فلاں درخت کے نزدیک تک نہ جانا لیکن انسان نے اُس درخت کا پھل کھا لیا۔ باوجود خدا کے صریح حکم کے اُس نے اپنے قیاس اور اختیار پر عمل کیا۔ خدا نے فرمایا کہ اس جگہ تم میرے حکم کے خلاف اپنا قیاس اور اختیار استعمال نہیں کر سکتے۔ اس جگہ سے علٰحدہ ہو جاؤ اور نیچے چلے جاؤ۔ میں نے تم کو ایک حد تک اختیار دیا جس کی تم کو خواہش تھی۔ تم کو خیر و شر کا علم دے دیا گیا ہے (فالہمہا فجورہا و تقواہا) باوجود ان سب باتوں کے میں تمہارے لئے تم ہی میں سے اپنے نبی و ہادی بھیجوں گا۔ اُن کے کہنے پر عمل کرو گے، تو پھر تمہارے لیئے رستگاری ہے اور اُس جنت میں پھر آ جاؤ گے۔ اور اگر نہیں، تو اپنے ساتھی شیطان کے ساتھ دوزخ میں جلنا۔

شیطان کو اس وجہ سے مہلت دی گئی کہ وُہ اپنے اس دعوٰی کو ثابت کرے کہ میں انسان سے افضل ہوں۔ میں تیرے سارے بندوں کو ورغلاؤں گا۔ خدا نے فرمایا کہ تُو جن کو ورغلائے گا، اُن سب کو تیرے ساتھ دوزخ میں ڈال دوں گا۔ لیکن تُو میرے سچے اور مخلص بندوں کو نہیں بہکا سکے گا۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے شیطان سے افضل ہے۔ اگر شیطان کو یہ مہلت نہ ملتی تو ثابت ہوتا کہ شیطان کا دعوٰی درست ہے۔ لہٰذا مہلت ملی اور اس لفظ کے ہر وسیع معنی میں مہلت ملی۔ اس وسعت کے یہ معنی ہوئے کہ خداوند تعالیٰ جبراً نہیں مل کر اُن قوانین قدرت کے مطابق جو حیاتِ انسانی پر حاوی ہیں۔ انسانی کی ہدایت کرے گا۔ اور شیطان کو بھی مہلت یعنی اجازت ملی کہ اُن ہی اسباب و قواعد کو انسان کی گمراہی کے لیئے استعمال کر سکتا ہے۔ شیطان کے چیلنج کے ساتھ خدا نے بھی شیطان کو ایک چیلنج دیا کہ تُو میرے مخلص بندوں کو نہیں ورغلا سکے گا۔ وہ مخلص بندے جو اپنی اُس فطرت پر قائم ہیں جس کی وجہ سے میں نے تجھ پر آدمؑ کو فوقیت دی۔ اب اگر شیطان خدا کے مخلص بندوں کو بھی گمراہ کر سکے، تو خداوند تعالےٰ کا چیلنج فیل ہو جاتا ہے۔ لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ شیطان خدا کے مخلص بندوں کو بہکانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ لوگ نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔ جو کہتے ہیں کہ شیطان کے ورغلانے سے جناب رسولؐ خدا نے عرب کی خدائنیوں کے لیئے کہہ دیا کہ تلک غرانیق العلٰی

اور اُن کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ ان امور کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ اس بیان سے مسائل جبر و اختیار اور قضا و قدر حل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بحث میں ہمیشہ اجازت یعنی مہلت اور حکم یعنی قضا کے فرق کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں اکثر کہا گیا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں ہدایت کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں پڑا رہنے دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن لوگوں کو توفیق ہدایت نہیں ملتی۔ وُہ ایسے لوگ ہیں جو گناہ پر اصرار کرتے ہیں، اور خداوند تعالےٰ کی نشانیوں پر توجہ نہیں دیتے۔

خداوند تعالےٰ کی وحدانیت کے دلائل میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ تمام کون و مکان میں خداوند تعالےٰ کی وحدانیت کے اثر سے یکجہتی ہے۔ اگرچہ مختلف اقسام کے اشیاء مختلف انواع کے جانور دُنیا میں نظر آتے ہیں، لیکن اُن سب کا منبع ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی قانون کے تابع ہیں۔ حرکتِ کن فیکون سے ایک لہر حیات پیدا ہوئی۔ اُس کا نام بجلی کی لہر رکھو۔ یا حیات کی موج۔ اُس سے ایٹم پیدا ہوئے، ایٹم سے مخلوقات بنی۔ ایٹم کتنی چھوٹی سی شے ہے۔ لیکن اُس کے اندر کا نظام ایسا ہی ہے، جیسے سبع سیارگان کا۔ ایٹم کے اندر کے اجزا کی مختلف تعداد و ترکیب سے اختلاف اشیاء و جانداران پیدا ہوُا۔ سب کا منبع ایک ہی تھا۔ یہ ہی قانونِ وحدت غیر مرئی اشیاء اور صفات میں جاری ہے۔ دُنیا میں کتنی قسم اور انواع کی بدیاں اور نیکیاں ہیں۔ خیر و شر کے کتنے اصناف ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اُن سب کا منبع ایک ہے۔ بروئے فقۂ اسلام دنیا میں محض ایک گناہ یا بدی ہے اور ایک ہی نیکی یا احسان ہے۔ وُہ گناہ ظلم ہے۔ اور وُہ نیکی اُس کے برعکس عدل ہے۔ دنیا میں جتنی خرابیاں یا بُرائیاں ہیں اگر اُن کا اختصار کیا جائے، تو صرف ایک جزو رہ جائے گا، اور وُہ ظلم ہوگا۔ اُن کی ابتداء بھی ظلم سے ہوتی ہے، اور انتہاء بھی ظلم پر ختم ہوتی ہے۔ اُسی ابتداء و انتہاء کے اندر سب کچھ آجاتا ہے یہاں تک کہ شرک کو بھی ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ اور ہر بدی کرنے والے کو، ہر ایک منکرِ آیاتِ خداوندی کو قرآن شریف میں ظالم کا خطاب دیا گیا ہے۔ اور اسی طرح اگر حسنات پر غور کیا جائے، تو وُہ سب عدل پر مبنی نظر آئیں گی۔ ظلم اور عدل کی

Marfat.com

ہیں۔ اشیاء، صفات و اخلاقیات کی غلط قدریات کا نام ظلم ہے، اور اُن کے صحیح انداز سے کا نام عدل ہے۔ اس صحیح قدرات یعنی میزان کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ: وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝

الرحمٰن - ۵۵: ۷، ۸، ۹ -

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید ۵۷: ۲۵)

اس میزان کو اگر دال چاول کی تول پر حاوی کرنا چاہو، تو کر لو۔ لیکن قطعاً یہ اُس میں منحصر نہیں ہوتا۔ وہاں ختم نہیں ہوتا۔ اس کی قدر و منزلت یہ ہے، کہ انبیاءؑ کے ساتھ اُن کی کتاب کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے۔ اور جب زمین و آسمان بنائے گئے تب ہی یہ بھی بنایا گیا۔ صحیح آئمہ و رہنمایاں کی شناخت اور اُن کی پیروی اس ہی میزان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ آئمہ ہدیٰ کو آئمہ تلبیس سے علیحدہ کرنا، یہ اُن کی شناخت ہے۔ اور شناخت کیا ہے؟ ہر ایک چیز، ہر ایک شخص کو اُس کی صحیح اور اصلی قدر دینا۔ اگر اس حکمِ خداوندی کو مانا جاتا، تو پھر کوئی شخص نہ تو شیطان کی پیروی کرتا۔ اور نہ آئمۂ تلبیس کے پیچھے جاتا۔ اور دُنیا میں عدل کامل کا رواج ہوتا۔ سقیفہ میں کیا ہوُا، کربلا میں کیا ہوُا، انبیاء کی کیوں تکذیب کی گئی، آنحضرت شعب ابی طالب میں کیوں محصور کیئے گئے؟ ہجرت پر کیوں مجبور ہوئے؟ ان سب اور دیگر ایسے ہی واقعات کی وجہ صرف ایک ہی تھی۔ لوگ صحیح قدرات سے تجاوز کر گئے، صدق و کذب کو غلط ملط کر دیا۔

غرضکہ دُنیا میں ایک ہی گناہ ہے، ایک ہی بدی ہے، اور وُہ ظلم ہے۔ ایک ہی نیکی ہے، ایک ہی عمل صحیح ہے اور وُہ عدل ہے۔ ہر ایک شخص کو وُہ ہی دو خواہ مال ہو خواہ شہرت، جس کا وُہ اہل ہے۔ محفلوں میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کی صفات نیک کو جتانا اور بڑھانا، اور اپنے مخالفین کی صفاتِ حسنیٰ کو چھپانا یا گھٹانا، یا اُن کی غیبت کرنا۔ یہ بھی ظلم ہے۔ یہ ایسا ہی بُرا ہے جیسا بے جا تقسیم مال۔

Marfat.com

بلکہ اس سے زیادہ، بہت زیادہ تمام فساد اور فتنے کی بنا، یہ ہی ہے۔

یہاں ایک معترض دھریہ اعتراض کر سکتا ہے کہ خداوند تعالےٰ نے ظلم کو اتنا بُرا سمجھا اور اسلام میں اُس کو تمام بُرائیوں کی جڑ بتایا گیا۔ لیکن ہم دُنیا میں دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ظلم ہی ظلم ہے۔ ممکن ہے کچھ تو یہ ظلم انسان کے اپنے اعمال و افعال کا نتیجہ ہو۔ لیکن ایسے بھی مصائب ہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہیں، اور خدا ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں۔ موت کا بے محل اور بے جا اور بے وقت عمل اُن میں سے ایک ہے۔ انسان ایک کمزور ہستی ہے اور اُس کو ایسے ترغیبات و خواہشات کے طوفان میں ڈال دیا ہے کہ بقول شاعر؎

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

القاہ فی الیم و قال لہ ایاک ایاک ان تبتل بالماء

انسان اتنے مصائب میں گھرا ہوا ہے کہ ہر روز بلکہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ دُنیا سے آسمان کی طرف صدائے فریاد و گریہ و زاری و آہ و نالہ جاتی رہتی ہے۔ اُن کے مقابلہ میں خوشی کی صدائیں جو خود غم آمیز ہوتی ہیں، بہت کم جاتی ہیں۔ موت اپنے بے محل اور بے وقت عمل سے رہی سہی راحت و آرام کو بھی مکدّر کر دیتی ہے۔ بڑوں کو تو جانے دو، معصوم بچّے کبھی یتیم و یسیر ہو کر روتے رہتے ہیں۔ کبھی موت کے بے وقت عمل سے ضائع ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ بچوں کی نگہداشت کیا، ان کو پوری خوراک نہیں دے سکتا۔ اس میں بھی تو محبت پدری ہوتی ہے۔ اپنے تئیں دیکھتا ہے، اپنے بچوں کو دیکھتا ہے، پھر آسمان کی طرف دیکھ کر غم کا گھونٹ پی لیتا ہے۔ باہر نکلتا ہے تو ایسے انسانوں کو دیکھتا ہے جس کے ایک ایک بچہ پر دو دو ماماًئیں ہیں۔ یہ نعمت سے ہر وقت متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کو اتنا گوارا نہیں کہ ذرا بچہ کی پیشانی پر شکن آئے، رونا تو درکنار۔ پھر اپنے بچوں کی طرف نظر کرتا ہے۔ رات کو بھوک کے مارے روتے روتے سو جاتے ہیں۔ اور ایک گھر اُدھر ہی کا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ عالم الغیب والشہادت ہے؟ اس کے علم میں ہے۔ اور یہ ظلم جاری ہے۔ یہ مصائب

Marfat.com

ختم نہیں ہوتے۔ اس پر وہ اپنے تئیں علیٰ کل شیئٍ قدیر کہتا ہے۔ ارحم الراحمین فرماتا ہے، ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ وہ دہریہ کہتا ہے کہ ہماری سمجھ میں تو یہ منطق آتی نہیں۔ ظلم کی اتنی فراوانی اور قادر مطلق کی موجودگی جس نے کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ۔ کا اعلان کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔

فلسفۂ اسلام میں یہ امور بہت اچھی طرح حل کر دیئے گئے ہیں۔ ذرا غور شرط ہے پہلے اس بات کا ثبوت ہونا چاہیئے کہ دنیا میں ظلم خدا کی طرف سے ہے۔ کسی جوان یا بچے کی موت یا کسی شخص کی غربت کو دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ یہ ظلم ہے درست نہیں۔ جب تک کہ ہم کو اس کے صحیح حالات نہ معلوم ہوں، ہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات پر انصاف کے ساتھ غور کرے۔ اور پھر نتیجہ نکالے کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے یا جو گزر رہا ہے یا گزرا ہے انصاف ہے۔ ہر ایک شخص اپنی جگہ اسیطرح غور کرے، تو ہم کو یقین ہے کہ وہ سب اس ہی نتیجہ پر پہنچیں گے، کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے عین انصاف ہے۔ اور جب سب اس ہی نتیجہ پر پہنچے، تو پھر ظلم تو نہ ہوا۔

دنیا میں مصائب ہیں، سختیاں ہیں۔ ان کا جواب قرآن شریف میں اچھی طرح دیا گیا ہے۔ مصائب و تکالیف مندرجہ ذیل صورتوں میں آ سکتی ہیں، اور آتی ہیں۔

(۱) بسا اوقات وہ مصیبت ہمارے اپنے ہی فعل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے :۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ النساء ۴ : ۷۹۔ لیکن چونکہ خدا کی حکومت ہر شے پر ہے۔ ہر ایک شے اس کے تحت فرمان ہے۔ لہٰذا اگر ہمارے فعل سے بھی ہم کو مصیبت پہنچی ہے تو وہ بھی خدا کی اجازت سے ہوتی ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ التغابن ۔ ۶۴ : ۱۱۔ یہاں تک کہ اگرچہ اجل کا ایک دن مقرر ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے لیکن وہ بھی جب آتی ہے، تو ہماری غلطی ہی اس کے آنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

Marfat.com

علاج میں کمی رہ گئی۔ پرہیز میں غلطی ہوگئی۔ ڈاکٹر کی نالائقی اور نا اہلیت تھی۔ رہائش کی خرابیاں۔ عادتوں کی بے اعتدالیاں۔ غرض کچھ بھی ہو، پچھتاوا ہمارے ہی لیئے ہے۔

(۲) جتنی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی مصائب وتکالیف ہیں، وُہ سب اس ہی عنوان کے نیچے آتی ہیں اور وُہ بہت ہیں۔ مصائب وتکالیف کی اکثریت کا منبع یہ ہی ہیں۔ دولت کی ناروا تقسیم، مزدوروں کے ظلم مالکان پر اور مالکان کے ظلم مزدوروں پر۔ روزگار کا نہ ملنا، بے روزگاری کا طوفان۔ اقربا پروری، خودغرضی، ان کے مصائب بے شمار ہیں۔ تقریباً سارے ہی موجودہ مصائب اس میں آجاتے ہیں۔ اور وہ سب انسان کے اپنے ہاتھوں سے لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسان نے خدا کی نافرمانی کر کے ناروا آزادی چاہی۔ کسی حد تک اختیار مل گیا۔ اب اس کی شکایت خدا سے کیا، اور اس کا الزام خدا کو کیا دینا۔ خداوند تعالےٰ نے اپنے انبیاء، اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے بتا دیا کہ کس طرح ان سے بچ سکتے ہو۔ ان پر عمل نہیں۔

(۳) جن اغراض اور جن وجوہات سے مصائب انسان پر پڑتے ہیں، وُہ بھی مختلف ہیں۔ مثلاً :-

(ا) عذاب،

(ب) امتحان،

(ج) کفارۂ گناہان،

(د) جذبۂ تضرع وزاری پیدا کر کے خدا کی طرف بلانا،

(ھ) مصلحت،

(و) مشیتِ ایزدی،

(ز) رفع درجات،

(ح) انبیاء وآئمہ کے لیے مصائب کا مخصوص ہونا۔

ان میں سے ہر ایک پر تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

(۱) عذاب:- قرآن شریف میں اس کی مثالیں بہت سی ہیں۔ طوفانِ نوحؑ، طوفانِ زلزلہ، قصۂ فرعون وغیرہ وغیرہ۔ تاریخ عالم میں بہت سی مثالیں مثلاً یزید کی موت، بنو اُمیہ کی بربادی، مسلمانوں کی پریشانی، ہندوستان کے زمانہ حال کا مسلمانوں کا قتل و غارت وغیرہ۔ اور اس کا یہ اصُول ہے کہ جب کوئی قوم جس پر عذاب نازل ہوا ہے اُس عذاب کی پرواہ نہ کرے گی، تو اُس پر عذاب سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا۔ جس طرح لوگوں نے تقسیم ہندوستان کے وقت بھی قتل و غارت سے سبق نہ لیا، تو اب وہ اُس سے شدید تر عذاب میں مبتلا ہیں۔

(ب) امتحان:- اس کے لیئے قرآن شریف کی یہ آیت ملاحظہ ہو:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ ۲: ۱۵۵، ۱۵۶۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۔ ۳: ۱۴۲۔

(ج) کفارۂ گناہان:- اکثر دیکھا گیا ہے کہ نیک آدمی پر بھی مصائب آتے ہیں۔ اُنہوں نے کچھ نہ کچھ گناہ تو ضرور کیئے ہوں گے۔ یہ دُنیا کی مصیبت اُن کے گناہان کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

(د) تضرع و زاری۔

وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ الاعراف ۷: ۱۶۸

(ہ، و، ز، ح)

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی اصلاح و منفعت کے لیئے انبیاء و آئمہ علیہم السلام مصائب و تکالیف میں مبتلا کیئے جاتے ہیں۔ تاکہ اُن کے صبر و استقلال و فعل و عمل سے لوگوں کو ہدایت ملے۔ خدا کی معرفت حاصل ہو اور اپنے طرزِ عمل کو اُن کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ فطرتِ انسانی جب صراطِ مستقیم پر رہتی ہے۔ تو کتنی ارفع و اعلےٰ ہوتی ہے۔ چونکہ محض مشیت خداوندی کی اطاعت میں وُہ یہ صبر کرتے ہیں، لہذا اُن کے درجاتِ اُخروی بہت اعلےٰ ہو جاتے ہیں اور

Marfat.com

وہ لوگ جو ان پر ظلم کرتے ہیں ان کی قساوات قلبی اور ظلم کا بھی اچھی طرح اظہار ہو جاتا ہے۔ اور جب قیامت میں ان مظلوموں کے درجے بلند ہوں گے اور ان ظالموں کو اسفل السافلین کا عذاب ملے گا تو لوگوں پر ظاہر ہو گا کہ یہ بھی عین انصاف خداوندی ہے۔ مظلوموں نے اپنے صبر سے اپنے تئیں اس فضل و کرم و رحمت کا مستحق ثابت کر دیا، اور ان ظالموں نے اپنے فعل سے ظاہر کر دیا کہ وہ اس ہی عذاب کے مستوجب تھے۔ انبیاء کرام و اولیاء پر جو مصائب پڑتے وہ اس عنوان کے تحت آتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ دنیا کے مصائب و آلام کتنے ہی سخت ہوں آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

کفار اور ظالم بھی بظاہر اس دنیا میں راحت و آرام میں معلوم ہوتے ہیں۔ اول تو ان کے دل کی حالت خدا ہی جانتا ہے، کہ وہ راحت میں ہیں یا تکلیف میں۔ کیونکہ خوشی تو محض دل کی حالت کا نام ہے۔ بہت سے لوگ غربت میں مفلسی میں خوش و خورم رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ پھولوں کی سیج پر بھی تڑپتے رہتے ہیں۔ لہذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کفار اور ظالمین واقعی راحت میں ہیں یا نہیں۔ اور ظاہری ثروت اور دولت جو ان کو ملتی ہے اس کی تو یہ وجہ ہے کہ برے سے برا آدمی بھی کچھ نیکیاں تو کرتا ہی ہے، اس کو ان نیکیوں کا بدلہ اس ہی دنیا میں مل جاتا ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ ۝

المرسلات ۷۷ : ۴۶ طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۱

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ البقرہ ۲ : ۲۰۰

یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ان تکالیف و مصائب کے نتائج اس دنیا ہی میں آگے چل کر اچھے نکل آتے ہیں۔ چونکہ ہم ان سے واقف نہیں ہوتے اس لیئے سمجھتے ہیں کہ یہ مصیبت ہے۔ حضرت موسےٰؑ کا قصہ اس مرد غیب کے ساتھ جس نے بظاہر بغیر کسی وجہ کے ایک بچے کو مار ڈالا، کشتی میں سوراخ کر دیا، گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دیا اس ہی اصول کا سبق دیتا ہے۔ ان سب افعال کے نتائج آخر کار اچھے ہی نکلے۔ لیکن اس وقت حضرت موسیٰؑ کو نہ معلوم تھے، لہذا اعتراض کر بیٹھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔

بچوں کی تکالیف و مصائب و موت کا مسئلہ بھی اکثر زیر بحث رہا ہے۔ یہ مصائب دو صورتوں کے ہو سکتے ہیں۔ (۱) یتیمی (۲) موت۔ ان کے علاوہ جو مصائب ہوں گے وُہ در اصل والدین کے اعمال کی پاداش میں ہوتے ہیں۔ یتیمی بسا اوقات بچے کے لیئے آخر کار فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ دنیا کی تختیوں میں سے اوائل عمر میں گذر کر اُس کے قوائے عقلی و ذہنی اتنی ترقی کر جاتے ہیں کہ وُہ آیندہ اپنے لیئے بہت اچھی جگہ دنیا میں حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے اوپر خود اعتماد کرنے کا ایسا جوہر اس میں پیدا ہو جاتا ہے جو اُس کو اعلےٰ درجہ پر لے جاتا ہے۔ بچپن میں موت ہونے کی صورت یہ ہے کہ بسا اوقات تو وُہ والدین کے لیئے اُن کے اعمال و افعال کے پاداش میں ہوتی ہے یا اُس میں کچھ اور مصلحت ہوتی ہے۔ یہ ثابت نہیں کہ وُہ بچہ کے لیئے مصیبت ہے یا اُس پر ظلم ہے اس کا فیصلہ تو قطعی طور پر ہم اُس وقت کر سکتے ہیں کہ جب ہم کو یقیناً معلوم ہو تا ہے کہ مرنے کے بعد اُس پر کیا گزری۔ فقہ اسلام کہتا ہے۔ کہ معصوم بچے مرنے کے بعد نہایت عمدہ حالت میں ہو جاتے ہیں۔

انسان کے مصائب و آلام میں ایک یہ بھی راز ہے کہ جس پر وُہ واقع ہوئے ہیں، اُس کے لیئے تو اُس کے اعمال کے نتائج ہیں۔ لیکن دوسروں کے لیئے باعث عبرت ہوتے ہیں۔ شریعت کا حکم ہے کہ جب کسی کو گرفتار مصائب دیکھو تم ان سے آزاد ہو تو خداوند تعالےٰ کا شکر ادا کرو۔ دُنیا میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے کہ جو ایک آدمی پر پڑی ہے اور دوسرے کو لاحق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ہم اُس مصیبت سے بری ہیں۔ یہ شکر تین طرح ادا ہو سکتا ہے۔ (۱) زبان سے اس کا ذکر کرنا چاہیئے، (۲) دل سے ماننا چاہیئے، (۳) عمل سے ظاہر کرنا چاہیئے۔ عمل کی صورت یہ ہے کہ ہم گرفتار مصائب و آلام کی مدد کریں۔

جہلا کی ایک یہ بھی بحث ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے کہ ہم کیوں مساکین و غربا کو کھانا کھلائیں۔ اگر خدا چاہتا ہے تو اُن کو خود رزق وافر دے دے۔ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ۔ دُوسرے الفاظ میں اُس کا مطلب ہوا کہ ہم دُوسروں کی تکالیف میں، اُن کی پریشانی و افلاس میں کیوں اُن کی مدد کریں۔

خدا نے اُن پر یہ تکالیف ڈالی ہیں، اب خدا کا کام ہے کہ اُن کو تکالیف سے نکالے لیکن یہ خیال کرنا چاہیئے کہ دُنیا اُن اسباب و قواعد کے مطابق چل رہی ہے جو خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اُن سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہے، کسی کو راحت۔ ایک شخص ان قوانین کے مطابق عمل نہیں کرتا وُہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے، دوسرا عمل کرتا ہے وُہ راحت پاتا ہے جہاں تک اس دُنیا کا تعلق ہے اس رنج و راحت کے نتیجہ میں کافر و مسلمان کا فرق نہیں ہے ہاں حشر کے دن اُن تکالیف و مصائب کا خیال رکھا جائے گا۔ اور وہاں کفر و ایمان کا فرق عیاں ہو گا۔ جہاں تک دُنیا کا تعلق ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ ہاں یہ بھی ضرور ہے کہ قوانین و اسباب بنا کر خدا معطّل بھی نہیں ہو گیا۔ معجزے بھی ہوتے ہیں۔ بہرے گونگے اچھے ہوتے ہیں۔ مردہ تک زندہ ہو جاتے ہیں — کذالک ننجی المومنین۔ کہہ سکتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ اسباب کا اجتماع ایسا کر دیتا ہے کہ یہ امور ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتَابِ۔

خداوند تعالےٰ نے انسان کو اس دُنیا میں اُس کی کمزور حالت میں بغیر مدد کے نہیں چھوڑا۔ ایک تو اُس میں عقل کا جوہر عطا فرما دیا جو اُس کے لیئے نہایت عمدہ سپر اور بہت اچھا ہتھیار ہے۔ دوسرے اپنی رحمتِ کاملہ سے اُس کی ہدایت کے لیئے انبیاء و مرسلین بھیجے۔ جنہوں نے اُس کو اوائل ایام میں بہت سے ہنر سکھائے اور اشیاء کی خواص و ماہیت سے اُس کو آگاہ کیا۔ اور ہدایت تو ہمیشہ کی۔ اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے طریقے بتائے۔ دُنیا میں حکومت کا مسئلہ بہت مشکل رہا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا نمونہ بھی خداوند تعالےٰ نے دکھا دیا۔ اور انبیاء و اوصیاء کے ذریعہ سے اُس کے طریقے بھی بتا دیئے۔ موت جسمانی کے بعد حشر و نشر، میزان و حساب کتاب یہ وُہ امور ہیں، جو فقۂ اسلام کو دیگر مذاہب سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ یہ وہ کہ انسان کو پھر جسم ملے گا اور ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی اُس پر ظلم نہ ہو گا، وُہ شے ہے جو انسان کو دُنیا کی مصیبت و تکلیف کو صبر کے ساتھ سہنے کے لیئے آمادہ کر دیتی ہے، اور مصیبت مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ہی تو وُہ شے تھی جس نے امام حسینؑ اور اُن کے متعلقین کو کربلا کے میدان میں سے گزارا۔ اور یہ ہی وُہ بات تھی جس نے اجتماعِ

سقیفہ اور اُس کے نتائج کو حضرت علیؑ کے لیئے اتنا سہل کر دیا رضائے خداوندی کی اُمید نے مصائب دنیا کو ایک ایسی دلآویز صورت دے دی ہے کہ جس نے آتشِ دُنیا کو صاحبانِ عزم و یقین کے لیئے گلزار بنا دیا ہے۔ ورنہ در اصل دُنیا کے مصائب ایسے ہیں کہ انسان اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتا۔ اور وہ حکما، خودکشی ہی کی تلقین کرتے رہے ہیں جن کا فلسفہ اس اُمید سے خالی تھا۔

رُہبانیہ فطرت کے خلاف دُنیاکی زندگی کی حقیقت اسلام دینِ فطرت ہے۔ قرآن شریف میں اسلام کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ - الروم ۳۰ : ۳۰

خدا کی تلاش انسان کی فطرت کے موافقت میں نہ کہ اُس کی مخالفت میں۔ یہ ہے اسلام کا اصول۔ امتزاجِ دین و دُنیا اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ اب تک حکما، کا یہ خیال تھا، کہ انسان کی بہتری دُنیا سے کنارہ کشی میں ہے۔ ان کا یہ تصور یہودیت اور مسیحیت میں بھی لے لیا گیا۔ حکما، کے فلسفہ میں حیات بعد ممات، میزان، حساب و کتاب و عدل کا تو کوئی یقینی تصور ہی نہ تھا۔ لہٰذا دُنیا کی بے ثباتی، ظلم کی فراوانی، اور موت کی موجودگی کو دیکھ کر وہ اس ہی نتیجہ پر پہنچے کہ مصائب دنیا کا علاج محض خودکشی ہے۔ اس تصور کا آخری نمایندہ Stoicism تھا۔ اور ایک وہ زمانہ تھا کہ جب یہ فلسفہ تمام دُنیا میں رائج تھا۔ یہاں تک کہ جب مسیحیت آئی، تو اُس نے بھی اس سے بہت اثر لیا۔ اس فلسفہ کا بانی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، زینو ZENO تھا اُس نے دُنیا کے مصائب کا حل خودکشی میں دیکھا۔ یہ شخص حضرت عیسیٰؑ سے ۳۴۲ سال پہلے ہوا تھا۔ اور ۲۷۰ سال قبل ان کے مر گیا۔ اس کا فلسفہ تمام رومانوی دُنیا پر چھا گیا تھا اور مثل مذہب کے سمجھا جاتا تھا۔ (۱۲۴) چونکہ عیسائی رہنماؤں کو اپنا مذہب پھیلانا مقصود تھا۔ اور وہ نہیں پھیل سکتا تھا، جب تک رومانوی دُنیا کے لیڈر خاص نہ ہو لہٰذا اُن کی نظروں میں مسیحیت کو خوشنما ظاہر کرنے کے لیئے ان مسیحی رہنماؤں نے

(124) Robert Briffault: The Making of Humanity p. 146

اُس وقت کے مروجہ رومانوی مذاہب سے بہت کچھ رسوم وعقائد لے کر اپنے مذہب میں داخل کر لیئے۔ اس کو تفصیل سے ہم نے اپنی کتاب "البلاغ المبین" حصہ دوم طبع ثانی میں بیان کیا ہے۔ اور کچھ اس سے پہلے اسی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ دیکھو صفحات ۲۴۸ تا ۲۶۹ کتاب ہذا۔ چنانچہ اُنہوں نے اس فلسفہ STOICISM (رواقی) کے بھی اصول اپنے مذہب میں شامل کر لیئے۔ وہ دو امور پہلے ہی سے ایسے تھے جنہوں نے اس امر میں مدد دی۔ ایک تو عورت کا ڈر جو مسیحیت کا جزو بن گیا تھا۔ اُس زمانہ کے پادری عورت کو شیطان اور زہریلا سانپ سمجھتے تھے جس کے سایہ سے روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ بے چاری عورت کی یہ گت اس وجہ سے بنی کہ اُن کے خیال میں آدم کو ورغلانے میں یہ شیطان کی مددگار تھی اور دراصل اُس نے ہی آدم کو جنت سے نکلوایا۔ دوسرے اس زمانہ میں بیراگیوں، راہبوں اور دیر وصومعہ کا رواج عام تھا۔ نکاح نہ کرنا، عورت کے پاس نہ جانا، یہ مذہب کا خاص جزو تھا۔ جو عورت سے علیحدہ رہتا تھا، وہ بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس غلط نظریہ نے جو خرابیاں، بدمعاشیاں اور بدتمیزیاں آخر کار بن بیاہے مرد MONKS اور بن بیاہی عورتوں (NUNS) کی MONASTERIES میں پیدا کر دیں وُہ ہم کیا بیان کریں۔ خود ان ہی کی زبانی سُن لینا بہتر ہوگا۔ دیکھو (۱۲۵)

یہ نظریہ محض اس فلسفہ رواقی ہی کا نتیجہ تھا۔ بلکہ بائیبل کی غلط تحریر وتدوین بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ موجودہ انجیل کے لکھنے والوں نے حضرت عیسےٰؑ کے مُنہ میں یہ الفاظ ڈالے تھے:۔

ترجمہ:۔ اگر کوئی میرے پاس آتا ہے اور وُہ اپنے باپ، ماں، بیوی، بچوں، بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہیں کرتا، تو وُہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ اصل کے لیئے دیکھو ضمیمہ ۱۹

ایک امیر دولتمند نوجوان سے حضرت عیسےٰ نے کہا:۔

(125) MYERS : THE MIDDLE AGES, P.58., GIBBON : THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE, VOL I.

Marfat.com

ترجمہ:۔ اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ سب فروخت کر دے اور غربا کو دے دے۔ (اصل کے لئے ضمیمہ نمبر ۲)

حضرت عیسیٰ کی زبان ارمی تھی۔ اُس زبان کی انجیل اصلی تو انہیں ملی نہیں۔ کسی نے اس کا یونانی اور لاطینی ترجمہ کر دیا تھا، وہ رائج تھا۔ کیونکہ یہ زبانیں رومیوں اور ایشیائی کو چک کے یونانیوں کی تھیں۔ اور ان میں مسیحیت کا رائج کرنا مدعا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے خیالات کے مطابق ہو۔ لہٰذا ان ترجمہ کرنے والوں نے اپنی خواہش کے مطابق الفاظ کے دُور از کار معانی لے کر یہ ترجمہ کر دیا۔ کبھی کبھی ایک لفظ کے دو معانی ہوتے ہیں انہوں نے وہ معنی لے لیئے جن سے اُن کا مقصد حل ہوتا تھا۔ بہر صورت موجودہ مذہب جو رائج ہوا وہ تو یہ ہی تھا۔ چنانچہ سینٹ پال نے اس تعلیم کے تتبع میں یہ کہا:۔

ترجمہ:۔ جس نے شادی نہیں کی وہ تو خدا کی چیزوں کی پرواہ کرتا ہے اور جو شادی شدہ ہے وہ اُن چیزوں کی پرواہ کرتا ہے جو اس دنیا کی ہیں۔ (اصل کے لیئے ضمیمہ نمبر ۳)

دُنیا کی حالت کو دیکھ کر یونانی فلسفہ نے تو کہا کہ خودکشی کر لو۔ اور مسیحیت نے کہا کہ ماں، باپ، بیوی، بچوں، بھائیوں اور بہنوں کو چھوڑ دو۔ بلکہ اپنے سے بھی نفرت کرو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ غریبوں کو دے کر دُنیا سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ ہم نے یہاں ترجمہ میں "نفرت" لکھا ہے، ورنہ اُردو بائیبل میں اس جگہ "دشمنی" کا لفظ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر غور و فکر کرنے والا شخص دنیا کی بے ثباتی، غم کی فراوانی اور موت کی زیادتی سے متاثر ضرور ہوگا۔ اور ہر ایک فلسفہ کے سامنے حل کے لیئے یہ ہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ نے آخر کار اس کا حل خودکشی سے کیا۔ اور مسیحیت نے اس کا حل تجرد و رہبانیت اور دیر و صومعہ کی زندگی سے کیا۔ یہ دونوں حل ایسے ہیں جو حل نہیں کہے جا سکتے، بلکہ کشمکش حیات کی تاب نہ لا کر اس سے فرار ہے۔ یہ بہادری نہیں ہے بزدلی ہے۔ اسلام نے ان ہی امور کی منطق سے اور اُن کی بناء پر ایسے ایسے عالی نتائج نکالے ہیں، جو انسان کی زندگی کو ایک قابل قدر شئے اور خود انسان کو اشرف المخلوقات کے درجہ تک پہنچاتے ہیں۔ اسلام نے ازدواجی زندگی کو ضروری قرار دیا۔ جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ

نکاح میری سُنّت ہے۔ جس نے نکاح سے اعراض کیا وُہ میرا پیرو نہیں ہے۔ اسلام نے بتایا کہ دُنیا مزرعۂ آخرت ہے۔ یہاں عمل نیک کرو تاکہ عاقبت میں دوامی زندگی حاصل ہو۔ دُنیا کا ترک اسلام میں جائز نہیں۔ لیکن دُنیا میں پھنس کر عاقبت کو بھول جانا یہ بھی بُرا ہے امام علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

لیس منا من ترك الدنیا للاٰخرة ومن ترك الاٰخرة للدنیا۔ یعنی وُہ ہم میں سے نہیں ہے (یعنی) وُہ ہمارا پیرو نہیں ہے جو آخرت کے لیئے دنیا کو، اور دُنیا کے لیئے آخرت کو چھوڑ دے۔ یہ ہے مطابقِ فطرتِ انسانیت۔ عورت و دُنیا کو بالکل ترک کرنا خلافِ فطرت ہے۔

اسلام نے ان تمام مشکلات کا حل اور انسان کی نجات کا حصر اعتقاد و عمل میں رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اور جن سے نجات کا وعدہ کیا گیا ہے، وہاں ہر جگہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا فقرہ استعمال ہوا ہے۔ نہ تو صرف ایمان کافی ہے، اور نہ صرف عمل۔ بلکہ دونوں ہونے چاہئیں۔ اسلام کیا ہے؟ الاقرار باللسان، والتصدیق بالجنان والعمل بالارکان۔ یہ اگر ہوئے تو پھر ایمان مکمل ہے۔

وُہ شخص فلسفۂ اسلام کو مطلق نہیں سمجھ سکتا، جو ہمیشہ اس بات کو ذہن میں نہیں رکھتا کہ اسلام کے نزدیک اس دنیا کی زندگی بذاتِ خود لہو و لعب اور بے حقیقت ہے۔ مادی ترقی بذاتِ خود کوئی شے نہیں۔ دولت و ثروت بسا اوقات بُرائی کی طرف لے جاتی ہے۔ مال دنیا میں سے بقدرِ کفاف اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ ذلّت و حقارت سے بچو۔ لیکن دولت و ثروت کو اپنا مقصدِ زندگی اور معیارِ بزرگی نہ بناؤ۔ قرآن شریف میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْھَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۷: ۲۹)

یعنی اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول دو کہ سب کچھ دے ڈالو، اور تم کو ملامت زدہ حسرتناک بیٹھنا پڑے۔

Marfat.com

لیکن اسلام کی یہ نصیحت کہ دُنیا کی دولت وجاہ کو اپنا مقصدِ حیات نہ بناؤ، بہت کم مسلمانوں نے قبول کی۔ اور اس نصیحت پر نہ عمل کرنے کی وجہ سے صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے۔ اس کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے علامہ مشرقی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مادی ترقی ہی اصلی مقصدِ زندگی ہونا چاہیئے۔ وُہ تو یہاں تک غلطی کرتے ہیں کہ اُس کو ہی اسلام کا مدعا بتاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے، دُنیا کی دولت، حشمت اور ثروت ہی ہے جس کے پاس یہ ہے اُس کے پاس توحید ہے۔ جس کے پاس یہ نہیں وُہ کافر ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کافر ہیں۔ انگلستان، جرمن، فرانس اور رُوس کے عیسائی توحید پرست ہیں۔ اصلی مسلمان ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس ثروت اور طاقت ہے۔ جو اس دُنیا میں مزے کر رہے ہیں، وُہ آخرت میں بھی مزے کریں گے۔ سجدے کرنا تو اَوندھے مُنہ پڑ کر غوں غوں کرنا ہے۔ قارونی دولت ہی نعمتِ عظمےٰ ہے۔ دیکھو تذکرہ۔ دیباچہ ص۱۸ - لغایت ص۱۲۲۔ عنایت اللہ مشرقی ہی پر کیا منحصر ہے جس نے مسلمانوں کی سلطنت کا رویہ اور حصول سلطنت وحکومت کا عشق ابتدائی خلافت سے اب تک غور سے مطالعہ کیا ہے، وُہ اس ہی نتیجہ پر پہنچے گا۔ صحیح اسلام کی تعلیم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قدم اس جگہ ڈگمگا جاتے ہیں۔

قرآن شریف صریحاً بتاتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ عیسائیوں کی رہبانیۃ کا ذکر کرتے ہوئے خداوند تعالےٰ فرماتا ہے:۔ مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ۔ الحدید ۲۷:۵۷

دُنیا کی زندگی کی ماہیت وناپائداری پر اسلام میں بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن شریف نے ذیل سے عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے، اور آئمۂ اسلام نے بھی اس کو نہایت تصریح و تاکید سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ دُنیا کی ساری خرابیوں کی جڑ اُس کی نا نذیبا زینت میں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے گرد وپیش کے حالات سے عبرت حاصل کریں۔ اور دُنیا کے رنج وراحت کی حقیقت معلوم کریں۔ تاکہ ہم اپنے دُنیاوی نقصان و مصیبت پر رنج نہ کریں۔ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ۔ آل عمران ۱۵۳

کہاں ہیں وہ لوگ جو اب سے چند سال پہلے دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ ہر ایک شخص پر اُن کا حکم رواں تھا۔ اور ہر شخص اُن کی عنایت کا محتاج۔ بظاہر سلمے عیش وراحت کے سامان موجود تھے۔ اب قبروں میں کیڑوں کی خوراک بنے ہوئے ہیں۔ اور اب سے

Marfat.com

چند سال بعد ہماری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ ممکن ہے دوسرے لمحہ ہی میں ہو جائے۔ ہمارے دوست، اقربا اور محبوب جن سے ہماری زندگی تھی اور جو ہم کو دیکھ کر زندہ رہتے تھے، وہ کہاں گئے۔ اُن کی محبت کیا ہوئی۔ ہماری آنکھیں اُنہیں ڈھونڈتی ہیں۔ ہمارے وُہ مہربان والدین جو ہمارے جسم پر مکھی کے بیٹھنے کے روادار نہ تھے، اب وہ کہاں گئے۔ ہمارے جسم پر تلواریں لگ رہی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نظر نہیں آتا۔ اگر ہمارا ایک آنسو گرتا تھا تو وُہ بے قرار ہو جاتے تھے، اور اشک کے دریا بہاتے تھے۔ اب ہماری آنکھوں سے خون کے دریا جاری ہیں، اور کوئی جھوٹے مُنہ بھی نہیں پوچھتا کہ تمہیں کیا ہُوا۔ یہ ہے دُنیا اور دُنیا کی حقیقت۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دیکھیئے اس کے متعلق کتابِ اسلام اور آئمۂ اسلام کیا فرماتے ہیں:

قرآن شریف:-

(۱) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۔ (۶: ۳۲)

ترجمہ:- اور یہ دُنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور یقیناً آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیئے بہت اچھا ہے۔"

(۲) وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۔ ۲۹: ۶۴ ۔

ترجمہ:- اور یہ دُنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقی زندگی (کی جگہ) بس آخرۃ کا گھر ہے۔"

(۳) اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۔ ۴۷: ۳۶ ۔

ترجمہ:- دُنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔"

(۴) اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ؕ (۵۷: ۲۰)

Marfat.com

ترجمہ:۔ جان لو کہ دُنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہش ہے دنیاوی زندگی (کی مثال) تو بارش کی سی مثال ہے جس (کی وجہ) سے کسانوں کی کھیتی (لہلہاتی اور) اُن کو خوش کر دیتی ہے پھر سُوکھ جاتی ہے۔ تو تُو اُس کو دیکھتا ہے کہ زرد ہو جاتی ہے۔ پھر چُور چُور ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں کفار کے لیئے سخت عذاب ہے اور مومنوں کے لیئے خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے۔ اور دُنیاوی زندگی تو بس فریب کا سازو سامان ہے۔"

حکماءِ اسلام (یعنی آئمۂ اہلبیت علیہم السلام)

ان امامانِ اُمت کے قول قرآن شریف کی آیات کی تشریح کرتے ہیں، اور اُن کا عمل مشعلِ راہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام

دُنیا کی نسبت آپؑ فرماتے ہیں:۔

تَغُرُّ وَ تَضُرُّ وَ تَمُرُّ۔ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَرْضَھَا ثَوَابًا لِاَوْلِیَائِہٖ وَلَا عِقَابًا لِاَعْدَائِہٖ۔ وَاِنَّ اَھْلَ الدُّنْیَا کَرَکْبٍ بَیْنَا ھُمْ حَلُّوْا اِذْ صَاحَ بِہِمْ سَائِقُھُمْ فَارْتَحَلُوْا۔

ترجمہ:۔ دُنیا دھوکہ دیتی ہے، نقصان پہنچاتی ہے، اور تلخیاں چکھاتی ہے۔ خداوند تعالےٰ نے اس دُنیا کو اپنے دوستوں کے لیئے بطور ثواب کے پسند نہیں کیا۔ اور نہ اپنے دشمنوں کو اس کے ذریعہ سے عذاب دینا پسند کیا۔ دنیا کے لوگ اُن سواروں کے مانند ہیں جو ابھی منزل پر پہنچے تھے کہ ان کو کوچ کا حکم دینے والے نے پکارا، اور وہ کوچ کر گئے۔

دُنیا کے رنج و راحت کا کیا عمدہ بیان ہے۔ مومن کو جو یہاں عمدہ چیزیں ملتی ہیں، وہ اُس کی نیکیوں کا بدلہ نہیں ہوتا۔ وہ تو آخرت میں دیا جائے گا۔ اور دُشمنانِ خدا کو جو یہاں مصائب پہنچتے ہیں، وہ اُن کے گناہوں کا عذاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ان کے

گناہوں کا عذاب ہو تو پھر آخرت میں دوبارہ عذاب نہ ہو۔ لیکن یہ عذاب دہریں کے لیئے مخصوص ہے۔ اس دنیا کے رنج وراحت کے واقع ہونے کے اور اسباب اور قوانین ہیں۔ یہ نہ کہنا چاہیئے کہ فلاں شخص نیک، مومن تھا وہ کیوں مصائب میں مبتلا ہوا اور فلاں شخص بُرا تھا اُسے کیوں نعمتیں ملیں۔ اس مسئلہ کا کیسا عمدہ جواب ہے۔ اکثر لوگ یہ دیکھ کر ہی دہریئے ہو گئے ہیں کہ یہاں نیکیوں کو کیوں مصائب ہیں، اور بد لوگ کیوں عیش وعشرت وراحت میں ہیں۔

وَالدَّهْرُ يَوْمَانِ يَوْمٌ لَكَ وَيَوْمٌ عَلَيْكَ فَإِذَا كَانَ لَكَ فَلَا تَبْطَرْ، وَإِذَا كَانَ عَلَيْكَ فَاصْبِرْ۔

ترجمہ:۔ زمانہ کے دو دن (دو حالتیں) ہیں۔ ایک تیری آسائش وراحت کے لیئے، اور دوسرا تیری سختی اور مصیبت کے لیئے۔ پس جب تیری راحت کا دن ہو، تو مغرور نہ ہو جا اور اتراتا نہ پھر۔ اور جب مصیبت کا دن آئے، تو صبر کر۔

یہ دو حالتیں ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ ان کے لیئے تیار رہنے کے لیئے اور اُن کے لیئے طرزِ عمل مقرر کرنے کے لیئے یہ نصائح ہیں۔

مَا خَيْرٌ بِخَيْرٍ بَعْدَهُ النَّارُ، وَمَا شَرٌّ بِشَرٍّ بَعْدَهُ الْجَنَّةُ وَكُلُّ نَعِيمٍ دُونَ الْجَنَّةِ فَهُوَ مَحْقُورٌ، وَكُلُّ بَلَاءٍ دُونَ النَّارِ عَافِيَةٌ۔

ترجمہ:۔ دنیا کی کوئی اچھی شے اچھی نہیں ہے اگر اُس کا انجام جہنم ہو۔ اور کوئی بُری شے بُری نہیں ہے جس کا انجام جنّت ہو۔ نعمہائے بہشت کے علاوہ ہر ایک نعمت حقیر ہے، ہر ایک مصیبت جہنم کے علاوہ راحت ہے۔

اَلرُّكُونُ إِلَى الدُّنْيَا مَعَ مَا تُعَايِنُ مِنْهَا جَهْلٌ وَالتَّقْصِيرُ فِي حُسْنِ الْعَمَلِ إِذَا وَثِقْتَ بِالثَّوَابِ عَلَيْهِ غَبْنٌ وَالطُّمَانِيْنَةُ إِلَى كُلِّ أَحَدٍ قَبْلَ الْاِخْتِبَارِ عَجْزٌ۔

ترجمہ:۔ دنیا کی طرف راغب ہو جانا باوجودیکہ اُس کے حالات تیرے مشاہدہ میں آ رہے ہیں، نادانی ہے۔ حُسنِ عمل میں کوتاہی کرنا حالانکہ تجھے اس پر ثواب ملنے کا یقین ہے، سخت زیان کاری ہے۔ کسی شخص کو آزمانے سے پہلے اُس کی طرف سے مطمئن ہو جانا عجز ونادانی ہے۔

Marfat.com

یَا اَیُّھَا النَّاسُ! مَتَاعُ الدُّنْیَا حُطَامٌ مُوْبِیٌٔ فَتَجَنَّبُوْا مَرْعَاہُ قُلْعَتُھَا اَحْظٰی مِنْ طُمَانِیْنَتِھَا، وَ بُلْغَتُھَا اَزْکٰی مِنْ ثَرْوَتِھَا حُکِمَ عَلٰی مُکْثِرٍ بِھَا بِالْفَاقَۃِ وَاُعِیْنَ مَنْ غَنِیَ عَنْھَا بِالرَّاحَۃِ۔ وَمَنْ رَاقَہٗ زِبْرِجُھَا اَعْقَبَتْ نَاظِرَیْہِ کَمَھًا، وَمَنِ اسْتَشْعَرَ الشَّغَفَ بِھَا مَلَأَتْ ضَمِیْرَہٗ اَشْجَانًا لَھُنَّ رَقْصٌ عَلٰی سُوَیْدَاءِ قَلْبِہٖ ھَمٌّ یَشْغَلُہٗ، وَھَمٌّ یَحْزُنُہٗ۔ کَذٰلِکَ حَتّٰی یُؤْخَذَ بِکَظْمِہٖ فَیُلْقٰی بِالْفَضَاءِ مُنْقَطِعًا اَبْھَرَاہُ۔ ھَیِّنًا عَلَی اللّٰہِ فَنَاؤُہٗ وَعَلَی الْاِخْوَانِ اِلْقَاؤُہٗ وَ اِنَّمَا یَنْظُرُ الْمُؤْمِنُ اِلَی الدُّنْیَا بِعَیْنِ الْاِعْتِبَارِ وَیَقْتَاتُ مِنْھَا بِبَطْنِ الْاِضْطِرَارِ، وَ یَسْمَعُ فِیْھَا بِاُذُنِ الْمَقْتِ وَالْاِبْغَاضِ اِنْ قِیْلَ اَثْرٰی قِیْلَ اَکْدٰی وَ اِنْ فُرِحَ لَہٗ بِالْبَقَاءِ حُزِنَ لَہٗ بِالْفَنَاءِ ھٰذَا وَلَمْ یَاْتِھِمْ یَوْمٌ فِیْہِ یُبْلِسُوْنَ۔

ترجمہ:۔ ایہا الناس! دُنیا کی دولت شکستہ کرنے والی ہے، اور اخرابیوں کی وبا پیدا کرنے والی ہے۔ اس چراگاہ سے دُور رہو جس کا دُور کرنا اُس میں آرام کرنے سے بہتر ہے۔ اس میں سے صرف بقدر کفاف لینا پاک تر ہے بہ نسبت اُس کی فراوانی مال و متاع کے۔ جس شخص کے پاس اُس کا بہت مال و متاع ہے، دراصل وہ مفلس ہے۔ اصلی راحت اُس کو حاصل ہے، جو اُس سے مستغنی ہے۔ جس شخص کو اُس کی آرائشیں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں، اُس کو دنیا آخر کار اندھا بنا دیتی ہے۔ جس شخص نے دُنیا کی محبّت کو اپنا شعار بنایا، دُنیا نے اُس کے دل کو اپنے رنج و آلام سے لبریز کر دیا۔ اُس کے سویداء دل پر وُہ آرائشیں اپنا رقص کرتی ہیں۔ وُہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وُہ مشغول رہے، لیکن وُہ ہی کام اُس کو غمگین کرتے ہیں۔ وُہ برابر اس ہی حالت میں رہتا ہے تاآنکہ اُس کو اجل پکڑ لیتی ہے، اور وُہ فضائے قبر میں ڈال دیا جاتا ہے، اور اُس کی رگیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ خداوند تعالیٰ پر اُس کا فنا کرنا آسان ہو جاتا ہے اور اُس کے بھائیوں پر اُس کا قبر میں ڈال دینا۔ بتحقیق کہ مومن دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اُس میں سے وُہ اتنا ہی لیتا ہے کہ جس سے اس کا اضطرار و احتیاج دور ہو۔ دُنیا داروں کی باتیں سُنکر اُس کو غصہ آتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ فلاں شخص دنیا کو دوست رکھنے والا بہت مال دار ہے، تو درحقیقت یہ کہا گیا کہ وُہ محتاج و فقیر ہے۔ اگر

سے اگر اسے دنیا کی خوشخبری دی جاتی ہے، تو در حقیقت اُسے فنائے دُنیا کی خبر دے کر محزون کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں اہلِ دُنیا کے حالات۔ حالانکہ ابھی وہ دن نہیں آیا ہے، جس میں وہ رحمتِ خدا سے مایوس ہوں۔ (وہ دن تو آگے آنے والا ہے)

معاشر الناس اتقوا اللہ فکم من مؤمّلٍ ما لا یبلغہ، و بانٍ ما لا یسکنہ، و جامعٍ ما سوف یترکہ، و لعلّہ من باطلٍ جمعہ، و من حقٍّ منعہ، اصابہ حراماً، و احتمل بہ آثاماً، فباء بوزرہ و قدم علیٰ ربّہ آسفاً لاھفاً قد خسر الدنیا و الآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین۔

ترجمہ: اے لوگو! خدا سے ڈرو۔ بہت سے آرزومند ہیں جو اپنی آرزوؤں تک نہیں پہنچتے۔ بہت سے عمارتیں بنانے والے ہیں جنہیں اُن میں رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ بہت سے مال جمع کرنے والے ہیں جسے وہ عنقریب چھوڑ جائیں گے۔ شاید کہ اُنہوں نے اس مال کو از راہِ باطل جمع کیا ہو۔ اس کے سبب سے اُنہوں نے گناہ کا بوجھ اُٹھایا اور اس وبال کو لیے ہوئے اپنی بازگشت کی طرف گئے، اور نہایت ہی اندوہناک اور حسرتناک حالت میں اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوئے ہوں۔ ان لوگوں نے دُنیا و آخرت کا خسارا اٹھایا اور ظاہر بظاہر نقصان ہے۔

لو رأی العبد الأجل و مصیرہ لأبغض الأمل و غرورہ۔
لکلّ امرئٍ فی مالہ شریکان: الوارث، و الحوادث

ترجمہ: اگر بندہ اپنی موت اور اپنے آخری مقام کو دیکھ لے، تو وہ آرزوؤں اور اپنے غرور کو اپنا دشمن سمجھے۔

ہر ایک آدمی کے مال میں دو شریک ہیں۔ ایک تو وارث اور دوسرے حوادث۔

واللہ لدنیاکم ھذہ اھون فی عینی من عراق خنزیرٍ فی ید مجذوم۔

ترجمہ: قسم خدا کی تمہاری دنیا میری نگاہ میں اس خنزیر کی ہڈی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہے، جو جذامی کے ہاتھ میں ہو۔

ہر موقع پر نصیحت کرنا اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلانا حضرت علیؑ کا مقصد تھا۔ چنانچہ آپ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے، تو آپ نے ایک شخص کو ہنستے ہوئے

Marfat.com

دیکھا۔ آپ نے فرمایا:-

كَأَنَّ الْمَوْتَ فِيهَا عَلٰى غَيْرِنَا كُتِبَ، وَكَأَنَّ الْحَقَّ فِيهَا عَلٰى غَيْرِنَا وَجَبَ، وَكَأَنَّ الَّذِي نَرٰى مِنَ الْأَمْوَاتِ سَفْرٌ عَمَّا قَلِيلٍ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ۔ نُبَوِّئُهُمْ أَجْدَاثَهُمْ، وَنَأْكُلُ تُرَاثَهُمْ، كَأَنَّا مُخَلَّدُونَ بَعْدَهُمْ، ثُمَّ قَدْ نَسِينَا كُلَّ وَاعِظٍ وَوَاعِظَةٍ، وَرُمِينَا بِكُلِّ جَائِحَةٍ۔

ترجمہ:- گویا اس دنیا میں موت ہمارے غیر کے واسطے ہی لکھی گئی ہے اور گویا موت کا حق ہونا دوسروں ہی کے لیئے واجب کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ مسافر و مردے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں، عنقریب ہمارے پاس پلٹ آئیں گے۔ ہم اُن کو قبروں میں رکھتے ہیں اور اُن کی میراث کھاتے ہیں، گویا ہم اُن کے بعد ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ ہم ہر نصیحت دینے والے (حوادث دنیا) کو بھول گئے، اور اُن کی نصیحت کو بُھلا دیا حالانکہ ہم ہر ایک مصیبت اور آفت میں پھینکے گئے ہیں۔

مَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَسُّهَا وَالسَّمُّ النَّاقِعُ فِي جَوْفِهَا، يَهْوِي إِلَيْهَا الْغِرُّ الْجَاهِلُ، وَيَحْذَرُهَا ذُو اللُّبِّ الْعَاقِلُ۔

ترجمہ:- دُنیا کی مثال اُس سانپ کی سی ہے جس کا ظاہر تو چھونے میں نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اندر اس کی کچلیوں میں زہرِ قاتل بھرا ہوتا ہے۔ فریب خوردہ جاہل تو اس کی خواہش کرتا ہے، لیکن عقلمند اور دانا آدمی اس سے منہ پھیرتا ہے۔

إِنَّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ عَدُوَّانِ مُتَفَاوِتَانِ، وَسَبِيلَانِ مُخْتَلِفَانِ۔ فَمَنْ أَحَبَّ الدُّنْيَا وَتَوَلَّاهَا أَبْغَضَ الْآخِرَةَ وَعَادَاهَا، وَهُمَا بِمَنْزِلَةِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ وَمَاشٍ بَيْنَهُمَا: كُلَّمَا قَرُبَ مِنْ وَاحِدٍ بَعُدَ مِنَ الْآخَرِ، وَهُمَا بَعْدُ ضَرَّتَانِ۔

ترجمہ:- دُنیا و آخرۃ دو دُشمن ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں۔ دو راستے ہیں جو بالکل ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔ جس نے دُنیا سے محبت کی اور دوستی کی، اُس نے آخرت کو دُشمن سمجھا۔ اور اس سے عداوت کی۔ یہ دونوں بمنزلہ مشرق و مغرب ہیں، اور چلنے والا ان دونوں کے درمیان ہے۔ جب وہ ایک سے نزدیک ہوا تو دوسرے سے دُور ہوتا گیا۔ یہ دونوں مثل دو سَوکنوں کے ہیں۔"

جناب امیر علیہ السّلام کے بہت سے خطبے دُنیا اور دنیا کی زوال پذیر حالات و نعمات کے متعلق ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک ایسا ہے، کہ بار بار پڑھا جائے۔ اگر ان کی بدولت کی جائے، تو مجھ کو یقین کامل ہے کہ دُنیا کی اصلی حالت کا نقشہ ایسا دل پر بیٹھ جائے اور آخرت کی خوبیوں کا اتنا یقین ہو جائے، کہ انسان دنیا کی نعمتوں کی خاطر عاقبت کے خیال کو کبھی نہ چھوڑے۔ اُن خطبات کی فہرست ہم نیچے درج کرتے ہیں۔ حوالے اُس نسخہ نہج البلاغہ کے صفحات کے ہیں جو شیخ محمد عبدہ کی شرح کے ساتھ مطبعۃ الاستقامت مصر میں چھپی ہے۔

نہج البلاغہ الجزء الاوّل !

صفحہ	۶۶	خطبہ	۲۷	صفحہ	۹۶	خطبہ	۵۱
"	۱۰۴	"	۶۰	"	۱۰۵	"	۶۱
"	۱۲۷	"	۷۹	"	۱۲۸	"	۸۰
"	۲۱۶	"	۱۰۷	"	۲۲۰	"	۱۰۹

الجزء الثانی

"	۱۵	"	۱۲۵	صفحہ	۳۸	"	۱۴۱
		صفحہ	۷۸	خطبہ	۱۵۶		

ان میں سے ایک خطبہ ۱۰۷ صفحہ ۲۱۶ الجزء الاوّل ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اُحَذِّرُکُمُ الدُّنْیَا فَاِنَّھَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ، حُفَّتْ بِالشَّھَوَاتِ، وَتَحَبَّبَتْ بِالْعَاجِلَۃِ، وَرَاقَتْ بِالْقَلِیْلِ، وَتَحَلَّتْ بِالْاٰمَالِ، وَتَزَیَّنَتْ بِالْغُرُوْرِ۔ لَاتَدُوْمُ حَبْرَتُھَا وَلَاتُؤْمَنُ فَجْعَتُھَا، غَرَّارَۃٌ ضَرَّارَۃٌ، حَائِلَۃٌ زَائِلَۃٌ نَافِدَۃٌ بَائِدَۃٌ، اَکَّالَۃٌ غَوَّالَۃٌ لَاتَعْدُوْ اِذَا تَنَاھَتْ اِلٰی اُمْنِیَّۃِ اَھْلِ الرَّغْبَۃِ فِیْھَا وَالرِّضَاءِ بِھَا اَنْ تَکُوْنَ کَمَا قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی:۔ کَمَاءٍ اَنْزَلْنَاہُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ ھَشِیْمًا تَذْرُوْہُ الرِّیَاحُ وَکَانَ اللّٰہُ

Marfat.com

على كل شيءٍ مقتدراً، لم يكن امرؤٌ منها في حبرةٍ إلا أعقبته بعدها عبرةً
ولم يلق في سرّائها بطناً إلا منحته من ضرّائها ظهراً ولم تطلّه فيها
ديمة رخاءٍ إلا هتنت عليه مزنة بلاءٍ وحريٌّ إذا أصبحت له منتصرةً
أن تمسي له متنكرةً وإن جانبٌ منها اعذوذب واحلولى أمرّ منها جانبٌ
فأوبى لا ينال امرؤٌ من غضارتها رغباً إلا أرهقته من نوائبها تعباً،
ولا يمسي منها في جناح أمنٍ إلا أصبح على قوادم خوفٍ غرّارةٌ غرورٌ
ما فيها فانيةٌ فانٍ من عليها لا خير في شيءٍ من أزوادها إلا التقوى من
أقلّ منها استكثر ممّا يؤمنه، ومن استكثر منها استكثر ممّا يوبقه
وزال عمّا قليلٍ عنه، كم من واثقٍ بها قد فجعته وذي طمأنينةٍ قد
صرعته، وذي أبّهةٍ قد جعلته حقيراً وذي نخوةٍ قد ردّته ذليلاً؟
سلطانها دولٌ وعيشها رنقٌ وعذبها أجاجٌ وحلوها صبرٌ وغذاؤها
سمامٌ وأسبابها رمامٌ حيّها بعرض موتٍ وصحيحها بعرض سقمٍ، ملكها
مسلوبٌ وعزيزها مغلوبٌ وموفورها منكوبٌ وجارها محروبٌ۔
ألستم في مساكن من كان قبلكم أطول أعماراً وأبقى آثاراً وأبعد آمالاً
وأعدّ عديداً، وأكثف جنوداً، تعبّدوا للدنيا أيّ تعبّدٍ، وآثروها
أيّ إيثارٍ، ثمّ ظعنوا عنها بغير زادٍ مبلّغٍ، ولا ظهرٍ قاطعٍ، فهل بلغكم
أنّ الدنيا سخت لهم نفساً بفديةٍ أو أعانتهم بمعونةٍ - أو
أحسنت لهم صحبةً؟ بل أرهقتهم بالفوادح وأوهنتهم بالقوارع
وضعضعتهم بالنوائب وعفّرتهم للمناخر ووطئتهم بالمناسم،
وأعانت عليهم ريب المنون فقد رأيتم تنكّرها لمن دان لها، وآثرها
وأخلد لها، حتّى ظعنوا عنها لفراق الأبد، وهل زوّدتهم إلا السغب؟
أو أحلّتهم إلا الضنك؟ أو نوّرت لهم إلا الظلمة أو أعقبتهم إلا الندامة؟
أفهذه تؤثرون، أم إليها تطمئنّون؟ أم عليها تحرصون؟
فبئست الدار لمن لم يتّهمها، ولم يكن فيها على وجلٍ منها
فاعلموا وأنتم تعلمون بأنّكم تاركوها، وظاعنون عنها،

وَاتَّعِظُوا فِيهَا بِالَّذِينَ قَالُوا (مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً) حُمِلُوا إِلَى قُبُورِهِمْ فَلَا يُدْعَوْنَ رُكْبَانًا، وَأُنْزِلُوا الْأَجْدَاثَ فَلَا يُدْعَوْنَ ضِيفَانًا، وَجُعِلَ لَهُمْ مِنَ الصَّفِيحِ أَجْنَانٌ، وَمِنَ التُّرَابِ أَكْفَانٌ، وَمِنَ الرُّفَاتِ جِيرَانٌ۔ فَهُمْ جِيرَةٌ لَا يُجِيبُونَ دَاعِيًا، وَلَا يَمْنَعُونَ ضَيْمًا، وَلَا يُبَالُونَ مَنْدَبَةً، إِنْ جِيدُوا لَمْ يَفْرَحُوا، وَإِنْ قُحِطُوا لَمْ يَقْنَطُوا، جَمِيعٌ وَهُمْ آحَادٌ، وَجِيرَةٌ وَهُمْ أَبْعَادٌ، مُتَدَانُونَ لَا يَتَزَاوَرُونَ، وَقَرِيبُونَ لَا يَتَقَارَبُونَ۔ حُلَمَاءُ قَدْ ذَهَبَتْ أَضْغَانُهُمْ، وَجُهَلَاءُ قَدْ مَاتَتْ أَحْقَادُهُمْ، لَا يُخْشَى فَجْعُهُمْ، وَلَا يُرْجَى دَفْعُهُمْ۔ اسْتَبْدَلُوا بِظَهْرِ الْأَرْضِ بَطْنًا، وَبِالسَّعَةِ ضِيقًا، وَبِالْأَهْلِ غُرْبَةً، وَبِالنُّورِ ظُلْمَةً فَجَاؤُوهَا كَمَا فَارَقُوهَا حُفَاةً عُرَاةً، قَدْ ظَعَنُوا عَنْهَا بِأَعْمَالِهِمْ إِلَى الْحَيَاةِ الدَّائِمَةِ، وَالدَّارِ الْبَاقِيَةِ، كَمَا قَالَ سُبْحَانَهُ: (كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ)

ترجمہ:۔ بعد حمدِ خدا و نعتِ رسولؐ کے اے لوگو! تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تم کو دُنیا کی حالت سے ڈراتا ہوں یہ نہایت خوش رنگ شیریں حلوہ نظر آتی ہے۔ شہوات کے باعث لوگ اس کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ اس کی نعمتیں جلد زائل ہونے والی ہیں۔ پھر یہ محبوب ہے اس میں زندگی کتنی قلیل ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خوش آیندہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی آرائش یہ ہے کہ یہ آرزوؤں کے ساتھ وابستہ ہے۔ مکر و فریب اس کی زینت ہے۔ اس کی خوشیاں اور فرحتیں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ اور اس کے مصائب و آلام سے پناہ نہیں مل سکتی۔ دُنیا فریب دینے والی ہے۔ ضرر پہنچانے والی ہے۔ آخرت کی خوبیوں سے روکتی ہے اور خود بہت جلد زائل ہونے والی ہے۔ یہ تو اب برباد ہوئی اب ختم ہوئی یہ بہت تیزی سے کھانے والی ہے۔ اور اپنے گرفتاروں کو ہلاک کرنے والی ہے۔ یہ دُنیا اپنی طرف رغبت کرنے والوں کی آرزوؤں کی آخری حد تک پہنچ جانے پر بھی اس کی وُہ ہی حالت ہوتی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ "دنیا کی مثال اُس پانی کی ہے جسے ہم نے آسمان سے اُتارا، اور نباتات ارضیہ اُس کے ساتھ مخلوط ہو گئے یعنی چاروں طرف سبزہ نظر آنے لگا۔ تو پھر سرسبز و شاداب گھاس سُوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور ہوائیں اُس کو

Marfat.com

چاروں طرف منتشر کر دیتی ہیں۔ بیشک خداوند تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" یہی حالت دُنیا کی ہے ابھی سرسبز تھی ابھی خشک پڑی ہے۔ اور خرمنِ ہستی کو فنا کی ہوائیں اُڑائے لئے جاتی ہیں کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس نے دُنیا میں کوئی ساعت خوشی سے گزاری ہو اور معاً فوراً ہی آنسوؤں کا تار نہ بندھ گیا ہو۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ اس دنیا نے اپنی مسرتوں کے ساتھ ملاقات کی ہو، اور پھر اُسے مصیبتوں اور سختیوں کے مزے نہ چکھائے ہوں۔ کسی شخص پر وسعتہائے دنیا کی بارشیں نہیں ہوتیں مگر یہ کہ فوراً اُس پر بلاؤں کے بادل چھا جاتے ہیں۔ دُنیا کا یہی وطیرہ ہے کہ جب کبھی کسی شخص کی صبح کو نصرت کرتی ہے، تو شام کو اُس سے دشمنی کرتی ہے۔ اگر ایک جانب سے وُہ اس کے لیئے شیریں و خوشگوار ہوتی ہے، تو دُوسری بات سے اُس کو اپنی تلخیاں پہنچاتی ہے۔ کوئی شخص اس دُنیا میں اپنی خوشی و راحت کو نہیں پہنچتا۔ لیکن یہ کہ دُنیا مصائب و حوادث کی مشقتوں کا بوجھ اُس پر لاد دیتی ہے۔ اس دُنیا میں کوئی شخص امن و راحت کے پردوں میں شام نہیں کرتا لیکن یہ کہ خوف و ہراس کے سایہ میں صبح کرتا ہے۔ یہ دنیا بڑی دھوکہ دینے والی ہے۔ یہ سراسر فریب ہے۔ جو اشیاء اس میں موجود ہیں، وُہ سب کی سب فانی ہیں۔ جو اس کے ساتھ لپٹا اُس کو ہی اس نے نیست و نابود کر دیا۔ اس دنیا میں اگر کوئی شے توشہ و زادِ راہ بنانے کے قابل ہے، تو وُہ تقویٰ ہے۔ زہد و تقویٰ کے سوا اور کسی چیز میں بھلائی نہیں۔ جس شخص نے دنیا کے مال و متاع میں قلیل حصہ لیا اُس نے اُن اشیاء میں بہت بڑا حصہ لے لیا جو اُسے عقوبت و عذاب سے امن دینے والی ہیں۔ اور جس شخص نے اُس دنیا کا بہت سامال و متاع جمع کیا اُس نے وُہ چیزیں بہت زیادہ میں اکٹھا کر لیں جو اُسے ہلاک کرنے والی ہیں۔ اور بہت جلد اُس کے پاس سے وُہ زائل اور مفقود ہو جائیں گی۔ جس شخص نے دُنیا پر بھروسہ کیا وُہ ہی درد و غم میں مبتلا ہُوا جو شخص دُنیا میں مطمئن ہُوا اور عیش و راحت اُسے ملا، اُس ہی کو یہ دنیا زمین پر پچھاڑ دیتی ہے۔ جو صاحبِ جاہ و منزلت ہُوا اُسی کو اس دنیا نے حقیر اور پست کر دیا۔ جس شخص نے یہاں نخوت کی اُسی کو اس دنیا نے ذلت و خواری میں گرفتار کر دیا۔ دُنیا کی طاقتیں (حکومتیں) پلٹنے والی ہیں۔ اس کے عیش مکدر ہیں۔ اس کی شیرینیاں ناگوار ہیں اس کی حلاوتیں تلخ ہیں۔ اس کی غذائیں زہر ہیں۔ اس کے اسباب و ذرائع ہاتھ سے نکل جانے والے ہیں۔ اس کی زندگی ہمیشہ موت سے دوچار ہے۔ اس کی تندرستی کے

Marfat.com

ساتھ مرض لگا ہوا ہے۔ اس کی سلطنت سلب کر لی جاتی ہے۔ اس کے طاقتور لوگ ہی مغلوب ہیں۔ اس کے اموال معرضِ نکبت میں آئے ہوئے ہیں۔ اور اس کے سایہ میں رہنے والے آوارہ و پریشان ہیں۔ کیا تم اُن پہلے لوگوں کے مکانوں میں نہیں ہو جن کی عمریں تم سے طویل اور جن کے آثار تم سے باقی رہنے والے تھے۔ جن کی آرزوئیں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ جو تعداد میں تم سے بہت زیادہ تھے۔ جن کے لشکر بہت زیادہ فراہم اور کثیر تھے۔ انہوں نے کس کس طرح دنیا کی بندگی نہ کی۔ کن کن طریقوں سے دنیا کو اختیار نہ کیا۔ مگر آخرکار دنیا سے چلے گئے۔ نہ تو زادِ راہ میسّر ہوا جو منزل تک پہنچا دے اور نہ کوئی سواری میسّر ہوئی جو قطع مسافت میں کام آئے۔ کیا تمہیں کبھی خبر پہنچی ہے کہ دُنیا نے ایک لحہ کے لیئے بھی اپنی مکمل خوشی اُن کو دی ہو۔ یا اُن کی مدد کسی اور طریقہ سے کی۔ یا اُن کے ساتھ اچھائی اور خوبی سے رہی ہو۔ نہیں نہیں۔ بلکہ سخت سخت مصائب کو اُن کے شاملِ حال کر دیا۔ اور انہیں طرح طرح کی کوفت پہنچا کر مضمحل کر دیا۔ حوادثِ زمانہ نے اُن کو مضطرب کر دیا۔ اور اُنہیں نتھنوں تک خاک میں آلودہ کر دیا۔ اُن کو اُونٹ کے قدموں سے خوب ہی روندا اور حوادثاتِ زمانہ کو اُن پر مسلط کر دیا۔ بے شک تم نے اُس شخص کے ساتھ دُنیا کی بے وفائی کو دیکھ لیا جو اس کا تقرب تلاش کر رہا تھا۔ اور اُس ہی کے اختیار کرنے پر آمادہ اُس کی طرف مائل تھا۔ یہاں تک کہ وہ اُس سے ہمیشہ کی جدائی کر کے چلا گیا۔ کیا سوائے گرسنگی کے اور بھی کچھ زادِ راہ دنیا نے ان لوگوں کو دیا؟ کیا سوائے تنگی اور ضیق کے کہیں اور جگہ بھی ان کو دی۔ سوائے ظلمت و تاریکی کے کیا کچھ اور بھی اُن کے ظاہر کیا؟ کیا سوائے پشیمانی کے اُنہیں کچھ اور بھی ملا؟ اب کیا تم اس دنیا کو اختیار کرتے ہو اور اس کی طمع رکھتے ہو؟ کیا ایسی دنیا کی طرف سے تم کو اطمینان حاصل ہے، کہ تم اس کی حرص کرتے ہو؟ خوب سمجھ لو۔ دُنیا اُس شخص کے لیئے نہایت ہی بُرا مقام ہے جو اُسے محلِ تہمت و اتہام نہ سمجھے۔ اور اس میں رہ کر خوف و بیم میں زندگی نہ گزارے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم اس کو چھوڑنے والے ہو۔ اور یہاں سے کُوچ کر جانے والے ہو۔ کیا تم ان لوگوں کے قدم بقدم چاہتے ہو جو کہا کرتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت میں کون ہے۔ اور وہ اپنی قبروں کی طرف سوار کرا کر روانہ کر دیئے گئے اور کسی نے نہ کہا کہ کیسے شوکت والے سوار ہیں۔ انہیں قبروں میں داخل کر دیا

گیا اور کسی نے اُن کی مہمانی نہ کی۔ اب تو ان کی قبریں پتھروں کے ڈھیر ہیں۔ مٹی اُن کا کفن ہے۔ بوسیدہ ہڈیاں اُن کی ہمسایہ ہیں۔ اب وُہ ایسے ہمسایہ میں کہ لاکھ اُن کو پکارو وُہ جواب نہ دیں گے۔ اُن پر کتنا ہی ظلم کیا جائے، وُہ اُس کے روکنے پر قادر نہیں ہیں اور نہ رونے کے لیئے اُن کی آنکھوں میں طراوت باقی ہے۔ اگر اُن کے ساتھ نیکی کی جائے تو انہیں کچھ خوشی حاصل نہ ہوگی۔ اور اگر اُن کو کچھ نہ دیا جائے، تو اُن پر مایوسی کے آثار ظاہر نہ ہوں گے۔ وہ ایک جگہ جمع ہیں، لیکن پھر اکیلے ہیں۔ آپس میں ساتھ ہیں، لیکن پھر ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں۔ وُہ آپس میں نزدیک ہیں، لیکن ایک دُوسرے کی زیارت نہیں کر سکتے۔ باوجود قریب ہونے کے قربت حاصل نہیں۔ وُہ بردبار ہیں۔ کینہ اُن کے دلوں سے نکل چکا ہے۔ وُہ نادان ہیں۔ حسد اُن سے بالکل زائل ہو گیا ہے۔ اُن کی تکالیف اُن کو خوفناک نہیں بنا سکتیں۔ اور اب نہ اُن کے مٹا دینے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے زمین کی سطح کو اُس کی تہ سے بدل لیا ہے۔ اور وسعت کی بجائے تنگی اختیار کر لی ہے۔ اور اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر تاریکی میں چلے گئے ہیں۔ اب وُہ پھر اُسی طرح زمین کے اُوپر آئیں گے۔ جس طرح اُس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ تن و تنہا اور پھر اپنے اعمال کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی اور دائمی مقام کی طرف چلے جائیں گے۔ جیسا کہ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے: کما بدانا اول خلق نعیدہ وعدا علینا انا کنا فاعلین۔" (ختم ہوا ترجمہ)

کیا اس سے بہتر کوئی دُنیا کی حقیقت کو بیان کر سکتا ہے۔ اور اس شخص سے زیادہ کوئی شقی نہیں جو باوجود ان حقائق کے سُننے کے پھر دُنیا سے لپٹا ہے۔ اسلام میں جن ارکان پر اعمال صالحہ کی عمارت قائم ہے، اُن میں سے دُنیا کی حقیقت کا علم اور اُس سے بے رُخی بہت بڑا رُکن ہے۔ اس کے بغیر کوئی نیک عمل ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نہ سمجھنا ہی آج کل دُنیا کے لوگوں کو اُن کی بربادی کی طرف لے جا رہا ہے۔ لہٰذا فلسفۂ اسلام کے بیان میں جتنا اس پر زور دیا جائے، کم ہے۔ اندریں صورت اس حکیم الٰہی کا ایک اور خطبہ نقل کرتے ہیں۔ اس خطبہ کا نمبر ۱۰۹ ہے، اور یہ نہج البلاغہ کے صفحہ ۲۲۰ سے شروع ہوتا ہے:۔

وَاُحَذِّرُکُمُ الدُّنْیَا فَاِنَّهَا مَنْزِلُ قُلْعَةٍ، وَلَیْسَتْ بِدَارِ نُجْعَةٍ

Marfat.com

قَدْ تَزَيَّنَتْ بِغُرُورِهَا، وَ غَرَّتْ بِزِينَتِهَا دَارُهَا هَانَتْ عَلٰى رَبِّهَا: فَخَلَطَ حَلَالَهَا بِحَرَامِهَا، وَخَيْرَهَا بِشَرِّهَا وَحَيَاتَهَا بِمَوْتِهَا، وَحُلْوَهَا بِمُرِّهَا: لَمْ يُصْفِهَا اللّٰهُ تَعَالٰى لِأَوْلِيَائِهِ۔ وَلَمْ يَضِنَّ بِهَا عَلٰى أَعْدَائِهِ۔ خَيْرُهَا زَهِيدٌ وَ شَرُّهَا عَتِيدٌ وَجَمْعُهَا يَنْفَدُ۔ وَمُلْكُهَا يُسْلَبُ وَ عَامِرُهَا يَخْرَبُ فَمَا خَيْرُ دَارٍ تُنْقَضُ نَقْضَ الْبِنَاءِ، وَعُمْرٍ يَفْنٰى فِيهَا فَنَاءَ الزَّادِ، وَمُدَّةٍ تَنْقَطِعُ انْقِطَاعَ السَّيْرِ! اِجْعَلُوا مَا افْتَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مِنْ طَلَبِكُمْ وَاسْأَلُوهُ مِنْ أَدَاءِ حَقِّهِ مَا سَأَلَكُمْ، وَأَسْمِعُوا دَعْوَةَ الْمَوْتِ آذَانَكُمْ، قَبْلَ أَنْ يُدْعٰى بِكُمْ۔ إِنَّ الزَّاهِدِينَ فِي الدُّنْيَا تَبْكِي قُلُوبُهُمْ وَإِنْ ضَحِكُوا، وَيَشْتَدُّ حُزْنُهُمْ وَإِنْ فَرِحُوا، وَيَكْثُرُ مَقْتُهُمْ أَنْفُسَهُمْ وَإِنِ اغْتَبَطُوا بِمَا رُزِقُوا، قَدْ غَابَ عَنْ قُلُوبِكُمْ ذِكْرُ الْآجَالِ وَحَضَرَتْكُمْ كَوَاذِبُ الْآمَالِ، فَصَارَتِ الدُّنْيَا أَمْلَكَ بِكُمْ مِنَ الْآخِرَةِ، وَالْعَاجِلَةُ أَذْهَبَ بِكُمْ مِنَ الْآجِلَةِ، وَإِنَّمَا أَنْتُمْ إِخْوَانٌ عَلٰى دِينِ اللّٰهِ، مَا فَرَّقَ بَيْنَكُمْ إِلَّا خُبْثُ السَّرَائِرِ، وَسُوءُ الضَّمَائِرِ، فَلَا تَوَازَرُونَ وَلَا تَنَاصَحُونَ وَلَا تَبَاذَلُونَ وَلَا تَوَادُّونَ. مَا بَالُكُمْ تَفْرَحُونَ بِالْيَسِيرِ مِنَ الدُّنْيَا تُدْرِكُونَهُ وَلَا يَحْزُنُكُمُ الْكَثِيرُ مِنَ الْآخِرَةِ تُحْرَمُونَهُ، وَيُقْلِقُكُمُ الْيَسِيرُ مِنَ الدُّنْيَا يَفُوتُكُمْ، حَتّٰى يَتَبَيَّنَ ذٰلِكَ فِي وُجُوهِكُمْ وَقِلَّةِ صَبْرِكُمْ، عَمَّا زُوِيَ مِنْهَا عَنْكُمْ۔ كَأَنَّهَا دَارُ مُقَامِكُمْ وَكَأَنَّ مَتَاعَهَا بَاقٍ عَلَيْكُمْ، وَمَا يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ أَنْ يَسْتَقْبِلَ أَخَاهُ بِمَا يَخَافُ مِنْ عَيْبِهِ إِلَّا مَخَافَةُ أَنْ يَسْتَقْبِلَهُ بِمِثْلِهِ قَدْ تَصَافَيْتُمْ عَلٰى رَفْضِ الْآجِلِ، وَحُبِّ الْعَاجِلِ، وَصَارَ دِينُ أَحَدِكُمْ لُعْقَةً عَلٰى لِسَانِهِ صَنِيعَ مَنْ قَدْ فَرَغَ مِنْ عَمَلِهِ وَ أَحْرَزَ رِضٰى سَيِّدِهِ۔

ترجمہ: میں تم کو دنیا سے ڈراتا ہوں۔ یہ وہ مکان ہے جس کی بنیادیں اکھڑنے والی ہیں۔ یہ آرام کرنے کا گھر نہیں ہے۔ یہ لوگوں کو فریفتہ کرنے کے لیے مزین ہو رہی ہے، اور لوگوں کو اپنی آرائش سے فریب دیتی ہے۔ اپنے رہنے والوں کے لیے یہ ذلت و

Marfat.com

خواری کا مقام ہے۔ اس کے حلال حرام سے اور بھلائیاں برائیوں سے ملی ہوئی ہیں
اس کی حیات موت سے ملی ہوئی ہے اور اس کی شیرینی میں کڑواہٹ ملی ہوئی ہے۔ اسی لیے
پروردگارِ عالم نے اسے اپنے دوستوں کے لیے منتخب نہیں کیا اور اپنے دشمنوں کو اس کی
بخشش کرنے میں بخل نہیں کی۔ اس کی بہبودیاں نایاب ہیں۔ دشواریاں مہیا ہیں۔ اس کے
اموال کا اجتماع نیست و نابود ہونے والا ہے۔ اس کا ملک سلب ہو جانے گا۔ اس کی
عمارتیں بہت جلد برباد ہو جائیں گی۔ اس مکان میں کون سی خوبی ہے جس کی بنیادیں
گرنے والی ہیں۔ اور اس عمر میں کیا خوبی ہے جو توشہ دان کی طرح ختم ہو جانے والی ہے
اس مدت میں کیا بہتری ہے جو مسافر کے سفر کی طرح منقطع ہو رہی ہے۔ جو تمہارے
مطالب و مقاصد میں سے خداوند تعالےٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ اس کو بجا لاؤ۔
تم خدا سے اسی شے کا سوال کرو جو تم سے ادائے حقوق کی بابت اس نے
تم سے سوال کیا ہے۔ موت کی آواز کو گوشِ دل سے سنو قبل اس کے کہ
موت تم کو بلائے۔ بالتحقیق کہ دنیا میں زاہدوں کی طرف رغبت نہ کرنے والوں کے دل
روتے رہتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ہنستے ہوں (یعنی خوشی کے سامان مہیا ہوں)۔
ان کا حزن و ملال بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اگرچہ وہ بظاہر خوش ہوں (یعنی خوشی
کے سامان مہیا ہوں) ان کا غصہ نفسِ امارہ پر زیادہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اگرچہ سامانِ
خوش حالی جو ان کے لیے مقدر کر دیئے گئے ہیں موجود ہوں۔ تمہارے دلوں سے
موت کا تصور غائب ہو گیا ہے۔ اور جھوٹی آرزوؤں کا غلبہ تم پر مسلط رہتا ہے اور
تمہیں کارہائے آخرت سے زیادہ دنیاوی امور متحرک کر رہے ہیں۔ اور اس دنیا کے
خیال نے آخرت کا خیال تمہارے دلوں سے محو کر دیا ہے۔ خوب سمجھ لو از روئے
دینِ اسلام تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔ تمہیں کوئی شے ایک دوسرے سے جدا
نہیں کر سکتی۔ لیکن تمہارے اندر کی پوشیدہ خباثت اور تمہارے دلوں کی برائیاں
تمہیں پراگندگی پر آمادہ کرتی ہیں۔ پس تم ایک دوسرے کا بوجھ نہیں بٹاتے ہو۔
ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے کو نصیحت نہیں
کرتے۔ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ دنیا کا مال تمہیں تھوڑا سا مل جائے تو تم خوش
ہو جاتے ہو۔ اور وہ اجرِ کثیرِ آخرت، جس سے تم محروم کر دیئے جاتے ہو، تمہیں ذرا بھی

Marfat.com

اندوہناک نہیں کرتا۔ اگر دنیا کی ذرا سی چیز تم سے نکل جاتی ہے تو تم مضطرب اور پریشان ہو جاتے ہو۔ اس کا قلق اور اضطراب تمہارے چہروں سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ تمہارے چہروں پر انتہائی بے صبری برسنے لگتی ہے۔ اس چیز کے سبب سے جو تم سے لے لی جاتی ہے گویا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دنیا تمہاری ہمیشہ کی سکونت کا مقام ہے۔ اور اس کا مال و متاع ہمیشہ تمہارے پاس باقی رہے گا۔ وہ کون سی چیز ہے جو تم میں کسی فرد واحد کو اس بات سے روکتی ہے کہ اپنے بھائی کا سخت عیب اس کے منہ پر بیان کر دے۔ مگر بات یہ ہے کہ وہ بھی اس سے ڈرتا ہے کہ اس کے عیب بھی اسی طرح بیان کر دیئے جائیں گے۔ اس صورت میں البتہ ترک آخرت اور محبت دنیا پر تم لوگوں میں خالص دوستی پیدا ہو گئی ہے اور تم میں سے ہر ایک کا دین فقط اسی قدر رہ گیا ہے، کہ اسے زبان سے چاٹ لیا جائے (یعنی فقط زبان ہی پر دین کا نام ہے۔ اور دل اعتقاد سے خالی ہے) تمہاری یہ خصلت اس غلام کی خصلت کے مانند ہے، جو اپنے آقا کے کاروبار سے فارغ ہو چکا ہو، اور اس کی خوشنودی حاصل کر لی ہو۔

جناب امام حسن علیہ السلام

جنادہ ابن امیہ نے اپنے مرض موت میں امام حسن علیہ السلام سے استدعا کی کہ کچھ نصائح ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:۔

استعد لسفرك وحصل زادك قبل حلول اجلك واعلم انك تطلب الدنيا والموت يطلبك ولا تحمل هم يومك الذى لم يأت على يومك الذى انت فيه واعلم انك لا تكسب من المال شيئا فوق قوتك الا كنت فيه خازنا لغيرك واعلم ان الدنيا فى حلالها حساب وفى حرامها عقاب وفى الشبهات عتاب فانزل الدنيا بمنزلة الميتة خذ منها ما يكفيك فان حلالا كنت قد زهدت فيها وان كان حراما لم يكن فيه وزر فاخذت منه كما اخذت من الميتة وان كان العتاب فالعتاب يسير واعمل لدنياك

کانک تعیش ابدًا واعمل لآخرتک کانک تموت غدا واذا اردت عزًا بلا عشیرة وھیبة بلا سلطان فاخرج من ذل معصیة الله الی عز طاعة الله عز وجل واذا نازعتک الی صحبة الرجال حاجة فاصحب من اذا صحبته زانک واذا خدمته صانک واذا اردت معونة اعانک وان قلت صدق قولک وان صلت شد صولک وان مددت یدک بفضل مدھا وان بدت منک ثلمة سدھا وان رای منک حسنةً عدھا وان سألته اعطاک وان سکت عنه ابتداک وان نزلت بک احدی الملمات واساک من لا تاتیک منه البوائق ولا تختلف علیک منه الطرائق ولا یخذلک عند الحقائق وان تنازعتما منقسما آثرک۔

ترجمہ:۔ اپنے سفر کے لیئے تیاری کر اور زادِ راہ حاصل کر لے قبل اس کے کہ اجل آئے۔ اور اچھی طرح سمجھ لے کہ تُو دنیا کو طلب کرتا ہے، اور موت تجھ کو طلب کرتی ہے اُس دن کا رنج نہ اُٹھا جو ابھی نہیں آیا۔ اور اس کل رنج کو آج کے رنج پر زیادہ نہ کر۔ یاد رکھ مالِ دُنیا میں سے تُو اپنی ضروریات سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ اور باقی مال کا تُو دوسروں کے لیئے چوکیدار ہے۔ یہ بھی سمجھ لے کہ دنیا کے حلال کا حساب ہے حرام کا عذاب ہے اور تیرے شبہات کے لیئے عتاب ہے۔ دنیا کو بمنزلہ مُردار کے سمجھ (جو موجب نصِ قرآنی خاص حالتوں میں جائز ہو جاتا ہے) اُس میں سے اتنا ہی لے جتنا تیرے لیئے تجھ کو کافی ہو۔ کیونکہ اگر وہ حلال ہے، تو زیادہ نہ لینے کی وجہ سے تجھے زہدِ دُنیا کا ثواب ملے گا اور اگر اس پر حرام ہونے کا گمان ہے تو تیرے اُوپر بوجھ نہ ہو گا کیونکہ تُو نے اتنا ہی لیا ہے جتنا مردار سے خاص ضرورت کی حالت میں لیا جاتا ہے۔ اور اگر اس میں عتاب ہے تو وُہ عتاب نرم ہو گا۔ جب تو دُنیا کے امور کی طرف متوجہ ہو تو اس تن دہی کے ساتھ ہو کہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور جب تو آخرت کے لیئے عمل کرے تو یہ خیال کر کہ گویا تو کل مر جائے گا۔ اگر تُو چاہتا ہے کہ تجھ کو بغیر اقربا کی مدد کے عزت ملے اور بغیر حکومت کے لوگوں کے دلوں میں تیری ہیبت ہو تو معصیت الٰہی کی ذلت سے

نکل کر خداوند عزّوجل کی طاعت کی عزت میں آجا۔ اور اگر کوئی حاجت تجھ کو لوگوں سے ملنے پر مجبور کرے تو ایسے شخص سے مل کہ جب تو اس سے ملے تو تجھے زینت دے اور تو اس کی خدمت کرے تو وہ تیری حفاظت کرے۔ اور اگر تجھ کو اس کی اعانت کی ضرورت ہو تو وہ تیری مدد کرے۔ اگر تو کوئی بات کہے تو اس کو وہ پورا کردے۔ اگر تو کسی پر حملہ کرے تو وہ تیرے حملہ کو شدید کردے۔ اگر تو اپنا ہاتھ نیکی کے ساتھ بڑھائے تو وہ بھی بڑھا دے اگر تجھ سے کچھ نقص یا رخنہ ظاہر ہو تو وہ اس کو بند کردے۔ اور اگر وہ تجھ سے نیکی دیکھے تو وہ بھی نیکی کو زیادہ کردے۔ اگر تو اس سے کچھ سوال کرے تو وہ عطا کردے اور اگر تو اس سے بات کرنی چھوڑ دے تو وہ تجھ سے بات کرنے میں ابتداء کرے۔ اگر تجھ پر کوئی مصیبت پڑے یا کسی طرف سے تجھے برائی پہنچے تو اس شخص کی طرف سے تجھے سختیاں نہ پہنچیں اور تیری طرف سے اس کی آنکھ نہ پھرے۔ اور نہ وہ تجھے مصیبت کے وقت چھوڑ دے۔

جناب امام حسن علیہ السلام نے ایک خطبہ میں فرمایا:۔

یا ابن ادم عف عن محارم اللّٰہ تکن عابدا وارض بما قسم اللّٰہ تکن غنیا واحسن جوار من جاورک تکن مسلما وصاحب الناس بمثل ما تحب ان یصاحبوک بہ تکن عدلا انہ کان بین ایدیکم اقوام یجمعون کثیرا ویبنون مشیدا ویاملون بعیدا اصبح جمعہم بورا وعملہم غرورا ومساکنہم قبورا یا ابن ادم انک لم تزل فی ھدم عمرک منذ سقطت من بطن امک فخذ مما فی یدیک لما بین یدیک فان المؤمن یتزود والکافر یتمتع۔

ترجمہ:۔ اے فرزند آدمؑ! خداوند تعالیٰ کے محرمات سے بچ تاکہ تو اس کی بندگی (اطاعت) کرنے والا شمار کیا جائے جو خداوند تعالیٰ نے تقسیم رزق کر دیا ہے، اس پر راضی ہو جا تاکہ تو غنی (ہر ایک شے سے مستغنی) ہو جائے۔ اور اپنے ہمسایہ اور ساتھی کے ساتھ نیکی کر تاکہ تجھ کو سلامتی ملے۔ اور لوگوں کے ساتھ اس طرح مل کہ جس طرح تو چاہتا ہے کہ لوگ تجھ سے ملیں۔ تو انصاف کر دیکھ تو سہی! تیرے سامنے تجھ سے پہلے جنہوں نے سب مال جمع کر لیا تھا عالی شان محل بنوائے تھے۔ اور بڑی لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ آخر کار ان کا مجمع ہلاک ہو گیا۔ اور ان کے سارے کام برباد ہو گئے

اور ان کے پیٹ کی جگہ ان کی قبر ہو گئی۔ اے فرزند آدم! جب سے تو اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے، متواتر تیری عمر کم ہو رہی ہے۔ پس جو تیرے ہاتھ میں ہے اس سے اپنی آخرت کا زاد بنا۔ کیونکہ مومن آخرت کے لئے جمع کرتا ہے اور کافر اسی یہیں فائدہ اٹھالیتا ہے۔

جناب امام حسین علیہ السلام

کشف الغمہ میں جناب امام حسین علیہ السلام کا یہ خطبہ درج ہے:

ایها الناس نافسوا فی المکارم وسارعوا فی المغانم ولا بمعروف لم تعجلوه واکسبوا الحمد بالنجح ولا تکسبوا بالمطل ذما فمهما یکن لاحد عند احد صنیعته رای انه لا یقوم بشکرها فالله له بمکافاته فانه اجزل عطاءً واعظم اجرا واعلموا ان حوائج الناس الیکم من نعم الله علیکم فلا تملوا النعم فتحور نقما واعلموا ان المعروف مکسب حمدا ومعقب اجرا فلو رایتم المعروف رجلا رایتموه حسنا جمیلا یسر الناظرین ولو رایتم اللؤم رایتموه سمجا مشوها تنفر منه القلوب وتغض دونه الابصار ایها الناس من جاد ساد ومن بخل رذل وان اجود الناس من اعطی من لا یرجوه وان اعفی الناس من عفا عن قدرة وان اوصل الناس من وصل من قطعه والاصول علی مغارسها بفروعها تسمو فمن تعجل لاخیه خیرا وجده اذا قدم علیه غدا ومن اراد الله تبارک وتعالی بالصنیعة الی اخیه کافاه بها فی وقت حاجته وصرف عنه من بلاء الدنیا ما هو اکثر منه ومن نفس کربة مؤمن فرج الله عنه کرب الدنیا والآخرة ومن احسن احسن الله الیه والله یحب المحسنین۔

ترجمہ:- لوگو! عزت اور نیکنامی کے کاموں میں باہم مقابلہ کرو۔ اور منفعت حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جاؤ۔ جس نیکی میں تم نے تاخیر کی پھر اسے نیکی نہ سمجھو۔ حاجت برآری کر کے تعریف کے قابل بنو۔ ٹال مٹول کر کے مذمت کے مستحق نہ بنو

اگر کوئی شخص کسی پر احسان کرے اور یہ سمجھتا ہو کہ وُہ شخص ہمارے احسان کا شکریہ نہ ادا کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے احسان کا بدلہ دے گا اور خدا تو بہت گراں قدر عطیہ اور بڑا معاوضہ دینے والا ہے۔ یہ جان لو کہ لوگوں کا اپنی حاجتیں تمہارے پاس لانا تمہارے لیئے بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اس نعمت سے برداشتہ خاطر نہ ہو ورنہ وُہ تمہارے لیئے بجائے نعمت کے وبال بن جائے گی۔ یہ سمجھ لو کہ احسان کر کے انسان مدح و ستائش حاصل کرتا ہے اور بعد میں ثواب بھی پاتا ہے اگر احسان آدمی کی شکل اختیار کرتا تو تم اُس کو نہایت حسین و جمیل دیکھتے جسے دیکھ کر دیکھنے والوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر بخل انسان کی صورت اختیار کرتا، تو وہ زشت رُو اور کریہ المنظر ہوتا جس سے دل متنفر ہوتے ہیں اور آنکھیں اُسے دیکھنے سے گریز کرتی ہیں۔ لوگو! جس نے سخاوت کی وُہ سردار ہوا۔ جس نے بخل کیا وُہ رذیل ہوا۔ اور سب سے زیادہ فیاض وہ شخص ہے جو ایسے کو دے جو اُس سے اُمید نہیں رکھتا ہو۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ عفو کرنے والا وُہ شخص ہے، جو قابُو پانے کے باوجود معاف کر دے اور لوگوں میں سب سے زیادہ صلہ رحم کرنے والا وُہ شخص ہے جو اُس کے ساتھ صلہ رحم کرے، جس نے اُس کے ساتھ قطع رحم کیا ہو۔ جڑیں اپنے جمنے کی جگہوں میں اپنی شاخوں ہی کے ساتھ بڑھتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص اپنے بھائی کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کرے گا تو وُہ جب خود کسی ضرورت سے مجبور ہو کر اُس کے پاس آئے گا، تو اپنی بھلائی موجود پائے گا۔ اور جو شخص اپنے بھائی پر احسان کر کے خدا سے اجر کا طالب ہو، تو خدا بھی اُس کی ضرورت کے وقت اس کے احسان کا بدلہ دے گا اور دُنیا کی اتنی مصیبتیں دُور کرے گا جتنی اُس نے اپنے بھائی کی دُور کی تھیں۔ جو شخص کسی مومن کو رنج سے چھڑائے گا، تو خدا اُسے دُنیا اور آخرت کے رنج سے نجات دے گا۔ جو شخص دوسروں پر احسان کرے گا، خدا اُس پر احسان کرے گا۔ اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

دُنیا کی زندگی کے یہ بہترین اصول ہیں۔ ناظرین غور کریں۔ دنیا سے الگ ہو کر رہبانیت اختیار کرنا اور ہمالیہ پہاڑوں پر رشی اور منی بن کر زندگی بسر کرنا یا بدھ کی طرح عورتوں اور بچوں کے علائق کی تکالیف سے گھبرا کر اُن سے علیحدہ ہو جانا اچھا ہے، یا اس طرح دنیا میں رہ کر لوگوں کی حاجت برآری کرنا؟ —

Marfat.com

یا ابن آدم تفکر وقل این ملوک الدنیا وارباہا الذین عمروا خرابہا، واحتفروا انہارہا، وغرسوا اشجارہا ومدنوا مدائنہا، فارقوہا کارہون وورثہا قوم آخرون، ونحن بہم عما قلیل لاحقون۔ یا ابن آدم اذکر مصرعک وفی قبرک مضجعک وموقفک بین یدی اللہ، تشہد جوارحک علیک یوم تزل فیہ الاقدام وتبلغ القلوب الحناجر وتبیض وجوہ، وتسود وجوہ وتبدو السرائر ویوضع المیزان القسط، یا ابن آدم اذکر مصارع آبائک وابنائک کیف کانوا وحیث حلوا وکانک عن قلیل، قد حللت محلہم وصرت عبرۃ المعتبر۔ وانشد شعراً:-

این الملوک التی عن حفظہا غفلت
حتی سقاہا بکاس الموت ساقیہا
تلک المدائن فی الآفاق خالیۃ
عادت خراباً وذاق الموت بانیہا
اموالنا لذوی الوارث نجمعہا
ودورنا لخراب الدہر نبنیہا

ترجمہ:- اے فرزند آدم غور کر! اور بتا کہ شاہان دنیا اور دنیا والے کہاں ہیں کدھر گئے وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا کے ویرانوں کو آباد کیا تھا۔ انہوں نے نہریں کھودیں، درخت لگائے، اس کے شہروں کو آباد کیا۔ آخر کار انہیں یہ دنیا چھوڑنی پڑی درآنحالیکہ وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے؛ اور ان کی جگہ دوسرے لوگ مالک بن بیٹھے۔ ہم لوگ بھی عنقریب ان سے جا ملیں گے۔ اے فرزند آدم! اپنے پچھڑنے، اور قبر میں لیٹنے اور پھر بروز قیامت خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر۔ جہاں تیرے اعضاء تیرے خلاف گواہی دیں گے۔ اس دن جبکہ قدموں کو لغزش ہوگی، اور دل حلق تک آ جائیں گے۔ اور بعضوں کے چہرے سفید اور بعضوں کے سیاہ ہوں گے۔ اور دل میں چھپائی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی اور انصاف کی ترازو نصب کی جائے گی۔ اے فرزند آدم! اپنے باپ، دادا، اور

Marfat.com

اپنی اولاد کے مرنے کو یاد کر کہ پہلے وُہ کہاں تھے، اور اب کہاں ہیں۔ اور تُو بھی عنقریب اُن کے ساتھ جا ملے گا۔ اور عبرت حاصل کرنے والے کے لیئے نمونۂ عبرت بن جائے گا۔

پھر آپؐ نے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:-

کہاں ہیں وُہ بادشاہ جو اپنی جانوں کو نہ بچا سکے؛
یہاں تک کہ پلانے والے نے اُن کو موت کا جام پلا دیا۔
دُنیا میں اُن کے شہر خالی ہیں؛
اور ویران ہو رہے ہیں اور اُن کے بنانے والے نے موت کا مزہ چکھ لیا۔
ہم اپنے مال اپنے وارثوں کے لیئے جمع کرتے ہیں،
اور اپنے گھر زمانہ کے بگاڑنے کے لیئے بناتے ہیں۔

یہ خطبہ تاریخ ابن عساکر سے لیا گیا ہے:-

قال بعد الحمد والثناء عباد اللہ! اتقوا اللہ وکونوا من الدنیا علی حذر فان الدنیا لو بقیت لاحد وبقی علیہا احد لکانت الانبیاء احق بالبقاء و اولی بالرضاء وارضی بالقضاء غیر ان اللہ خلق الدنیا للبلاء وخلق اھلہا للفناء فجدیدھا بال ونعیمہا مضمحل وسرورھا مکفھر والمنزل بلغۃ والدار قلعۃ فتزودوا فان خیر الزاد التقوی

ترجمہ:- بندگانِ خدا! خدا سے ڈرو، اور اس دُنیا سے ہوشیار رہو۔ اگر یہ دُنیا کسی کے لیئے ہمیشہ باقی رہتی، اور دنیا میں کوئی ہمیشہ باقی رہ سکتا تو انبیاءؑ ہمیشہ باقی رہنے کے زیادہ حقدار تھے۔ اور اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ ہر بات اُن کی مرضی کے مطابق ہو، اور وُہ سب سے زیادہ تقدیر کے فیصلے اپنی پسند کے مطابق پاتے۔ مگر خدا نے اس دُنیا کو بلا و مصیبت ہی کے لیئے خلق کیا ہے، اور اس دُنیا کے لوگوں کو فنا ہو جانے کے لیئے۔ دُنیا کی ہر نئی چیز کہنہ ہو جانے والی ہے، اور اس کی نعمتیں فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی خوشی تو نمائشی خوشی ہے۔ یہ ایک دُوسری منزل کا پیش خیمہ ہے، اور ناقابلِ سکونت گھر ہے۔ لہٰذا اس دُنیا سے زادِ راہ فراہم کر لو، اور بہترین زادِ راہ تقوٰے ہے۔

Marfat.com

ایک دفعہ آپؑ سے کہا گیا کہ اے فرزندِ رسولؐ آپؑ نے کس طرح صبح کی؟ تو آپؑ نے فرمایا:

"اصبحت ولی ربی فوقی والنار امامی والموت یطلبنی والحساب محدق بی، وانا مرتھن بعملی۔ لا اجد ما احب، ولا ادفع ما اکرہ، والامور بید غیری فان شاء عذبنی وان شاء عفی عنی فای فقیر افقر منی"۔

ترجمہ:- مَیں نے اس طرح صبح کی کہ میرا پروردگار میرے اُوپر ہے آتشِ جہنم میرے سامنے ہے، موت میری طلبگار رہتی ہے، اور حساب میرے اوپر نگاہ جمائے ہوئے ہے۔ مَیں اپنے اعمال کا اسیر ہوں۔ جو چاہتا ہوں پاتا نہیں، اور جس سے بیزار ہوں اُس کو اپنے سے دُور نہیں کر سکتا۔ میرے کُل امور دوسرے کے ہاتھ میں ہیں۔ وُہ چاہے تو مجھ پر عذاب کرے، اور چاہے تو معاف کر دے۔ لہذا مجھ سے زیادہ نادار و مجبور اور کون ہو سکتا ہے۔

آئمہؑ کا طرزِ بیان ایسا ہوتا تھا کہ جس سے دوسروں کو نصیحت ہو اور ہدایت حاصل کریں۔ لہذا جو کچھ کہتے تھے، اپنے اُوپر رکھ کر کہتے تھے

مؤرخ مسعودی مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ متوکل عباسی سے کسی نے حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی چغلی کی اور کہا کہ ان کے پاس بہت اسلحہ و مال ہے اور اب یہ تیرے خلاف خروج کرنے والے ہیں۔ اُس نے ترکوں کی ایک جماعت رات کے وقت آپؑ کے پاس بھیجا کہ گرفتار کر کے لائیں۔ وُہ جماعت جب آپؑ کے مکان پر پہنچی، تو دیکھا کہ آپؑ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ اور قرآن شریف کی آیات کا ورد ہے بالوں کا کمبل اوڑھے ہوئے تھے، اُسی حالت میں وُہ لوگ آپؑ کو متوکل کے پاس لے گئے اور کہا، کہ کوئی مشتبہ شئے آپ کے مکان میں نہیں ملی۔ اور آپ کی عبادت کا حال سُنایا۔ اُس نے عزّت سے آپ کو اپنے پاس بٹھایا۔ متوکل اُس وقت شراب خواری میں مشغول تھا، اور جامِ شراب گردش کر رہا تھا۔ متوکل نے ایک جام شراب آپؑ کو پیش کیا۔ جناب امام علی نقی علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے معاف رکھا جائے۔ آج تک شراب نے میرے خون و گوشت کو مَس نہیں کیا۔ اُس نے کاسۂ شراب پر اصرار نہ کیا۔

Marfat.com

لیکن کہا کہ کچھ اشعار سنائیے۔ آپؑ نے کہا میں شعر تو نہیں کہا کرتا۔ متوکل نے کہا کہ نہیں شعر تو ضرور کہنے ہوں گے۔ اس پر آپؑ نے مندرجہ ذیل اشعار اُسی وقت انشاء کر کے سنائے۔ یہ اشعار بھی مسعودی نے نقل کئے ہیں۔ "مروج الذہب مسعودی طبع مصر الجزء الرابع ص۴۴"

وُہ اشعار یہ ہیں:-

(۱) باتوا علی قلل الاجبال تحرسہم ! غلبُ الرجال فما اغنتہم القلل،

(۲) واستنزلوا بعد عز عن معاقلہم فاودعوا حُفراً یا بئس ما نزلوا

(۳) ناداھم صارخ من بعد ما قبروا این الاساور والتیجان والحلل،

(۴) این الوجوہ التی کانت منعمۃ من دونہا تضرب الاستار والکلل

(۵) فافصح القبر عنہم حین ساءلہم تلک الوجوہ علیہا الدود یقتتل

(۶) قد طالما اکلوا دھراً وما شربوا فاصبحوا بعد طول الاکل قد اکلوا

(۷) وطالما عمروا دوراً لتحصنہم ! ففارقوا الدور والاھلین وانتقلوا

(۸) وطالما کنزوا الاموال وادخروا ! فخلفوھا علی الاعداء وارتحلوا

(۹) اضحت منازلہم قفراً معطلۃ، وساکنوھا الی الاجداث قد رحلوا

ترجمہ:- (۱) وُہ لوگ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتے تھے جہاں لوگوں کی طاقتور جماعتیں اُن کی حفاظت کرتی تھیں۔ لیکن اُن کی بلند چوٹیوں نے بھی اُن کو کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔

(۲) اس شان و شوکت کے بعد وُہ اپنی بلند پہاڑوں کی پناہ گاہوں سے نیچے اُتار لیئے گئے۔ اور ایک گڑھے میں ڈال دیئے گئے۔ کیا خراب جگہ ہے جہاں وُہ آ گئے۔

(۳) اُن کے دفن ہونے کے بعد ایک ندا دینے والے نے ندا دی کہ کہاں ہیں وُہ سونے چاندی کے ڈھیر، اور وُہ تاج و قیمتی لباس۔

(۴) وُہ چہرے جو ناز و نعم میں رہتے تھے، اور جن کے سامنے ستار و طنبورے بجتے تھے، اب کہاں ہیں۔

(۵) جب اُن کی قبر نے ذرا سا پردہ ہٹایا کہ یہ ہیں وُہ چہرے جن کے کھانے کے لیئے

کیڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔

(۶) ایک زمانہ تک عیش و عشرت میں کھاتے پیتے رہے، لیکن آج وُہ خود کھائے جا رہے ہیں۔

(۷) ایک زمانہ تک اُنہوں نے محل آباد کیئے تاکہ محلوں میں اُنہیں امن ملے۔ لیکن پھر اُنہیں اپنے محل اور اہل و عیال چھوڑنے پڑے۔

(۸) ایک زمانہ تک اُنہوں نے مال جمع کیا، اور اس کا ذخیرہ لگایا۔ لیکن پھر ان خزانوں کو اپنے دشمنوں پر تقسیم کر کے خود چلتے بنے۔

(۹) ان کے رہنے کے گھر غیر آباد اور ویران ہو گئے اور ان گھروں کے رہنے والے قبروں میں اُتار دیئے گئے"۔

وہ شخص کتنا شقی ہو گا جو ان معلمان اسلام کی اس تعلیم کے بعد بھی اس دُنیائے فانی میں دل لگائے، اور ناجائز طریقوں سے اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اپنی موت اور اپنے انجام سے غافل رہے اور اصلی اور حقیقی ابدی زندگی کو بھول جائے۔ ایک ایک لفظ دل پر اُس نشتر کا کام کرتا ہے جس سے زخم کی پیپ اور مواد نکالا جاتا ہے۔ بار بار ان کو پڑھنا چاہیئے تاکہ صفائے قلب اور جلائے نظر ایسی روشن ہو جائے کہ پھر اُس پر نہ زنگ آئے اور نہ کوئی پردہ حائل ہو۔ لیکن انسان کی خلقت، اُس کی زندگی اور یہ دُنیا عبث نہیں ہیں۔ ان کو ترک کرنے کی اسلام میں ممانعت ہے۔ خودکشی اور رہبانیت کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ امتزاج دین و دنیا ہی اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس ہی دنیا میں رہ کر اور اس کے مکروہات پر صبر کر کے آزمائش کی سیڑھیوں سے غیر فانی نعمتوں کے ملک میں انسان پہنچ سکتا ہے۔

اسلام ترکِ دنیا اور عشقِ دُنیا دونوں کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور اپنے اٹل اصول یعنی عدل کی پابندی کراتا ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔ اہل تصوف دردِ دل کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ لیکن وُہ بھی حد اعتدال سے نہ بڑھے کہ جس کو دیکھا رو دیئے۔ رہبانیت کے تتبع میں مسلمان حکماء و شعراء اور "اہلِ دل" کہتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑنا ہی بہت بڑا تقویٰ ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے نہایت اچھے الفاظ میں ترکِ دُنیا کی تعریف اس طرح کی ہے: ؎

از جہاں مجنوں برید و روئے در ویرانہ کرد ؛ کم کند عاقل چنیں کارے کہ ایں دیوانہ کرد

Marfat.com

مذہب تو ہر فرد کے لیئے ہوتا ہے۔ سب ہی دُنیا کو چھوڑ کر ویرانہ میں چلے جائیں تو پھر ویرانہ آباد ہو کر وہ ہی دنیا ہو جائے۔ اور قطع تعلق کے سلسلہ میں شادی و معاملات بند ہوں تو دُنیا ہی نیست و نابود ہو جائے۔ لیکن یہ مشیت ایزدی نہیں ہے۔ دُنیا کے علائق سے گریز کرنا بزدلی ہے۔ اور پھر دُنیا چھوڑ کر بھی تو خوشی نہیں ملتی۔ خداوند تعالٰے نے دنیا کو اس حکیمانہ طریقہ سے بنایا ہے کہ اس کی تکالیف ہی میں ایسی دلچسپی کی آمیزش کر دی ہے کہ لوگ اُن تکالیف کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اولاد سے جو تکالیف مرد و عورت دونوں کو ہوتی ہے ظاہر ہے۔ لیکن اولاد نہ ہو تو لوگ اُس کی تلاش میں ہر گردان رہتے ہیں۔ عورت و مرد کی صحبت ہی بہت سے غم و الم کا باعث ہوتی ہے لیکن لوگ جوانی کو روتے ہیں اور جب وُہ جاتی ہوئی نظر آتی ہے، تو ہر ایک جتن سے اُس کا دامن گھسیٹ کر اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ اور جب شگوف کے کتنے سے بدن پھوٹ نکلتا ہے، تو خدا کو الزام دینے لگتے ہیں۔ یہ معجزہ ہے اور قدرت و حکمتِ الٰہی کا نمونہ ہے کہ ان مصائب و تکالیف دُنیا ہی میں دلآویزی موجود ہے۔ ایسی دلآویزی کہ کوئی شخص اپنی خوشی سے مرنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ مشیتِ ایزدی یہ ہے کہ دُنیا چلے۔ نہ یہ کہ سب لوگ ترک دنیا کر کے دنیا کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ترکِ دُنیا کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خدا کی رضا ملی، اور نہ خوشی حاصل ہوئی۔ حکیم اسلام حضرت علی علیہ السلام دنیا کی زندگی کے فوائد اس طرح بیان کرتے ہیں:۔ ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ البصری متوفی ۲۵۵ھ نے اپنی کتاب المحاسن والاضداد کے صفحہ ۱۳۲ پر جناب امیر علیہ السلام کا یہ خطبہ زیرِ عنوان محاسن فضل الدنیا نقل کیا ہے۔

الدنیا دار صدق لمن صدقها ودار عافیة لمن فهم فیها ودار غنی لمن تزود منها مسجد انبیاء اللہ، ومهبط وحیه، ومصلی ملائکته ومتجر اولیائه یکسبون فیها الرحمة ویربحون فیها الجنة فمن ذا یذمها؟ وقد آذنت ببینها ونادت بفراقها ونعت نفسها وشوقت بسرورها الی السرور وببلائها الی البلاء تخویفاً وتحذیراً ترغیباً وترهیباً، فیا ایها الذام للدنیا والمفتتن بغرورها متی غرتك بمصارع آبائك من البلی ام بمضاجع امهاتك تحت الثری؟ کم عللت بکفیك وکم مرضت بیدیك تبتغی لهم الشفاء وتستوصف لهم الاطباء وتلتمس لهم الدواء؟ لم تنفعهم بطلبتك ولم تشفعهم بشفاعتك ولم تستشفعهم باستشفائك بطبك مثلت بهم الدنیا مصرعك ومضجعك حیث

...لم بکاؤک ولا یغنی عنک احباؤک ثم التفت الی قبور ھناک فقال:۔ یا اھل الثراء والعز الازواج قد نکحت والاموال قد قسمت والدور قد سکنت ھذا خبر ما عندنا فما خبر ما عندکم، ثم قال لمن حضر واللہ لواذن لھم لاجابوا بان خیر الزاد التقوی وانشد:۔

مَا اَحْسَنَ الدُّنْیَا وَاِقْبَالَهَا ! اِذَا اَطَاعَ اللّٰهَ مَنْ نَالَهَا
مَنْ لَمْ یُوَاسِ النَّاسَ مِنْ فَضْلِهَا عَرَّضَ لِلْاِدْبَارِ اِقْبَالَهَا

ترجمہ:۔ دُنیا دارِ صداقت ہے اُس شخص کے لئے جس نے اس کی حقیقت کو پہچانا، اور دارِ عافیت ہے اُس شخص کے لئے جس نے اُس میں غور و فکر کر کے اُس کو سمجھا۔ دارِ دولت ہے اُس شخص کے لئے جس نے اس میں سے عاقبت کے لئے زادِ عقبیٰ جمع کیا۔ یہ انبیاء اللہ کے سجدہ کرنے کی جگہ ہے، اور اُس کی وحی کے نزول کا مقام ہے۔ اُس کے ملائکہ کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اور اُس کے دوستوں کی تجارت کی جگہ ہے جہاں وُہ خدا کی رحمت حاصل کرتے ہیں۔ اور نفع میں جنت لیتے ہیں۔ پھر کیوں اس کی مذمت کی جائے۔ درآنحالیکہ دُنیا نے اپنے فرزندوں کو (محبت کرنے والوں کو) اس صورت سے طلب کیا ہے کہ اپنی مفارقت کی بھی منادی کر دی ہے۔ اور اپنے فنا ہونے کی سُنائی بھی سُنادی ہے۔ اور اپنی راحتوں کی طرف شوق بھی دلایا ہے۔ اور اپنی بے شمار آفات کی طرف بھی توجہ دلادی ہے۔ دنیا خوف دلانے والی بھی ہے، ڈرانے والی بھی ہے اور رغبت بھی دلاتی ہے۔ اور خوف زدہ بھی کرتی ہے۔ پس اے مذمت کرنے والے، دنیا کے اور اس کے مکر سے فریفتہ ہونے والے کیا تجھ کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ تیرے آباء کی موت نے یا تیری ماؤں کے زیرِ خاک دفن ہو جانے نے (یعنی اے مذمت کرنے والے کیا تو اس وجہ سے دنیا کی مذمت کرتا ہے) اور اے دنیا کی زینت کے مکر میں آنے والے) کیا تو نہیں دیکھتا کہ کتنی مرتبہ تُو نے بیماروں کی تیمارداری کی ہے اور کتنے مریضوں کا اپنے ہاتھ سے علاج کیا ہے کہ اُن کو شفا ہو جائے، اور کتنی مرتبہ تُو نے اُن کے لئے اطباء کو طلب کیا ہے، اور اُن کے لئے دوا مہیا کی ہے۔ لیکن تیری کوششوں نے کچھ فائدہ نہ پہنچایا اور نہ تیری شفاعت نے اُن پر کچھ اثر کیا۔ اور نہ تیری تیمارداری نے کو شفا بخشی۔

پھر آنجناب اُن قبروں کی طرف متوجہ ہوئے جو وہاں موجود تھیں، اور فرمایا:۔

"اے اہل ثروت عزت! تمہاری ازدواج سے لوگوں نے نکاح کر لیئے، تمہارے اموال تقسیم کر دیئے گئے، تمہارے گھروں میں اور لوگ ساکن ہو گئے۔ یہ تو خبر ہماری طرف سے ہے جو ہم تم کو دیتے ہیں، اب تمہاری طرف سے کیا خبر ہے؟ پھر ان لوگوں سے فرمایا جو وہاں موجود تھے، کہ واللہ! اگر ان کو اجازت مل جائے تو البتہ یہ جواب دیں کہ بتحقیق کہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ اور یہ شعر پڑھا:۔

کس قدر اچھی ہے دنیا اور اُس کا آنا جبکہ خدا کی اطاعت کرے وُہ شخص،
جس کو وہ حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر وُہ اُس کی نعمتوں سے لوگوں کی مدد نہ
کرے، تو اُس نے پلٹ دیا دنیا کے حصول کو اُس کی واپسی سے۔ یعنی اُس کا
نہ حاصل ہونا ہی اُس کے لیئے بہتر تھا"؛

دنیا کی اصلی حقیقت اور حالت اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ دُنیا میں انسان کی زندگی کے مقصد اور طریقۂ رہائش کو کیسے عمدہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور اشعار میں اُس کا خلاصہ رکھ دیا ہے۔ دنیا بہترین جگہ ہے، حصول امن و دوام کا ذریعہ ہے، اگر اس میں خوف خدا اور اُس کے اوامر و نواہی کی پابندگی میں زندگی گزاری جائے۔ دنیا بدترین جگہ ہے اگر اُس میں انہماک ہے، اور اُس کی زینت سے عشق ہے۔ تو اس کا نتیجہ غفلت اور عاقبت کا عذاب ہے۔

حصۂ اول خداوند تعالےٰ کے فضل و کرم سے ختم ہوا۔ اس کے بعد حصۂ دوم شروع ہوتا ہے۔ اس میں انشاء اللہ اُن تمام ارکانِ حیات ابدی کا تذکرہ ہوگا جو اس کتاب کے صفحہ پر جدول کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

عبدہ المذنب!
"محمد سلطان مرزا"

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

[illegible] الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ... وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۳:۱۸۵

[illegible] اور تم لوگ قیامت کے دن اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ پاؤ گے دنیا کی زندگی تو ایک دھوکہ ہے۔

فلسفۂ اسلام

حصہ اول

جس میں

(۱) ادیانِ عالم، فلسفۂ یونان و ایران و ہندوستان و مصر اور حالات و مآثر و تہذیبِ اقوامِ ماضی مثلاً اہلِ بابل، آشوریا، فینیقیا، مصر و جزیرہ قریطہ، چین وغیرہم کو وضاحت سے بیان کرکے انکا مقابلہ فقہ و فلسفۂ اسلام سے کیا گیا ہے جس سے حقیقت و فضیلتِ اسلام عیاں ہے۔

(۲) ارشاداتِ قرآن و تعلیماتِ ائمہ علیہم السلام کو موزوں مقامات پر شرح و بسط کیساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) دہریت کے نظریات و معتقدات کی تردید باحسن دلائل کی گئی ہے (۴) آیاتِ فطرت سے فاطرِ ارض و سموات کیطرف دلالت کیگئی ہے اور اس ضمن میں علمِ اجرامِ فلکی و علمِ طبیعیات و تخلیقِ کائنات و ابتدائے حیات و گردشِ ثوابت و سیارگان و اثرِ خارجِ عالمی و تقلیبِ معدنیات و اختلافِ خلقت کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور سائنس کی لاعلمی کو ہر مناسب موقعہ پر عیاں کیا گیا ہے ——— !

تالیف

آغا محمد سلطان مرزا
ایم اے، ایل ایل بی۔ ڈسٹرکٹ و سیشن جج ریٹائرڈ جسٹس آف پیس کراچی و نوٹری پبلک کراچی۔ سابق آنریری سیکرٹری پراونشل سول سروس جوڈیشل برانچ پنجاب سابق ممبر کورٹ اور دہلی یونیورسٹی۔

مؤلفِ البلاغ المبین، نور المشرقین من حیاۃ الصادقین، کتاب التعلیق و التحریف فی الاسلام، کتاب سیرۃ فاطمۃ الزہرا۔ وغیرہ وغیرہ؛

ناشر

امامیہ کتب خانہ

مغل حویلی

حلقہ ۲ ــــــــــــ لاہور ۸

[illegible] قیمت حصہ اول سفید کاغذ مجلد [illegible]

Marfat.com